



جامعہ




جامعہ ملیہ کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ

جلد ۱۰ | بابت ماہ جنوری ۱۹۲۸ء | نمبر ۱




مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
1927

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

نمبر ۱	بابتہ ماہ شعبان ۱۳۴۶ھ مطابق جنوری ۱۹۲۸ء	جلد ۱۰

فہرست مضامین

وائے، برون!

(۳)

(گزشتہ سے پیوستہ)

برون نے جب فرقہ بابیہ کے متعلق قلم اٹھایا، تو ایک طرف تو سارے یورپین ادبیات کا غائر مطالعہ کیا، دوسری طرف جو بابی ادبیات خود خرید کر ساتھ لائے تھے، یا برٹش میوزیم میں موجود تھیں انہیں بھی بالاستیعاب نہایت غور و فکر کے ساتھ پڑھا، ان تمام کتابوں کا ہر جزئی مسئلہ کے متعلق ایک دوسرے کے ساتھ مقابلہ کیا، اور بالآخر انہوں نے وہ مضمون لکھا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

بابی فرقہ کے متعلق مختلف پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی تھی۔ مثلاً ایک صورت یہ تھی کہ انکے عقائد و خیالات کے تحلیل و تجزیہ کے بعد انکے ہر اصول کے مانند پر بحث کیجاتی، سابق ایرانی، زرتشتی مزدکی، اور دیگر مذاہب سے انکا مقابلہ کیا جاتا، یا سابق اسلامی فرق، نصیریہ، اسماعیلیہ وغیرہا اور بابیہ میں جو عام مشترک اصول تھے اُن کو ظاہر کر کے دکھایا جاتا، یا ہمعصر فرق اسلامیہ، وہابیہ، ہندیہ وغیرہا کے اصولی خیالات میں ایک حد تک اتحاد، اس کے اسباب، وغیرہا سے بحث کی جاتی۔ لیکن برون نے ان تمام حیثیات سے عموماً قطع نظر کیا، اگرچہ بعض بعض مقامات پر ان امور کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، انکے خیال میں یہ سب عرصہ کے بعد بھی کیا جا سکتا تھا بشرطیکہ خود بابیوں کی کتابیں اور انکے عقائد مرتب و معتبر شکل میں محفوظ رہیں۔

اس مضمون کے لکھنے سے جیسا کہ خود بیان کرتے ہیں، انکے مقصود اصلی صرف دو تھے اولاً بابیوں کی تاریخ و ادبیات کی حتی الامکان ترتیب و حفاظت۔ ثانیاً دیگر مستشرقین کا اس کی

اہمیت کیطرف متوجہ کرنا۔

اس مضمون کے انہوں نے دو حصے کئے ہیں، پہلے حصہ میں فرقہ بابیہ کے ساتھ اپنی دلچسپی کے اسباب، ایام قیام فارس میں، اس فرقہ کے لوگوں کے ساتھ اپنی ملاقات، انکے چشم دید حالات، ان کی خصوصیات، باب اور بہا کی پیشین گوئیاں بیان کی ہیں، انکے بعض تاریخی واقعات کے متعلق سنین وشہور میں جو اختلافات معلوم ہوتے ہیں انہیں صاف کرنیکی کوشش کی ہے، اور اپنی رائے کی تائید میں اہم بابی کتابوں سے استناد کیا ہے۔ آخر میں اہم بابی تاریخی واقعات کا ایک تبصرہ دیا ہے، جو تاریخی حیثیت سے بہت اہم ہے۔

دوسرے حصہ میں بابی ادبیات کی تاریخ لکھی ہے اور انکی تنقید کی ہے، اس حصہ کا مصنف ایک نوجوان کثیر المطالعہ مستشرق ہی نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس میں مشہور مورخ ادبیات ایران کا دماغ وقلم صاف صاف نظر آتا ہے بابی ادبیات کو چار دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) بابی ادبیات قبل مرزا علی محمد باب (۲) تصانیف مرزا علی محمد باب (۳) تصانیف مرزا علی حسین نوری بہاء اللہ قبل دعوے نبوت (۴) تصانیف بہاء اللہ بعد دعوے نبوت۔

اگر ان حالات وواقعات کو پیش نظر رکھا جائے جنمیں بابی مذہب کو ترقی واشاعت ہوئی تو معلوم ہوگا کہ اس مصنف ادب کی مندرجہ بالا تقسیم کتنی مشکل تھی۔ ایک تو جھگڑوں اور قصوں کیوجہ سے بابی تصانیف پر نہ کتابوں کا نام لکھا جاتا تھا، نہ مصنف کا، دوسرے خود ان واقعات کی تاریخ کے متعلق سابق مصنفین میں اختلاف آرا تھا، پھر شیخ احمد احسائی کی تصانیف کا اس وقت تک کوئی پتہ نہیں تھا، کہ انکے خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا۔ ان حالات کے باوجود، براؤن اپنی غائر ادبی نظر، دیدہ ریزی، اور جانکاہ محنت وشوق مطالعہ وکتب بینی کے بدولت اپنے منطقیانہ تقسیم میں بالکل کامیاب ہوئے، شیخ احمد احسائی کے عقائد کا پتہ تو انہوں نے ان کتابوں سے چلایا جو انکے مخالفین نے انکے رد وجواب میں لکھی تھیں، اور جن میں رد لکھتے ہوئے ان لوگوں نے ان کے عقائد بیان کئے تھے بابی تصانیف کے اسماء ومصنفین وتاریخ کا نشان خود ان تصانیف کی ورق گردانی سے ملا کیونکہ

ان تصنیفات میں ایک دوسرے سے اقتباسات مع نام کتاب اکثر پائے جاتے ہیں، اسکے علاوہ جن واقعات کیطرف ان میں اشارہ کیا گیا ہے ان میں سے بعض کی تاریخ معلوم و مشہور تھی، اس سے ان کتابوں کے زمانۂ تصنیف کا ایک حد تک اندازہ کیا، اور خارجی شواہد و اسناد کے ذریعہ سے اس کی تحدید و تعیین کی۔

مختلف تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے کم و بیش اسکا خلاصہ بھی دے کر ہر کتاب پر مختلف حیثیتوں سے تنقید کی ہے۔ اس میں وہ خطوط بھی داخل ہیں جو بہاء اللہ نے ملکۂ وکٹوریہ، قیصر ولیم (جرمنی) نپولین ثالث اور پوپ وغیرہ کو اپنے مذہب کی دعوت کے خیال سے لکھے تھے، آخر میں مشہور بابی شاعر قرۃ العین کی جو بابی مذہب اختیار کرنیکے قبل زرین تاج اور اس کے بعد جناب طاہرہ کے نام سے مشہور تھیں، دو نظموں کا متن اور انکا انگریزی ترجمہ، اور ذیل کی نظم متعلق تاریخ باب مع انگریزی ترجمہ کے ملحق کردی ہیں

اس مضمون کے متعلق براؤن کی محنت و دیدہ ریزی اور حقیقی جد و جہد تنقید واقعی کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے کہ قرۃ العین کی نظموں کے متعلق پہلے تو انہوں نے خود یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا یہ نظمیں واقعی قرۃ العین ہی کی تھیں؟ اس شاعرہ کی نظموں کا کوئی مجموعہ کبھی شائع ہوا، نہ کہیں پایا جاتا ہے، جس سے اس دعوے کا ثبوت مل سکے، اور مرزا حسین خاں نے تو اپنی کتاب تنبیہ الاطفال میں جو قسطنطنیہ سے ۱۳۰۰ء میں شائع ہوئی ہے، مشہور نظم

لمعات وجہک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلے | ز چہ رو الست بربکم نزنی؟ بزن کہ بلے بلے
بجواب طبل الست تو ز ولا چہ کوس بلا زدند | ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم و بلا "
آہ

کو ملا محمد باقر صحبت کیطرف اور دوسری نظم :-

جذبات شوقک الجمت بسلاسل الغم و البلا | ہمہ عاشقان شکستہ دل کہ دہند جان برہ ولا
اگر آں صنم ز رہ ستم پی کشتن من بیگنہ | لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضے
آہ

سے کے اول شعر کو مرزا عبد الکریم ساکیطرف منسوب کیا ہے۔ اس کے بعد اس مسئلہ کے متعلق اپنی تحقیق و تجزیہ ابوالنہوں کی رائے اور انکی ذہنیت وغیرہ سے استدلال کر کے یہ ثابت کیا کہ یہ نظمیں قرۃ العین ہی کی ہیں کسی دوسرے کی نہیں۔ اسی طرح ہر مسئلہ کے متعلق مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کے حل کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اس زمانہ کے موجودہ بابی ادبیات پر پوری تنقید کی ہے۔

اس مضمون میں براؤن سے بہتیری غلطیاں بھی ہیں جن میں باب کی سنہ پیدائش کا مسئلہ بھی داخل ہے۔ لیکن اولاً تو وہ انسان تھے اور معصوم نہ تھے۔ ثانیاً بڑی حد تک اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں جو کتابیں موجود تھیں انہیں دیکھکر غالباً اگر کل نہیں تو اکثر مصنفین یہی غلطیاں کرتے۔ ثالثاً جس جس مسئلہ کے متعلق انکو اپنی غلطیوں کا پتہ چل گیا ہے، اس کے متعلق انہوں نے فوٹ نوٹ میں اپنی غلطی کا اقرار کر کے اصل مسئلہ کی تصحیح کر دی اور اصل میں تغیر نہ کرنے کے اسباب بیان کر دئے ہیں۔

اس مضمون سے براؤن کے دماغ، تخیل، اور ذہنیت کے متعلق چند اہم باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱- براؤن کے دل و دماغ کو ناجائز جبر و دباؤ، اور ظلم و استبداد سے طبعی نفرت تھی، اگر مظلوم و مجبور اپنے ہمت و ارادے میں استقلال و پامردی دکھاتا تو اس سے انکو دلی ہمدردی ہوجاتی، ترکوں کے ساتھ ان کی ابتدائی دلچسپی، اس کے فرقہ بابیہ، اور اس کے ادبیات کے متعلق انکے شغف کا باعث انکا یہی طبعی میلان تھا۔

۲- السنۂ مشرقیہ کے متعلق انکا شوق و شغف نفس زبان کی خوبی و سلاست، مذہب و بلاغت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ زبان کو وہ صرف دماغ و ذہنیت، طریق تخیل تک پہونچنے کا آلہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علم اللسان، صرف و نحو، وغیرہ سے، انکو کبھی بھی کوئی خاص دلچسپی نہ رہی۔

۳- ان کا ادبی ذوق صلہ و ستائش کا مرہون منت نہ تھا۔ نہ اپنے ادبی افکار و اعمال کے ذریعے انکو اپنا نام و نمود مقصود تھا۔ بلکہ انکے خیال میں اس تمام جد و جہد کی علت غائی صرف علمی خدمت اور نوجوانوں کی تشویق تھی۔ چنانچہ اپنے اس ابتدائی مضمون کے دیباچہ میں

لکھتے ہیں کہ اس مضمون کے لکھنے سے انکا مقصود صرف یہ ہے کہ ایران کے بابی ادبیات کو ضائع ہونے سے بچالیں، اور گوبینو نے جس کام کو شروع کیا تھا اس کی تکمیل کردیں نیز یہ کہ دیگر مستشرقین کو اس کی طرف متوجہ کریں، کیونکہ اگر اس دلچسپ موضوع کی طرف جلد توجہ نہ کی گئی تو بہت ممکن ہے کہ یہ دنیا سے ہمیشہ کے لئے معدوم ہوجائے

۴۔ ہر مصنف کا یہ فرض اولین سمجھتے تھے کہ اپنا قلم ہاتھ میں لینے سے پہلے کل ادب متعلق موضوع پر عبور کرکے پوری واقفیت حاصل کرلے اور پرانی باتوں کے بیکار تکرار کی جگہ ادبیات میں واقعی اضافہ کرنیکی کوشش کرے۔

۵۔ براؤن اپنے مضامین کے دیباچہ میں اکثر اپنے ماخذ کا ذکر کرکے انپر مختصر تنقید بھی کردیا کرتی ہیں، تاکہ لوگوں کو انکے نتائج کے متعلق تنقید کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

۶۔ براؤن اپنی ذات کے متعلق معصومیت کا خیال نہ رکھتے تھے، بلکہ خود کو انسان اور غلطی کرنیکی صلاحیت رکھنے والا جانتے تھے، اگر کوئی غلطی کرتے، اور ان پر یہ ظاہر اور ثابت ہوجاتا تو اسے فوراً تسلیم کرلیتے۔ ہمارے ملک کے انشا پردازوں کی طرح دوسری غلطی یعنی خطا، پر اصرار نہ کرتے بلکہ وہ تو یہ کہا کرتے تھے کہ اس قسم کی غلطیاں بھی باعث خیر و برکت ہیں،، اگر یہ غلطیاں نہ ہوتیں تو انکی تصحیح بھی نہ ہوتی۔ ٹیگور نے صحیح کہا ہے کہ ہندوستانیوں کی بڑی شامت تو یہ ہے کہ عرصہ مدید سے اس قوم نے من حیث القوم کوئی بڑی غلطی تک نہ کی۔

۷۔ انداز بیان صاف دلچسپ اور ہر قسم کی آلائش آرائش و تصنع سے بالکل پاک ہے۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے جس جلسہ میں اس مضمون کا پہلا حصہ پڑھا گیا تھا اس میں اس خاص مضمون کے متعلق کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا تھا لیکن جب اس مضمون کی اہمیت اس کی ہمہ گیری، اور براؤن کا فضل و کمال اور حزم پہلے حصہ سے ظاہر ہوگئی تو دوسرے کے لئے جو تاریخ مقرر کی گئی تھی (۱۰ جون ۱۸۸۹ء) اس میں انگلستان کے اکثر بلند پایہ مستشرقین، ڈاکٹر لائٹنر، مسٹر کے، مسٹر پوپی وغیرہ موجود تھے۔ اور ڈاکٹر لائٹنر تو خاصکر اس مضمون کے متعلق اظہار

خیال کرنے کے لئے سوسائٹی کیطرف سے بلائے گئے تھے۔

براؤن کے مضمون اور اس کے متعلق سوالات اور مباحثہ کے ختم ہونیکے بعد ڈاکٹر لائٹنر نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ براؤن نے بہتیری تفصیلیں، جو انکے جوابات سے ظاہر ہوئیں، اپنے مضمون میں داخل نہ کیں[1]، لیکن اگر وہ لائٹنر کے خیال پر عمل کرتے تو انکا مضمون ایک دفتر کی شکل اختیار کر لیتا۔

براؤن کے اس مضمون نے مستشرقین کے حلقہ میں انکی قابلیت، اور مستشرقیت کا سکہ بٹھادیا۔ چنانچہ مسٹر ایچ، سی کے جب سوسائٹی کے صدارت سے علیحدہ ہونے لگے تو انہوں نے اس مضمون کی تعریف کی[2]۔ بیرن وکٹر روزن نے اپنے مضامین میں اگر براؤن کے مضمون کی منصفانہ مخلصانہ تنقید کی، تو ساتھ ساتھ ان کی قابلیت محنت، اور سچی علمی خدمت کی قابل رشک داد بھی دی[3]۔ میجر جنرل گولڈ سمتھ نے ان کی اشاعت "تاریخ جدید" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ اگر براؤن نے بابی ادبیات اور تعلیمات کے متعلق، اپنے ابتدائی قابل آفریں مضمون کے علاوہ کوئی دوسری خدمت نہ کی ہوتی، جب بھی مستشرقین اور طلبہ علوم مشرقیہ کی منت پذیری، اور شکریہ کے پورے ضرور مستحق ہوتے[4]۔ کیپٹن ٹومنسک نے اپنے روسی ترجمہ لوح اقدس میں پروفیسر براؤن کی خدمات کی اتنی تعریف کی کہ براؤن خود بھی شرما گئے[5]۔

اس قابل فخر مدح وثنا، اور تعریف وتحمید کا اثر ایک معمولی انسان پر تو یہ ہوتا کہ وہ اس کو اپنے عروج وکمال کا انتہائی نقطہ خیال کرکے شکر کرتا، قناعت کے عام لغو اور بے معنی مفہوم کو یاد کرتا، اور آئندہ کے لئے اپنے تمام قوائے دماغی اور علمی کو معطل چھوڑ دیتا۔ ایک ہندوستانی نوجوان بیکار تو نہ بیٹھتا لیکن آئندہ بجائے علمی خدمت کرنیکے لوگوں کی تعریفوں اور ثنا ذل کے اوراق کو علیحدہ چھپوا تا

---

(۱) رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۹ء صفحہ ۱۰۱،

(۲) " " " سنہ ۱۸۹۰ء صفحہ ۶۷۰-۶۶۹

(۳) " " " سنہ ۱۸۹۲ء صفحہ ۲۶۹

(۴) " " " سنہ ۱۸۹۴ء صفحہ ۶۲۰

(۵) " " " سنہ ۱۹۰۰ء صفحہ ۳۵۱

انہیں اپنے خرچ سے تمام اخباروں میں شائع کراتا۔ ان سبھوں کو ایک کتاب کی شکل میں طبع کراتا۔ اور اگر اس سے ممکن ہوتا تو اس مطبوعہ کتاب کے مختلف اوراق کی جلی قلم سطروں کو تراش کر اپنی پیشانی اپنے چہرہ وغیرہ پر چپکا کر ارباب حل وعقد حکومت اور خاصکر خداتگان سررشتۂ تعلیم سے ملنے کو جاتا، اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کا گشت کرتا۔ اور اگر بہت منکسر المزاج ہوتا تو ایک رسالہ شائع کرنا شروع کر دیتا، اور اس کے ہر نمبر کے اول و آخر اوراق میں اپنے متعلق لوگوں کی رائیں شائع کیا کرتا۔

یورپ کے فضلا میں عموماً اس قسم کی تنگ دلی اور سبک سری نہیں پائی جاتی۔ ان لوگوں نے نہ تو قناعت کے اس غلط مفہوم کا سبق پڑھا ہے۔ نہ انکو لوگوں کے آرا کی بہت پروا ہوتی ہے۔ یہ لوگ تو جس کام کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں، صرف اپنی دلچسپی کی وجہ سے لیتے ہیں، اور براون کی ذات تو ان باتوں سے کوسوں دور تھی، ذرا چشم عبرت سے دیکھئے کہ اس طرح دنیا کا ان پر کیا اثر ہوا۔ انکی آتش شوق تیز تر ہوگئی۔ انکا علمی شغف اور بھی ترقی کر گیا۔ انکو خیال ہوا کہ بابیوں کے متعلق جو کام شروع کیا گیا ہے اُس کی تکمیل ان لوگوں کے مقتداؤں 'باب' اور 'صبح ازل' سے ذاتی طور پر تبادلہ خیال کئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ جس سال سوسائٹی کے جلسہ میں انہوں نے اپنا مضمون پڑھا تھا اُسی سال گرمیوں کی تعطیل میں، جزیرہ قبرس اور وہاں سے شام چلے گئے، اور جزیرہ قبرس کے شہر ماغوسا، اور شام کے شہر عکا میں "صبح ازل" اور "بہاء اللہ" سے ملے۔ ماغوسا میں دو ہفتہ تک 'صبح ازل' کے ساتھ مقیم رہے، مختلف مسائل بابیہ پر دل کھولکر اُن سے گفتگو کی، اور فرمائش کر کے باب و بابیہ کے متعلق ایک مختصر تاریخی رسالہ لکھنے پر راضی کیا۔ عکا میں ایک ہفتہ بہاء اللہ کے مہمان رہے، اور کئی دفعہ بہاء اللہ سے ملے، رخصت ہونیکے وقت بہاء کے صاحبزادہ عباس آفندی معروف بہ عبدالبہاء نے اپنی کتاب "مقالہ سیاح" کا ایک نسخہ تحفۃً پیش کیا۔(۱)

کیمبرج واپس آئے تو پہلے سے اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بابی ادبیات کا

---

(۱) مقدمہ نقطۃ الکاف صفحات ز۔ یا

مطالعہ اور اُنکے متعلق تصنیف و تالیف شروع کی۔ اس بحث و جستجو کے نتائج کی فہرست حسب ذیل ہے:۔

۱۸۹۱ء عبدالبہا کا (مذکورہ بالا) مقالہ سیاح متن فارسی اور انگریزی ترجمہ مع تنقیدی مقدمہ حواشی بہ ایں فاضلانہ تبصرات و تکملات (۱) دو جلد۔

۱۸۹۲ء باب کے بیان (فارسی) کی اشاعت کے خیال سے اس کے پانچ مختلف قلمی نسخوں کا باہم مقابلہ اور فہرست مضامین وغیرہ کی تیاری (۲) بابی ادبیات کے متعلق چند اہم مضامین (۳)۔

۱۸۹۳ء ۱۔ انگریزی ترجمہ تاریخ جدید مصنفہ مرزا حسین ہمدانی مع طویل مقدمہ و حواشی و تبصرات (۴)

" ۲۔ سفرنامہ ایران جس میں منجملہ اہم فرقہ بابیہ کے متعلق بھی معلومات کا معتدبہ اہم اور مستند ذخیرہ موجود ہے (۵)

" ۳۔ مائیر دن کی کتاب "حیات و تعلیمات عباس آفندی" کا تینتالیس صفحوں کا مقدمہ۔

۱۸۹۷ء۔ بابیوں کی جنگ زنجان کے متعلق ایک اہم فارسی رسالہ کا انگریزی ترجمہ (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۹۷ء)

۱۹۰۲ء۔ باب و بابی (انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس جلد ۲۔ صفحات ۲۹۹-۳۰۸)

---

(۱) اس کتاب کے تکملہ و لواحق میں اُس مختصر تاریخ باب و بابیہ کا انگریزی ترجمہ داخل ہے جو صبح ازل نے براؤن کی فرمائش سے لکھی تھی۔

(۲) چند در چند مشکلات و عوائق کے باعث یہ کتاب نہ شائع ہوسکی۔ لیکن اسکا انڈکس وغیرہ جو براؤن تیار کرچکے تھے سلسلہ گب میموریل میں نقطۃ الکاف کے ساتھ شائع ہوگیا ہے۔

(۳) دیکھو فہرست مضامین رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بابت ۱۸۹۲ء۔

(۴) اس کتاب کے مقدمہ میں مترجم نے کتاب کی اہمیت اور اس کے غیر مستند ہونیکے متعلق فاضلانہ بحث کی ہے۔ اور تکملہ میں بعض اہم بابی مکتوبات کا خلاصہ بھی داخل کیا ہے۔

(۵) اس سفرنامہ میں بابیوں کے متعلق معلومات کا معتدبہ مستند ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اسیوجہ سے تصانیف متعلقہ بابیہ میں داخل کیا گیا ہے۔ اسکا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۶ء میں سر ڈینیزن روس کے مقدمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

سنہ ۱۹۱۰ء - متن کتاب نقطۃ الکاف مع طویل مقدمہ تنقیدی (سلسلہ گب میموریل)

۲- بابی - انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد صفحات [illegible]

سنہ ۱۹۱۸ء - مجموعہ رسائل و مضامین متعلقہ بابیہ — Material for the study of Babi Religion

اس فہرست پر صرف سطحی نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادبیات بابیہ میں براؤن کی دلچسپی کا اصلی مرکز تاریخ باب و بابیہ تھا۔ انکے عقائد کے متعلق گرچہ براؤن کو اچھا خاصہ تحقیقی علم تھا جیسا کہ انکی تصنیفات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے متعلق انہوں نے کوئی اہم کتاب شائع نہیں کی بجز اپنے ابتدائی مضمون (رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۹ء) میں ایک حد تک تحقیقی حیثیت سے عقائد با-ے متعلق بحث کی ہے، اور اس موضوع پر اپنی آخری تصنیف میں ایک غیر بابی مسلمان، آقا محمد تقی کے رسالہ احقاق الحق کا ترجمہ داخل کر دیا ہے(۱) لیکن آقا محمد تقی نے خود احقاق الحق رد بابیت میں لکھی تھی، اور ایک فریق کا بیان اس کے مخالف عقائد کے متعلق چنداں قابل اعتبار نہیں ہو سکتا۔ براؤن پر یہ ایک الزام تھا کہ انہوں نے تاریخ بابیہ کے متعلق تو اس قدر لکھا، لیکن انکے عقائد کے متعلق تقریباً خاموش ہی رہے(۲) میرے خیال میں یہ اعتراض آج بھی اسی قدر صحیح ہے جتنا مجموعہ رسائل و مضامین بابیہ کے اشاعت کے قبل تھا۔ مگر کیا یہ اعتراض بھی قابل توجہ ہے، براؤن نے میسیوں مسائل، اور مباحث پر ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اس میں عقائد بابیہ ہی کی کیا خصوصیت ہے۔ ہر شخص اپنی دلچسپی کے مطابق ہی کام کرتا ہے۔

بابی تاریخ کے ساتھ براؤن کی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ اگر انکو اس کے متعلق ایک معمولی سا رسالہ بھی ملجاتا تو غور و فکر کے ساتھ اسکا مطالعہ کرتے اس کے ہر جز کا ادب متعلق کے ساتھ مقابلہ اور موازنہ کرتے، ہر مسئلہ کے متعلق نہایت غور و فکر کے ساتھ رائے قائم کرتے، اگر کسی مسئلہ کے متعلق انکو تشفی نہ ہوتی تو مستند لوگوں سے اس کے متعلق استفسار کرتے۔ رسائل اور کتابیں اگر شائع کرتے

---

(۱) Material for the study of Babi Religion pp. 322-329

(۲) Intr. pp. XIII-XIV

تو اس کے ساتھ ادب متعلق کا وہ حصہ بھی شائع کر دیتے جس سے اس کے بیانات کی تائید یا تردید ہوتی ہو اور حواشی میں تمام گتھیوں کے سلجھانیکی پوری کوشش کرتے۔ رسالہ سیاح ۔ تاریخ جدید اور نقطۃ الکاف کی اشاعت انکے مقدمے اور لواحق و حواشی ہمارے بیان کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

رسالہ سیاح چونکہ بہاء اللہ کے صاحبزادہ عباس آفندی نے بہاء کے حکم سے لکھا تھا اس لئے اس کے لواحق میں بہاء کے حریف صبح ازل کا رسالہ بھی داخل کر دیا۔ تاریخ جدید ایک قدیم تر کتاب (نقطۃ الکاف) پر مبنی ہے اور بہائیوں کے زیر اثر تصنیف ہونیکی وجہ سے اس میں بیسیوں تاریخی واقعات کی ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ اس لئے اولاً تو براؤن نے تاریخ جدید کے حواشی و لواحق میں اس کی پوری طرح جانچ پڑتال کی، اور بعض اہم مکتوبات کو جس سے اس کے مضامین کی تائید یا تکذیب ہوتی تھی شائع کیا۔ اور اسکے بعد جب انکو دیگر اشغال سے کچھ فرصت ملی تو فوراً انہوں نے نقطۃ الکاف کا متن بھی شائع کر دیا (۱)

---

(۱) مرزا محمد قزوینی نے جو مضمون براؤن کے متعلق لکھا ہے اور ایران شہر میں شائع ہوا ہے (اس مضمون کا اُردو ترجمہ رسالہ "اردو" میں شائع ہو گیا ہے) انہیں اس کتاب کی تصحیح و اہتمام کو ایک دوست کی محنت کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "از ہماں وقت (وقت اشاعت تاریخ جدید) عزم کردم کہ متن نقطۃ الکاف را البتہ بطبع برسانم ولے بواسطہ موانع بسیار از آنجملہ باز ایں عزیمت در بوتہ اجمال ماند، ولا ینقطع موانع جدیدہ می آمد و فرصت دست زدن بایں کار نمی داد تا دو سال پیش کہ بعد از طبع جلد دوم از "تاریخ ادبیات زبان پارسی" کہ مرا فی الجملہ فرصتے پدید آمد بے درنگ عزم خود را از قوت بفعل آوردہ مشغول طبع کتاب گردیدم۔ و بجہد واتمین آنرا کہ بخط خود نوشتہ بودم با نسخہ پاریس با دقت تمام مقابلہ نمودم و اینک بیاری خداوند حسن توفیق او طبع نقطۃ الکاف تمام گردید" (صفحہ یح) اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نقطۃ الکاف کی تصحیح وغیرہ براؤن نے خود کی تھی۔ لیکن مرزا محمد کے بیان کو غلط سمجھنا بھی سخت غلطی ہو گی۔ خاصکر ایسی صورت میں کہ دوست مرزا محمد کے سوا کوئی اور صاحب نہیں ہو سکتے۔ اس اختلاف بیان کی توجیہ یوں بھی کیجا سکتی ہے کہ آخری تصحیح اور مقابلہ غالباً ان دوست صاحب نے کیا ہوگا یا یہ کہ انکا اشارہ اس نقل نویسی کیطرف ہے جس نے پیرس کے کتبخانہ سے اس کتاب کی نقل کی تھی۔

براؤن کا مقدمہ نقطۃ الکاف نہایت دلچسپ ہے۔ اس مقدمہ میں براؤن نے جن الفاظ میں اس کتاب کے متعلق اپنی تلاش و جستجو، اسمیں ابتدائی ناکامی، اور آخری اتفاقی کامیابی کا تذکرہ کیا ہے اس سے اگر ایک طرف براؤن کی سعی بلیغ اور بہائیوں کے حرکات و اعمال کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان بہائیوں کا براؤن کے دماغ پر جو اثر پڑا اس پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے۔

براؤن لکھتے ہیں (مقدمہ فارسی نقطۃ الکاف صفحہ یب)۔ "درضمن اشتغال بترجمہ تاریخ جدید، دیدہ بودم کہ مصنف از یک کتاب قدیمترے تالیف حاجی مرزا جانی کاشانی نقل میکند بہمیں جہت تاریخ خود را موسوم بتاریخ جدید نمود تا از تاریخ مرزا جانی کہ از آں قدیمتر است امتیاز یابد لہذا در صدد بودم کہ ایں تاریخ را نیز بدست آورم .... ودر اوقاتیکہ کہ در ایران بودم از ہرکس کہ سراغ ایں کتاب را گرفتم از آں اطلاعی نداشت۔ پس از مراجعت باروپا نیز بدوستان بابی خود در ایران و اسلامبول و شام وغیرہا نوشتم و از اطراف در صدد تفتیش برآمدم، ہرچہ بیشتر جستم کمتر یافتم۔ بالآخر مایوس گشتم و یقین کردم کہ ایں کتاب بکلی از میان رفتہ است تا در بہار ۱۸۹۱ء (۱۸۹۱) در اوقات فصح Easter بپاریس رفتم و در ضمن تفتیش در کتب بابیہ محفوظہ در کتابخانہ ملی پاریس اتفاقاً یک نسخہ از تاریخ حاجی مرزا جانی یافتم۔ بدیہی است کہ تا چہ درجہ خوش وقت شدم پس از تحقیق معلوم شد کہ ایں نسخہ ملک مرحوم کومت گوبینو مولف "مذاہب و فلسفہ در آسیائے وسطے" بودہ است .... پس از مراجعت بکیمبرج بتوسط یکے از دوستان تقاضا خود مقیم پاریس یک نسخہ از روے نسخہ کتابخانہ پاریس براے خود نویسانیدہ متن آنرا با متن تاریخ جدید مقابلہ کردم۔ معلوم شد کہ مصنف تاریخ جدید کتاب حاجی مرزا جانی را نسخ بلکہ مسخ کردہ است، و باندازہ جرح و تعدیل و تصرفات مغرضانہ در آن نمود کہ بکلی حقیقت تاریخ دورہ اولاے بابیہ در پردۂ خفا ماندہ"۔ اس کے بعد اس کتاب کی کمیابی بلکہ نایابی کے اسباب (بہائیوں کی خودغرضی اور انکی قابل افسوس کوششیں بیان کرکے لکھتے ہیں۔ (صفحات مہ۔ مو)" باانکہ من درنقاط مختلفہ ایران میان بابیان تجسس شدید و فحص

فوق العادة برائے بدست آوردن نسخہ از تاریخ مرزا جانی نمودم ہیچ اثرے از آن نیافتیم۔ و این مسئلہ
خیلے مہم است۔ و در خصوص تاریخ مذاہب دیگر نیز خیلے چیزہا میتوان از آن استنباط نمود، چہ برائے
امثال ما در بیان کہ معتادیم کتب چاپی کہ ہزارہا نسخ از آن منتشر است و کتابخانہائے عمومی کہ کتابہا
بالکمال وقت و اہتمام در آن محفوظ است خیلے مشکل است تصور این مسئلہ کہ یک چنین کتاب مہمے را چگونہ
با این درجہ از سہولت میتوان محو و نابود نمود۔ و ہمچنین مشکل است تصور این امر کہ متدینین بیک
مذہب کہ قطعاً صاحب منتہی درجۂ قدس و ورع و در حوادث یومیہ و امور معتادہ دارائے اعلیٰ مراتب
صدق و درستکاری ہستند چگونہ برائے محو یک اثر تاریخی و تدلیس امر و تمویہ حق بدین سہولت بایکدیگر ہمعہد
و ہمداستانی می نمائند"

اسی مقدمہ کے دوسرے حصہ میں صاحب تاریخ جدید کی واقعات تاریخیہ کے متعلق ترمیم و
تنسیخ اور تدلیس و تحریف کو بیان کرتے ہوئے اجتماع بدشت کے متعلق لکھتے ہیں :۔

(صفحہ ۱۰) قسم سوم آن کہ متعلق است بشرح اجتماع بدشت و حرکات غریبہ بابیہ در آنجا کہ
نہ فقط اسباب قیل و قال و ہیاہوے مسلمانان گشت بلکہ بعض از بابیہ خود نیز این حرکات را تشنیع کردند
. . . . بکلی از تاریخ جدید حذف شدہ است و این حذف چنداں ہم جائے تعجب
نباید شد۔ کہ نقطۃ الکاف جناب قدوس در آن اجتماع نمود قطعاً تہمتہائے کہ مسلمانان ببابیہ میزدند
از قبیل آنکہ ایشان طریقہ اباحیہ دارند یا آنکہ باشتراک در نساء قائل اند و نحو ذلک، قدرے
صورت صدق میدہد، و معلوم میکند کہ این تہمتہائے بکلی بے اساس صرف نبودہ است . . .
بلکہ چیزکے بودہ و مردم چیزہا گفتہ اند۔

غالباً انہیں حالات کے انکشاف، بہائیوں کے امریکا وغیرہ میں طریق تبلیغ اس سلسلہ میں
انکی غلط بیانی(۱) انکے خیالات میں روزافزوں تغیرات ان لوگوں میں خاص ایران کی محبت کی

---

(۱) مطالعات بابیہ Material for the study of Babi Religion صفحات ۱۲۵ و ۱۳۰ و ۱۴۲ وغیرہ۔

کی اور ایسے تفرقات اور خانہ جنگیوں وغیرہ کی وجہ سے براؤن کی بابیوں اور بہائیوں کے ساتھ دلچسپی کم ہوگئی۔ براؤن کی تصنیفات متعلقہ بابیہ مندرجہ بالا اور اُنکے سنین تصنیف کے مقابلے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ جدید کے ترجمہ کے بعد سات برس تک اُنہوں نے بابی ادبیات کے متعلق ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ اور نقطۃ الکاف کی اشاعت کے بعد (جس کا پورا سامان تاریخ جدید ہی کی تصنیف کے زمانہ میں تیار ہوگیا تھا) آٹھ برس تک بابیوں کے متعلق بالکل خاموش رہے۔ اس خاموشی کا سبب اگر ایک طرف مشاغل کی افزونی، دلچسپیوں کی بوقلمونی، اعمال ادبیہ کی گوناگونی، اشغال کی وسعت اور وقت کی قلت تھی، تو دوسری طرف بہائیوں کے متعلق دلچسپی کی کمی بھی تھی۔ آخری دو تصانیف میں نہ وہ پہلا سا جوش و خروش ہے نہ وہ زور شور، نہ وہ افراط خلوص ہے، نہ وہ ہمدردی کی لہر چنانچہ مقدمہ نقطۃ الکاف میں لکھتے ہیں "این تفرقہ آخری و حقد و حسد و جنگ و جدالی کہ ازاں ناشی شدہ راستی این است کہ اثر خیلے بدی در ذہن این بندہ پدید آورد" (صفحہ مو) "مذہب بہائی بعقیدۂ این بندہ زیادہ از آں مشرب بین الملی دارد کہ امروز تواند بحال حالیہ ایران مفید واقع شود یا درد ے از دردہائے ایران را علاج نماید۔ از کلمات بہا ءاللہ است کہ لیس الفخر لمن یحب الوطن۔ بل الفخر لمن یحب العالم، و این سخن اگرچہ در مقام خود بس عالی و لطیف است و لے امروز تنہا سے کہ ملت خود از ہر چیز و ہر کس در دنیا دوست داشتہ باشند فقط چیزے است کہ ایران بداں احتیاج دارد" (صفحہ مز) اپنی آخری بابی تصنیف "مطالعہ مذہب بابی Material for the study of Babi Religion میں لکھتے ہیں "اگرچہ بابی تحریک کی سیاسی اور ملی اہمیت اتنی زیادہ نہ ثابت ہوئی جتنی میں ایک زمانہ میں سمجھتا تھا جب بھی مختلف مذاہب کے باہم موازنہ و مقابلہ اور مذہبی تخیل کی ترقی کے لحاظ سے یہ مذہب ہمیشہ ایک خاص اہمیت رکھیگا۔ (Intr. P. VIII)

مندرجہ بالا اقتباسات وغیرہا میں براؤن نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُنکے باوجود بھی کچھ تو انہوں نے اپنی تصانیف و مضامین کے ذریعہ سے فضل و کمال، اور خاصکر بابی تحریک کے متعلق سند ہونیکی جو شہرت حاصل کرلی تھی اُس کی وجہ سے اور کچھ اُنکی خوش خلقی اور عام انسانی

ہمدردی کیوجہ سے ۔ بابی اور جو لوگ اس مذہب اور اس کے متعلق ادبیات سے دلچسپی رکھتے تھے انکی نہایت قدر کرتے ۔ اکثر بابی، بہائی ہوں یا ازلی، اپنی تصنیفات و مضامین انکے پاس بھیجا کرتے تھے ۔ اگر کوئی بابی انگلستان آتا ۔ یا انگلستان کیطرف سے گزرتا تو عموماً ان سے ملنے کو لئے کیمبرج آیا کرتا۔" براؤن نے بھی اپنی خالص علمی اور ادبی دلچسپی اور فطرتی انسانی ہمدردی کی وجہ سے ان لوگوں کے ساتھ اپنے تعلقات قائم رکھے ۔ اور بہاء اللہ اور انکے مقلدین، اور مرزا یحییٰ صبح ازل اور انکے متبعین دونوں کے ساتھ آخر آخر تک خط و کتابت جاری رکھی ۔ اور ان سبھوں کے ساتھ اپنے تعلقات رکھے ۔ اس سلسلہ خط و کتابت وغیرہ کی وجہ سے ۔ انکے پاس اہم بابی ادبیات کا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا[1] ۱۹۱۸ء میں اپنے دیگر مشاغل سے ان کو کچھ فرصت ملی تو خیال ہوا کہ اس ذخیرہ کی اگر خبر نہ لی گئی تو ممکن ہے کہ یہ بالکل ضائع ہو جائے ۔ انہوں نے بعجلت ان میں سے بعض اہم رسائل کا انگریزی ترجمہ کیا ۔ اور بقیہ کی کچھ تنقیدی کچھ معمولی فہرست تیار کی ۔ اور ایک چھوٹا سا جس میں صفحوں کا معمولی مقدمہ منضم کر کے Material for the study of Babi Religion کے نام سے شائع کر دیا ۔

اس مجموعہ میں حسب ذیل رسائل کے انگریزی ترجمے داخل ہیں :-

۱- بابی و بہائی ۱۸۹۷ء ۔ مصنفہ مرزا محمد قزوینی ۔

۲- ابراہیم جورج خیر اللہ و تبلیغ بہائیت در امریکہ ۔

۳- مختصر فہرست کتب قلمیہ و مطبوعہ، بابیہ بہائیہ و ازلیہ

۴- باب کی جرح تبریز کے متعلق پانچ غیر شائع شدہ مکتوبات ۔

۵- ۱۸۵۲ء میں باب پر جو مظالم ہوئے انکے متعلق اسٹریا کے ایک افسر کا چشم دید بیان ۔

۶- ۱۸۶۴ء سے ۱۹۰۳ء تک اصفہان میں بابیوں پر جو مظالم ہوئے انکی تاریخ ۔

۷- بابیوں کے بغداد سے یورپین ٹرکی کیطرف منتقل کئے جانے کے متعلق دو غیر شائع شدہ سرکاری

(۱) مطالعات بابیہ صفحات ۲۰۸، ۲۰۹ ذخیرہ سے اسکا کافی ثبوت ملتا ہے ۔

۸۔ مرزا محمد یحییٰ صبح ازل کی وفات اور تکفین و تدفین کے حالات۔
۹۔ بہاء اللہ اور صبح ازل کے والد ماجد مرزا بزرگ کے ورثہ کی فہرست
۱۰۔ احقاق الحق مصنفہ مرزا محمد تقی کا خلاصہ۔
۱۱۔ قرۃ العین اور نبیل کی چند چیدہ نظمیں۔ مع ترجمہ انگریزی۔

اس فہرست سے اکثر رسالوں کی اہمیت بالکل ظاہر ہے۔ اس اہمیت کیوجہ سے براؤن نے کچھ وقت صرف کرکے انکو شایع تو کر دیا، لیکن اپنی کتاب میں وہ دقیقہ سنجی پیدا کر سکے جو بغیر دلچسپی کے پیدا ہی نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں فاضل، نقاد اور جز رس براؤن کا قلم کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ بلکہ وہ اس میں صرف ایک مترجم کی حیثیت سے دکھائی دیتے ہیں بعض بعض جگہ جو حواشی لکھے ہیں ان سے بھی اس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتا کہ مترجم کا مطالعہ ادبیات بابیہ انہیں چند کتابوں میں محدود نہ تھا۔

براؤن کی ذہنیت کا اندازہ کرنیکے لئے یہ کتاب بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء تک اپنے علمی اشغال کیوجہ سے فضل و کمال اور علمی نقد و اختیار کی حیثیت سے جو شہرت و وقعت حاصل کرلی تھی اُس کے لحاظ سے ایسے ترجمہ محض کا شائع کرنا کوئی بہت مناسب نہ تھا، ممکن تھا کہ ان کی قابلیت کی شہرت پر اس کی وجہ سے داغ آجاتا لیکن جب یہ زیادہ براؤن کو یہ خیال نہ ہوا اور انہوں نے اپنی ذاتی دلچسپی کم ہوجانیکے باوجود صرف تاریخی اہمیت کی وجہ سے مستشرقین اور طلبہ بابیات کی اعانت کے خیال سے اسے شائع کر دیا، تاکہ اس موضوع سے زیادہ دلچسپی رکھنے والے طلبہ اس سے اپنے افکار علمیہ میں مدد لے سکیں۔

اس مجموعہ کے مطالعہ سے ایک طرف تو بابی تاریخ، اور طریق تبلیغ کے متعلق بیسیوں اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں اور دوسری طرف براؤن کی "ذہنیت" پر بھی بہت روشنی پڑتی ہے۔

خود باب نے آخری زندگی کے اوقات میں علماء کے ساتھ مناظرہ میں خاموشی اور پشیمانی سے

اپنے کاذب ہونیکا جو ثبوت دیا (صفحہ ۲۷۹-۲۰۲) حکومت ایران نے بہائیوں کو بغداد سے منتقل کرنے کے لئے ترکوں کے ساتھ جو ساز باز کیا (صفحہ ۲۷۹-۲۰۲) بہائیوں اور ازلیوں میں جو جنگ وجدال ہوا (صفحہ ۲۰-۳۰) بہاءاللہ کے لڑکوں میں جو اختلافات پیدا ہوئے اور بہائیوں نے امریکہ میں تبلیغ کے سلسلہ میں جو صورتیں اختیار کیں (صفحہ ۱۱۵-۱۷۱) اُن سبھوں پر اس مجموعہ سے بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔

خود براؤن کی حق پسند طبیعت کا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مجموعہ کے تیسرے حصہ میں سید محمد مہدی کی "سوانح خود نوشت" کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سید محمد مہدی نے اپنی زندگی کے ۱۹۱۰ء ہی تک کے واقعات لکھے تھے کہ انکے صاحبزادے نے انکو نقطۃ الکاف کی ایک جلد لاکر دی۔ انہوں نے میرا مقدمہ پڑھا تو اپنی سوانح عمری تو علیحدہ ڈالدی، اور میرے دلائل ونتائج کی تنقید و تردید میں مشغول ہو گئے۔ اور اپنی کتاب کے ایک غیر مکمل نسخہ کے حاشیہ پر سرخ روشنائی سے یہ لکھکر بھیجدیا کہ بقیہ حصہ اس کے بعد بھیجا جائے گا جو بدقسمتی سے آجتک میرے پاس نہ آیا صفحہ ۲۲۳ اس کتاب کی تنقید کے لئے بہت وقت کی ضرورت تھی، کیونکہ ادب متعلق کے مقابلہ ومقایسہ کے بغیر بھی تنقید ناممکن تھی، اور براؤن کے ادبی مشاغل اب اسقدر ترقی کر گئے تھے کہ اس کے لئے وقت نکالنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا، لیکن اس کتاب کو انہوں نے اول سے آخر تک پڑھا اپنی فہرست میں اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کتاب سے مصنف کا ابتدائی اور انتہائی واقعات تاریخ بابیہ کے متعلق وسیع علم اور ادبیات بابیہ پر کامل عبور ظاہر ہوتا ہے، اسکا مہذب اور منطقیانہ طرز ادا قابل صد آفریں ہے، بہائیوں کی حمایت میں جتنی کتابیں میری نظر سے گزری ہیں اُن میں یہ بہترین ہے، اس میں ایسے معلومات کا جو کسی اور کتاب میں نہیں ملتے، زبردست ذخیرہ موجود ہے (صفحہ ۲۲۳)

ذرا غور کیجئے کہ ایک طرف تو براؤن، مصنف کے بیانات کی نہ تردید کرتے ہیں، نہ تائید کیونکہ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف حق پسندی کی وجہ سے اپنے حریف کی خوبیوں کی

تعریف کرنے سے پہلو تہی بھی نہیں کرتے۔ براؤن کی حق پسندی کی بہتیری اور مثالیں آئندہ بیان کی جائنگی

بابی ادبیات کے متعلق براؤن کی دلچسپی، اس کے اسباب اور اس کے نتائج کی داستان آپ سن چکے۔ لیکن اس داستان کے متعلق ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ براؤن اس تمام جد و جہد سے اپنے مقصود کے حصول میں کہانتک کامیاب ہوئے؟

یہ تو میں بیان کرچکا ہوں کہ اس تمام کوشش و کاوش سے براؤن کا اصلی مقصود مستشرقین اور طلبہ علوم مشرقیہ میں بابی ادبیات کے متعلق علمی دلچسپی پیدا کرنا، ان ادبیات کو حتی الامکان ضائع ہونے سے بچانا، اور کومت دو گوبینو کے اعمال علیہ کو مکمل کرنا تھا۔ ان میں سے اپنے اول مقصود میں تو یہ بالکل ناکام رہے۔ لیکن آخری مقاصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، کیونکہ براؤن کے علاوہ کسی انگریز مستشرق نے اس فرقہ کے متعلق جہانتک مجھے علم ہے آجتک کچھ بھی نہیں لکھا فرانسیسیوں میں اس کے متعلق کچھ تو انکے قبل سے دلچسپی موجود تھی، کچھ خود بہائیوں کی تبلیغ کیوجہ سے پیدا ہوئی[1] جرمنوں نے اولاً تو بابی ادبیات کے متعلق کوئی اہم کتاب نہیں لکھی۔ اندریاس، گولڈزیہر وغیرہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ براؤن کی کتابوں یا مضامین سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ ذاتی علمی شغف یا بہائیوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر[2] امریکہ میں بھی بہائیوں کی تبلیغ اتنی منظم، اور زبردست طور پر ہوئی کہ وہ اس سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکے[3]

---

(۱) فرانسیسی مستشرقین میں گوبینو، اور کلیمان ہوار کے علاوہ ادبیات بابیہ کے متعلق اے۔ ال۔ ام نکولاس اور دریفس خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

(۲) جرمنوں نے اس صنف ادبیات کے متعلق بہت کم لکھا ہے، گولڈ سیہر، اندریاس، اور رشر المس کے متعلق کچھ لکھا ہے۔ جرمن زبان میں تاریخ بابی و بہائی کے متعلق مبسوط کتاب رومر کی ہے جو انہوں نے تصنیف کے طور پر لکھی تھی لیکن یہ کتاب بھی زیادہ تر خود براؤن کی تصنیفات پر مبنی ہے، گولڈ سیہر کے مضامین البتہ محققانہ ہیں۔

(۳) امریکہ کے لوگوں نے بہائیوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر جرمنوں کے اعتبار سے زیادہ (دیکھو صفحہ ۱۹)

ہاں اپنے دوسرے مقاصد میں برون پوری طرح کامیاب ہوئے۔ کیونکہ ایک تو انہوں نے بابی تاریخ کے متعلق اہم کتابیں جستجو کر کے شائع کر دیں، دوسرے بابی ادبیات کی فہرست بھی وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے۔ جس سے غیر شائع شدہ کتابوں کا اجمالی علم لوگوں کو ہو گیا۔

کومت دو گوبینو کی بابی تصنیف صرف ایک کتاب کے ایک باب میں محدود تھی۔ اس میں بھی انہوں نے بابیوں کے اجمالی حالات ۱۸۶۲ء ہی تک لکھے تھے۔ برون نے اسے تفصیل و تنقید کے ساتھ موجودہ صدی تک پہنچا دیا۔ اور جو کچھ لکھا وہ ایسی تحقیق وہ ایسی تدقیق کے ساتھ لکھا کہ اکثر اہل الرائے مستشرقین نے فرقہ بابیہ اور بہائیہ کے متعلق سند تسلیم کر لیا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۸) لکھا ہے لیکن ان لوگوں کے ادبیات بابیہ یا تو مبلغانہ ہیں۔ یا مخالفانہ۔ (یہ معلومات خود برون کی فہرستوں اور فانیولر کی اسلام لٹریچر سے ماخوذ ہیں)

دانیالی بشارتیں

(امام نبوت)

(۱)

حضور سرور عالم احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں سے ساری بائبل لبریز ہے لیکن سب سے واضح الفاظ میں حضرت دانیال علیہ السلام نے آپ کی خبر دی جن کو یہود ایک ولی کامل اور عیسائی ایک پیغمبر مانتے ہیں، عہد نبوت کے یہود بھی پیغمبر ہی مانتے تھے انکی بشارتوں کا ایک بڑا حصہ اب انکے صحیفہ میں موجود نہیں۔

محذوف بشارتیں

(۱) امام شہاب الدین قرافی نے اپنی کتاب اجوبہ فاخرہ میں، ابن قیم نے ہدایۃ الحیاری میں اور علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح میں لکھا ہے کہ حضرت دانیال نے تصریح کے ساتھ حضور صلعم کا نام لیکر آپ کی بشارت دی ہے اور فرمایا ہے۔

سینزع فی قسیک اغراقا وترتوی السہام بامرک یا محمد ارتواء — اے محمد! آپ کی کمانوں میں خوب کھچاؤ پیدا ہوگا، اور آپکے حکم سے تیر سیراب ہوں گے۔

یہ بشارت اب صحیفہ دانیال میں نہیں ہے، حالانکہ ان بزرگوں کے عہد میں یہ عبارت موجود تھی

(۲) یہی بزرگ یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ جس خواب کو دیکھکر بخت نصر بھول گیا تھا۔ اسکی تعبیر میں حضرت دانیال نے بتایا۔

اما الحجر العظیم الذی رایتہ دق الصنم ففتتہ فھو نبی یبعثہ الہ السماء و الارض بشریعۃ قویۃ فیدق جمیع — مگر وہ بڑا پتھر جسے تو نے دیکھا کہ اس نے بت کو توڑکر ریزہ ریزہ کیا ایک نبی ہے جسے آسمان اور زمین کا خدا بھیجیگا ایک مضبوط شریعت دیکر تمام زمین کی ساری حکومتوں

ملوك الارض وأممها حتى يملأ الارض منه ومن امته ويدوم سلطانه الى انقضاء الدنيا اور قوموں کو پارہ پارہ کردے گا اور اس سے اور اسکی امت سے دنیا بھر جائے گی اور اسکی حکومت آخر دنیا تک رہیگی

چونکہ یہ بشارت اتنی واضح تھی کہ بجز اسلام اور پیغمبر اسلام کے کسی اور کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوسکتا تھا، لہذا اب یہ تعبیر بدل دی گئی اور اس کی جگہ ذیل کی عبادت ہے۔

"اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہوگی (دان ۲: ۴۴)"

ابن تیمیہ، ابن قیم، اور قرافی نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت دانیال فرماتے ہیں کہ "میں نے اللہ سے سوال کیا، اور گریہ و زاری کی تاکہ وہ مجھے بتائے کہ بنی اسرائیل کے حق میں کیا ہونیوالا ہے آیا وہ انکی طرف پھریگا یا نہیں، انکو انکا ملک لوٹائے گا یا نہیں اور انمیں انبیا مبعوث کریگا یا نہیں یا یہ فضیلت اوروں کو بخشی جائیگی؟ تو ایک جوان کی صورت میں فرشتہ ظاہر ہوا اور اس نے کہا سلام تجھ پر اے دانیال! اللہ کہتا ہے، بنی اسرائیل نے مجھے برہم کیا اور انہوں نے مجھ سے سرکشی کی اور میرے سوا غیر معبودوں کی عبادت کی اور دانائی کے بعد نادانی اور سچ کے بعد جھوٹ کیطرف چلے اس لئے میں نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا ہے جس نے انکے مردوں کو قتل کیا، زندوں کو اسیر کیا، مسجدوں کو گرادیا، کتابوں کو جلادیا، ایسا ہی اس کے بعد والے انکے ساتھ کریں گے، اور میں ان سے ناراض رہوں گا، وہ میرے غضب میں رہیں گے پھر عذرا، بتول کے فرزند اپنے مسیح کو بھیجوں گا اور انپر لعنت اور غضب کا خاتمہ کردوں گا اور وہ ہمیشہ دھتکار اور ذلت اور بیچارگی میں رہیں گے یہانتک کہ میں بنی اسمٰعیل والے نبی کو بھیجوں گا جس کی خبر فرشتے بھیجکر میں نے ہاجرہ کو دی تھی، اس کی طرف میں وحی کروں گا، اور اسکو اسما کی تعلیم دوں گا اور اسے تقوی سے زینت دوں گا، اور نیکی کو اسکا شعار بنا دوں گا اور تقوی کو اسکا ضمیر اور سچائی کو اسکا قول اور وفا کو اس کی طبیعت اور میانہ روی کو اس کی عادت اور ہدایت کو اسکا طریقہ، اس کو خاص کروں گا ایک کتاب دیکر جو پچھلی کتابوں کی سچائی ظاہر کرے گی، اور بعض باتیں منسوخ کریگی، اس کو راتوں رات اپنی طرف بلالوں گا، اور آسمانوں سے

آسمانوں پر چڑھاؤنگا۔ میں اسے اپنے قریب بلاکر اسپر سلامتی بھیجوں گا اور اس کی طرف وحی کروں گا پھر اسے خوشی اور رشک کے ساتھ واپس کروں گا۔ وہ ان باتوں کا پاسبان ہوگا جو میں اسے ودیعت کروں گا سچا ہوگا میرے حکم کا، نرم ہوگا اپنے قول کا، اور اچھے وعظ کے ذریعے میری توحید کیطرف بلائیگا سخت ہوگا نہ کڑا، بازاروں میں نہ چلائے گا۔ اپنے دوستوں پر مہربان اور اپنے مومنوں پر رحم دل ہوگا، اپنے دشمنوں پر کڑا ہوگا، اپنی امت کو میری توحید اور میری عبادت کیطرف بلائے گا۔ اور ان کو ان تمام نشانیوں کی خبر دیگا جن کو وہ دیکھے گا پس لوگ اسے جھٹلائیں گے اور ستائیں گے۔

اس کے بعد قیامت تک کے حالات مذکور ہیں۔

علامہ ابن قیم اس فصل کو نقل کرنیکے بعد فرماتے ہیں۔

وھذہ البشارۃ الآن عند الیھود و النصاریٰ یقرءونھا ویقرون بھا ویقولون لم یظھر صاحبھا	یہ بشارت آج بھی یہود اور نصاریٰ کے پاس ہے، وہ اسکی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صاحب بشارت ابھی نہیں آیا۔

موجودہ بشارتیں۔

لیکن اب بھی دانیال کا سارا صحیفہ آنحضرت صلعم کی بشارتوں سے پُر ہے، حضرت دانیال نے بڑی وضاحت کے ساتھ حضور صلعم کی پیدائش بعثت اور اعلان نبوت کے سن و سال بھی بتادئے ہیں لیکن افسوس حضرت دانیال کا زمانہ ہی گھٹا دیا گیا ہے مگر حضرت دانیال نے صرف آپکے سنین کی تعیین نہیں کی ہے بلکہ آپکے زمانہ کے واقعات سے بھی تحدید کردی ہے، سب سے پہلے ہم واقعات ہی کی شہادت کو پیش کرتے ہیں۔

بت شکن پتھر یا مذہب اسلام۔

بنوکدنضر (بخت نصر) نے یروشلم پر اپنی حکومت کے دوسرے سال، خواب میں ایک بت کو دیکھا جس کا سر سونے کا سینہ اور بازو چاندی کے، رانیں تانبے کی اور ٹانگیں لوہے کی پاؤں آہن و خاک کے تھے لیکن پاؤں کی کچھ انگلیاں لوہے کی تھیں اور کچھ مٹی کی۔ زمین سے خود بخود ایک پتھر نکلا جس نے

اس بت کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ پتھر بالآخر ایک پہاڑ بن گیا اور ساری زمین کو چھا لیا۔

بخت نصر یہ خواب بھول گیا تھا۔ دانیال نے بتایا، اور تعبیر یہ دی کہ یہ بت چار حکومتوں کی تصویر ہے اور سونے کا سر تو ہی ہے یعنی پہلی سلطنت سے مراد خود اہل بابل کی حکومت ہے۔

باقی تین حکومتوں کے نام اس موقع پر مذکور نہیں، لیکن خود حضرت دانیال کی تصریحات سے سب کے نام معلوم ہو جاتے ہیں۔

دوسری حکومت کے متعلق اس موقع پر "چاندی کی حکومت" فرمایا ہے لیکن جب بابلی حکومت کا خاتمہ ہونے کو تھا تو ایک غیبی ہاتھ نے بابلی عربی میں شاہی محل میں یہ عبارت لکھدی تھی۔

منی منی تقیل وفرسین   تیرا اندازہ کیا گیا۔ تو کم ٹہرا۔ تجھے پھاڑا گیا۔

حضرت دانیال کے علاوہ اس غیبی نوشتہ کو کوئی پڑھ نہ سکا آپ نے پڑھا اور مطلب یہ بتایا کہ تیری حکومت مادہ اور فارس کو دی گئی[1] اس سے ثابت ہوا کہ دوسری حکومت سے مراد مادہ (میڈیا) اور فارس کی ذوالقرنین حکومت ہے۔

فارس کے بادشاہ خورس (خسرو گشتاسپ) کے زمانہ میں دانیال کو فرشتے نے خبر دی کہ اب فارس میں صرف ۴ بادشاہ اور ہونگے پھر یونان کی حکومت قائم ہو جائیگی (۱۱:۲) اس سے معلوم ہو گیا کہ تانبے کی حکومت سے مراد یونان کی حکومت ہے۔

چوتھی سلطنت کا نام حضرت دانیال کی زبان سے نہیں معلوم ہوتا لیکن واقعات تاریخ نے بتا دیا کہ اس حکومت کا نام رومن ایمپائر تھا

اس موقع پر حضرت دانیال نے اس حکومت کے تین ادوار بتائے اور یہ تینوں دور صرف رومن ایمپائر میں ہوئے۔

پہلے دور کے متعلق فرمایا کہ "چوتھی سلطنت لوہے کے مانند مضبوط ہوگی اور . . . لوہے کی طرح . . . سب چیزوں کو . . . ٹکڑے ٹکڑے کریگی" (۲:۴۰) یہ رومن ایمپائر کا پہلا دور ہے۔

---

[1] دانیال ب ۵

دوسرے دور کے متعلق فرمایا "اور جیسا کہ تونے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کمہار کی مٹی کی تھیں اور کچھ لوہے کی سو اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا مگر جیسا کہ تونے دیکھا کہ اس میں لوہا مٹی سے ملا تھا سو لوہے کی توانائی اسمیں ہوگی" (۲:۴۱) یہ رومن ایمپائر کے اس دور کا نقشہ ہے جب مشرقی اور مغربی دو قیصروں کے درمیان حکومت بٹ گئی مگر باہم اتحاد رہا۔

آخری دور کے متعلق فرمایا "اور جیسا کہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی تھیں اور کچھ کمہار کی مٹی کی تھیں سو وہ سلطنت کچھ قوی اور کچھ ضعیف ہوگی"۔

اس چوتھی حکومت کے متعلق یہ بھی فرمایا تھا کہ "اور جب کہ تونے دیکھا کہ لوہا مٹی سے ملا ہوا ہے وہ اپنے کو انسان کی نسل سے ملائیں گے لیکن جب کہ لوہا مٹی سے میل نہیں کھاتا تب وہ باہم میل نہ کھائیں گے" (۲:۴۳)

اس موقع پر باہم ترجمہ غلط ہے عبری میں اس کی جگہ اُس سے ہے۔ اب اسکے معنی یہ ہو جائیں گے کہ وہ آدم کے بیٹوں سے اپنا رشتہ قائم کریں گے مگر یہ رشتہ محض لفظی ہوگا۔

فرزند آدم بائبل کے پرانے عہدنامے میں "پیغمبر" کا مرادف ہے اور نئے عہدنامہ میں حضرت مسیح کا خاص لقب ہے۔ اس لئے پیش گوئی کے معنے یہ ہوئے کہ یہ چوتھی حکومت اپنا رشتہ حضرت مسیح یا کسی پیغمبر سے قائم کرے گی مگر اس پیغمبر سے اسے ذرہ برابر مناسبت نہ ہوگی۔ اس چوتھی حکومت کے آخری دور کے متعلق یوحنا لاہوتی نے بھی فرمایا ہے کہ اس کے سینگھ تو برہ (مسیح) کے سے ہونگے اور بولی اژدہا (شیطان) کی سی ہوگی (مکاشفہ ۱۳:۱۱)

اس قدر متعین ہو جانے کے بعد کہ چار سلطنتوں سے مراد بابل، ایران، یونان اور روما کی حکومتیں ہیں (جو برکت والی سرزمین یہوداہ میں پے در پے برسر عروج آئیں) بت شکن پتھر کا نام بھی خود بخود معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام ہے

اس پتھر کی تعبیر حضرت دانیال نے فہو بنی لقیہ الالسار کے الفاظ میں کی تھی لیکن اب یہ فقرہ موجود نہیں تاہم یہ تسلیم ہے کہ اس بت شکن پتھر کو:

(۱) آسمان کا خدا برپا کریگا۔ اس کے معنی صاف ہیں کہ اسلام کو خود خدائے جل و علا نے برپا کیا
(۲) اور وہی ابد تک قائم رہیگی۔ اسلام ابدی سلطنت ہے۔

(۳)

خدا کے قدوسوں کی حکومت۔

بخت نصر کو بابل، ایران، یونان، اور روما کی حکومتیں (الکفر ملتہ واحدۃ) کے اصول پر ایک ہی بت کے مختلف اعضاء کی شکل میں نظر آئی تھیں لیکن سنہ جلوس بلشضر میں حضرت دانیال کو یہ چاروں حکومتیں چار متفرق درندوں کی صورتوں میں نظر آئیں (باب ہفتم)

پہلا درندہ بابل | پہلا درندہ شیر ببر کی مانند تھا، اور عقاب کے سے پنکھ رکھتا تھا، جب اسکا پر اکھاڑا گیا تو اسکا دل انسان کا سا ہوگیا، یہ بابلی حکومت کا نقشہ ہے۔

دوسرا درندہ ایران | دوسرا درندہ ریچھ کی شکل کا تھا، اس کو ایک مرتبہ حضرت دانیال نے دو سینگ والے مینڈھے کی شکل میں دیکھا تھا اور اسکا نام مادہ اور فارس کی حکومت بتایا تھا (باب ہشتم)

تیسرا درندہ یونان | تیسرا درندہ تیندوے کی شکل کا تھا اس کو ایک مرتبہ بال والے بکرے کی صورت میں دیکھا تھا اور حضرت دانیال کو فرشتے نے یونان کا نام بتایا (باب ہشتم)

چوتھا درندہ روما | چوتھا درندہ نہایت "ہولناک اور ہیبت ناک اور نہایت زبردست تھا" اس کے دانت لوہے کے تھے، سب حیوانوں سے متفرق تھا، اسکے دس سینگ تھے، ان سینگوں میں سے ایک اور سینگ نکلا جس کے منہ تھا اور آنکھیں تھیں، وہ منہ کفر کی باتیں بک رہا تھا، وہ سینگ مقدسوں سے جنگ کرتا رہا اور انپر غالب ہوتا رہا یہانتک کہ عدالت بیٹھی، اور اس نے ساری حکومت خدا کے مقدس لوگوں کو چھین کر دیدی (باب ہفتم) تاریخ بتا دیتی ہے کہ اس درندہ سے کونسی حکومت مراد ہے، مگر تاریخ سے زیادہ قابل تسلیم خود بائبل کی شہادت ہے۔

حضرت دانیال فرماتے ہیں کہ فرشتے نے انکی درخواست پر بتایا کہ چوتھا حیوان چوتھی سلطنت ہے جو دنیا میں ہوگی۔ ۔ ۔ اور وہ دس سینگ جو ہیں سو دس بادشاہ ہیں جو اس سلطنت

میں سے اٹھیں گے اور انکے بعد ایک اور ہوگا اور وہ پہلوں سے متفرق ہوگا اور تین بادشاہوں
پر غالب ہوگا اور حق تعالیٰ کی مخالفت میں باتیں کریگا (باب ہفتم) اس سے صاف ظاہر ہے کہ چوتھا جانور چوتھی
حکومت ہے، جو بابل، ایران، اور یونان کے بعد دانیال کے وطن میں قائم ہوئی، اور یہ دس بادشاہ ہیں
جو حضرت یوحنا لاہوتی کے بعد ہوئے، چنانچہ انہوں نے بھی اس چوتھی حکومت کو سر اور دس سینگ
کے ایک درندہ کی شکل میں دیکھا، اور سر اور سینگ دونوں کی تعبیر "بادشاہ" کی، اور
فرمایا کہ پانچ تو گزر چکے ایک موجود ہے، ایک آنے کو ہے اور دس ابھی تک نہیں آئے۔
اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ چوتھی حکومت سے مراد یقینی طور پر ہی رومن ایمپائر ہے جس نے مسیح
کو بظاہر صلیب دی

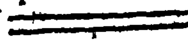
مقدسوں کی حکومت اسلام | حضرت دانیال فرماتے ہیں کہ، میں نے دیکھا کہ وہی سینگ مقدسوں
سے جنگ کرتا رہا۔ اور ان پر غالب ہوتا رہا جب تک قدیم الایام آیا اور مقدسوں کا انصاف کیا گیا
اور وقت آپہونچا کہ مقدس لوگ سلطنت کے مالک ہوں (دان ۷: ۲۱ و ۲۲)
ان آیتوں سے صاف ظاہر ہوگیا پانچویں سلطنت جو حضرت دانیال کے بعد قائم ہوئی۔ وہ خدا
کے مقدس لوگوں کی سلطنت ہے، اسلئے مسیحیوں کا فرض ہے کہ وہ بھی خدا کے مقدس لوگوں
میں یعنی مسلمانوں میں شامل ہوجائیں۔

قدیم الایام | اس مقدس حکومت کی صورت تعبیر حضرت دانیال نے یہ بتائی ہے کہ چوتھی حکومت
کا سینگ کفر اور تکبر کی باتیں بول ہی رہا تھا کہ اتنے میں

"کرسیاں آتاری (یا رکھی) گئیں قدیم الایام آیا اور بیٹھ گیا اسکا لباس برف سا سپید
تھا، اس کے سر کے بال صاف سنہرے اون کی مانند تھے۔ اس کا تخت آگ کے شعلہ
کی مانند نورانی تھا اس کے جلتی آگ کی شکل (روشن) تھے ایک آتشیں
(یعنی نورانی) سیلاب بہ رہا تھا جو اسکے آگے سے نکلا تھا، ہزاروں ہزار اس کی خدمت
میں حاضر تھے اور لاکھوں لاکھ اس کے آگے کھڑے تھے۔

یہ تو وہی نقشہ ہے جو خدا کے موعود فارانی جلال نے بتا دیا گیا تھا (تثنیہ ۳۳ حبقوق ۳)
عدالت ہو رہی تھی، کتابیں کھلی تھیں میں نے دیکھا کہ اسی سینگ کے باعث جو بڑے گھمنڈ
کی باتیں بول رہا تھا وہ حیوان مارا گیا اور شعلہ زن آگ (جہنم) میں ڈالا گیا (۷۔ ۱۱، ۱۲)
قدیم الایام سے مراد یقیناً آنحضرت صلعم ہیں کہ آپ ہی مقدسوں کی حکومت یعنی پانچویں
سلطنت کے بانی تھے۔

حضرت دانیال نے اس موقع پر دو زمانہ بھی بتا دیا ہے جب یہ قدیم الایام عدالت کرنے کو
آنے والا تھا لیکن ہم زمانہ کی تفسیر بعد کو کریں گے۔



قطعہ

مشتمل بر تاریخہائے ہجری رحلت غفران پناہ فردوس آرامگاہ عالیجناب حکیم محمد اجمل خاں مرحوم

(از جناب حکیم سعید الہاشمی اسعد ٹونکی)

آہ عیسیٰ دمے مسیح الملک — کہ تواں بخشش ملک و ملت بود
حافظ و عالم و حکیم و طبیب — فرد در نصح قوم و ہمت بود
آنکہ در طب و عزت و اقبال — گوئے سبقت زہمسراں بر بود
زبدۂ نسل خواجہ احرار — فخر اولاد اکمل و محمود
ہیچ در عمر خود نداشت دریغ — از خدا و نبی بجود و درود
خضر کارے بد و مسیح دمے — فیض را ماند جاوداں موجود
دم گیرائش کار معجزہ کرد — امن و راحت بملک روئے نمود
جامع علم و فضل و عزت و عقل — متفق ساز مسلمین و ہنود
بہ محن کرد ملک را بیدار — پس پئے رفع ماندگی بغنود
کہ پس از استراحتے خوش دل — بر دو در حضور رب ودود
تا پئے قوم رحمتے خواہد — کہ بیابند دائمی بہبود
پس بانعام ایں صنیعۂ خویش — خوش خدا داد باغ خلد خلود
سال تاریخ رحلتش ہاتف — گفت اعز شریف خاتمہ بود (۱۳۴۶ھ)
گفت اسعد و ماد تاریخش — در جناں باد دائمی خوشنود (۱۳۴۶)
شاہ عجم سال ماتمش گفتند (۱۳۴۶) — غفراللہ ۔ دعا گہ پدرود (۱۳۴۶ھ)

مقدمہ بر آزادی مصنفہ مل

(گذشتہ سے پیوستہ)

مل کی "آزادی" کوئی خالص علمی کتاب نہیں ہے، یعنی وہ کسی ایسے عالم کی لکھی ہوئی نہیں ہے جسے سوا اپنے علم کے کوئی اور دلچسپی نہیں۔ ہم اگر اُسے علم سیاست میں ایک بڑا درجہ دیتے ہیں تو اس وجہ سے کہ مل نے اس کتاب میں ان مسائل پر بحث کی ہے جو سیاسی زندگی کی بنیاد ہیں۔ لیکن مل نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اُس میں ایک نکتہ چیں بہت سی خامیاں اور غلطیاں نکال سکتا ہے۔ مل کا انداز بیان ایک جج کا سا نہیں جو معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتا ہے بلکہ ایک وکیل کا سا ہے جو بڑے جوش و خروش سے فیصلہ کو اپنی رائے کے مطابق کرانا چاہتا ہے، اُس نے "آزادی" میں نہ ہر طرف سے معلومات حاصل کر کے جمع کی ہیں نہ یہ کوشش کی ہے کہ غیر جانب دارانہ سیاست کے مسائل پر غور کرے۔ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ مل نے صرف اپنے دل سے ایک بات پوچھی اور اُسکا جواب لکھدیا۔ یہ کتاب کی اگر بڑی خوبی ہے تو علمی نقطہ نظر سے کمزوری بھی ہے۔

مل نے سماج کی کوئی شکل و صورت یا خاص حیثیت قرار نہیں دی ریاست کی اُس نے تعریف تک نہیں کی ہماجی اور سیاسی زندگی کے اصل مقصد پر نہ اپنی رائے ظاہر کی نہ کوئی نظریئے قائم کئے اور آزادی پر بغیر ان مسائل کو حل کئے بحث کرنا گویا بے ملک کے باشندے بنانا ہے۔ مگر مل نے جس نقطہ نظر سے بحث کی ہے وہ ہم کو معلوم ہے، اور جو رائے اسکے ہم خیال لوگوں نے قائم کی تھی اس سے بھی ہم ناواقف نہیں اس لئے ہم یہ اعتراض کرنے کے بعد بھی "آزادی" کے نظریوں سے جو نتیجے نکلتے ہیں اُن پر بحث کر سکتے ہیں۔

عہد وسطیٰ کے تخیل نے دنیا کے لئے ایک ایسا نظام بنا دیا تھا جس میں فرد کی کوئی حیثیت نہیں تھی اُس زمانہ میں اگر کوئی سر اٹھاتا تھا تو ساری دنیا کے خلاف، اگر کوئی نظریئے پیش کئے جاتے تھے تو وہ بھی تمام

مخلوق کے لئے، چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی۔ عہد جدید کے شروع میں سدھار کی تحریک نے اس
دنیا اور اس تخیل کو نیست و نابود کر دیا۔ اب سیاسی نظریوں کا تعلق بجائے ساری دنیا کے مختلف ریاستوں
سے ہو گیا، اگرچہ ان میں جو عام اصول تھے وہ ہر جگہ استعمال کئے جا سکتے تھے مثلاً بیچ کی
صدیوں میں شہنشاہ اور پوپ میں جو جھگڑے ہوئے اُن میں بحث اس پر تھی کہ خدا یا حضرت عیسیٰ نے دنیا
کی حکومت پوپ کے سپرد کی ہے یا شہنشاہ کے؟ اور اگر ان دونوں میں اختلاف ہو تو قوم کو کس کے
حکم کے مطابق چلنا چاہئے، جو نظریئے اس سلسلہ میں پیش کئے گئے اُن سے ہم کو یہاں کوئی مطلب
نہیں۔ ہم کو صرف یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس بحث میں ساری دنیا کی قسمت کا فیصلہ ہوتا تھا برخلاف اس کے
عہد جدید کے شروع کو دیکھئے، مذہبی اختلاف نے پوپ اور شہنشاہ دونوں کو اُنکے شاندار خوابوں سے
جگا دیا ہے، پرانی دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں۔ اب اگر کسی کو فکر ہے تو اُسی ٹکڑے کی جس میں وہ
رہتا ہے اور انہیں مسائل کی جو وہاں زیر بحث ہیں۔ دوپلیسی مورنے اپنی کتاب Vindiciae
contra tyrannos (1512-3 میں یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مشرک یا بے دین بادشاہوں کے خلاف
بغاوت کرنا جائز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حکومت کی بنیاد دو معاہدوں پر قائم ہے۔ ایک بادشاہ اور خدا کے
درمیان جس کے مطابق خدا اس کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ بادشاہ کو فتح مند اور رعایا کو خوشحال رکھے گا بشرطیکہ
وہ سچے دین سے نہ ہٹیں اور خدا کے احکام کی پابندی کرتے رہیں، دوسرا معاہدہ بادشاہ اور اُس کی رعایا
کے درمیان ہوتا ہے جس میں رعایا اطاعت کا عہد کرتی ہے اس شرط پر کہ بادشاہ راہ راست پر چلے
ہمارے لئے ان نظریوں میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ پہلے تو یہ کہ لکھنے والا صرف مختلف ریاستوں کا ذکر
کرتا ہے اور بجائے شہنشاہ اور پوپ کے ہر ریاست کے سردار کا براہ راست خدا سے تعلق پیدا کر دیتا ہے
ثبوت کے لئے تو وہ انجیل پیش کرتا ہے، بالکل اُسی طرح جیسے لوگ بیچ کی صدیوں میں کیا کرتے تھے
لیکن اس زمانہ کا جس بات پر اصرار تھا یعنی یہ کہ ساری دنیا ایک ریاست ہے اور اُس کا ایک ہی بادشاہ
ہو سکتا ہے۔ وہ اب لوگ بھول جاتے ہیں۔ دوسری بات جس پر ہمیں غور کرنا چاہئے وہ یہ ہے کہ بے دین
بادشاہوں کے خلاف بغاوت کرنے کا حق کسی شخص کو نہیں، بلکہ صرف خاص جماعتوں کو دیا جاتا ہے

یعنی جمہوریت کی دنیا جا چکی ہے۔ لیکن مل کی انفرادیت ابھی بہت دور ہے۔

سیاست کے نقطۂ نظر سے یورپ میں کوئی زمانہ اتنا مردم خیز نہیں ہوا ہے جتنا مذہبی لڑائیوں کا لیکن فرد کا کبھی کہیں ذکر نہیں آتا۔ اس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ بحث اور جنگ میں جتنے فریق تھے سب دراصل آزادی کے دشمن تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ لوگ آزادی پسند بھی ہوتے تو انفرادیت ایک انتہا ہے جس تک پہونچنا انکے لیے بہت مشکل تھا۔ اس وجہ سے کہ اس حد تک پہنچنے کے لئے انہیں ان سب باتوں سے انکار کرنا ہوتا جو انہیں ہمیشہ عزیز رہی تھیں، ایک عالم، ایک مذہب، ایک خدا کی جگہ پر ہزاروں آزاد اور خود مختار ہستیوں کا تصور کرنا اُسی وقت ممکن تھا جب نہ عالم باقی رہا ہو نہ مذہب نہ خدا۔

علم سیاسیات میں فرد صرف اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوتا ہے، اور روسو کا یہ نعرہ، "انسان آزاد پیدا ہوا تھا اور میں اُسے ہر طرف زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں" انفرادیت کو علم سیاست میں داخل کرتا ہے۔ لیکن فرد کی ذاتی شخصیت اور اُس کے حقوق کا دعوی کرنا ایسی جرأت کا کام تھا کہ روسو بھی صرف نعرہ ہی لگا کر رہ گیا "عقد اجتماعی" جس کی ابتدا ان الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے بعد کو اسی کا الٹا ثابت کرتا ہے۔ انسان کو آزادی تو ضرور دیجاتی ہے۔ لیکن روسو کی ریاست میں انسان کو ایک فرد بننے اور انفرادیت کے سلسلہ میں اپنے حقوق کا ذکر کرنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا۔ انفرادیت کے قائل وہی لوگ ہو سکتے تھے جن میں اتنا تخیل نہ ہو کہ وہ اسکے تمام نتائج کا ایک ساتھ خیال کر سکتے ہوں اور جنہیں خودی کا جوش اس قدر ہو کہ وہ اس عالم بے پایاں میں بھی اپنی ہستی کو ایک خاص اہمیت دے سکیں یہ خاصیتیں صرف انگریزوں میں پائی جاتی ہیں اور انفرادیت اسی لئے انگریزوں کا حصہ رہی ہے لیکن انگلستان میں بھی انفرادیت اسی وقت رائج ہوئی جب تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ زندگی کے بعض معاملات میں اگر انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اُسے نقصان نہیں ہوگا۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات میں لکھا گیا ہے، انفرادیت کی اصل بنیاد معاشی ضروریات تھیں۔ ہنری

دریافت انسان میں ایک جوش پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتا ہے
" آزاد تجارت " اور انفرادیت دونوں اپنی جگہ پر قابل غور اصول ہیں لیکن اگر انفرادیت معاشی معاملات
میں ملک اچھا یا فائدہ مند اصول ثابت کیجا سکی ہے[1] تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ سیاسی، مذہبی یا اخلاقی
دنیا میں بھی اُسے اختیار کر لینا چاہئے۔

مل نے جس طریقہ سے بحث کی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرد بذات خود بھی کوئی چیز ہے اور
سماج اور ریاست سے الگ بھی اُس کی اپنی خاص زندگی ہے یا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن مل نے
اسے ثابت نہیں کیا، اور ارباب فکر کی ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ انسان کے لئے سماج اور ریاست
دونوں آب و ہوا اور غذا کی طرح ضروری ہیں۔ ارسطو کا یہ قول کہ " انسان ایک سماجی جانور ہے " اب تک درست
مانا گیا ہے اور ہمارے زمانہ کی جدید سے جدید دریافت نے اسی کو دوسرے طریقے سے ثابت کیا ہے۔ مل
کی انفرادیت کی اصل وجوہ دو معلوم ہوتی ہیں اور انہیں پر ہمیں غور کرنا چاہئے۔

(۱) اُسے اس کا یقین نہیں ہے کہ مجموعی حیثیت سے سماج میں کافی حق پرستی اور حرکت پیدا کیجا سکتی ہے
اور اس لئے ضروری ہے کہ ہر فرد کو دریافت اور جستجو کی اجازت دیجائے۔

(۲) جستجو اور دریافت کی اصل وقعت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ انسان کے ذاتی تجربہ سے
صحیح ثابت ہو جائے، خاص طور سے مذہبی اور اخلاقی معاملات میں۔

(۱) ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہر سماج میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو سستی
یا بزدلی کی وجہ سے جسے قدامت پسندی بھی کہتے ہیں، ہر نئی چیز کے خلاف ہوتے ہیں۔ اپنی حالت پر قائم
رہنے کے لئے وہ ہر قسم کی سختی اور زبردستی کو جائز سمجھتے ہیں۔ ارسطو اور افلاطون جو انسان کو بذات

---

[1] معاشی زندگی میں بھی انفرادیت کے قائل صرف انگریز رہے ہیں۔ ان پر یورپ کی اور قومیں اعتراض
کرتی ہیں کہ انہوں نے خود غرضی کو بنا سنوار کر ایک علم کی صورت دیدی ہے، اور اپنے فائدے کے لئے
اس کا پرچار کرتے ہیں۔ یہ تو ضرور صحیح ہے کہ " آزاد تجارت " سے یا تو صرف انگلستان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے یا
دوسری قومیں اس وقت تک آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتی رہی ہیں۔

خود بالکل بے بس اور بیکار قرار دیتے ہیں اسی وجہ سے اس پر خاص زور دیتے ہیں کہ ہر ریاست اور سماج کو اپنے آدرش یا نصب العین مقرر کر لینے چاہئیں اور اپنی تعلیم کو اس ڈھنگ کا بنانا چاہئے کہ ہر بچے میں اپنے فرائض ادا کرنے کی خواہش پیدا ہو اور اس راستہ پر استقلال سے چلتا رہے جو سماج نے اپنے لئے مقرر کیا ہو۔ افلاطون نے اپنی ریاست کو عدل پر مبنی کیا، اور "عدل" کرنا اس نے ہر چیز اخلاقِ سیاسی کا سب سے بڑا فرض ثابت کیا۔ ارسطو نے افلاطون کی طرح کوئی خیالی ریاست نہیں بنائی لیکن اخلاقی ترقی اور انسانی فطرت کی پوری نشو و نما اس کے نزدیک بھی ریاست اور سماجی زندگی کی روح تھیں جس ریاست نے اپنے لئے یہ آدرش نہ مقرر کیا ہو وہ ریاست نہیں، اور جو انسان اس فرض سے غافل ہو وہ انسان نہیں۔

عہد وسطیٰ میں جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، فرد کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سماج کا سب سے چھوٹا جزو برادری یا ہم پیشہ لوگوں کی جماعت مانی جاتی تھی، اور سماج خود ان برادریوں کا مجموعہ تھی۔ بذات خود ایک فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا تھا۔ اگر تھا کچھ تو اپنی برادری کے ایک جزو کی حیثیت سے۔ زندگی کے ہر پہلو پر برادری کی حکومت تھی۔ تعلیم، اخلاق، پیشہ سب برادری طے کرتی تھی، قانون بھی ان معاملات میں وہی بناتی تھی، مجرم بھی اسے کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اسمیں ان کو کامیابی چاہے نہ ہوئی ہو لیکن اس زمانہ کے لوگوں نے اپنی سماج اور اپنی سماجی زندگی کے لئے بہت سے بلند آدرش بھی مقرر کئے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیم کی پیروی کرنا اور انہیں کی طرح رہنا، یہ ذاتی زندگی کا بہترین طریقہ سمجھا جاتا تھا۔ دنیا میں انہوں نے وہی نظام قائم کرنے کی کوشش کی جو اُنکے خیال میں جنت میں تھا، اور دنیاوی زندگی کو وہ اسی قدر پاک و صاف بنانا چاہتے تھے جیسے آسمان پر فرشتوں کی زندگی تھی، اس لحاظ سے بھی انفرادیت اصولاً ناممکن تھی۔ جو دنیا چھوڑتا اُسے اپنی ذات کو ویسے بھی خدا کی ذات میں غرق کر دینا ہوتا، جو دنیا میں رہتا اُسکا اخلاقی فرض تھا کہ سماج کی خدمت میں اپنی ذات کو بھول جائے۔ رفتہ رفتہ یہ آدرش دھندلے پڑ گئے اور سارا نظام کمزور ہو گیا۔ لوگ اس کے خلاف علانیہ بغاوت کرنے لگے۔ اب سے کوئی ایک سو برس پہلے جو صنعت و حرفت میں انقلاب پیدا ہوا، اس نے ہر چیز کو

اس پیمانہ پر پہنچا دیا کہ زندگی کو بالکل قابو سے نکل جانے کا ڈر پیدا ہوگیا بغیر خود اسکا احساس کئے ہوئے
انیسویں صدی میں جو لوگ سیاسی مسائل پر غور کر رہے تھے، چاہے وہ عالم رہے ہوں یا مدبر، در اصل
اسی معاملہ کو طے کر رہے تھے کہ سماج اور ریاست اپنی بڑھتی ہوئی آبادی اور پھیلتی ہوئی زندگی میں کسی
قسم کا نظام قائم کر سکتی ہیں یا نہیں۔ اٹھارہویں صدی کے انقلاب نے فرانس میں ایک مضبوط ریاست
قائم کر دی تھی۔ مرکزی حکومت میں انقلاب ہوتے رہے لیکن انکے باوجود ریاست کے دخل کا دائرہ
بڑھتا رہا تعلیم، مقامی حکومت، وغیرہ سب قوم نے اپنی مرضی سے اس کے سپرد کر دی۔ جرمنی میں نپولین
کی زیادتیوں نے قومیت کا احساس پیدا کر دیا جسے بعد میں بسمارک نے صحیح طریقہ سے استعمال کر کے جرمن
سامراج قائم کیا۔ کانٹ اور ہیگل کے سیاسی نظریوں کا ہم اگر مقابلہ کریں تو جرمن قوم کے خیالات میں جو
تبدیلی ہوئی ہے وہ ہم پر صاف طور سے ظاہر ہو جائیگی اور جو صورت "ریاست" کے تخیل نے جرمنی
میں اختیار کی ہے وہ بھی ہم کو معلوم ہو جائے گی۔ کانٹ نے جس زمانہ میں اپنی تصانیف لکھیں اُس وقت
جرمنی میں کوئی ایسی ریاست نہ تھی جو لوگوں کے تصور پر اثر کرتی یا جو خدمات ریاست قوم کی کر سکتی ہے
اُنکا نمونہ پیش کرتی۔ اس وجہ سے کانٹ ریاست کو زندگی میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اس کی طرف سے
کچھ بدگمانی سی ظاہر کرتا ہے اُس کے خیال میں سماجی زندگی انسان کے لئے ضروری ہے لیکن ریاست
سے بہت ممکن ہے کہ فائدہ کے بہ نسبت نقصان زیادہ پہونچے۔ ہیگل کی آنکھوں کے سامنے پرشا
کی ریاست موجود تھی اور جو اخلاقی اور دنیاوی فائدے پرشا نے جرمن قوم کو پہنچائے تھے ان
سے بھی وہ واقف تھا اسی لئے وہ ریاست کو ایک بہت بلند درجہ دیتا ہے اُس کے نزدیک جب تک
سماج ریاست کی شکل نہ پائے اُسوقت تک اُس میں اور ریاست میں وہی فرق ہے جو انسان کی
مردہ گوشت پوست میں ہے۔ سماج کو ایک ذات، خصوصیت، مقصد، یہ سب چیزیں اسی وقت میسر ہوتی
ہیں جب وہ ایک ریاست بن جائے، ریاست گویا ایک اعلیٰ شخصیت ہے، جو قوم کے آدرش
یا نصب العین اپنی ذات میں رکھتی ہے اور جس کے بغیر قوم ایک گمنام اور بے معنی پریشانیوں کا مجموعہ
ہے۔

ریاست کی تمام قابلیتیں ہیگل کے خیال میں لڑائی کے وقت میں نمایاں ہوتی ہیں۔ سماج اور مختلف افراد جنگ کے زمانہ میں اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں جیسے سپاہی کا بدن زرہ بکتر یا وردی میں ریاست ایک "شخص" ایک خیال، ایک مقصد بن جاتی ہے، اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہزاروں لاکھوں ہستیاں ایک دل میں دھڑک رہی ہیں۔

جرمن ریاست کو صدیوں کی آرزو نے بنایا، یہ کوئی تعجب نہیں ہے اگر ہیگل نے اُسے اس قدر اہمیت عطا کی۔ انگریزی مصنفوں میں ہوبز کے علاوہ کوئی ایسا شخص ہم کو نہیں ملتا جس نے ریاست کو ہیگل کی طرح "ہمہ اوست" کا درجہ دیا ہو۔ اسی میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ سیاسی نظریے سیاسی ضرورتوں کے کس قدر پابند ہیں۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جسے دشمنوں کے حملے سے کوئی ڈر نہیں جس میں ایک زبان، ایک نسل کی قومیں ہیں، جسے قدرت نے تجارت کے لئے خاص موقع عطا کیا ہے اور اسلئے انگریزوں کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ریاست کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے روکیں۔ یورپ کے ارباب فکر کا عام طور سے یہ بھی خیال ہے کہ انگریزوں کے تخیل میں اتنی بلند پروازی اور اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ تجارتی جھگڑوں سے ہٹ کر ریاست کی نازک اور اعلیٰ ہستی کو سمجھ سکیں۔ برخلاف اس کے جرمنی میں تخیل کی کوئی کمزوری نہیں رہی ہے لیکن دشمنوں نے اس کو بہت پامال کیا اور جرمن قوم میں آپس کا بیر بھی بہت رہا ہے۔ اسی لئے ایک ایسی ریاست کی جو دشمن سے مقابلہ کر سکے اور جس میں شامل ہونے سے جرمن قوم کے تمام فرق مٹ جائیں ہر صاحب دل کی آرزو تھی، اور جب اُس کے آنے کا چرچا ہوا تو اس جوش وخروش سے اُسکا استقبال کیا گیا۔

ہیگل کے سیاسی خیالات جن کو "ریاست کا فلسفیانہ نظریہ" بھی کہتے ہیں، دراصل وہی ہیں جو افلاطون اور ارسطو کے خیالات تھے۔ فرق جو ذرا سا پیدا ہو گیا ہے وہ اصول کا نہیں ہے دنیا کی صورت بدل گئی ہے، ریاست کی وسعت میں بہت اضافہ ہو گیا ہے سماج کی ضروریات زیادہ ہو گئی ہیں، مل اور عام طور سے انفرادیت کے حامی ہی صرف ایسے ہیں جو اس خیال کے خلاف ہیں اور جو ریاست کو حقوق اور حیثیت دینا قوم کے افراد یعنی خود قوم کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اُن کی

یہ رائے کہاں تک صحیح ہے۔

انفرادیت کی بحث چھیڑ نا بھی ایک طرح سے اس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ فرد اور قوم کے اغراض میں اختلاف ہو یعنی جس میں ایک کا فائدہ ہے اُس میں دوسرے کا نقصان ہو سکتا ہے، علاوہ اس کے یہ بھی کہ انسان سماج سے الگ بھی کوئی ہستی رکھتا ہے اُس کے کچھ حقوق ہیں جو فطرت نے اُسے عطا کئے ہیں اور اُس کی دینی، اخلاقی اور دنیاوی بہبودی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ اگر ہم مختلف زمانوں میں اس خیال کا پتہ لگائیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل بنیاد کیا ہے، یہ لوگوں میں کیسے پیدا ہوا اور یہ کہاں تک صحیح ہے۔

سولھویں صدی میں مذہبی اور سیاسی اختلاف کو جائز ثابت کرنیکے لئے یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ سماج اور ریاست کی بنیاد چند معاہدوں پر ہے جو قوم اور بادشاہ، یا قوم اور خدا، یا خدا اور بادشاہ کے درمیان قائم ہیں، اور سیاسی فرائض قوم اسی وقت تک ادا کرنے پر مجبور ہے جبتک کہ دوسرا فریق اُس کی شرطیں پوری کرتا رہے، سترہویں صدی میں اسی معاہدہ کو اور صورت دی گئی، ہوبز اور اسپنوزا نے مختلف ارادوں سے یہ دکھانا چاہا کہ سماج اور ریاست قوم نے آپس میں معاہدہ کرکے بنائی تھی، اور اس معاہدہ سے پہلے ہر شخص آزاد تھا اور ایک نظری حالت میں رہتا تھا۔ اس حالت میں اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے قدرت نے اُسے طاقت بخشی تھی جو کچھ تو وہ اپنی طاقت، جرأت یا سمجھ سے حاصل کر سکتا تھا وہ اس کا گویا حق تھا۔ لیکن یہ زندگی سب کے لئے موزوں نہ تھی، اور اس لئے سب نے مل کر سماج اور ریاست قائم کی جس میں سب کے حقوق برابر تھے، اور اسمیں جان اور مال کی حفاظت پوری طرح سے ہو سکتی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں روسو کی تصانیف نے انسان کی اس فطری حالت کو ایک نہایت شاعرانہ ڈھنگ و روپ دیدیا۔ اور اگرچہ اسی کتاب میں جو اُس کی سب سے بڑی سیاسی تصنیف مانی جاتی اُس نے اپنی رائے بالکل بدل دی ہے اور سماجی اور سیاسی زندگی کو فطری زندگی سے بہتر بتایا ہے۔ اس وجہ سے کہ اخلاقی احساس اور اخلاقی ترقی صرف سماجی اور سیاسی زندگی ہی میں ممکن ہے، لیکن پھر بھی فطری حالت اور فطری حقوق کا ڈھنڈورا اُسی طرح سے پٹتا رہا۔ سترہویں صدی کے آخری حصہ میں دو زبردست انقلا

ہوئے، جن میں سے ایک امریکہ کا انگریزوں کے خلاف تھا اور دوسرا فرانسیسی انقلاب، ان دونوں میں انسان کے قدرتی حقوق کا بڑے زور شور سے اعلان کیا گیا۔ ان دونوں انقلابوں کو اس خیال کے پرچار کا عروج کہا جا سکتا ہے۔

قوموں کو آزادی حاصل کرنی تھی اور اس کے لئے انہوں نے بہانے نکالے تھے جب آزادی مل گئی اور ان سیاسی عقیدوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا گیا اس وقت معلوم ہوا کہ یہ سب عقائد بڑی حد تک غلط تھے، اس سے یہ مطلب نہیں کہ آزادی کے لئے جن لوگوں نے جان دی وہ سب جھوٹے اور مکار تھے، اور نہ یہ کہ آزادی حاصل کرنے کا انہیں حق نہیں تھا ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ ان سیاسی نظریوں کے متعلق ہے۔

تاریخ سے یہ تو ضرور ثابت ہو سکتا ہے کہ انسان ایک زمانہ میں بالکل وحشی تھا، لیکن نہ تو یہ زندگی بہت اچھی تھی، اور نہ اُنکے کوئی حقوق" تھے "حق" کا ذکر، جیسا کہ گرین نے لکھا ہے، اسی وقت ہو سکتا ہے جب قانون ہو، اور قانون صرف ریاست یا سماج بنا سکتی ہے، معاہدہ اسی وقت ہو سکتا ہے، اور اسکی پابندی پر لوگ مجبور اُسی حالت میں کئے جاتے ہیں جب ایک سماج یا ریاست موجود ہو اور اُس نے قانون کے ذریعہ سے اسے لازم کر دیا ہو۔ اس لئے تاریخ یا منطق سے فطری حالت یا فطری حقوق کو ثابت کرنا ناممکن ہے بلکہ اس زمانہ کی علم الانسان کی تحقیقات نے تو یہ دکھایا ہے کہ انسان "فطری" حالت میں رسوم اور قوانین کے اندر بالکل جکڑا ہوتا ہے، اور وہ آزادی جو نظریوں نے اُسے فطری حالت میں دی تھی اسے وہ دراصل رفتہ رفتہ حاصل کرتا ہے، جیسے جیسے اُس کے علم کا دائرہ بڑھتا ہے ویسے ویسے وہ اپنی سمجھ سے کام لینے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔

اُنیسویں صدی اور اس زمانہ کے لوگ جو انفرادیت کے حامی ہیں وہ اس فطری حالت یا فطری حقوق کا کہیں کوئی ذکر نہیں کرتے اور نہ انہیں ثابت کرنے کی کوئی کوشش کرتے ہیں۔ ہربرٹ اسپنسر کو یہ یقین ہے کہ انسان کو قدرت نے جو قابلیت دی ہے وہ دنیا میں جتنے نظام کی ضرورت ہے اسے قائم رکھنے کے لئے کافی ہے اُسے صرف جان و مال کی حفاظت چاہئے، وہ بھی تعلیم اور تہذیب

رفتہ رفتہ پیدا کردیں گی یعنی ریاستوں میں لڑائیاں نہیں ہوا کریں گی اور تعلیم کی وجہ سے چوری وغیرہ بھی معدوم ہوجائے گی۔ مل ریاست کو اس قدر حقارت سے نہیں دیکھتا جیسے اسپنسر دیکھتا ہے لیکن سماجی زندگی کا مرکز اُس کے نزدیک بھی مختلف افراد اور اُنکی دلچسپیاں ہیں۔ ریاست کا حکومت کے ایک خاص دائرے کے باہر اثر ڈالنا، سماج کا محض ایک تخیل سے زیادہ ہونا، یہ دونو صرف فرد کی آزادی کے لئے بھی خطرناک ہیں۔ چنانچہ لبرلزم کے اصولوں میں سے ایک زمانہ تک یہ بھی رہا ہے کہ ریاست کی بیجا مداخلت سے فرد کو بچانا چاہئے، حالانکہ جس فرد کو وہ بچانا چاہتی تھی وہ بالکل فرضی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ شے جسے لوگ فرد کہتے ہیں بالکل فرضی ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے اور نفسیات کے اعتبار سے بھی ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اپنے ماں باپ کی کچھ خاصیتیں لیکر آتا ہے۔ زندگی کے پندرہ بیس برس وہ اپنی سمجھ سے پوری طرح کام نہیں لے سکتا۔ اس وجہ سے نہیں کہ ریاست یا سماج اسے منع کرتی ہے بلکہ اس وجہ سے کہ خود اُسکی سمجھ کا کافی نشوونما نہیں ہوا ہے۔ اس زمانہ میں اُس کے گرد و پیش جو لوگ ہوتے ہیں انکا اور اُنکے خیالات کا اثر اس پر خود بخود پڑتا رہتا ہے یعنی اگر ریاست اور سماج اس کی کوشش بھی کریں کہ ہر فرد آزاد ہو اور اس کی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہونے پائے تب بھی ہر فرد ویسا ہی رہے گا جیسا اب ہے۔ مادی اور نفسی نقطۂ نظر سے انسان چند طبعی خاصیتوں کا مجموعہ ہے، سماج ان پر صرف ایک حد تک اثر ڈال سکتی ہے۔ مل یہ چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے راستہ پر چلنے کی ہر طبیعت کو اپنی خواہش کے مطابق نشوونما پانے کی اجازت ہو۔ لیکن انسان میں نقل کا مادہ موجود ہے، وہ بغیر کسی کے حکم کے خود دوسروں کی پیروی کرتا ہے خود دوسروں کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے دوسری مثال لیجئے، مل نے خیالات کی آزادی پر زور دیا ہے، اور کہتا ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے لوگوں کو ایک دوسرے پر سختی نہ کرنی چاہئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ خود اختلاف سے ڈرتے ہیں، قدامت پسند لوگ جو عام طور سے تمام سختیوں کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اس سے ڈرتے ہیں کہ جس خیال میں وہ زندگی بھر رہے ہیں وہ غلط ثابت ہوجائے گا اور اُنکی روحانی تسکین کا ایک سہارا جاتا رہیگا۔ جو لوگ اُن کی سختیوں سے ڈر جاتے ہیں انکو خود اپنے اوپر اعتماد نہیں ہوتا، اور وہ اکیلے رہ جانے سے

گھبراتے ہیں، یعنی جس بات کو مل سماج کا ظلم سمجھتا ہے وہ دراصل انسان کی فطرت کا ایک جزو ہے جسے بحث اور دلیل دور نہیں کر سکتی ہے۔ انفرادیت کا سارا تخیل جس غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ افراد اور سماج میں فرق کیا جا سکتا ہے، اس سے پہلے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ نظریہ کیونکر پیدا ہوا، اور اس نے تاریخ میں کس طرح سے مختلف صورتیں اختیار کیں، یہ بھی دکھا دیا گیا تھا کہ یہ دعویٰ کہ ریاست اور سماج ایک معاہدہ کا نتیجہ ہیں، بالکل غلط ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ریاست اور سماج بنائی ہوئی چیزیں نہیں ہیں بلکہ رفتہ رفتہ بنی ہیں اور اس کے سوا اور کوئی نظریہ ممکن نہیں۔ تو یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ افراد اور سماج میں فرق کرنا اسی طرح غلط ہے جس طرح ایک درخت اور اُس کے پھول پتے اور تنے میں فرق کرنا غلطی ہے۔ مل کی یہ خواہش کہ سماج کی عام رائے یا اُن چند لوگوں کے خیالات جو سماج پر راج کر رہے ہوں، ہر شخص کو دوا کی طرح نہ پلائے جائیں نہایت قابل تعریف ہے اور ایک درد مند دل اور روشن دماغ کی دلیل ہے، لیکن اسے سیاست کا ایک نظریہ قرار دینا مشکل ہے اور جب تک کہ انسان کی طبیعت جیسی ہے ویسی ہی رہے گی اس وقت تک یہ بحث بیکار رہی ہے۔ انسان کو کسی نے کمزور نہیں بنایا، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ مل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

"غیر معمولی ذہانت کے اشخاص صرف آزادی ہی کی فضا میں سانس لے سکتے ہیں۔۔۔
۔۔۔۔ دنیا کا عام میلان یہ رہا ہے کہ متوسط درجہ کے اشخاص کو لوگوں پر امتیاز اور تفوق دیا جائے"

ممکن ہے یہ بالکل صحیح ہو مگر اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ دوسری جگہ وہ لکھتا ہے۔

"لوگوں کو فرد کی آزادی فعل میں انفرادی ۔۔۔۔۔۔۔۔ یا اجتماعی حیثیت سے دخل دینے کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے اور وہ آپ اپنی حفاظت کے خیال سے ہے۔۔۔۔ خود اس فرد کی جسمانی یا اخلاقی بہبودی کا عذر کافی دلیل نہیں ہو سکتا۔ جن معاملات کا تعلق صرف اس کی ذات سے ہے، اس میں وہ کامل خود مختار ہے۔"

مل کا خیال ہے کہ اگر سماج اپنی تنگ نظر آنکھیں بند کرے اور اپنے تحمل دماغ سے کام لے تو انسان

اور انسانیت دونوں فائدہ میں رہیں گے لیکن جس صورت میں اُس نے یہ نظریہ پیش کیا ہے اُس پر بہت سے اعتراضات ہو سکتے ہیں۔

(۱) سماج کو کسی فرد کے معاملات میں دخل دینے کا حق صرف اپنی ہی حفاظت کی بنا پر ہو سکتا ہے لیکن اگر ہم انسان کو محض ایک زندہ جسم سے کچھ زیادہ سمجھیں تو حفاظت کے معنی ہم کو بہت وسیع کرنے ہوں گے یعنی ہمیں سماج کو اپنی روحانی حفاظت کا حق بھی دینا ہوگا۔ دنیا میں لوگوں پر اُن کے خیالات کی وجہ سے جو سختیاں کی گئی ہیں اور جن کا ثبوت ہمیں تاریخ کے ہر صفحہ پر ملتا ہے، وہ ہمیشہ دنیاوی یا ذاتی ہی اغراض کے سلسلہ میں نہیں کی گئی ہیں۔ رومن کیتھولک کلیسا مشرکوں اور ملحدوں کو صرف اپنی آمدنی کو بچانے کے خیال سے آگ میں نہیں جلاتا تھا۔ ممکن ہے یہ غرض بھی شامل رہی ہو لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ جتنے باغی تھے وہ سب ایک نظام کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ اُسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ یہ نظام صدیوں سے قائم تھا، ہزاروں کو اُس سے دنیاوی فائدہ اور روحانی تسلی مل رہی تھی۔ رومن کیتھولک کلیسا نے جو سزا اپنے باغیوں کے لئے مقرر کی تھی وہ نہایت وحشیانہ تھی، اسی لئے سزا کا جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہو سکا، لیکن اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ رومن کیتھولک کلیسا کو اپنے نظام اور اپنے تخیل کی حفاظت کرنے کا حق ہی نہیں تھا۔

(۲) جن افعال کا تعلق سماج سے نہیں اُن میں فرد کو آزاد ہونے کا حق دینا چاہیئے۔ یہاں مل نے اپنے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری لے لی ہے، کسی فعل کے متعلق یہ ثابت کرنا کہ اُس کا تعلق صرف ایک جزو سے ہے سماج سے نہیں، تقریباً ناممکن ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ کوئی فرد ایسا فعل نہیں کر سکتا جس کا سماج سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو، بشرطیکہ وہ کسی سماج میں اپنے آپ کو شامل سمجھتا ہو۔ مل کے ذہن میں اگر یہ خیال نہ بیٹھ گیا ہوتا کہ سماج اور افراد کے مقاصد و اغراض میں بنیادی مخالفت ہے تو وہ ہرگز اس قسم کی رائے ظاہر نہ کرتا۔

(۳) جستجو اور دریافت کی اصل وقعت اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ انسان کے ذاتی تجربہ سے صحیح ثابت ہوں، خاص طور سے مذہبی اور اخلاقی معاملات میں مل کے اس خیال کی مخالفت کوئی

سمجھدار شخص نہیں کرسکتا، جتنا ہم اس پر غور کرتے ہیں اتنا ہی ہم اس کے او قائل ہوتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کمی ہم محسوس کرتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ مل نے بغیر کوئی دلیل پیش کئے یہ طے کر دیا ہے کہ کوئی فرد اپنے ذاتی تجربہ سے ان آدرشوں کو صحیح نہیں پائے گا جو سماج نے اپنے لئے مقرر کئے ہیں یہ غلطی مل کی ذاتی نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کی عام کمزوری ہے۔ عہد وسطیٰ کی دنیا کے تباہ ہو جانے پر یورپ میں کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی کہ تمام سماج کے لئے کوئی بلند آدرش قائم کیا جائے۔ رومن کیتھولک کلیسا کے ساتھ عیسائی مذہب پر جو تھوڑا بہت عقیدہ لوگوں کو تھا وہ جاتا رہا۔ اس کا ذمہ دار بڑی حد تک رومن کلیسا تھا، پھر بھی ہم یورپ کے علما اور قوم پرست لوگوں کو الزام سے بری نہیں سمجھ سکتے۔

ہر شخص کو اپنے عقیدے اپنے ذاتی تجربہ سے ثابت کرنی چاہئیں۔ لیکن نہ مل نے یہ محسوس کیا اور نہ مغربی تہذیب نے اسکا کافی خیال رکھا کہ سماجی زندگی بغیر مذہب اور عقیدہ کے بے معنی اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔ جہاں مل نے ہر شخص کو خود مختار رہنے کی تعلیم دی ہے وہاں اُسے یہ بھی چاہئے تھا کہ اس خود مختاری کا کوئی انجام بھی قرار دیتا۔ وہ لکھتا ہے کہ سب سے اعلیٰ اور اہم اصول جس کے لئے تمام دلائل ان صفحات میں بیان کئے گئے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی ترقی کے لئے ہر قسم کی خیالی اور عملی اختلافات کو جاری رکھنا نہایت ضروری اور اہم ہے۔" اس کی تائید ہم بڑی خوشی سے کرتے ہیں لیکن اگر ہم کو یہ بھی بتا دیا جاتا کہ چلنے والے کو کہاں جانا چاہئے تو ہم بہت زیادہ شکر گزار ہوتے۔

اگر ہم ان تمام کوششوں کو جو دنیا میں لوگوں نے اپنی ترقی و بہتری کے لئے کی ہیں ایک فقرہ میں بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ تمام کوششیں آزادی حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہیں لوگوں نے اس کے نام الگ الگ رکھ لئے ہیں۔ اکثر ظاہر طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے دشمن ہیں لیکن جو پردے اس پر ڈالے گئے ہیں اگر ہم انہیں ہٹا کر دیکھیں تو ہمیں سوائے آزادی کی کوشش کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ ہندوستان جیسے ملک میں بھی، جہاں جتنا بھی لوگوں کو کھلتا ہے، ہر طرف

آزادی کی کوشش جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ ہمارے یہاں سیاسی آزادی کو اتنی اہمیت نہیں دیجاتی۔ ہماری توجہ مذہب کی طرف زیادہ ہے، اگرچہ مذہب کے جو معنی لئے گئے ہیں انمیں کچھ اختلاف کی گنجایش ہے۔ آج کل مسلمانوں کے نزدیک آزادی حاصل کرنا یا تو اپنی طبیعت میں ایسا اعتدال یا اتنی قناعت پیدا کرنا ہے کہ دنیاوی لذتوں کی کشمکش سے نجات ملجائے، یا پھر دنیا کو ایسا چھوڑ دینا کہ وہ انکے پھندوں میں نہ پھنسا سکے۔ ہندوؤں نے بھی آزادی کے معنی تقریباً یہی سمجھے ہیں لیکن انہوں نے فلسفہ اور تخیل سے زیادہ کام لیا ہے، انکے یہاں کوئی ایسا خدا نہیں ہے جس کے احکام کی پابندی انہیں آزادی دلا سکے، نہ کوئی یوم حساب ہے جس میں تمام گناہ معاف ہو جائیں۔ جبتک انسان آزاد نہ ہو وہ دنیا اور زندگی کی تمام مصیبتیں جھیلتا رہے گا، اُسے آنند اُسی وقت مل سکتا ہے جب وہ ہستی کی تمام پہیلیاں بوجھ لے، اور اس جال سے جس میں وہ پھنسا ہوا مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہے، نکل کر آزاد ہو جائے۔

یورپ میں آزادی کے بالکل دوسرے معنی لئے گئے ہیں، اس مسئلہ میں اگر کوئی مشابہت ایشیائی اور یورپی تخیل میں پائی جاتی ہے تو ایک حد تک عہد وسطیٰ میں ہے۔ آزادی کو اُس زمانہ میں وہ تنگ سیاسی جامہ نہیں پہنایا گیا جس میں ہم اُسے بعد کے زمانہ میں دیکھتے ہیں، مذہب، اخلاق اور فلسفہ کو اُس میں بہت زیادہ دخل تھا۔ جو شخص راہب بنکر اپنے آپ کو ایک خانقاہ میں بند کر لیتا تھا اسے بھی یقین تھا کہ اسے اس سے اصل آزادی حاصل ہوگی۔ یورپ کے عہد جدید میں جس آزادی پر بحث ہوتی ہے وہ بالکل دوسری چیز ہے، اسکا آغاز دوسرے طریقہ سے ہوا اور مقصد بالکل جداگانہ تھا۔

عہد وسطیٰ میں قانون پر بہت زور دیا جاتا تھا ہر بات کا ثبوت، ہر فعل کا جائز ناجائز ہو کسی قانون کے مطابق طے پاتا، ہر شخص علاوہ جسم و جان کے ایک قانونی ہستی بھی رکھتا تھا جس کے مطابق اُسے چلنا ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے اُس پر جہاں بہت سے فرائض اور قیود عاید تھے وہاں بہت سی چیزوں کی اجازت بھی تھی، جن باتوں کی اُسے اجازت تھی، جو حقوق اسے سماج یا ریاست یا رسم و رواج نے دئے تھے وہ اُس کی "آزادیاں" کہلاتی تھیں، یہ حقوق مملوکہ اشیا کی طرح چھینے، جبر لئے اور دئے جا سکتے تھے، اس کی مثال تو شاید ہی ملے کہ کسی ایک شخص کو خاص "آزادیاں" دی گئی ہوں،

کیونکہ عہد وسطیٰ کے تخیل میں فرد کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ایک جماعت یا ایک برادری کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کی اپنی "آزادیاں" تھیں، زیادہ تر جن "آزادیوں" کا ذکر تاریخ میں آتا ہے وہ شہروں اور میونسپلٹیوں کی ہیں، لیکن اُس زمانہ کے بہت سے کاغذات موجود ہیں جن سے عام لوگوں کی آزادیوں کا ثبوت بھی مل سکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی آزادی اُس زمانہ کے نظام کے ساتھ رخصت ہو گئی مذہبی جنگوں نے اس ضرورت کو ثابت کر دیا کہ آزادی کو کوئی اور صورت دینی چاہیئے، کیونکہ اس زمانہ کے تخیل میں شک، بحث اور اختلاف کے برداشت کرنے کی طاقت نہیں تھی۔ یورپ کی موجودہ آزادی ان مذہبی جنگوں کا براہ راست نتیجہ نہیں کہی جا سکتی، لیکن ان لڑائیوں نے موجودہ زمانہ کے خیالات کا راستہ بہت کچھ صاف کیا ہے، اور افراد کی آزادی کو ممکن بنا دیا ہے۔

انگریزی سیاسی خیالات میں ہم آزادی کے تخیل کا نشو و نما بہت اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں۔ سترہویں صدی کے شروع میں سر ایڈورڈ کوک آزادی کو ایک قانونی حق سمجھتا ہے، اور جیمز اول اور پارلیمنٹ کے درمیان جو جھگڑے ہوتے ہیں ان میں وہ "قانون عام[1]" کو پارلیمنٹ کے دعووں کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ بادشاہ اور رعایا میں اب تک قانونی بحث کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بحث جب شروع ہوئی تو لوگوں نے محسوس کیا کہ عہد وسطیٰ کا تخیل اس قدر لچکدار اور مبہم ہے کہ اس کے مطابق کسی قسم کا فیصلہ کرنا ناممکن ہے اور لڑائی کے سوا انکے لئے اور کوئی چارہ باقی نہ رہا۔ علاوہ سیاسی جھگڑوں کے فساد کا ایک اور ذریعہ پیدا ہو گیا اور وہ مذہبی اختلاف تھا، چنانچہ جن لوگوں نے بادشاہ کو قتل کر کے اپنی جمہوریت قائم کی تھی انہوں نے دراصل اپنے مذہب کو بچانے کے لئے تلوار اٹھائی تھی۔ چارلس دوم کی حکومت عیاشی میں گذر گئی۔ یہ زمانہ خاص سیاسی تنزل تھا، اور وہی لوگ جن کے باپ دادوں نے آزادی کے لئے جان دی تھی، درباروں اور خوشامد میں ڈوب گئے، علاوہ ان لوگوں کے نکمہ پن کے چارلس

---

[1] انگریزی قانون کے انیسویں صدی کے قانونی سدھار تک، دو حصے تھے، ایک قانون غیر موضوعہ کہلاتا تھا اور دوسرا "قانون موضوعہ"۔ قانون عام وہ رسوم و ضوابط تھے جو قوم میں پہلے سے چلے آتے تھے اور جنہیں انگلستان کے ججوں نے رفتہ رفتہ بہت وسیع اور مفید بنا دیا ہے "قانون موضوعہ"، انگریزی قانون کا دوسرا حصہ[illegible]

دوم کی چالاکی بھی اس کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ کیونکہ اُس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی زندگی بھر کوئی ایسی حرکت نہ کریگا جس سے مخالفت پیدا ہو۔ اُس نے دربار کو عیاشی میں پھنسا دیا، اور ملک میں ملکی معاملات کی طرف سے عام بے توجہی پھیلا دی۔ لیکن اُسکا بھائی جو اُس کے بعد تخت پر بیٹھا، بالکل دوسری طبیعت کا آدمی تھا، وہی قوم جو بیس برس سے سو رہی تھی ایکبارگی جاگ اُٹھی۔ بادشاہ کو ملک سے بھاگنا پڑا، اور بغیر ایک قطرہ خون گرائے ہوئے اُس کی جگہ پر ولیم سوم تخت نشین ہو گیا۔

ان واقعات سے ہمیں چنداں بحث نہیں۔ اس زمانہ میں، اُس جماعت کی طرف سے جس نے انقلاب کرایا تھا "کتاب الحکومت" کے نام سے ایک کتاب شائع کرائی گئی جس کا انگلستان کے باہر بھی بہت اثر رہا۔ اس کتاب کے مصنف لاک نے بادشاہ کی معزولی کو جائز ثابت کرنے کیلئے معاہدہ کا نظریہ پیش کیا، اور یہ دعوےٰ کیا کہ حکومت کی اطاعت رعایا پر اُسی وقت تک لازم ہے جبتک کہ حکومت قابل برداشت رہے، اور بادشاہ اُس معاہدے کو نہ توڑے جو اُس کے اور قوم کے درمیان شروع میں ہوا تھا۔

اس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معاہدہ کا نظریہ بالکل غلط ہے۔ لیکن لاک کی کتاب انگلستان میں سب سے بڑی سیاسی جماعت "وِگز" کے لئے بہت عرصہ تک ایک سیاسی انجیل کا کام دیتی رہی جب تک یہ ثابت نہ ہوا کہ معاہدہ کا نظریہ واقعات اور عقل کے خلاف ہے، اس خیال نے ہر آزادی پسند انگریز کے دل میں جگہ کر لی تھی۔

اس کے ساتھ قانون دانوں کے سیاسی نظریے بھی اثر کرتے رہے۔ آزادی فرد کی حفاظت کرنے اور پارلیمنٹ کی عزت رکھنے کے لئے انگلستان کا قانون عام پیش کیا گیا تھا۔ اُس کے بعد پارلیمنٹ نے ۱۶۷۹ء میں "قانون[1] تحقیقات محبوس" جاری کر کے اس خیال کو اور مضبوط کر دیا کہ انگریزوں کی آزادی

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۳) وہ حصہ تھا جو پارلیمنٹ نے ملک کی ضروریات کو دیکھکر خاص طور سے بنایا تھا۔ پارلیمنٹ نے قانون بنانا سولھویں صدی میں شروع کیا۔ اس سے پہلے قانون عام کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا۔

[1] ایک قانون ہے جس کے مطابق کوئی قیدی بغیر قانونی تفتیش و تحقیق کے جیل میں ایک خاص مدت سے زیادہ نہیں رکھا جا سکتا۔

اسکے ملک کے قوانین کا ایک حصہ ہے اور اس لئے کوئی انگریز غلام ہو سکتا ہے نہ کسی اور طرح اپنی آزادی کھو سکتا ہے۔ "آزادی میرا پیدائشی حق ہے" اس نظریہ کا دعوے اسی پر مبنی ہے انگریزی قانون میں افراد کو حکومت کی زبردستی اور ظلم سے بچانے کے لئے بھی خاص انتظام ہے اور چونکہ قانون کے وہ حصے جن کی امداد انگلستان کا ہر باشندہ اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے طلب کر سکتا ہے، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ "قانون عام" میں پہلے سے موجود ہیں، اس لئے یہ خیال اور زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بعد سے حکومت میں کوئی ایسی خرابی باقی نہیں رہی تھی جس سے قوم کو کوئی خاص تکلیف پہونچتی، لیکن مذہبی اختلاف ہمیشہ باقی رہا اور انگریزی کلیسا کے خلاف برابر بغاوتیں ہوتی رہیں، چونکہ کلیسا کے سرداروں اور عام طور سے خود قوم میں اتنی روشن خیالی نہ تھی کہ اختلاف کو جائز سمجھیں اور باغیوں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کریں اس وجہ سے انگلستان میں ہمیشہ ایک نہ ایک فرقہ موجود رہا جسے حکومت سے شکایت رہی۔ ہربرٹ اسپنسر اگر حکومت سے اور سرکاری ملازموں سے خفا ہے تو اس لئے کہ اسکی پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی تھی جس کی حکومت اور کلیسا سے پرانی عداوت تھی۔

اگر اس تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مل اور اسپنسر کی انفرادیت اور ان دونوں کا آزادی کا تخیل بہت آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ذاتی آزادی کی لوگوں کو عادت پڑ گئی تھی، قانون اور تاریخ نے اس خیال کو دل میں اور بٹھا دیا تھا۔ مل کے زمانہ میں ریاست اور حکومت میں وہ روشن خیالی نہیں پیدا ہوئی تھی جو اُس وقت کی علمی ترقی کا تقاضا تھا، اور چونکہ وہ آزادی جس کی اسے خواہش تھی، ایسی نہ تھی جو کوئی حکومت دے سکے، بلکہ ایسی تھی کہ ہر حکومت اُسے چھین سکے، اس لئے وہ آزادی اس میں سمجھتا ہے کہ حکومت اور سماج ہر فرد کو اُس کے حال پر چھوڑ دیں۔

انگلستان کے علاوہ آزادی کو یہ قانونی صورت کہیں نہیں دی گئی ہے، اور انفرادیت کے حامی بھی انگلستان کے باہر مشکل سے ملتے ہیں۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آزادی کا یہ تخیل کس قدر

وقعت رکھتا ہے۔

تخیل تو دراصل اسے کہنا نہ چاہئے، کیونکہ اس کے بنانے میں تخیل سے بالکل کام نہیں لیا گیا بلکہ یہ ایک پودا ہے جو خود بخود پیدا ہو گیا اور بعد میں لوگوں نے اُس کے پھل اور پھول کو پسند کیا۔ اگر ہم اس کا آزادی کے دوسرے نظریوں سے مقابلہ کریں تو اس کی سب سے بڑی کمزوری یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی حمایت میں کوئی فلسفیانہ دلیل نہیں پیش کیجاسکتی۔ محض عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے فائدے بہت ہیں، اور انگریز اپنی آزادی پر فخر اسی وجہ سے کرتے ہیں کہ اُسکے فائدے گن گن کر بتانا ممکن ہے لیکن کامیابی ہی کسی چیز کی خوبی کی دلیل پوری نہیں ہے جسے یہ خاص قسم کی آزادی ناپسند ہو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ بالکل بیکار چیز ہے۔ اور اس میں وہ زیادہ غلطی پر نہ ہوگا۔

ارسطو کہتا ہے "ہر ریاست کسی نہ کسی قسم کی جماعت ہوتی ہے، اور ہر جماعت کسی خاص فائدہ کے لئے بنائی جاتی ہے۔ . . . لیکن اگر ہر جماعت کا مقصد کوئی بھلائی ہوتا ہے تو ریاست یا سیاسی جماعت کو جو سب سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے، اور جس میں اور سب جماعتیں شامل ہیں، سب سے زیادہ بلند مقصد رکھنا چاہئے"۔ ریاست کا فلسفیانہ نظریہ جس کے بانی ارسطو اور افلاطون ہیں اور عہد جدید کے بڑے حامی فرانس میں روسو، جرمنی میں ہیگل اور ایک حد تک کانٹ اور انگلستان میں گرین اور بوسانکے ہیں، آزادی کی اصل اور اس کے مقصد کو سمجھتا ہے یعنی اُس کے نزدیک وہ شخص جسے ریاست کے ظلم سے کوئی ڈر نہ ہو اُس وقت تک ہرگز آزاد نہیں جب تک وہ سیاسی اور سماجی زندگی کے اصل مقصد سے غافل ہے اور صرف اپنی فکر میں پڑا ہے۔ آزادی اُسے اسی وقت مل سکتی ہے۔ جب وہ اپنے فرائض سے پوری طرح واقف ہو اور اُنکے ادا کرنے میں اپنی بھلائی سمجھے۔ مل نے فرد کو آزادی اسی وجہ سے دلائی ہے تاکہ وہ پوری طرح سے ترقی کر سکے، لیکن اُس نے ہر فرد کو اس قدر خود مختار بنا دیا، کہ اس کی آزادی کا کوئی عام مقصد نہیں رہتا۔ مل اس کے جواب میں کہتا ہے کہ "کوئی پروا نہیں، بلکہ یہ بہت اچھا ہے۔ اس طرح سماج کو اسکا موقع نہیں ملے گا کہ وہ لوگوں کو اپنے خیالات پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرے" مل کا یہ جواب بظاہر بہت خوشنما اور

صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں دو غلطیاں ہیں۔ مِل نے بغیر اس بات کو ثابت کئے ہوئے پہلے سے فرض کر لیا ہے کہ انسان کو اگر آزادی دیدی جائے تو اُسے وہ خود بہترین طور پر استعمال کر سکے گا، اور اس کے لئے اُسے سماج یا ریاست کی کسی قسم کی امداد کی ضرورت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اگر سماج یا ریاست اپنے لئے کوئی آدرش یا نصب العین مقرر کرے تو وہ خود بخود ظلم اور زبردستی کا ذریعہ بن جائے گا، اور اس لئے انہیں بالکل خاموش الگ کھڑے رہنا چاہئے۔

ارسطو کہتا ہے "اس بات کا ثبوت، کہ ریاست ایک فطری چیز ہے اور فرد پر سبقت رکھتی ہے، یہ ہے کہ انسان، اگر وہ بالکل اکیلا رہے تو اپنی ضروریات پوری نہیں کر سکتا، اور اپنے لئے وہ کافی نہیں اس واسطے اُسکا اور سماج کا تعلق جزو کا اور کل کا ہے۔ لیکن جو سماج میں نہیں رہ سکتا، جسے اپنی جسمانی اور روحانی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت نہیں، وہ یا تو محض جانور ہے یا دیوتا۔ ریاست کا وہ جزو نہیں بن سکتا۔ ہر شخص میں سماجی زندگی کی خواہش موجود ہے ۔ ۔ ۔ " محض پرانے زمانہ کی منطق نہیں بلکہ آج کل نفسیات نے دریافت کیا ہے کہ انسان کی طبیعت میں اپنے ہم جنس کے ساتھ رہنے کی خاص ضرورت پائی جاتی ہے۔ یہی خواہش شہروں کو ضرورت سے زیادہ باشندوں سے بھر دیتی ہے۔ یہی لوگوں کو شام کے وقت سیر کرنے کو لیجاتی ہے۔ اسی ضرورت کے پورے کرنے کے لئے ریاست بنی تھی اور اسیوجہ سے وہ ریاستیں بھی جن میں ظلم ہوتا ہے قائم رہتی ہیں۔ انسان کسی چیز سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا تنہائی سے۔ مگر جب انسان اپنی ضرورت سے سماج میں شریک ہوتا ہے اور اُس میں شامل رہتا ہے تو اُسے ایسی خاص آزادی مانگنے کا کیا حق ہے؟ اور اگر یہ آزادی اُسے مل بھی گئی تو کیا وہ اُسے بہترین طور پر استعمال کر سکے گا؟ اگر سماج کوئی ظلم اور زبردستی نہ بھی کرے، کیا یہ کسی کی ہمت کا کافی امتحان نہیں ہے کہ اُسکے چاروں طرف جو لوگ ہیں، جن سے مل جل کر رہنا اُس کی ایک ذاتی ضرورت ہے، اُس کی رائے کے خلاف ہیں؟ اُس کی حرکتوں سے انہیں خفگی نہ ہوئی تو تکلیف پہونچے گی۔ مِل کی دلی خواہش ہے کہ سچائی کی جستجو ہمیشہ جاری رہے۔ اس سے بھی انکار کرنا ناممکن ہے کہ شخصیت کا ترقی

سے بہت گہرا تعلق ہے، اور وہی قوم نشو ونما پا سکتی ہے جسے شخصیت کا اور اپنے افراد کی آزادی کا خیال ہو۔ تاریخ سے اسکا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ عام رائے اور سماج اکثر شخصیتوں کی دشمن رہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ دنیا کی جو عظیم الشان شخصیتیں مانی جاتی ہیں انہیں اپنی سماج سے بہت مدد بھی ملی ہے، اور انکے کارناموں میں ایک بہت بڑا حصہ اُن کی سماج کا ہے جو کچھ انہوں نے کیا، وہ اُن کی سماج کی چھپی ہوئی آرزو تھی، جو کچھ انہوں نے کہا اُس کے سُننے کے لوگ پہلے سے مشتاق تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ضرور ہوا ہے کہ سماج نے، یا اُن لوگوں نے جو سماج پر راج کر رہے تھے، اپنے یہاں شخصیتوں کے پیدا ہونے کا موقع نہیں دیا یا اگر کوئی شخصیت پیدا ہوگئی تو اُسے اپنا اثر ڈالنے سے روکا، لیکن ایسا نسبتاً کم ہوا ہے۔ رومن کلیسا اپنی تنگ نظری اور ظلم کے لئے مشہور ہے۔ مگر اُس میں بہت سی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن کے سامنے اس نے اپنا سر جھکایا اور جن کی ہستی سے اس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ سختی وہ اسی وقت کرتا تھا جب اسے اپنا مذہبی اور کلیسائی نظام خطرہ میں نظر آتا تھا اور اس معاملہ میں اُس کے مخالف جتنے یورپ میں پیدا ہوئے کچھ کم نہ تھے۔ ہم اگر اس زمانہ کی آزادی دیکھکر رومن کلیسا کے افعال سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں تو ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ وہ اُس وقت کے خیالات کے مطابق چل رہا تھا، اور جو خامیاں اُس میں تھیں وہ عام طور سے اُس زمانہ کی سماج میں اور شخصیتوں میں تھیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یورپ کو چھوڑ کر دنیا کے اور حصوں میں سماج نے اپنے لئے ایک آدرش یا نصب العین مقرر کر لیا ہے، اور جو شخصیتیں اُسے اس خاص راستہ پر چلنے دیتی ہیں اُنکی وہ پوری عزت کرتی ہے۔ جن شخصیتوں کی کوشش ہوتی ہے کہ پرانی دنیا کے بجائے ایک نئی دنیا اپنے دل کی آرزوؤں کے مطابق بنائیں، اُن کی سخت مخالفت ہوتی ہے، اور اُن پر اکثر ظلم بھی کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں صوفیاء نے بہت سے ایسے عقائد کا پرچار کیا ہے جنہیں قرآن مجید کی تعلیم میں شمار کرنا مشکل ہوگا، لیکن ان پر عام طور سے قوم مہربان رہی۔ صوفیاء کے سوا مسلمانوں میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے جن کی تعلیم سے اسلام کو کسی قسم کا نقصان نہیں

پہونچ سکتا تھا لیکن انکے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ کیا گیا، صرف اس وجہ سے کہ بجائے مسلمانوں کی رہبری کرنے کے انہوں نے اسلام پر بیجا نکتہ چینی اور اس کے اصول میں بے جا اضافہ کرنا چاہا

مل کو سماج اور فرد، عام انسان اور خاص شخصیتوں میں جو بنیادی اور ایک حد تک لاعلاج مخالفت اور عداوت نظر آتی ہے وہ زیادہ تر "مایا" ہے: سماج کو زندہ رہنے اور اپنی زندگی کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے شخصیتوں کی ضرورت ہے شخصیتیں سماج کے آدرشوں کو اس کی نظر کے سامنے وضاحت کے ساتھ رکھتے، سماج کی دنیاوی اور روحانی ترقی پر مہر لگانے اور اسے سماجی تہذیب کا جزو بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ سرسری نظر ڈالنے سے تاریخ کچھ یہی دکھائے تمدن اور تہذیب کا راز اسی میں ہے کہ سماج شخصیتوں سے محبت کرے اور شخصیتیں سماج کی خدمت کریں۔

ایک سچا افسانہ

وسط یورپ کے ایک مشہور شہر میں ہندوستان کے چند نوجوان مسلمان تعلیم پاتے ہیں۔ جوانی کا جوش و خروش، بڑھے ہوئے ارادے، بلند خیالات، ایک زندہ قوم کی مثال ان سب باتوں کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی آئندہ زندگی کو ملک و ملت کی خدمت میں صرف کرنے کا قصد کر لیا ہے۔ چونکہ سب کے سب علمی مذاق رکھتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے اپنا مقصد زندگی یہ قرار دیا ہے کہ ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو یورپ کی ذہنی غلامی سے نجات دلائیں۔ انہیں احساس ہے کہ یورپ نے اپنے علوم کی بیڑیاں خود اُنکے پیروں میں بھی ڈالدی ہیں لیکن وہ جانتے ہیں کہ ان بیڑیوں میں جو لوہا لگا ہے وہ بجائے خود بہت مفید چیز ہے اور اگر کسی میں ہمت و جرات ہو اور توفیق الٰہی اسکا ساتھ دے تو وہ ان بیڑیوں کو گلا کر تیز تلوار بنا سکتا ہے جو دشمنوں کے دل میں ڈر اور دوستوں کے دل میں عزت و احترام پیدا کرتی ہے۔ عقل سلیم نے انہیں بتایا ہے کہ اگر اُنکے ایک ہاتھ میں مشرقی تمدن کی ڈھال اور دوسرے ہاتھ میں مغربی تہذیب کی تلوار ہو تو وہ دنیا کی ساری قوموں سے پکار کر کہہ سکتے ہیں کہ اگر تمہارے دل میں بدی ہے تو آؤ یہ تلوار تمہیں برباد کر دے گی، اور یہ ڈھال ہمیں بچائے گی لیکن اگر تمہاری نیت نیک ہے تو ہم اس تیغ کو نیام میں اور اس سپر کو دوش پر رکھ لیتے ہیں۔ چلو صلح اور آشتی کی راہ پر۔ دیکھیں کون بڑھ کر قدم رکھتا ہے۔

یہ ہمتیں اور یہ ارادے ہیں اُن نوجوانوں کے۔ مگر دنیا میں بڑے کام کرنے کے لئے محض ہمت اور ارادہ کافی نہیں جب تک تجربہ اور معلومات، دانائی اور تدبیر، احتیاط اور استقلال شریک کار نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صفات نوجوانوں کو نصیب نہیں۔ یہ اس پیر دانشمند کے حصے میں آتی ہیں جس کی رگوں میں خون کی گردش معتدل ہو چکی ہو اور جس کی سیرت میں ذہنی قوتیں امتزاج پا چکی ہوں۔ ان نوجوان سپاہیوں

کو تلاش ہے ایک پیر مرد کی جو انکا سپہ سالار بنے۔ یہ ایسا سوار چاہتے ہیں جس نے مشرق و مغرب کے درمیان کی دشوار گزار گھاٹیوں کو طے کیا ہے۔ اور دونوں میدانوں میں داد شجاعت دی ہے جس نے رن دیکھے ہیں اور معرکے جیتے ہیں، جس نے سختیاں جھیلی ہیں اور مشکلوں پر فتح پائی ہے۔ یہ لوگ چشم تصور سے ہندوستان کے تمام سربرآوردہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں مگر کوئی انکے کام کا نظر نہیں آتا۔

ایک دن خبر آتی ہے کہ ایک قریب کے شہر میں ہندوستان سے ایک مسیحا نفس حکیم آرہا ہے۔ یہ نوجوان امید و بیم کی کشمکش دل میں لئے ہوئے اُس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔ یہ منظر جہاں ولولہ شباب و دبدبہ پیری کے آگے سر نیاز خم کرتا ہے دیکھنے کے قابل ہے۔ پہلی نظر امید دلاتی ہے کہ جس رہنما کی انہیں تلاش تھی وہ مل گیا ہے اور پہلی گفتگو اس امید کو یقین سے بدل دیتی ہے۔ وہ انکے خیالات کو غور و فکر اور شفقت و محبت سے سنتا ہے اور گنے ہوئے الفاظ میں اپنے تُلے فقروں میں ایسا جواب دیتا ہے کہ انکا دھندلا تخیل ایک واضح اور روشن نصب العین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انکی آنکھوں سے ناتجربہ کاری کے پردے ہٹ جاتے ہیں، اور راہ عمل صاف نظر آنے لگتی ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ چلو میرے ساتھ دہلی کی ایک تعلیمگاہ میں کام کرو جو تمہارے اصول کے مطابق چل رہی ہے وہاں تمہارے لئے مال و دولت اور جاہ و حشم نہیں ہے مگر خدا کی خوشنودی اور وہ مسرت جو خلق کی سچی اور خاموش خدمت سے ہوتی ہے موجود ہے۔ نوجوانوں کے دل میں اس پیر روشن ضمیر کو دیکھ کر اور اس کی گفتگو سن کر عجیب جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جوش کا طوفان اٹھتا ہے لیکن اسکی متانت و وقار کی چٹان سے ٹکرا کر نشیب میں گرتا ہے اور عزم و استقلال کا دریا بن کر خاموشی مگر تیزی سے بہنے لگتا ہے۔ نعرہ ہائے تحسین لب تک آتے ہیں لیکن اس کی پرسکون شخصیت کے اثر سے خدمت و عمل کا عہد بن کر زبان سے نکلتے ہیں۔ نوجوانوں کے لئے یہ بالکل نیا احساس ہے۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے جسے اس پیکر وقار کی صحبت کا فیض حاصل ہوا ہے۔ یہی اس بے نظیر شخصیت کے اثر و نفوذ کا راز ہے جسے دنیا چشم حیرت سے دیکھتی ہے۔

خلقش بہ اتفاق تمامت جہاں گرفت

اس سچے افسانے کا دوسرا منظر وہ ہے جن نوجوانوں کو آپنے مغرب کے طلسمات میں مسحور دیکھا تھا وہ اب سرزمین مشرق کے حقیقت زار میں ہیں۔ یہاں پہونچکر انہیں نصب العین اور واقعات کا وہ متفاوت نظر آتا ہے جو سب نوجوانوں کے لئے شدید روحانی صدمے کا باعث ہوا کرتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ وہ جس قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُس کی بے مرکزی اور اُسکا انتشار حد سے گزر گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ذہنی اور سیاسی آزادی کی عاشق ہے لیکن حصول آزادی کے طریقے کے متعلق کوئی متفقہ رائے قائم نہیں کر سکتی۔ اُس کی ہمتیں بظاہر اتنی پست ہیں کہ وہ ترقی کے نام سے ڈرتی ہے۔ اس کو پچھلے پچاس سال میں اُس کے رہنماؤں نے دنیاوی قوتوں کا سہارا ڈھونڈنے کا اسقدر عادی بنا دیا ہے کہ نہ اُسے خدا پر توکل رہا ہے نہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ۔ یہ نوجوان اُس تعلیمگاہ کو جس کی ترقی کی کوشش میں انہیں اپنی عمر صرف کرنا ہے اس حال میں پاتے ہیں کہ نہ اُس کے پاس اپنی عمارت ہے نہ سرمایہ نہ ساز ہے نہ سامان۔ بس چند اللہ کے بندے جو ہمت کے پورے اور ارادے کے پکے ہیں جمع ہیں کہ اپنی عمر کا ایک حصہ تحصیل علم میں اس طریقہ سے گزاریں کہ دنیا کو جانیں اور اسکے مالک کو پہچانیں، اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق سے واقف ہوں، اپنے قدیم تمدن کی اجتماعی زندگی میں مضبوطی سے جڑ پکڑیں اور بقدر ضرورت اس میں جدید تمدن کا پیوند لگائیں۔ کوئی مفید پیشہ سیکھیں اور اپنی آئندہ زندگی اس پیشے میں اس طرح گزاریں کہ مقصود اصلی قوم کی فلاح و بہبود ہو اور مقصود ضمنی اپنی ذات اور اپنے خاندان کی پرورش۔ ان اولوالعزم افراد کو دیکھکر ہمارے نوجوانوں کے دل میں جوش اور ولولہ کی ایک آگ بھڑک اٹھتی ہے لیکن عقل دنیاوی یہ کہہ کر اس پر پانی پھیر دیتی ہے کہ

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہے تقدیریں کہیں

اس امید و بیم کی کارزار میں اس حوصلہ و مایوسی کی کشمکش میں نوجوانوں کی دستگیری

وہی پیر شصت سالہ کرتا ہے جس نے پہلی بار ان کے ذوق جادہ پیمائی کو صحیح راہ عمل دکھائی تھی۔ ذرا چشم عبرت سے اس بدلے ہوئے نقشے کو دیکھئے۔ ایک وہ حالت تھی کہ نوجوانوں کا طائر فکر عالم معنی کی نامحدود فضا میں اُڑ تا تھا اور تجربہ کار رہبر مرد نے اُسے ایک محدود دائرہ پرواز دکھایا تھا ایک یہ صورت ہے کہ ان کی ہمتیں بال و پر شکستہ کرنے والی ہیں کہ اُس مرد خدا کا عزم انہیں ابھار رہا ہے اور آہستہ آہستہ پروں کو تول کر بلندی کی طرف حرکت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ انہیں چشم تخیل سے ایک تصویر دکھاتا ہے۔ ایک عالی شان عمارت مغل طرز تعمیر پر بنی ہوئی ہے۔ اُس میں علم و ہنر کے پجاری ہزاروں کی تعداد میں اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ ایک طرف قرآن و حدیث کا درس ہو رہا ہے، دوسری طرف فلسفہ و حکمت کا۔ ایک طرف سائنس کے تجربات کئے جا رہے ہیں، دوسری طرف صنعت و حرفت کا بازار گرم ہے۔ ایک طرف ایک دار التصنیف ہے جس میں داد تحقیق دی جا رہی ہے دوسری طرف ایک مطبع ہے جس میں مفید کتابیں صحت اور خوشنمائی کے ساتھ چھپ رہی ہیں۔

مرکزی تصویر کے گرد ایک بہت بڑا دائرہ ہے جس میں دن اور رات کے مدرسوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے، اور ہر طبقے کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے۔ اس دائرہ میں جابجا کہیں کھیت نظر آتے ہیں کہیں دوکانیں کہیں صنعتی کارخانے جن میں ان مدرسوں کے فارغ التحصیل طلبہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں لیکن ہر جگہ وہ کتبے زرین حرفوں میں لکھے ہوئے آویزاں نظر آتے ہیں جن کی عبارت یہ ہے "مکمل زندگی دین و دنیا کے مجموعے کا نام ہے"۔ "فرد کی زندگی قوم کی زندگی سے وابستہ ہے"۔

یہ تصویر دکھا کر پیر مرد نوجوانوں سے کہتا ہے۔ دیکھو یہ ہے میرا اور تمہارا نصب العین اس کا حاصل کرنا مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے عزم و استقلال اور خاموشی سے لگا تار کام کرنے کی۔ اگر دیر لگے تو کوئی ہرج نہیں۔ میں نے دور دراز سفر کئے ہیں اور سعی پیہم کی لذت سے آشنا ہوں۔ اٹھو میرے ساتھ چلو۔ دشت نوردی کی صعوبتوں کا عادی ہونے کے بعد تمہیں میرا ہمزبان ہو کر کہنا پڑے گا۔

ہر قدم پر ہے فزوں لذت سرگرمی سعی
شوق نے خوب مزے دوری منزل کے لئے

نوجوانوں نے اس پیر دانا کی رہنمائی میں کام شروع کر دیا ہے باوجود اسکے کہ اس مرد خدا کی ذات بہت سے قومی کاموں کا مرکز اور بیشمار بندگان خدا کی انفرادی حاجتوں کا مرجع ہے وہ قومی تعلیم کے کام سے جس میں یہ نوجوان اُس کے رفیق کار ہیں ایک لمحہ کے لئے بھی غافل نہیں ہوتا۔ اُس کی مصروفیتوں کا اندازہ کرنے کے لئے ایک دن کا قصہ سنئے۔

یہ حکیم قوم صبح تڑکے بیدار ہوتا ہے۔ حوائج ضروریہ اور عبادت الٰہی سے فارغ ہو کر سات بجے اپنی نشست گاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں بعض تار رکھے ہیں جن کا فوراً جواب لکھوایا جاتا ہے بعض اہل غرض بیٹھے ہیں جن کی درخواست سنی جاتی ہے، اور پوری کیجاتی ہے۔ ابھی مطب کا وقت نہیں، لیکن دو چار مریض آگئے ہیں جنہیں آٹھ بجے کی گاڑی سے واپس جانا ضروری ہے۔ ان کی نبض دیکھی جاتی ہے نسخہ لکھا جاتا ہے۔ اب آٹھ بج گئے ہیں۔ دیوانخانے میں مریض جمع ہیں۔ صحن میں ڈولیاں اور پالکیاں رکھی ہیں۔ دروازے پر موٹریں، بگھیاں، تانگے کھڑے ہیں۔ مسیحا نفس حکیم اُٹھ کر مطب میں آتا ہے۔ مریض ایک ایک کر کے آتے ہیں۔ اور نبض دکھاتے ہیں۔ کوئی امیر ہے کوئی غریب، کوئی متعدی مرض میں مبتلا ہے، کوئی امراض جلد سے تصویر عبرت بنا ہوا ہے، کوئی ادب اور تمیز سے گفتگو کرتا ہے، کوئی اختصار سے اپنا ٹھیک ٹھیک حال بتاتا ہے، کوئی طول طویل بے سروپا تقریر کرنے لگتا ہے، لیکن حکیم سراپا صبر و تحمل، مجسم خلق و تواضع ہے۔ متانت سے توجہ سے سکون و اطمینان سے ہر مریض کو دیکھتا ہے۔ اُس سے مناسب سوال کرتا ہے اور اُسکا نسخہ لکھوا کر اُسے رخصت کر دیتا ہے۔ مریضوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ حکیم کی طبیعت خود ناساز ہے گرمی کے دن ہیں دھوپ کی حدت بڑھتی جا رہی ہے، پیشانی پر پسینہ کے قطرے جھلک رہے ہیں لیکن کیا مجال جو ابرو پر بل آجائے۔ اسی کشادہ پیشانی سے آخری مریض کو دیکھتا ہے جیسے پہلے کو دیکھا تھا۔ اب گیارہ

ساڑھے گیارہ ہوگئے کھانے کا وقت ہے۔ وہاں سے اُٹھ کر کھانے کے کمرہ میں آتے ہیں نشست گاہ میں کچھ رفقا، کچھ اہل کار، کچھ اجنبی بیٹھے ہیں ان کو بلا کر کھانے میں شریک کرتا ہے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کیا ہوتا ہے۔ استراحت؟ نہیں تو یہ استراحت کا کیا ذکر ہے۔ یہ خطوط کے سننے اور جواب لکھوانے کا وقت ہے۔ بیشمار خطوط ذاتی، دوا خانہ کے متعلق، طبی مدرسہ کے متعلق، قومی مدرسے کے متعلق سنے جاتے ہیں اور اُنکا جواب لکھوایا جاتا ہے۔ مگر یکسوئی کے ساتھ نہیں نشست بالا خانہ پر خاص کمرے میں ہے مگر یہاں بھی اہل حاجت پہنچ گئے ہیں۔ کوئی ذاتی کام سے آیا ہے کوئی قومی کام سے آیا ہے ان کی طرف بھی توجہ ہے کسی سے وہیں گفتگو ہوتی ہے کسی سے علٰحدہ کمرے میں جاکر اتنے میں کوئی زنانخانہ سے آکر کان میں آہستہ کہتا ہے "بہو کی طبیعت اس وقت بہت خراب ہے"۔ چہرے پر تفکر کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں مگر اضطراب کے نہیں۔ اٹھ کر اندر جانے کا قصد ہے۔ حاضرین مجلس سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں کاموں کا بار ڈالنا ٹھیک نہیں عرض کرتے ہیں "ہم کو اجازت ہو۔ کل حاضر ہو جائیں گے" ارشاد ہوتا ہے "نہیں بیٹھئے کام تو کرنا ہی ہے میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" تھوڑی دیر کے وقفہ کے بعد پھر یہ مبارک صورت نظر آتی ہے۔ چہرے سے دل کے جذبات کا بالکل پتہ نہیں چلتا۔ اللہ رے ضبط۔

کام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ڈھائی بجے تک جاری رہا۔ اب مریضوں کو دیکھنے کے لئے جانا ہے لیکن یہی ایک چیز نہیں طبی مدرسے کے ایک جلسہ میں شریک ہونا ہے، قومی مدرسہ میں ایک معزز مہمان کو لیجانا ہے نشست گاہ سے موٹر تک جاتے جاتے ان مدارس کے مہتمموں کو مفصل ہدایتیں دیجاتی ہیں۔ ہر کلی اور جزوی بات سمجھائی جاتی ہے۔ شام کو ساڑھے پانچ بجے بیشمار اہم کاموں سے فراغت کرنے کے بعد یہ جلیل القدر ہستی قومی مدرسہ میں چھوٹے بچوں کے دارالاقامہ میں نظر آتی ہے یہ پیر دانشمند کس اطفال کے حلقے میں ہے۔ اُن سے مسکرا کر باتیں ہو رہی ہیں "بتاؤ تم میں سب سے زیادہ شریر کون ہے" - "تم ہماری دعوت کب کرو گے" بچے خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ ہر طرف سے نرغہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک پر ایک گرا پڑتا ہے۔ وہی

کشش وہی جاذبیت جو بڑوں کو مسحور کرتی ہے بچوں پر بھی اثر کر رہی ہے۔ ساڑھے چھ بجے پھر نشستگاہ میں مراجعت ہوتی ہے۔ تنہائی اب بھی نصیب نہیں۔ چند مریض موجود ہیں اور چند اہل حاجت سب کی حاجت روائی ہوتی ہے۔ نماز سے فراغت کرنے کے بعد شام کا کھانا کھایا جاتا ہے۔ بعض احباب بعض اجنبی اسوقت بھی موجود ہیں۔ کھانے کے بعد پھر دربار رہتا ہے اب احباب خاص اور اہل شہر کا مجمع ہے۔ اخبار سنایا جاتا ہے۔ سیاسی اور علمی مسائل پر گفتگو ہوتی ہے قومی مدرسے کے لوگ وہی نوجوان جن کے ذکر سے یہ قصہ شروع ہوا ہے موجود ہیں ان سے اس تعلیمگاہ کے مستقبل کے متعلق باتیں ہوتی ہیں۔ آج شب کو بارہ بجے اسی کے لئے چندہ کرنے کو ایک دور دراز شہر میں جانا ہے مگر اس سے قبل بہت سے کام ہیں۔ شہر کے بعض معاملات پیش ہیں انکا فیصلہ کرنا ہے۔ دواخانہ کے لئے ایک نیا نسخہ تجویز کرنا ہے جس کے سلسلہ میں بعض طبی کتابوں کا دیکھنا ضروری ہے۔ ایک قومی انجمن کے کارکنوں کو ضروری مشورہ دینا ہے۔ افکار و مشاغل کا یہ ہجوم ہے لیکن وہی سکون وہی اطمینان وہی خلق و تبسم۔ ایک ایک کرکے ترتیب سے سارے کام نبٹائے گئے۔ ساڑھے گیارہ بج گئے، اسباب تیار ہے، موٹر حاضر ہے۔ سب سے رخصت ہو کر ایک ایک سے مصافحہ کرکے روانگی ہوتی ہے۔ رات کی نیند کا اللہ مالک ہے۔

جو قصہ آپنے سنا یہ ایک دن کا نہیں۔ تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ روز یہی ہوتا ہے۔ اس شدید مشغولیت کی حالت میں دو برس تک قومی مدرسے کا کام کیا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ترقی ہوتی ہے لوگ متوجہ ہوتے ہیں، طلبہ بڑھتے ہیں، مدرسے کی شاخیں قائم ہوتی ہیں، تعلیم کا نظام درست ہوتا ہے اشاعت علوم کا کام پھیلنا شروع ہوتا ہے۔ مطبع بڑے پیمانہ پر چلنے لگتا ہے۔ مالی مشکلات سب سے زیادہ تکلیف دہ ہیں لیکن یہ بھی کسی نہ کسی طرح دور کی جاتی ہیں کبھی دوسروں کی مدد سے کبھی اپنی فیاضی سے۔ حکیم قوم لوگوں کو قومی تعلیم کا مفہوم سمجھانے اور ان سے اپنی محبوب تعلیمگاہ کے لئے امداد حاصل کرنے کی غرض سے متعدد بار سفر کرتا ہے کبھی سخت بیماری کی حالت میں، اکثر تن تنہا، ہمیشہ مالی نقصان

برداشت کرکے یہ سچا ایثار اسے کہتے ہیں واسطے دوسرے قدرے سختے مدد کرنا۔ سب سے زیادہ اہم بمبئی کا سفر ہے۔ ملک کا مسیحا درد قولنج میں مبتلا بستر علالت پر ہے نقل و حرکت دشوار ہے۔ مگر بمبئی جاکر ایک اولوالعزم تاجدار کے سامنے قومی مدرسہ کیطرف سے سپاسنامہ پیش کرتا ہے۔ لوگ مایوس ہیں سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں سفر ناممکن ہے لیکن انہیں اس مرد خدا کی ہمت کا صحیح اندازہ نہیں۔ اسی حالت میں سفر ہوتا ہے۔ سپاسنامہ پیش ہوتا ہے ملک تاج و تخت قومی مدرسہ کی پر زور تائید کرتا اور امداد کا وعدہ کرتا ہے۔ تمام ہندوستان اس قومی تعلیمگاہ کیطرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ تمام ملت اسلامی اس کی قدر کرنے لگتی ہے۔

اب دو سال کوششوں کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ ہمارے نوجوان بہت خوش ہیں۔ اُن کی ہمتیں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ معلوم ہے کہ اُنکا محترم رہنما نئے سال کے شروع سے ملک کا دورہ کریگا اب خدا نے چاہا تو کامیابی یقینی ہے۔ نوجوان تعطیل میں اپنی تعلیمگاہ کی مقاصد کی نشر و اشاعت کر کے لئے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی مدراس میں ہے، کوئی علیگڈھ میں کوئی دلی میں، کوئی لکھنو میں۔ ۲۹ دسمبر کی صبح کو یکایک یہ لوگ اپنے اپنے مقام پر اخباروں میں یہ سرخی پڑھتے ہیں "حکیم اجمل خاں نے وفات پائی،، ان چند لفظوں کا اثر بیان نہیں ہو سکتا۔ سکتہ۔ بدن میں سنسنی آنکھوں میں اندھیرا۔

آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ "آں ساقی نماند" یہ حقیقت ہر بانکا حقیقت دلخراش حقیقت مگر "آں قدح شکست"؟ خدا نہ کرے، اجمل خاں نہیں رہے مگر اجمل خاں کا خدا موجود ہے۔ جو کسی کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ اجمل خاں کے فرزند ارجمند اور سچے دوست موجود ہیں اجمل خاں سے تربیت پائے ہوئے نوجوان موجود ہیں اور اجمل خاں کی قوم موجود ہے۔ کیا یہ سب اجمل خاں کے کام کو ادھورا چھوڑیں گے۔ عقل قبول نہیں کرتی دل گواہی نہیں دیتا۔

تنقید و تبصرہ

صراط مستقیم

مصنفہ ڈاکٹر صادق علی صاحب۔ (ریٹائرڈ سرجن میجر) کپور تھلہ

ڈاکٹر صاحب موصوف ان لوگوں میں سے ہیں جو صرف قرآن ہی کو اصل دین سمجھتے ہیں، اور روایات قیاسات کو دین کا جزو نہیں مانتے انکا دعوٰے ہے کہ جو کچھ وہ لکھتے ہیں قرآن ہی سے لکھتے ہیں۔ اسی بنا پر انکی خواہش یہ ہے کہ جو کچھ انکی تنقید یا تردید میں لکھا جائے وہ بھی قرآن ہی سے لکھا جائے۔

انکا خیال یہ ہے کہ قیاسات دین میں ممنوع ہیں۔ اور روایات تمامتر ان جماعتوں کی ہیں جو صفین اور نہروان وغیرہ کی باہمی جنگوں میں مبتلا ہوئے۔ ان لوگوں نے اپنے اپنے خیالات کو رسول کریم کیطرف منسوب کرکے دینی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جس سے امت اسلامیہ میں ایک دائمی تفرقہ قائم ہو گیا۔ سنی الگ، شیعہ الگ اور خارجی الگ ہو گئے۔ اور ہر ایک فرقہ نے اپنی اپنی حدیثوں کو صحیح سمجھکر ایک دوسرے کی تکفیر شروع کی، حالانکہ انکے رواۃ کا ایک بڑا حصہ ایسا ہے جن کی تلواریں خود مسلمانوں کے خون سے رنگین ہوئیں۔ اور وہ "یضرب بعضکم رقاب بعض" کے مجرم اور رسول اللہ کے خطبہ حجۃ الوداع کے مطابق کفر کے مرتکب ہو چکے تھے۔

روایات کے ابطال میں ڈاکٹر صاحب کی یہ دلیل کیا وزن رکھتی ہے یہ بحث طویل ہے۔ اور اس میں سردست ہم پڑنا بھی نہیں چاہتے کیونکہ روایات کی اصل حقیقت جانچنے کا معیار ہی دوسرا ہے جس کو انشاءاللہ ہم بسط و تفصیل سے جداگانہ طور پر لکھیں گے۔ اس وقت ہم انکی کتاب مذکورہ عنوان پر جو انہوں نے مسلمانوں کو صراط مستقیم دکھلانے کے لئے اپنے خیال کے مطابق قرآن ہی سے لکھی ہے نظر ڈالتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے وہ قرآن کے مطابق بھی ہے یا نہیں۔

غالباً کوئی مسلمان اس سے انکاری نہ ہوگا کہ قرآن مجید سے جو ہدایت اخذ کیجائیگی وہی اصلی ہدایت اور صراط مستقیم ہوگی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ قرآنی تعلیم کا اصلی مفہوم ہو۔ خود اپنے خیالات آیات کی آڑ میں پیش نہ کئے گئے ہوں۔ کیونکہ یہی وہ گمراہی ہے جس میں اکثروں کو ہلاک ہوتے ہوئے میں دیکھ رہا ہوں۔ لوگ قرآن کے الفاظ کو لیکر پہلے خیالی معنی پہنا دیتے ہیں اسکے بعد آیات قرآنی کے مفہوم کو اسی رنگ میں دکھاتے ہیں جس سے نفس حقیقت باطل بدلجاتی ہے۔ حالانکہ قرآن فہمی کا اولین اصول یہ ہے کہ اس کے الفاظ کے معانی وہی لئے جائیں گے جو عام طور پر اہل عرب ان سے سمجھتے تھے کیونکہ وہ عربی زبان میں ہے جیسا کہ خود بار بار اس نے تصریح کی ہے۔ خاص خاص معانی میں جو الفاظ منتقل ہوئے ہیں انکی تشریح خود قرآن ہی سے نکل آتی ہے۔

مجھے حیرت ہوتی ہے کہ خالص قرآنی تعلیم دینے والے حضرات روایات اور تفاسیر کو تو بت قرار دیکر توڑتے ہیں لیکن خود اپنے خیالات کے بت لاکر نصب کر دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا بھر سے اس کو پجوائیں۔

حق و باطل ڈاکٹر صاحب نے صراط مستقیم بیان کرنے سے پہلے حق و باطل کے الفاظ کو "قرآنی اصطلاح" قرار دیکر ایک طویل تمہید میں انکی تشریح کی ہے۔ انکے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ سارے عالم میں ہستی صرف ایک ہی ہے۔ وہی حق ہے اور باطل کوئی وجود نہیں رکھتا۔ اس خیال کا انکے اوپر ایسا غلبہ ہے کہ آغاز کتاب سے لیکر خاتمہ تک اسی جوش میں چلے گئے ہیں۔ صفحہ ۲۷ میں شیخ ابن عربی کے مسئلہ وحدۃ الوجود کو انہوں نے قرآن کے خلاف قرار دیا ہے لیکن خود صفحہ ۴۱ میں لکھتے ہیں کہ "وہی اول وہی آخر، وہی ظاہر۔ وہی باطن ہے۔ یعنی اسکے سوا کوئی ہستی موجود نہیں ہے"

ڈاکٹر صاحب کو اگر اس مسئلہ کی تلقین منظور تھی تو اسکے لئے فلسفہ کا راستہ کھلا تھا یا تصوف کی راہ سے آتے قرآنی شاہراہ انہوں نے کیوں اختیار کی۔ اس لئے کہ یہ نظریہ خواہ کیسی ہی دلفریب عبارت میں بیان کیا جائے قطعاً نہ اسلامی ہے نہ قرآنی اس کے ماتحت آیات کی جو تشریح کیجائے گی وہ تقریباً ویسی ہی ہوگی جیسی وہ تفسیر ہے جو شیخ ابن عربی کی طرف منسوب ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر

صاحب نے صفحہ ۱۰۲ میں لکھا ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا نہیں کیا۔ کیونکہ شیطان باطل ہے اور اللہ تعالیٰ حق ہے حق سے باطل نہیں پیدا ہوتا۔"

یہی دلیل مجوسیوں کی ہے جو یزدان اور اہرمن (خیر و شر کے) دو الگ الگ خالق مانتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا غالباً جواب یہ ہو گا کہ میں شیطان کا وجود ہی تسلیم نہیں کرتا۔ لیکن پھر یہ سوال ہو گا کہ ایک معدوم شے کی مخلوقیت یا عدم مخلوقیت کی بحث میں آپ کیوں پڑے۔ علاوہ بریں کیا قرآنی تعلیم یہی ہے؟۔

قرآن شیطان کو موجود مانتا ہے۔ اور اس کے مخلوق ہونے کی تصریح کرتا ہے۔ انسانی شیطان جناتی شیطان۔ خواہ بمعنی ابلیس خواہ بمعنی سانپ سب کے سب قرآن کی رو سے مخلوق ہیں اور وجود رکھتے ہیں۔

حق کے وجود اور باطل کے عدم پر ڈاکٹر صاحب نے جو آیات نقل کی ہیں انکا ادنےٰ تعلق بھی اس مسئلہ سے نہیں ہے۔ انکے زعم میں اس کی جو سب سے بڑی قرآنی دلیل ہے وہ یہ ہے صفحہ ۱۰۰

ذَالِکَ بِاَنَّ اللہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ الآیہ

اسکا مطلب ڈاکٹر صاحب کی عبارت میں یہ ہے

"اللہ تعالیٰ حق ہے اور جو کچھ ہے سب باطل ہے۔ باطل کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی ہستی نہیں رکھتا"

مقصود تو یہ ہے کہ معبودانِ غیر اللہ جن کو وہ لوگ پکارتے ہیں باطل ہیں۔ انکی معبودیت کا ابطال ہے نہ کہ ان کے وجود کا انکار۔ جب تک ڈاکٹر صاحب کی تفسیر ساتھ نہ لگائی جائے اس وقت تک آیت کا یہ مطلب جو انہوں نے لکھا ہے کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اب قرآن میں جہاں جہاں حق و باطل کا لفظ آیا ہے ہر جگہ یہ تشریح لگانی پڑے گی کہ "باطل کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی نہیں رکھتا" یہ قرآن کا اتباع تو نہ ہوا بلکہ قرآن کو اپنے خیال کا تابع بنانا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ اس قرآن فہمی پر صفحہ ۱۰۲ میں طنزاً رازی اور غزالی کی نسبت "قاموسی دماغ رکھنے والے علماء" کے الفاظ لکھے ہیں۔ یہی خود رائی اور خود بینی قرآن کے سمجھنے میں وہ بڑی رکاوٹیں بلکہ مہلک گھاٹیاں ہیں۔

رائے خود و فکر خود۔ در عالم رندی نیست   کفر است دریں مذہب خود بینی و خود رائی

اصلیت یہ ہے کہ کبھی کبھی بعض خیالات کا انسان کے دماغ پر ایسا غلبہ ہو جاتا ہے کہ حقیقت مجاز اور مجاز حقیقت کی شکل میں نظر آنے لگتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر اس خیال کے تسلط سے آزاد ہوتے تو دیکھتے کہ اس امتحان گاہ عالم میں حق اور باطل دونوں ہیں اور باہم دست و گریبان۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے "کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ" جس کے ڈاکٹر صاحب نے یہ معنی لکھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح حق و باطل کی مثال بیان کرتا ہے صفحہ ۲۰۵۔ مثال نہیں بیان کرتا بلکہ انکو مشابہ اور ہم شکل بنا دیتا ہے۔ کیونکہ اسی آیت میں "کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ" خود موجود ہے۔

اس قسم کی عامیانہ ترجموں کی مثالیں اس کتاب میں بہت ہیں۔ مثلاً "اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ" اسکا ترجمہ لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم آپ اپنی حالت نہ بدلے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ایک اہم اصول بتلایا ہے کہ "ما بالقوم" نتیجہ ہوتا ہے "ما بالانفس" کا چنانچہ اصلاح و تزکیہ نفوس کے آئین و طریق کی تعلیم قرآن میں دی گئی تاکہ نفس کی درستگی سے قومی حالت بھی درست ہو جائے۔ لیکن اس عامیانہ ترجمہ سے نہ یہ اصول سمجھ میں آئیگا۔ نہ اس کی طرف توجہ ہی ہوگی۔

یہود و نصاریٰ سے | ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی دعوے کیا ہے کہ رسول کریم کی نبوت خاص بنی اسمٰعیل کے لئے تھی۔ اور اسپر وہ آیتیں نقل کی ہیں جو انذار عرب سے متعلق ہیں۔ غنیمت یہ ہے کہ انہوں نے سارے جزیرہ عرب کے باشندوں کو اسمٰعیلی خیال کیا۔ اس طرح پر آنحضرت کے حدود نبوت میں کچھ توسیع ہوگئی

ان آیات کے علاوہ کلام مجید میں ایسی آیتیں بھی تھیں کہ ڈاکٹر صاحب اگر ان سے استدلال کرتے تو رسول کریم کی رسالت صرف مکہ اور اس کے ماحول تک محدود کر سکتے تھے مثلاً لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَہَا۔ بلکہ صرف بنی ہاشم تک مثلاً وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ۔ کیا ڈاکٹر صاحب کی نگاہ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔ یا وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ وغیرہ آیات پر جو خاتم النبیین کی رسالت کو جو بنی نوع انسان کے لئے ہر زمان اور ہر مکان میں عام کرتی ہیں نہیں پڑی؟

آنحضرت کی رسالت کو بنی اسمٰعیل پر محدود کر دینے کے بعد دیگر شرائع کو برحق تسلیم کر لینا اور ان کے اوپر عمل کی اجازت دے دینا بھی لازمی تھا کیونکہ ہمیشہ ایک غلطی دوسری غلطی کی معد ہوا کرتی ہے ؎

خشتِ اول گر نہد معمار کج　　　تا ثریا میرود دیوار کج

چنانچہ یہی ڈاکٹر صاحب نے کیا ہے اور صفحہ ۸۰ میں لکھا ہے کہ اہل کتاب اپنے اپنے مذہب پر رہکر بلا اسلام لائے بھی نجات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ استدلال میں سورۂ مائدہ کا وہی رکوع پیش کیا ہے جس کو اکثر اس خیال کے لوگ پیش کرتے ہیں یعنی لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ اور یہ آیت۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ الآیۃ

لیکن پہلے رکوع کو اس مسئلہ سے قطعاً تعلق نہیں کہ یہود اور نصاریٰ کے لئے نجات اور ہدایت کا اب کیا ذریعہ ہے۔ بلکہ اس کے بعد ہی مسلمانوں کو انکے ساتھ موالات رکھنے کی سختی کے ساتھ ممانعت کی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جبتک وہ اپنی شریعت پر ہیں اہل حق انسے دوستانہ تعلق نہیں رکھ سکتے۔ رہی دوسری آیت اس میں شرط ہے ایمان کی۔ یہ ایمان کیسا ہونا چاہئے اسکی تفصیل ڈاکٹر صاحب نے نہیں تلاش کی ورنہ ایسی بدیہی غلطی کے مرتکب نہ ہوتے۔

دراصل اس مسئلہ کو کہ اہل کتاب کا ذریعہ نجات نزول قرآن کے بعد کیا ہے دوسری جگہ سورۂ بقرہ میں اللہ تعالےٰ نے وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا کے ذیل میں تفصیل و تصریح کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ اور کہا ہے

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ۔

یعنی اہل کتاب کے لئے بھی بما انزل الی المسلمین پر ایمان لانا لازمی ہے۔ بلا اس کے وہ مقبول نہیں ہو سکتے۔ اور قرآن کا دستور ہے کہ ایک امر کو جب ایک جگہ وہ حتمی طور پر طے کر دیتا ہے تو پھر بار بار ہر جگہ غیر متعلق طور پر اس کو دہرایا نہیں کرتا۔ تاہم اس کو سورۂ اعراف میں بھی پھر ایک دوسری نوعیت سے بیان کیا ہے۔

فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

یہ خطاب خاص اہل کتاب سے ہے۔ اور صریح ہے کہ صرف وہی ان میں سے نجات پائیں گے جو اس رسول ﷺ پر اور اس کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی ہے اس پر ایمان لائیں گے۔

ڈاکٹر صاحب غالباً اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہونگے کہ رسول کریم نے اہل کتاب کو اسلام کی تبلیغ کی۔ ہرقل اور مقوقس کے نام دعوت نامے بھیجے۔ یہود کو مسلمان کیا۔ آخر یہ سب کس منصب کی بناء پر تھا؟

قرآن میں اہل کتاب کے ساتھ جہاد کا جو حکم ہے ڈاکٹر صاحب صفحہ ۵۰ میں اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ وہ جزیہ دیکر ماتحت ہوکر رہیں۔ یعنی قرآن میں جو غایت ہے ڈاکٹر صاحب کے نزدیک وہی غرض ہے۔

آنحضرت کی رسالت بنی اسماعیل پر محدود کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب انبیاء سابقین پر ان کی فضیلت بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ لیکن اگر وہ قرآن ہی پر مدار رکھیں تو کم سے کم تین فضیلتیں تو انکو ماننی پڑیں گی۔

آنحضرت ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ آپ کی رسالت کافۂ بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ آپ کے اوپر جو کتاب نازل ہوئی وہ ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ درانحالیکہ انبیاء سابقین میں ان تینوں صفتوں میں سے کوئی بھی نہ تھی یا کم سے کم قرآن سے ثابت نہیں ہوتی۔ باقی تاریخی حیثیت سے تو دنیا کے تمام انسانوں پر رسول کریم کی فضیلت بلکہ افضلیت سورج سے بھی زیادہ آشکارا ہے۔

اسی تحدید رسالت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ توریت اور انجیل کی صحت اور انکا قابل عمل ہونا بھی ڈاکٹر صاحب کو تسلیم کرنا پڑا اور تعجب یہ ہے کہ ایسی غلطیوں پر بھی وہ قرآن ہی سے استدلال کرتے ہیں قرآن سے صرف ان کتابوں کا آسمانی اور برحق ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں نکلتا کہ نزول قرآن کے زمانہ میں یا اس کے بعد بھی یہ درست و صحیح موجود تھیں۔ بلکہ اس کے برعکس انکے محرف اور مخلوط ہونے کی تصریحات ہیں۔

اہل کتاب کے لئے ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کی بیٹیاں بھی حلال سمجھتے ہیں۔ اور دلیل میں

آیات پیش کرتے ہیں

الیوم احل لکم الطیبات وطعام الذین اوتوا الکتاب حل لکم وطعامکم حل لھم والمحصنات من المومنات والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم اذا اتیتموھن اجورھن الآیۃ

ڈاکٹر صاحب کے خیال میں والمحصنت من المومنات طعامکم پر معطوف ہے یعنی تمہارا کھانا بھی اہل کتاب کے لئے حلال ہے اور پاکدامن مومنہ عورتیں بھی۔ حالانکہ باتفاق مفسرین اور باعرب جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے یہ طیبات پہ معطوف ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اگر تواعد عطف کا لحاظ رکھا ہوتا تو ایسی جدت طرازی میں نہ پڑتے کیونکہ والمحصنات من المومنات اگر حل لھم کے ساتھ متعلق ہو تو والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب کے بعد حل لکم کا تکرار لازم ہوجاتا ہے۔ اور یہ تو کسی قاعدہ سے جائز نہیں کہ ایک محصنت کا عطف طعامکم پر ہو اور دوسرے کا طیبات پر درانحالیکہ دونوں ایک ہی سلسلہ میں واقع ہیں۔ پھر معنوی لحاظ سے یہ کسقدر عجیب ہے کہ کتابیہ تو حلال ہو مومن کے لئے بشرط ادائے مہر و احصان اور مومنہ حلال ہو کتابی کے لئے بلا کسی شرط کے۔ دنیا بھر سے مخالفت کے لئے تو بڑی پختہ دلیل کی ضرورت تھی۔

المشرکین | جو لوگ رسول کریم کو صرف اہل عرب کا نبی مانتے ہیں اور انکی رسالت کو جزیرہ عرب تک محدود گردانتے ہیں انکا ایک دسیسہ یہ بھی ہے کہ المشرکین کے لفظ کو جو قرآن میں بار بار آتا ہے صرف مشرکین عرب کے لئے مخصوص اصطلاح قرار دیتے ہیں اور مختلف رکیک تاویلات اور رکیک دلائل اس کی تائید کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ یہ کوئی اصطلاح ہے نہ صرف مشرکین عرب کے لئے مخصوص ہے۔ قرآن میں غور کیا جائے تو ظاہر ہوجاتا ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن سے شرک کا فعل صادر ہو خواہ وہ عرب ہوں یا عجم۔ چنانچہ قرآن میں کہیں مشرکین بصیغہ اسم صفت اور کہیں والذین اشرکوا بصیغہ فعل مستعمل ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ کوئی خاص اصطلاح نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب بھی اس دسیسہ میں مبتلا ہیں اور انکو ہونا بھی چاہئے تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب میں صحیح قرآنی تعلیمات کے خلاف جس قدر باتیں ہیں وہ سب اگر تحریر میں لائی جائیں تو بلا مبالغہ اسی حجم کی ایک دوسری کتاب بن سکتی ہے۔ میں نے صرف چند اصولی غلطیاں نمایاں کی ہیں تاکہ وہ جس شکل میں امت کے سامنے قرآن کو پیش کرتے ہیں اس کی حیثیت ان پر واضح ہو جائے۔ اور آئندہ قرآن کو جو دنیا کے لئے ایک حقیقی نظام عمل ہے محض خیالی فلسفہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔

اس میں شک نہیں کہ اس کتاب میں بعض بعض باتیں قابل قدر بھی ہیں۔ خاصکر اعجاز قرآن کی بحث میں ڈاکٹر صاحب نے کلام الٰہی اور کلام انسانی میں جو قدرتی اور مصنوعی ہونے کا فرق بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے لیکن باوجود ان چند خوبیوں کے بھی مجموعی طور پر اس کتاب کے متعلق میری رائے یہی ہے کہ " اثمہ اکبر من نفعہ "

ڈاکٹر صاحب کے پتہ سے محصول ڈاک بھیجنے پر مفت مل سکتی ہے۔ اظم

سیرت باقی۔ (مصنفہ سید عزیز حسن صاحب بقائی۔ حجم ۱۱۶ صفحہ قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ۔ سید حسن انیس صاحب منیجر رسالہ پیشوا۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۰۵۔ دہلی)

اس کتاب میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی زندگی کے حالات سلیس عبارت میں بیان کئے گئے ہیں اور چند مکتوبات بھی ہیں جو مختلف بزرگوں کے نام لکھے گئے تھے کتاب سے پہلے مصنف کا دیباچہ ہے جس میں کتاب کے ماخذ بتائے گئے ہیں اور ایک مختصر سا تعارف خواجہ حسن نظامی صاحب کے قلم سے ہے۔ لکھائی چھپائی، کاغذ قابل اطمینان ہے۔ جو حضرات تصوف کا مذاق رکھتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔

بلتا زار۔ حجم ۳۲ صفحہ قیمت ۲ر } تقطیع ۳۰×۲۰/۱۶ شائع کردہ ہند بک ایجنسی۔ پوسٹ بکس
محبت۔ حجم ۴۰ صفحہ قیمت ۵ر } نمبر ۱۰۲۰۲، بالی گنج کلکتہ۔

ابن سراج حجم ۲۰۰ صفحہ قیمت ۸؍
ہندبک ایجنسی ایک سلسلہ یوروپ کے بہترین افسانوں کا شائع کر رہی ہے جس میں سے
یہ تین ہمیں بغرض ریویو موصول ہوئے ہیں۔

بلتازار۔ اناتول فرانس کی تصنیف ہے۔ اور مولوی عبدالرزاق صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔ حبش کے بادشاہ بلتازار اور سبا کی ملکہ بلقیس کا قصہ ہے۔ بلتازار عشق کی شراب کے مزے لینے کے بعد رقابت کے خمار کی زحمت اٹھاتا ہے۔ اس شدید کرب سے نجات پانیکے بعد پہلے فلسفہ کے خواب اور شہرت کو آزماتا ہے پھر مذہب کے آب حیات سے دائمی تسکین پاتا ہے۔ ترجمہ اسی قدر دلچسپ ہے جتنا اصل قصہ۔

محبت۔ روس کے انشا پرداز اور مصلح ٹالسٹائے کی تصنیف اور مولوی عبدالرزاق صاحب کا ترجمہ۔

میکائل نام ایک فرشتے کا قصہ ہے جس نے مشیت خداوندی میں دخل دینے کی یہ سزا پائی تھی کہ انسان بناکر دنیا میں بھیجا گیا۔ یہاں آکر اسے معلوم ہوا کہ دنیا کا قیام عقل و دانش پر نہیں بلکہ محبت پر ہے۔ اسی راز کے معلوم ہونے سے اسکی نجات ہوئی۔ ٹالسٹائے نے اپنے خاص انداز میں یہ قصہ لکھا ہے اور اہل دل کے لئے اسکا مطالعہ عبرت آموز ہے۔

ابن سراج۔ فرانس کے سحر نگار انشا پرداز شیتو بریان کی تصنیف اور بدیع الدین احمد صاحب کا ترجمہ۔

مترجم صاحب نے حرف بہ حرف ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ جا بجا تصرف سے کام لیا ہے۔ جمالیات کے نقطہ نظر سے اصل قصہ اور ترجمہ دونوں بہت کامیاب ہیں۔ نثر میں شعر کا بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو اس قصہ کو دیکھئے۔ بنی احمر کے خاندان کا ایک نوجوان ابن سراج غرناطہ کی ایک اسپینی دوشیزہ پر عاشق ہوتا ہے۔ وہ بھی اس کی محبت میں سرشار ہے لیکن چاہتی ہے کہ وہ عیسائی ہو جائے۔ عشق اور مذہب کی جنگ بہت خوبصورتی سے دکھائی گئی ہے۔ آخر میں وہ عیسائی لڑکی خود مذہب اسلام

قبول کرتی ہے اور ابن سراج سے اس کی شادی ہوتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ محض عشق نے مذہب کو مغلوب کر لیا بلکہ یہ تبدیل مذہب عشق کے جذب اور مذہب اسلام کی کشش کا مجموعی نتیجہ ہے۔

تینوں رسالوں کی چھپائی اچھی ہے لکھائی اور کاغذ معمولی ہے۔

(قطعہ دیگر از جناب حکیم سعید الہاشمی اسعد ٹونکی)

آہ محمد اجمل خاں۔ آں خضر مدنی و مسیح دم — فیض رساں و فخر زماں و کہف اماں مسیح الملک
عیسوی سال وفات تاریخش گیر از ظاہر باطن عمر — آخر رکز ز عیسوی سالے شد بجناں مسیح الملک
۲۷ ۶ ۱۹

اقتباسات

ہندو مسلم کشیدگی کے اسباب یہ مسئلہ روز بروز اس قدر اہم ہوتا جا رہا ہے کہ اسکا ذکر اخبارات سے گزر کر رسائل میں ہونا شروع ہو گیا ہے۔ اور ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات پر اگر کوئی کتاب لکھی جاتی ہے تو اسکا مصنف اس وقت تصنیف کا حق ادا نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس مسئلہ پر سنجیدگی اور اور متانت کے ساتھ بحث نہ کرلے۔ جے۔ ٹی۔ سدرلینڈ جنکا ذکر گزشتہ پرچہ میں آچکا ہے اور اسی کے ساتھ انکی تازہ شائع ہونیوالی کتاب "آزادی کے لئے ہندوستان کا مطالبہ" کے ایک باب کا خلاصہ بھی دیا جا چکا ہے۔ اپنی اسی کتاب کے ایک اور باب میں "ہندو مسلم فسادات" کا ذکر کرتے ہوئے، ان کے اسباب سے یوں بحث کرتے ہیں:۔

"ہندوستان میں جن مقامات پر برطانوی اثر غالب ہے، وہاں فسادات بکثرت وقوع پذیر ہوتے ہیں اور جہاں یہ اثر کم ہے، وہاں فسادات بہت کم کیا شاذ و نادر نظر آتے ہیں۔ انگریزوں کے ہندوستان میں آنے سے پیشتر ہندو اور مسلمانوں میں کوئی کشیدگی نہیں تھی۔ ہر جگہ وہ امن و صلح کے ساتھ رہتے سہتے تھے۔ ایسی ریاستوں میں جہاں نسبتہً انگریز کم ہوتے ہیں اور جہاں انگریزی اثر بہت تھوڑا ہوتا ہے وہاں فسادات بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن جب ہندوستان میں انگریزی راج قائم ہوا جہاں انگریزی حکومت کا اثر سب سے زیادہ ہے، وہاں ان دونو قوموں میں بغض و عناد کی آگ برابر بھڑکتی رہتی ہے اور فسادات کا وقوع اکثر و بیشتر ہوتا ہے۔

اسکے ثبوت میں مصنف مذکور نے متعدد تاریخی شہادتیں بھی دیں ہیں چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں شروع ہی سے برطانوی پالیسی یہ رہی ہے کہ آپس میں پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ لیکن ہمیشہ اس کی احتیاط کی گئی ہے کہ دوسروں کو اسکا پتہ نہ چلنے پائے اور موقع پر بسا اوقات اس سے صاف انکار بھی کر دیا ہے۔ پھر بھی بعض دیدہ دلیر انگریز ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے

اس پالیسی کا خود اپنی زبان سے اقبال کیا ہے اور اس کی مدافعت کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔
۱۸۲۱ء ہی میں ایک انگریزی افسر نے فرضی نام سے "ایشیاٹک ریویو" میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں اس نے صاف لفظوں میں کہا تھا کہ "پھوٹ ڈالکر حکومت کرنا، ہندوستان کے اندر ہمارے نظام حکومت کا خواہ وہ سیاسی ہو، یا سول ہو یا فوجی، سب سے بڑا نصب العین ہونا چاہئے"

"اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے قریب لفٹننٹ کرنل جان کوک نے جو مراد آباد میں فوجی افسر تھے لکھا تھا کہ ہماری کوشش یہ ہونا چاہئے کہ (ہماری خوش قسمتی سے) یہاں کی مختلف قوموں اور مذاہب میں جو بعد ہے اسے برابر قائم رکھا جائے اور اسکا موقع نہ آنے دیا جائے کہ وہ آپس میں متفق ہو سکیں۔ پھوٹ ڈالکر حکومت کرنا ہندوستانی حکومت کا اصل اصول ہونا چاہئے"

"لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی نے ۱۸۵۹ء میں اپنی ایک سرکاری تحریر میں لکھا تھا کہ "پھوٹ ڈالکر حکومت کرنا قدیم زمانہ میں اہل روما کا اصول تھا اور یہی اصول ہمارا بھی ہونا چاہئے" سر جان اسٹریچی جنکے نام سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا ہال مشہور ہے اور جو ایک مشہور سول افسر ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے مصنف بھی سمجھے جاتے ہیں انہوں نے ایک موقع پر لکھا تھا کہ "ہندوستان کے لوگوں میں باہم مخالف مذاہب کا ہونا ہمارے سیاسی پوزیشن کے لئے ایک بہت بڑی تقویت کا باعث ہے" انکے علاوہ مسٹر اے۔ او۔ ہیوم جنہوں نے تقریباً اپنی ساری عمر ہندوستان میں ایک بڑے عہدیدار کی حیثیت سے گزاری ہے انہوں نے کسی سلسلہ میں ایکبار مہاتما گاندھی سے نہایت صاف لفظوں میں فرمایا تھا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان میں صرف پھوٹ ڈالکر حکومت کرنے کی پالیسی پر قائم ہے"

ان تمام مستند تاریخی شہادتوں کے دینے کے بعد مصنف موصوف لکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ایک قدرتی امر سمجھا جاتا اگر ایک قوم کا دوسری قوم کو مفتوح بنانا درست اور بلا اسکی مرضی کے اسپر حکومت کرنا درست ہوتا۔ اسوقت حکومت برطانیہ کے لئے بھی اپنی حکومت کو مستحکم اور مضبوط کرنے کی غرض سے اس پالیسی کو استعمال کرنا اور یہاں کے لوگوں میں پھوٹ ڈالنا اور نفاق پیدا کرنا بالکل صحیح اور درست ہوتا۔ ایک متحدہ قوم کا نہ صرف محکوم بنانا دشوار ہے بلکہ اس پر حکومت کرنا اور

ہمیشہ اسے اپنے جوتے کے نیچے دبائے رکھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ لہٰذا اگر برطانیہ اس خیال
کو ملحوظ رکھتی اور ہندوستان کے اندر اپنی حکومت کے دوران میں اس سے فائدہ نہ اٹھاتی تو
یہ ایک سخت موجب حیرت ہوتا!!

مزدوروں اور سرمایہ داروں کی جنگ

قرون وسطیٰ میں جب مذہب کا دور دورہ تھا تو یورپ میں متحارب قوتیں
صلیب اور ہلال یا خود آپس میں کاتھولکی اور پروٹسٹائی کے نام سے برسر
پیکار رہا کرتی تھیں، لیکن اب اس صنعت و حرفت کے دور میں محاذ جنگ روح اور قلب سے ہٹکر
جسم اور اعضا پر قائم ہوگیا ہے اور اب یورپ کی خانہ جنگی روحانی غذا کے لئے نہیں بلکہ مادی قوت
لایموت کی غرض سے ہوتی ہے۔ آج کل کی متحارب قوتیں بت پرستی اور خدا پرستی، صلیب و ہلال
نہیں بلکہ مزدوری اور سرمایہ داری ہوتی ہیں جن میں سے ایک تمام سامان اور آلات کیساتھ مسلح ہوتی ہے لیکن دوسری
کے پاس جوش و خروش، سرگرمی و مستعدی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان متحارب قوتوں کا مستقبل کیا ہوگا، اسکا
اندازہ کرنا چاہو تو برلن (جرمنی) کو ایک اجتماع عظیم کے حالات ذیل میں ملاحظہ کرو:۔

صبح ۸ بجے سے کمیونسٹ مزدور بارکوں میں جمع ہونے لگے۔ ۱۰ بجے گشت کے لئے ان کی
روانگی کا وقت تھا۔ شہر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جو انکے قدموں اور باجوں کی آوازوں سے گونج نہ اٹھا
ہو۔ شہر کے کسی ایک گوشہ میں کھڑے ہو جاؤ تو تمہیں نظر آئے گا کہ خاکی وردیاں، سرخ ستارے
بنی ہوئی ٹوپیاں پہنے ہوئے مزدوروں کی جماعت چلی جا رہی ہے۔ جماعتوں میں نہایت ترتیب و
انتظام پایا جاتا ہے، سرخ جھنڈے اور جھنڈیاں ہر جماعت کے ساتھ نظر آتی ہیں اور باجے ہیں کہ ان
نغموں کے ساتھ فضائے آسمانی میں گونج رہے ہیں:۔

اٹھو! اے فاقہ مستو اٹھو۔ تم دنیا کے سب سے بڑے بدنصیب ہو۔
انصاف کا یہ تقاضا ہرگز نہیں۔ آئندہ کے حالات اس سے کہیں بہتر ہیں۔ مجمع نے اسی جوش و
خروش کیساتھ شہر کے ہر گلی کوچہ کا گشت لگایا اور ان کے ساتھ جوق در جوق اور جماعتیں بھی آ آ کر
ملتی گئیں جن کے ہمراہ بھی اسی قسم کے جھنڈے اور نشانات تھے اور جن پر نہایت جلی حرفوں میں مختلف

قسم کی عبارتیں لکھی تھیں مثلاً "تف ہے سرمایہ داری کی جنگ پر" "زندہ باد انقلاب چین!" "تف ہو انگریزوں کی سرمایہ داری پر" "لینن مرگیا ہے۔ زندہ باد روح لینن"

غرض یہ تمام لشکر بالآخر ایک جگہ جمع ہوتا ہے اور جلسہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے اس طرح ہر بات اور مفہوم کو ہر شخص مکرر اور بار بار ادا کرتا ہے تاکہ وقت کم صرف ہو اور اصل مقصد سننے والوں کے بخوبی ذہن نشین ہو جائے۔ ناظرین کے اندازہ کے لئے ایک تقریر کا آخری حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

تمام سرمایہ دار ملکوں میں نفع اٹھانیوالے سوویٹ یونین کے خلاف جہاد کی تیاری کر رہے ہیں لیکن ہم لوگ جرمنی کے تمام انقلابی قوت اور جذبات کو بیدار کر دینگے تاکہ وہ انکی تدبیروں کو چلنے نہ دیں۔ ہم مزدوری پیشہ لوگ صرف ایک جنگ کے لئے لڑینگے اور وہ جنگ کارخانہ داروں کے خلاف ہوگی۔ جرمن حکومت کے غیر جانبداری کے فریب میں ہرگز نہ آؤ جب جنگ کی نوبت آتی ہے تو اس وقت معاہدے اور عہد ناموں کی ردی کے کاغذوں سے زیادہ حقیقت نہیں ہوتی"

یہ اور اسی قسم کی دوسری تقریریں جب ختم ہو چکیں تو اخیر میں ایک قسم لیگئی اور سب نے قسم کے آخری حصہ کو اپنی اپنی زبان سے بلند آواز کے ساتھ دہرایا۔ ہر ایک نے اپنی زبان سے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ

"میں کبھی نہیں بھولوں گا اس بات کو کہ دنیا کی سرمایہ داری سوویٹ روس کے خلاف جنگ کی تیاری کر رہی ہے۔

"کبھی نہیں بھولوں گا اس بات کو کہ دنیا بھر کے مزدوروں کی قسمت سوویٹ روس سے وابستہ ہے۔

"کبھی نہیں بھولوں گا ۴ ر اگست ۱۹۱۴ء کی تاریخ کو اور مصلحین کی غداری اور بے وفائی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میں اسے یاد رکھوں گا۔

"کہ اپنے ان انقلابی فرائض کو ادا کروں جو مزدوری پیشہ جماعت اور سوشلزم کی طرف سے

مجھ پر عاید ہوتے ہیں. میں ہمیشہ ہمیشہ انقلاب کا ایک جوانمرد سپاہی رہوں گا"

یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ جوش و خروش، یہ الفاظ اور جملے اور یہ کسی عارضی جذبہ اور ہیجان کا نتیجہ تھا، نہیں بلکہ یہ ایک منظم اور باضابطہ جماعت کا (جس کا نام "روٹ فرنٹ" ہے) باقاعدہ جلسہ تھا جس کی شرکت کے لئے تمام گرد و نواح کے ملکوں سے مزدور پیشہ جماعتیں آئی تھیں. یہ تیاریاں آئندہ کی ایک بڑی جنگ یا کسی بڑی جنگ کے خلاف آمادہ جنگ ہونے کا پتہ دے رہی ہیں۔

صرف اخبار نویس حضرات کیلئے

دہلی کا اخبار "ریاست" خاص اہتمام کے ساتھ ہندوستان کی اردو اخباری برادری کے ان اراکین کی زندگی کے حالات اور بلاک کی تصاویر ایک کتاب کی شکل میں شائع کرنے والا ہے جو فن صحافت کو فروغ دینے اور ترقی کے اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کے لئے قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

امید ہے کہ تمام اخبار نویس حضرات خواہ وہ کسی حیثیت میں کام کرتے ہوں اپنی زندگی کے حالات مع عکسی تصاویر زیادہ سے زیادہ فروری ۳۲ء کے اخیر تک دفتر ریاست میں بھیج کر مشکور فرمائیں گے۔

منیجر ریاست دہلی

کلام راسخ عظیم آبادی

نگراں کبھو نہ یہ جانب رُخ دلفریب پری رہی مری چشم تا نگہ پسیں تری محو جلوہ گری رہی

پس مرگ جسم نزار کا لہو خشک ہو گیا سب ولے وہی خون رہا دل خوں شدہ وہی چشم تر کی تری رہی

تمہیں گل کی جس نے بنایا یوں کہا اُس نے مجھکو صبا تو رہے تم تو پردہ نشیں سدا مجھے آہ در بدری رہی

مرے پاس جنس ہنر تو تھی ولے بود و باش تھی اپنی واں کہ متاع بیش بہا سدا جہاں جنس بے ہنری رہی

نہیں ہوش والوں پہ کچھ حسد مجھے رشک ہے تو انہوں پہ ہے جنہیں تیرے جلوے کے سامنے مری طرح بیخبری رہی

جگر اور دل سب ہی رکھتے تھے ولے ہو سکا نہ کوئی طرف ہدف اس کے ناوک ظلم کی مری طرح بیخبری رہی

یہ جواب ہے آخر عاشقی کبھو ہوش ہے کبھو رفتگی نہ وہ گریۂ دل شب رہا، نہ وہ زاری سحری رہی

مجھے سونپ داغ فراق وے ہوئے یوں جدا کہ نہ پھر ملے مرے دل میں تا دم واپسیں وہ امانت انکی دھری رہی

نہ تھی چشم راسخ خستہ دل کبھو خالی اشک سے دوستاں
شب و روز جام پر آب کی روش آنسوؤں سے بھری رہی

دیگر

وے ہنسے میں جو اشکبار ہوا گریہ کیا آب رو تبہ کار ہوا

جلوہ دل میں وفا شعار ہوا مسکن درد و داغ یار ہوا

میری چشم پر آب کی دولت ابر بے مایہ مایہ دار ہوا

دل کی قیمت شکستگی سے بڑھی قلب تھا کامل العیار ہوا

بے گنہ حسن شاہد رحمت اس لئے میں گناہگار ہوا

تم جو دامن کشاں یہاں سے گئے صبر کا جیب تار تار ہوا

عشق میں اس کے بے جو غیرت آہ شہر شہر اپنا اشتہار ہوا

دل پروانہ سے مرے تہ خاک — تو کہے موسم بہار ہوا
در ہی اس کے زلف کی دم ہے — جس سے آشفتہ روزگار ہوا
تیغ میں نے سراہی اس گل کی — پر وہ میرے گلے کا ہار ہوا
ہم گئے آپ سے دلے اُن کا — نہ کبھی اس طرف گزار ہوا
دور میں اُس کی مست آنکھوں کے — محتسب بھی شراب خوار ہوا

قطعہ

ضبط گریہ تھا فرمن عین دلے — ہم کو اس پر نہ اختیار ہوا
آنسو نکلے ہو گیا طوفان — تھا جو پردے میں آشکار ہوا
حشر دیدار کیا قیامت ہے — ق — وعدہ یہ وجہ اضطرار ہوا
ہائے پھر طول شوق تو دیکھو — میں ہیائے انتظار ہوا
واہ کیا شان ہے کریمی کی — ق — مورد رحم بار بار ہوا
آنے کیا کیا عمل میں منہیات — مصدر جرم بے شمار ہوا
قطع ہو بار امید عفو ہوئی — لیک پھر میں امیدوار ہوا
شوق صیاد کیا فزا دال تھا — ق — درپئے جان بے قرار ہوا
لے گیا عاقبت لگا کے مجھے — وجہ یہ تھی کہ میں شکار ہوا
جان تھی اے بے خبر امانت یار — ق — حیف وہ جو نہ ہوشیار ہوا
لوٹ تن سے رکھا نہ جس نے پاک — وقت تسلیم شرمسار ہوا

اب مصاحب ہیں یار کے راسخ
آخر ان کو یہ اقتدا ہوا

شذرات

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

کس قدر دلخراش اور جانکاہ تھی وہ خبر جو ۲۹ دسمبر کو ہندوستان کی فضا میں گشت کر رہی تھی "مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا انتقال ہو گیا"۔ پچھلے مہینے سارا ملک اس حادثہ فاجعہ پر ماتم کر رہا تھا لیکن مرحوم کے خاندان، دہلی کے باشندوں خصوصاً جامعہ ملیہ، اور طبیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے جذبات رنج والم کا بیان کرنا زبان و قلم کی طاقت سے باہر ہے۔

اسی شدت الم میں مرحوم کے خاندان والوں اور احباب خاص کو یہ فکر بھی تھی کہ جو قومی کام مرحوم کی ذات سے چل رہے تھے انکا کچھ انتظام کیا جائے۔ آپس کے مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ مرحوم کے مطب میں انکے جانشین جناب حکیم محمد احمد صاحب ہوں۔ طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ میں مرحوم کے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خانصاحب اپنے پدر بزرگوار کی جانشینی کریں اور جامعہ ملیہ کی امارت کے فرائض بالفعل ڈاکٹر انصاری صاحب انجام دیں۔

خدا کے فضل سے دواخانہ اور طبی کالج کی مالی حالت اچھی ہے۔ خطرہ اگر تھا تو جامعہ ملیہ کے لئے۔ لیکن الحمدللہ اس معاملہ میں غفلت نہیں کی گئی بلکہ ڈاکٹر انصاری صاحب نے اپنے قیام مدراس ہی کے زمانہ میں یہ اپیل شائع کر دیا کہ مسیح الملک مرحوم کی یادگار میں ایک فنڈ قائم کیا جائے جس کا مقصد جامعہ ملیہ کو مالی اعتبار سے مستحکم کرنا ہو۔ ایک بیان سری نواس آئنگر صاحب، پنڈت جواہر لال نہرو اور جمنالال بزاز صاحب کی طرف سے شائع ہوا کہ تمام ملک کو اس وقت جامعہ ملیہ کی مدد کرنا چاہیے۔ پھر حکیم جمیل خانصاحب نے دو خطوط شائع کئے جس میں حکیم صاحب مرحوم کے تمام

قدردانوں کو جامعہ کیطرف خاص طور سے توجہ دلائی۔ مولانا محمد علی نے متعدد دیر زور مضامین ہمدرد میں اس بحث پر لکھے اور جامع مسجد دہلی میں تقریریں کیں۔ اور مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا میں اپنی طرف سے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کی طرف سے لوگوں کو اس کار خیر میں شرکت کی درخواست کی۔ اُس وقت سے ابتک ملک کے ہر طبقہ سے تمام سربرآوردہ لوگوں کے خطوط اور تار آرہے ہیں کہ وہ بھی مسیح الملک میموریل فنڈ کی تحریک میں جو جامعہ کی امداد کے لئے شروع ہوئی ہے شرکت کرتے ہیں۔

لیکن اب تک جو کچھ ہوا یہ محض ابتدائی کارروائی تھی جو اس تحریک کی اشاعت کے لئے کی گئی۔ اب آغاز فروری سے مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری صاحب عبدالمجید خواجہ صاحب حکیم محمد جمیل خاں صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب۔ مسعود علی صاحب ندوی ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کریں گے اور انتہائی کوشش کریں گے کہ تین چار مہینے میں آٹھ لاکھ کی رقم جمع کرلیں جس کی درخواست کی گئی ہے۔ خدا ان حضرات کی ہمتوں میں برکت دے اور ہماری قوم کو توفیق دے کہ وہ حکیم صاحب مرحوم کی یادگار قائم کرنے میں دل کھولکر مدد دیں۔

پچھلے پرچہ میں جو مضمون روحانی کلام اور روحانی عمل کے عنوان سے چھپا ہے وہ اصل میں راجیندرن صاحب کا ہے جن کا ہم ناظرین جامعہ سے تعارف کرا چکے ہیں۔ غلطی سے انکا نام رہ گیا اور صرف عبدالقادر صاحب کا نام چھپا جنہوں نے اس مضمون کا ترجمہ کیا ہے۔

اردو اکاڈمی کی ممبری کی جو درخواست ہم نے گزشتہ ماہ کی تھی وہ بحمداللہ قبول کیجا رہی ہے اور اس وقت تک ۲۰ ممبر ہو چکے ہیں۔ ان حضرات کو اس مہینہ سے رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم بھیجا جائے گا۔ اور انشاءاللہ آخر فروری تک اس سلسلہ کی پہلی کتاب "عربوں کا تمدن" ان کی خدمت

میں پہونچ جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ آخر ماہ تک اور بہت سے حضرات اکادمی کی ممبری قبول فرمائیں گے۔

گجرات ودیاپیٹھ احمد آباد کا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد شروع جنوری میں منعقد ہوا اور پادری اینڈریوز صاحب نے اس کی صدارت فرمائی۔ پادری صاحب کا خطبہ تقریباً اول سے آخر تک مسیح الملک مرحوم کا دردناک مرثیہ تھا۔ پادری صاحب نے نہایت موثر الفاظ میں مرحوم کی محترم اور جامع کمالات شخصیت کی تصویر کھینچی اور انکے خلوص، انکی ہمدردی، سادگی خوش اخلاقی اور دینداری کے سیدھے سادے دلنشیں الفاظ میں کماحقہ تعریف کی۔ اسی سلسلہ میں پادری صاحب نے جامعہ ملیہ کا بھی ذکر کیا اور اسے حکیم صاحب کے کاموں میں سب سے مفید اور اہم کام بتایا۔

مہاتما گاندھی نے بھی بحیثیت چانسلر اس جلسہ میں تقریر فرمائی جس میں ودیاپیٹھ کے طلبہ کی کمی تعداد کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ مجھے اس سے مطلق مایوسی نہیں ہے۔ اگر تم میں خلوص اور سچائی موجود ہے تو تعداد کی کمی ہرگز وجہ شکایت نہیں۔

ہمیں مہاتما جی کی رائے سے اتفاق ہے لیکن ہمارے خیال میں اگر گجرات کی تعلیمگاہ جامعہ ملیہ کی تقلید میں یونیورسٹی کی عمارت کے اندر ایک اسکول بھی کھول لے تو زیادہ مفید کام کر سکے گی اور چند سال کے بعد اسی اسکول سے کالج کے لئے بھی طلبہ مل سکیں گے۔ قومی تعلیم کی جتنی ضرورت یونیورسٹی کے لئے ہے اُس سے زیادہ اسکول کے طلبہ کے لئے ہے ہمیں امید ہے کہ ودیاپیٹھ کے کارکن اس پر غور کریں گے۔

مسیح الملک مرحوم کے انتقال کی خبر سن کر جہاں لوگوں نے اُنکے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خاں صاحب کے پاس تعزیت کے پیام ارسال کئے وہاں بہت سے حضرات نے جامعہ ملیہ

میں بھی اظہار الم و ہمدردی کے لئے خطوط اور تار بھیجے۔ ہم ان سب حضرات کے دل سے شکرگزار ہیں کہ انہوں نے اس سخت مصیبت میں ہمیں تسکین دی اور ہماری دستگیری کا وعدہ کیا۔ تعزیت سے اہل ماتم کا غم دور تو نہیں ہو سکتا لیکن بہت کچھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

اعلان

جنوری ۲۶ء

جامعہ ملیہ کا "شعبہ تصنیف و تالیف" جدید انتظام کے بعد "اردو اکادمی" کہلاتا ہے "اکادمی" کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کر شائع کرے۔ اب تک یورپ کی مختلف زبانوں سے بہترین کتابوں کے چند تراجم اور متعدد اور نجیل تصانیف شائع ہو چکی ہیں، آیندہ کے لئے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ کم سے کم چھوٹی کتابیں ہر سال لکھی جائیں "اکادمی" نے اپنے قدر دانوں کی آسانی اور اپنے فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ جو حضرات للعہ ۲۴ روپیہ سال اکادمی کو عطا فرمائیں وہ اس کے رکن قرار دئے جائیں اور انکی خدمت میں رسالہ "جامعہ" اور "اکادمی" کی سال بھر کی جملہ مطبوعات نذر کے طور پر پیش کیجائیں۔

زرچندہ کی وصولی کا یہ طریقہ ہے کہ ہر سہ ماہی کے شروع میں للعہ کا وی پی بھیجا جائے گا اور اُسکے وصول ہونے پر رکن کے نام رسالہ "جامعہ" ماہوار بھیجا جائے گا اور "اکادمی" کی جو کتاب تیار ہوگی وہ فوراً روانہ کی جائے گی، اگر کسی سہ ماہی میں وی پی نہ کیا گیا اور واپسی کے بعد پندرہ دن کے اندر زرچندہ منی آڈر سے نہ پہنچا تو مجبوراً رسالہ جامعہ اور کتابوں کی روانگی بند کر دی جائیگی۔

اسکا خیال رکھا جائے گا کہ رسالہ جامعہ اور سال بھر کی مطبوعات کی مجموعی قیمت للعہ ۲۴ سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ پندرہ روزہ رسالہ "پیام تعلیم" جس کی سالانہ قیمت عہر ہے تحفۃً ہر رکن کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ جو صاحب ان شرائط پر "اکادمی" کا ممبر بننا منظور فرمائیں وہ اپنا نام معہ پورے پتہ کے مندرجۂ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ناظم اردو اکادمی۔ جامعہ ملیہ۔ قرولباغ۔ دہلی

المعلن

احمد الیاس مجیبی

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی

جلد ۱ | بابتہ ماہ رمضان ۱۳۴۶ھ مطابق فروری ۱۹۲۸ع | نمبر ۲

فہرست مضامین

اجمل خاں

اُس عظیم الشان انسان کی زندگی، جس کو قضائے الٰہی نے دنیائے بے ثبات کی کشمکش اور زندگی کی تمام کاوشوں سے آزاد کر کے آغوشِ رحمت کی سپرد کر دیا صرف تین لفظوں میں بیان ہو سکتی ہے:-

محبت، خدمت، استقامت

جس روح نے اس کالبدِ خاکی میں ۶۲ برس اپنے وجودِ اعلیٰ کو دنیا کی گندگی سے پاک رکھا اور کبھی ان مادی محسوسات سے آلودہ نہ ہونے دیا جو ایک معمولی انسان کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، اُس روح کی ساری رودادِ زندگی ان تین لفظوں میں محفوظ ہے۔

میں اجمل خاں کا عقیدتمند، نیازکیش تھا، میں اُنکی پاکیزہ صحبتوں
اجمل خاں کے اُس لازوال تبسم کا ایک درمِ ناخریدہ تھا جس تبسم کے اندر
کو جھلکتے دیکھا ہے، ۱۶ برس تک اُس اعلیٰ اور ارفع انسانیت کی ہر ادا میں
کو حیاتِ حقیقی کے سبق پڑھاتی رہی۔ ۱۶ برس تک بعض اوقات شب و روز، دنوں اور ہفتوں مسلسل، اُس صحبت کے مزے لوٹے، سفر میں اور حضر میں، خلوت میں اور جلوت میں، شریف منزل کی ان صحبتوں میں جہاں کبھی کبھی انکے خاص احباب جمع ہو جایا کرتے تھے، اور ان محفلوں میں جہاں سیاسی اور قومی مسائل کے ہنگامے برپا ہوتے تھے۔ والیانِ ریاست کے درباروں میں، ہندوستان کے دور دراز مقامات پر، اور یورپ اور ممالکِ غیر کی اجنبی فضا میں، اجمل خاں بجائے خود ایک شمعِ محفل ہو جاتے تھے۔ اُن کی شخصیت، اپنی تمامتر جاذبیت اور سنجیدگی کے ساتھ، ہر محفل میں

نظر انداز کر خیال ہوا کرتی تھی سا۔ اس شمع اجمل خاں میں کیا تھا جواب نہیں ہے اور جو کچھ تھا وہ کہاں گم ہو گیا!

وہ فدا سا دل، ناتواں اور داغدار، جس کی حرکت ۲۸ اور ۲۹ دسمبر سنہ ۲۷ء کی درمیانی شب میں بند ہو گئی، محبت و اخلاص کا ایک موجزن سمندر تھا، جو کوئی اس کے ساحل تک پہنچا، کبھی ناکام نہ آیا۔ اجمل خاں کے دل کی وسعت وہی جان سکتا ہے جس نے انکی دلفریب صحبتوں میں اس دلنواز شخصیت کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا ہو۔ ۱۶ برس کے عہد نیازمندی میں کبھی ایک دفعہ بھی میں نے انکو اپنے کسی مخالف یا دشمن کے لئے کڑی بات کہتے نہ سنا، ہزار بار ایسا ہوا ہے کہ میں نے اور میری طرح دوسرے احباب نے بعض اشخاص کا تذکرہ کیا جن کی بدزبانی سر بازار انکو ہدف بناتی تھی، لیکن اجمل خاں کے پاس دشمنوں کی دشمنی کا صرف ایک ہی جواب تھا، یعنی مسکرا کر خاموش ہو جانا۔ زیادہ سے زیادہ سخت بات جو میں نے کسی شخص کے متعلق کبھی انکی زبانی سنی وہ صرف یہ ہوا کرتی تھی کہ "حکیمی صاحب! زید کچھ اچھا آدمی نہیں ہے"! کتنے انسان ہیں جو اس اولوالعزمی کے ساتھ دوسروں کی کمزوریوں کو نظر انداز کر سکتے ہوں۔ اُس دل میں محبت کے سوا کچھ نہ تھا، خاص احباب کا تو ذکر ہی کیا ہے غیر بھی انکے دل کے کسی نہ کسی گوشہ میں جگہ پا لیتے تھے، اور پھر وہ جگہ انکے لئے ہمیشہ محفوظ رہتی تھی، غریب اور امیر، بڑے اور چھوٹے، برے اور اچھے سب اُس گھر میں محبت کا سایہ پاتے تھے اور وہ ایک فیض عام تھا کہ جاری تھا۔

خدمت۔ اجمل خاں کی ساری زندگی کا کارکن جذبہ تھا، وہ اتنا اعلیٰ تھا، اتنا استوار تھا، اتنا عام تھا، کہ انکا آخری سانس بھی خدمت خلق میں گزر گیا، شخصی زندگی میں، خاندانی زندگی میں، طب میں، سیاسیات میں، معاشرت میں وہی ایک جذبۂ خدمت ہمہ وقت کارفرما تھا، ساری کاروبار زندگی کا سرِ رشتہ کار وہی ایک جذبۂ اعلیٰ تھا جس نے اجمل خاں کو لاکھوں دلوں کا حاکم اور لاکھوں گھروں کا چراغ بنا دیا تھا۔ تین سو برس تک جس خاندان نے طب کے ذریعہ سے ہندوستان

میں اور وہ اسے ہندوستان مخلوقِ خدا کی خدمت کرتی تھی اُس خاندان کے نام نیک کو اجمل خاں صاحب
کی وسعت سے بہت آگے اور اس فنِ شریف کی بلندیوں سے بلندتر رہے گئے۔ اُنکا جذبۂ خدمت وسیع
تر میدان مانگتا تھا، بلند تر فضا ڈھونڈتا تھا۔ بہت کم با اقبال ایسے ہیں جو اپنی پبلک زندگی کے شباب
میں، انحطاط کا وقت آنے سے پہلے میدانِ معرکہ کارزار میں کمر باندھے ہوئے گزر جائیں اور زندگی
کی پستی کا ایک قدم بھی انکو اٹھانا نہ پڑے۔ کارسازِ حقیقی اُنکا ایسا کارساز تھا جس نے اُنکے نفس
آخر تک وہی ایک کام اُن سے لیا جو دنیا کے بڑے سے بڑے اشخاص کا تمغۂ امتیاز اور مایۂ فخر
ہوتا ہے۔ وہ ایک غلام، مجبور، اور پست قوم کی تباہیوں میں پیدا ہوئے، ہاں، قدرت کا یہ ایک
غیر معمولی کرشمہ تھا کہ اس عام پستی کی حالت میں بھی آپکی فطرت اس قدر بلند اور اس قدر آزاد رہی۔
کاروبارِ قدرت میں کوئی انسان دم نہیں مار سکتا، لیکن اجمل خاں کو تو کسی زندہ قوم میں پیدا
ہونا چاہئے تھا! گذشتہ دسمبر میں جب امیر افغانستان کی تشریف آوری کے سلسلہ میں وہ بمبئی
تشریف لے گئے تھے تو بسترِ علالت سے اٹھ کر ایسی حالت میں روانہ ہوئے تھے، کہ اُنکے لئے معمولی نقل و
حرکت بھی تکلیف دہ تھی۔ میں نے کتنی دفعہ عرض کیا کہ اس حالت میں بمبئی کا طویل سفر کسی طرح مناسب
نہیں، پہلے تو خاموش رہے پھر فرمایا کہ "مجھے جامعہ کے لئے روپے کی فکر ہے، بغیر بمبئی گئے انتظام
ہونا ممکن نہیں" وہاں سے واپس ہو کر جب رامپور تشریف لائے تو پانچ روز سے غذا برائے نام
رہ گئی تھی، میں نے عرض کیا کہ کچھ روز رامپور میں قیام کیجئے، دلی کی مصروفیت ایسی حالت میں ناقابل
برداشت ہوگی، لیکن اُنکی حالت تو یہ تھی کہ ایک لمحہ بیکار نہیں گزار سکتے تھے، کام اُنکے لئے نفس
حیات تھا۔ رامپور میں کبھی ہز ہائنس سے اپنی علالت کا ذکر نہ فرماتے تھے اور تمام احباب کو
ہدایت ہوتی تھی کہ ہز ہائنس تک اُنکی سوءِ مزاجی کی خبر نہ جانے پائے، وہ خوب جانتے تھے کہ ایسی
حالت میں ہز ہائنس کی محبت کا لازمی تقاضہ یہ ہوگا کہ وہ رامپور میں روکے جائیں اور یہ انکو گوارا
نہ تھا، انکو گوارا نہ تھا کہ وہ اپنے مرکزِ عمل سے دور رہیں۔

یوں تو کبھی پیشانی پر شکن نمودار نہ ہوتی تھی لیکن اہلِ غرض کے لئے تو ہر وقت اُنکے گھر

کا اور دل کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ بارہا میں نے عرض کیا کہ اپنے مشاغل میں فرصت و آرام
کا بھی کوئی وقت نکالئے، جب فرمایا تو یہی فرمایا کہ "قاضی صاحب! میں کیسے کسی کو منع کر دوں"
خدمت خلق کے اس ذوق و دوام کے ساتھ شان استغنا یہ تھی کہ کبھی اپنے کسی عزیز دوست کو تکلیف
نہ دے سکتے تھے کبھی یہ گوارا نہ تھا کہ انکا کوئی عقیدتمند چند ساعت انکی کوئی خدمت کر سکے وہ دوسروں
کی خدمت کر کے مسرور ہوا ور انکی وجہ سے کوئی دوسرا تکلیف اٹھائے تو آزردہ ہوتے تھے۔ آپکا
وجود دنیا میں محض خدمت کے لئے تھا، بستر مرگ پر بھی انہوں نے اپنے کسی خادم یا دوست کو اس
کا موقع نہیں دیا کہ کوئی چند منٹ انکی خدمت کر لیتا جس شان سے دنیا میں زندہ رہے اسی شان
سے سدھار گئے۔ انکی زندگی کا سارا سفر جس طرح باعزم و وقار گزرا اسی طرح اس دنیائے ناپائدار
میں انکے آخری لمحے بھی انتہائی خودداری کے ساتھ (جو ہمیشہ نخوت سے پاک رہی) گزرے انہوں
نے احسان کئے، احسان لئے نہیں۔ اس خراب آباد عالم سے وہ ہنستے بولتے گزر گئے اور لاکھوں
کو روتا چھوڑ گئے۔

آں طبیبے کہ شفا یافت جہاں از نفسش
حال درد شب ہجراں کہ رساند ز لبش (شیدا)

استقامت۔ اجمل خاں کی تصویر حیات کا ایک فولادی فریم تھا۔ انکی فطرت کے لاکھوں لطیف
و نازک خط و خال اس فریم میں اہل بصیرت کے لئے زیب نظر تھے۔ وہ کوہ وقار انسان جس کا نام
اجمل خاں تھا اپنی زندگی کے اصولوں کا ایک سورما تھا۔ اجمل خاں کے اصولوں کی چٹان پر ہزارہا
خودغرض اشخاص کی کشتیاں ٹکرا ٹکرا کر غرق ہو جایا کرتی تھیں۔ عمر کا ایک بڑا حصہ انہوں نے اپنے
فن کی خدمت میں صرف کیا، آج طبیہ کالج اور دواخانہ یونانی اس عالی حوصلہ انسان کے عزم و
استقامت کا ایک ادنیٰ نمونہ ہیں۔ جو طب صدیوں سے حالت انحطاط میں تھی، جو طب دنیا کے ترقی یافتہ
علوم سے محروم اور اجنبی تھی، اس کو ایک بلند تر سطح پر لانے اور اس کام میں قدامت پسندوں

کی اقوام سینہ بسینہ کا مقابلہ کرنے میں مسیح الملک کو کتنی قربانیاں کرنی پڑی ہونگی کتنے مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا ہوگا! یہی نہیں بلکہ جب انہوں نے اپنے خاندان کے تمام علم سینہ کو عامتہ الناس کی ملکیت بنا دیا اور خاندانی نسخوں کو راز میں رکھنا اپنے لئے حرام کر لیا تو بلاشبہ انہوں نے ایک ایسی قربانی کی جس کی ہمت بڑے بڑوں کو کبھی نہ ہو سکی۔ انکی اس قربانی کا مظہر دواخانہ یونانی ہے جو آج خاندان شریفی کی تمام علمی جواہر کا مالک ہے۔ پھر جب انکی فطرت عالی نے اپنے لئے ایک وسیع تر میدان عمل مانگا تو وہ سیاسیات کی طرف متوجہ ہوئے اور اس عزم و قوت کیساتھ متوجہ ہوئے کہ اپنی بقیہ زندگی معہ اُن تمام آسائشوں اور راحتوں کے جو انکو میسر تھیں یک قلم قربان کر دی۔ وہ امراء اور رؤسا کی محفل سے اٹھکر، فرش خاک پر آ بیٹھے۔ میں نے اُن اجمل خاں کو بھی دیکھا تھا جو سیاسیات کے گزشتہ ہنگامہ عظیم سے پہلے۔ ایک عالی شان طبیب ایک اولوالعزم رئیس، اور ایک بلند مقام شخص تھے، اور پھر میں نے اُن کھدر پوش اجمل خاں کو دیکھا جن کی صبح اور شام کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ انکی زندگی کی صبح مسند پر ہوئی اور اس کی شام فقیر کے بوریے پر! یہ انقلاب عظیم محض سیاست و معاشرت کا انقلاب تھا۔ انسانیت کا جوہر تو وہی تھا جو خدا کا دیا لیکر وہ دنیا میں آئے تھے اور اپنے ساتھ قبر کے کونے میں لے گئے۔ انکی فطرت عالی کبھی زربفت اور کھدر کے اختلاف سے متاثر نہ ہو سکتی تھی۔ خدا نے جو کچھ انکو عطا کیا تھا وہ بہت عطا کیا تھا۔ اُن کے لئے عطائے الٰہی مقدار میں محدود نہ تھی۔ دولت بہت کمائی اور بہت صرف کی، عزت بہت حاصل کی اور آخر وقت تک اس کو محفوظ رکھا، محبت دوسروں سے اپنے لئے حاصل کی اور بے اندازہ حاصل کی، اسی طرح اپنے دل کی محبت دوسروں کو بخشی اور بے اندازہ بخشی! جذبۂ قومی انکو سیاسیات کی قربانگاہ پر لایا تو کچھ نہ تھا جو انہوں نے قربان نہ کر ڈالا ہو۔ یہ فقیر منش انسان اپنے دل کی سلطنت میں کتنا بڑا شہنشاہ تھا! اللہ! اللہ!!

---

(۱) اجمل خاں کی سیاست فی نفسہ بالکل تعمیری تھی، تخریبی نہ تھی، انکی فطرت ان کو ہر چیز کے

تعمیری پہلو کی طرف لیجاتی تھی۔ تخریب کا پہلو کتنا ہی اہم اور ناگزیر کیوں نہ ہو مگر تعمیری جذبہ
کا آخری اور محبوب ترین ثمر جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جس کے لئے انہوں نے اپنے آخری زمانہ میں
بہت سی کٹھن منزلیں طے کیں۔ جامعہ درحقیقت اجمل خاں کی اُن فطری خصوصیات کا ایک عجیب و
غریب مرکب ہے، یعنی محبت، خدمت اور استقامت۔ جب علیگڈھ میں دن اور رات پورانے کالج
اور نوخیز جامعہ کی کشمکش ہو رہی تھی، اُس وقت بھی، میرے ذاتی علم و یقین میں، اجمل خاں ایک ہی
اصول پر جمے ہوئے تھے اور وہ صرف یہ تھا کہ قومی تعلیم کا ایک نیا اور کامیاب مطمح نظر، جامعہ کے
قالب میں دنیا کے سامنے رکھا جائے، اُنکے خیال میں جامعہ کو سیاسی کشمکش میں ڈالدینا ایک سخت
غلطی تھی، وہ جامعہ کے بنیادی اصول کو ہمہ وقت پیش نظر رکھتے تھے اور دل سے چاہتے تھے
کہ خالص قومی تعلیم کا مرکز بناکر جامعہ کو سیاسی حوادث سے محفوظ کردیا جائے۔ وہ صحبتیں مجھے یاد
ہیں جب عبدالمجید خواجہ صاحب کے مکان پر اس مسئلہ کے متعلق اُن سے اور دوسرے اکابرین
قوم سے اختلاف رائے ہوتا تھا اور سیاسی فضا کی اُس گرمی میں اُنکو اپنے ہم خیال دو تین آدمی بھی
نہ ملتے تھے، پھر وہ وقت آیا کہ علیگڈھ میں جامعہ ایک مریض جاں بہ لب تھا اور اسکا یہ مسیح نفس
تیماردار اُس مایوسی کی حالت میں بیمار کو اپنے گھر لے آیا۔ وہ ایک خالص قومی محبت تھی، وہ
ایک جذبۂ بے اختیار تھا جس نے اجمل خاں کو مجبور کیا کہ تمام سیاسی مصلحتوں، اس کام کی
تمام ذمہ داریوں اور دشواریوں، اور اپنی خرابیٔ صحت سے قطع نظر کرکے وہ گرتی ہوئی دیوار
کی اینٹوں کو چُن کر علیگڈھ سے دہلی لائیں، یہ اُنکا عظیم الشان جذبۂ قومی تھا کہ انہوں نے جامعہ
کو جس کا سہارا وہ تھے، خود اپنی زندگی کا سہارا بنالیا، دنیا بھر کے تردد ات، سارے جہان کی
فکریں، لاکھوں مشاغل، یہ سب ایک طرف رہے اور جامعہ کا تخیل دوسری طرف! ترازو کا یہی پلہ
ہمیشہ بھاری رہتا تھا! مجھ سے کئی دفعہ فرمایا کہ "کاش! میں دو برس اور زندہ رہ سکوں،
جامعہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے، پھر مجھے کوئی فکر نہ ہوگی!" لیکن چراغ میں تیل ختم ہوچکا تھا
اس کو تو گل ہونا ہی تھا، جامعہ کو اب صرف خدا کے سہارے پر زندہ رہنا ہے، وہ صدا ایک

بعد اپنی محبت، خدمت، استقامت کے لازوال نقوش جامعہ کے در و دیوار پر چھوڑ گئے
جن کو جامعہ کی موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے چراغ ہدایت ہونا چاہئے۔

برزمینے کہ نشان کف پائے تو بود — سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

(اجمل خاں کے استقامت اور عزم کی اعلیٰ ترین تصویر جامعہ ملیہ ہے) اس باب میں اُنکے مخصوص احباب تک ان کی اس ہمت پر حیران تھے۔ میں تو کبھی کبھی تنگ آکر عرض کرتا تھا کہ "حکیم صاحب! اب خاک ڈالئے، کچھ نہ ہوگا۔ کہاں تک بھیک مانگئے گا"۔ یہ سنکر مسکرا دیا کرتے تھے، اور شاید دل میں میری کم ہمتی پر ہنسا کرتے ہونگے۔ انکا عزم راسخ ہم جیسے کتنوں کو شرما دیا کرتا تھا، شاید ہم ہی جیسوں کے لئے انہوں نے فرمایا تھا کہ:

توشیریں کار باش و باز نگر سر فروشے را
کہ من در زیر دلق خود قبائے کوہکن دارم (شیدا)

میں تو کچھ ایسا مایوس اور افسردہ ہوں کہ حرف تمنا کا تو ذکر ہی کیا ہے ایک نفس سرد بھی نہیں نکلتا۔ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جامعہ کا حشر کیا ہوگا، لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جامعہ کے متعلق اجمل خاں کے شیدائیوں کا فرض جو کچھ ہے وہ بالکل واضح ہے۔ ساری عمر اجمل خاں نے کسی سے اپنی خدمتوں کی قیمت اور داد نہیں چاہی، اپنی قربانیوں کا معاوضہ نہیں مانگا، آج اُن کی رحلت کے بعد کم از کم اُنکے مخصوص نیاز مندوں کو اُس شہید کے خون میں اپنا خون ملا دینا ہے، یوں تو اہل بصیرت کے لئے ہر قدم پر اجمل خاں کا نشان موجود ہے (لاکھوں داستانیں ہیں جو لکھی جائیں گی، پڑھی جائیں گی اور سنی جائیں گی، لاکھوں قصے ہیں جو بیان ہوں گے، مگر اُن کی زندگی کی آخری داستان جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے) اب اجمل خاں کی یادگار قائم کرنے کا سوال کیسا؟ یہ بحث کیسی کہ یادگار قائم ہو، کہاں قائم ہو، اور کیا قائم ہو۔ اجمل خاں کے چاہنے والوں کے لئے ان کی یہ یادگاریں کیا کم ہیں۔ ایک جامعہ جو اُن کی محبت کا

کلام صانع

ہم مصیبت کشتوں پہ کیوں شب غم بھرے   گو زمانے کو [illegible]

تم جو پردیس میں بسے گل کی طرح   ہم ہیں بلبل مد [illegible]

آپ سے ہو گئے ہیں بیگانے   جن سے تک آشنا ہے عالم

کہ ہر کعبہ کہاں کا عرش اعظم   دل شکستہ ہے کاشانہ تیرا

ایک تیری نگاہ آشنا نے   سب سے بیگانہ کر دیا ہے

جگہ تجھ سے میرے دل کی قیمت   یہ شیشہ مگر بہت [illegible]

دانیالی بشارتیں

سنین محمدؐ

(۲)

حضرت دانیالؑ نے آنحضرت صلعم کے ظہور کا سن اور سال تک بتادیا ہے لیکن آیتوں کو سمجھنے کے لیے ضرور ہے کہ ہم بخت نصر کی حکومت کا پہلا سال متعین کرلیں کہ وہ سن مسیحی اور سن ہجری سے کس قدر قبل تھا۔ ہمارے مسیحی احباب ۶۰۶ء یا ۶۰۵ء ق م بتاتے ہیں۔

زمانہ مابین بخت نصر و خسرو بہمن

بخت نصر کے پہلے سال اور خورس کے پہلے سال کے درمیان مسیحی علمائے دین اور مورخین صرف ۷۰ برس کا زمانہ فرض کرتے ہیں، حالانکہ خورس کے پہلے سال سے ۲۰۰ یا ۲۱۰ برس پہلے سلہ جلوس بخت نصر تھا۔

مسیحی غلطی کے اسباب مسیحی علما اور مورخین کو دھوکا ہوا، وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ تواریخ کے آخر میں اور عزرا کے شروع میں مذکور ہے کہ یہودی قوم بابل میں اس وقت تک غلام رہی جب تک یرمیاہ کی پیش گوئی کے ۷۰ برس گزر نہ گئے لیکن اسکا مطلب صرف یہ ہے کہ ۷۰ برس جب پورے ہولئے تو اسکے بعد واپسی کی اجازت ملی۔

ایک فرشتہ نے سلہ جلوس دارا میں فرمایا کہ "اے رب الافواج تو کب تک یروشلم اور یہوداہ کے شہروں پر رحم نہ کھائے گا جن پر تو ۷۰ برس سے غضب نازل کرتا ہے" (زکریا ۱: ۱۲) اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ بابل میں یرمیاہ کے موعودہ ۷۰ برس گزر جانے کے بعد بھی مصیبت کے برسوں کو انہیں ۷۰ برسوں میں شمار کر دیا گیا ہے۔

یرمیاہ نے بابل میں ۷۰ برس کی پیش گوئی کی تھی (یرمیاہ باب ۲۵ میں مذکور ہیں) ۷۰ برس بابل میں غلام رہنے کی میعاد انہوں نے مقرر کی تھی، اس کے بعد بابل کی تباہی کا وعدہ تھا۔ حزقی ایل کے بیان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کے لئے تباہی کی مدت خدا نے ۴۰ سال اور ۳۹۰ سال کل ۴۳۰ برس مقرر کی تھی (حزقی ایل باب ۴)

مسیحی غلطی کے دلائل

عزرا کا بیان ہے کہ "جب خورس کے پہلے سال میں بنی اسرائیل کے قبائل واپس آئے تو بنی حبایاہ، بنی ہقوص اور بنی برزلی وغیرہ قبائل اپنا نسب نامہ پیش نہ کر سکے اس لئے وہ ناپاک گنے گئے کہانت سے خارج کیے گئے" (عزرا ۲: ۶۱) کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نہیں متعدد قبیلے صرف ۷۰ برس کے اندر اپنا پورا نسب نامہ بھول جائیں؟ خصوصاً ایسی قوم جس کے بزرگوں کو سو سو، دو دو سو برس کی عمر کا بتایا جاتا ہے۔

یورپین مفروضہ کے خلاف ایک بات یہ بھی ہے کہ سنہ ۱ جلوس خورس میں زروبابل بن شالتی ایل ایک شخص نظر آتا ہے، جو ہزاروں کی گنتی میں بنی اسرائیل کو اپنی قیادت میں لیکر یروشلم میں آیا اور تعمیر ہیکل کا کام شروع کیا (عزرا باب دوم) یہ شخص بنی اسرائیل کا ناظم تھا (حجی ۱) اس لئے اس کی عمر سنہ ۱ خورس میں کم از کم ۳۰ - ۳۲ برس کی ہوگی، اس نے تعمیر کے لئے جن نوجوانوں کو مقرر کیا انمیں سے کسی کی عمر ۲۰ برس سے کم نہ تھی (عزرا ۳: ۸) اسی سے اندازہ کر سکتے ہو کہ اس وقت اس کی عمر کیا ہوگی۔

یہ شخص یکونیاہ سے گرفتاری کے ایام میں پیدا ہوا (متی ۱: ۱۲) اور سنہ یا سنہ میں گرفتار ہوا، جسے ہم یروشلم پر بخت نصر کے قبضہ کا آٹھواں یا نواں سال کہہ سکتے ہیں اسکے بعد پورے ۳۷ برس جیل میں رہا، ۳۷ ویں برس کے ختم ہونے کو ۵ دن باقی تھے جب یہ جیل سے نکلا (یرمیاہ ۵۲: ۳۱) اس بنا پر یہ قطعی ہے کہ سنہ یا سنہ قبضہ بخت نصر اس کے جیل سے نکلنے کا سال ہے۔ اپنی گرفتاری کے وقت وہ آٹھ برس کا تھا (تواریخ)

غرض [illegible] اس سے [illegible] کا [illegible]

کہ [illegible] بخت نصر سے پہلے [illegible] کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔

پھر [illegible] خورس [illegible] بخت نصر [illegible] تھا تو اس سال یکونیاہ کی عمر کسی طرح ۱۸ برس سے زیادہ

نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ۲ تواریخ کے مصنف اور متی کے متفقہ بیان سے ظاہر ہے کہ یکونیاہ کی پیدائش

[illegible] میں [illegible] جب یروشلم بخت نصر کی حکومت قائم ہوئی۔

[illegible] قبضہ بخت نصر میں اس کے بڑے سے بڑے فرزند کی عمر زیادہ سے زیادہ ۲۴ برس

کی ہوگی کیونکہ یہ قطعی ہے کہ [illegible] سے پہلے اس کی کوئی اولاد پیدا نہ ہو سکی۔

اب آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ اگر بخت نصر اور خورس کے سنین جلوس کے درمیان صرف

۰۰ برس کا فرق تھا تو آیا یہ ممکن بھی ہے زروبابل بن شیالتی ایل جو یکونیاہ کا پوتا یا پڑپوتا تھا [illegible]

قبضہ بخت نصر میں منصہ وجود پر آچکا ہو۔

بخت نصر کے پہلے سال خورس تک کا تخمینی زمانہ

زروبابل کو متی، عزرا، زکریا، حجی، اور لوقا متفقہ طور پر زروبابل بن شیالتی ایل

کہتے ہیں، اس سے تو یہ صاف ظاہر ہے کہ شیالتی ایل زروبابل کے آباء میں تھا، مگر ابھی یہ

طے کرنا باقی ہے کہ شیالتی ایل اسکا حقیقی باپ تھا، یا جس طرح متی نے یکونیاہ کے دادا یوشیاہ

کو اسکا باپ لکھدیا ہے (متی ۱ : ۱۰) اسی طرح شیالتی ایل بھی زروبابل کا دادا تھا، عرب اور یہود

دونوں کا طریقہ ہے کہ اکثر ابن کا لفظ دادا کی طرف بھی مضاف کر دیتے ہیں۔

(۱ تواریخ ۳ : ۱۹) زروبابل کو فدایاہ میں شمار کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ شیالتی ایل

اور فدایاہ دونوں زروبابل کے آباء میں داخل تھے۔

(۱ تواریخ ۳ : ۱۷) کی عبارت یوں ہے " اور بنی یکونیاہ، اسیر اسکا بیٹا شیالتی ایل

اور ملکرام اور فدایاہ،، اس آیت سے صاف واضح ہے کہ شیالتی ایل براہ راست یکونیاہ کا بیٹا نہیں

بلکہ اسیر کا بیٹا ہے۔

اس موقع پر فدایاہ شیالتی ایل کا بھائی معلوم ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ اس جگہ
قبائل کا تذکرہ ہو رہا ہے، خود فدایاہ تو شیالتی ایل کا فرزند تھا، لیکن اس کی نسل سے جو
قبیلہ پیدا ہوا وہ اتنا بڑا ہوا کہ ایک الگ قبیلہ قرار دیا گیا۔

اسیر بھی براہ راست یکونیاہ کا فرزند نہ تھا کیونکہ یکونیاہ کا بیٹا تو صدقیاہ تھا چنانچہ ۱ تواریخ
۳: ۱۶ میں صاف لکھا ہے۔

" اور یہویقیم کا بیٹا یکونیاہ اسکا بیٹا صدقیاہ "

اس موقع پر ۱۹۶۰ء کی چھپی بائبل میں صدقیاہ پر حاشیہ دیکر یہ لکھا ہے کہ "یہ اس کا چچا تھا، لیکن
چونکہ اسکا قائم مقام ہوا اس لئے اسکا بیٹا ٹھہرا " یہ حاشیہ پادری صاحبان کی جدت ہے، کیونکہ
یکونیاہ کے چچا صدقیاہ کا ذکر تو (۳: ۱۵) میں خود ہی آچکا ہے اس لئے یہ صدقیاہ یقیناً
بادشاہ صدقیاہ کے بھتیجے کا لڑکا ہے، پادری صاحبان غالباً یہ خیال کرنا مناسب نہ سمجھے کہ سامی
قوموں میں دادا اور پوتے اکثر ہم نام ہوا کئے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ زروبابل کا پورا نسب نامہ یوں ہے

" زروبابل بن فدایاہ، بن شیالتی ایل بن اسیر، بن صدقیاہ، بن یکونیاہ۔

یکونیاہ کا سال پیدائش (متی ۱: ۱۱) کی رو سے گرفتاری کے ایام میں داخل ہے یکونیاہ
جب تخت پر بیٹھا تو وہ صرف ۸ برس کا تھا (۲ تواریخ ۳۶: ۹) لیکن (۲ سلاطین ۲۴: ۸) میں اس
وقت اسکی عمر اٹھارہ برس بتائی گئی ہے، متی اور ۲ تواریخ کے متفقہ بیان کے مقابلہ میں اس
بیان کی وقعت نہیں نسخوں کی غلطی نے ۸ کو ۱۸ کر دیا۔

یکونیاہ سے نیچے کی پانچ پشتوں کی پیدائش کے لئے کسی طرح صرف ۲۵ برس کافی نہیں ہو سکتے ان
کی پیدائش کے لئے کم و بیش ۲۰۰ برس کا زمانہ درکار رہتا ہے۔

صحیح زمانہ

حضرت دانیال کی کتاب میں دو خورس کا تذکرہ ہے، ایک خورس تو وہ ہے جس کا

حضرت پہلا سال انہوں نے پایا (دان ۱۱ : ۱) دوسرا خورس وہ ہے جس کے تیسرے برس انہوں نے یونانی حکومت کے قیام کی خبر دی (دان ۱۰ : ۱)

عزرا کے زمانہ میں جو خورس تھا اسکا زمانہ اگر دانیال نے پایا ہوتا تو وہ انکا تذکرہ بھی ضرور کرتے۔

خورس جس کے تیسرے جلوس میں حضرت دانیال زندہ تھے وہ خورس نہیں ہے جو حضرت عزیز کا معاصر تھا، حضرت عزیز والے خورس یا خسرو کو حضرت یشعیاہ خدا کا مسیح (۴۵ : ۱) خدا کا چرواہا اور خدا کی مرضی پوری کرنے والا (۴۴ : ۲۸) قرار دیتے ہیں اور حضرت عزیز کے بیان سے وہ مامور من اللہ ثابت ہوتا ہے (۱ : ۲) لیکن دانیال کا خورس اتنا برا تھا کہ وہ ۲۱ دن تک خدا کے فرشتہ کا مقابلہ کرتا رہا (دانیال ۱۰ : ۱۳) اور جس سے جنگ کرنے کے لئے خدا کا فرشتہ مستعد تھا (دان ۱۰ : ۲۰)

اسی خورس کے عہد میں حضرت دانی ایل کے فرشتہ نے خبر دی کہ ایران میں چار بادشاہ اور ہونگے اس کے بعد یونانی سردار آئے گا (دان ۱۱ : ۲)

اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ خورس خسرو گشتاسپ تھا جس کے بعد بہمنؑ، ہمائےؑ جزاد دارائؑ ابن اور داراؑ ابن دارا چار بادشاہ اور ہوئے۔

مسیحی مورخ ابن العبری نے مختصر الدول میں لکھا ہے کہ تمام یہود، نصاری، مجوس اور مورخین کے نزدیک عزرا کا معاصر یہی بہمن بن اسفندیار تھا۔

بہمن کا پہلا سال حکومت [illegible] یا [illegible] ق م بتایا جاتا ہے بہمن کا پیشرو خورس یا خسرو گشتاشپ تھا، خدا نامہ ایران کی قدیم ترین تاریخ کے حوالہ سے مشرق کے تمام مورخین گشتاسپ کے ایام حکومت ۱۲۰ برس بتاتے ہیں اسلئے دانیال کے معاصر خورس کا پہلا سنہ جلوس یقینا [illegible] یا [illegible] ق م تھا۔

سنہ بخت نصر خود حضرت دانیال کے بیان سے واضح ہے کہ یہ خورس دارا ابن خشو برس مادی کے

بعد ہوا ہے۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اسکے ایام حکومت معلوم نہیں لیکن پھر بھی ہم کو یہ غور کرنا ضرور ہے کہ اس سال سے کتنے دنوں پہلے بخت نصر کا پہلا سال حکومت تھا۔

بخت نصر کے ایام حکومت عیسائی مورخین صرف ۴۳ یا ۴۴ برس فرض کرتے ہیں تاکہ وہ سنہ بختنصری سے سنہ جلوس بہن تک صرف ۷۰ برس کے زمانہ کا حساب درست رکھیں۔

حالانکہ (یرمیاہ ۵۲ : ۳۰) اور (۲ سلاطین ۲۵ : ۲۷) کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اویل مرودک نے اپنے پہلے ہی سنہ جلوس میں یکونیاہ کی گرفتاری کے ۳۷ ویں برس کے ۱۲ ویں مہینہ کی ۲۵ ویں (یا ۲۷ ویں) تاریخ کو یکونیاہ کو قید خانہ سے نکالا۔

ظاہر ہے کہ یہ اس نے عین تاریخ جلوس کے روز کیا ہوگا، جیسا کہ بادشاہوں کا ہمیشہ سے دستور رہا ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ بخت نصر جناب یکونیاہ کی اسیری کے بعد ۳۷ برس تک حکومت کرتا رہا۔

بخت نصر کی سیادت یروشلم پر سنہ یہویقیم سے شروع ہوتی ہے، وہ یروشلم پر آٹھ برس بذریعہ یہویاقیم حکومت کر چکا تھا پھر یکونیاہ تخت پر بیٹھا۔ یکونیاہ ۳ ماہ حکومت کرتا رہا چوتھے ماہ بخت نصر نے اسے تخت سے اتار کر قید کر لیا اور صدقیاہ کو تخت نشین کیا۔

صدقیاہ کے سنہ جلوس کو دانی ایل اور یرمیاہ بخت نصر کی حکومت کا ۱۹ واں سال بتاتے ہیں اس لئے سنہ جلوس صدقیاہ سنہ ۹ قبضہ بخت نصر کے برابر تھا، اور یہی یکونیاہ کی گرفتاری کا سال ہے۔

اب صاف ہو گیا کہ یروشلم پر استیلا کے بعد سے سنہ گرفتاری یکونیاہ تک ۴۵ برس بخت نصر نے یروشلم پر حکومت کی تھی۔

بائبل میں عموماً سنہ یہویقیم بخت نصر کی حکومت کا پہلا سال کہا گیا ہے، اس سے پادریوں نے اسی کو سنہ جلوس بخت نصر سمجھ لیا ہے، حالانکہ بائبل کے مصنفین بخت نصر کے سن

جلوس سے بحث نہیں کرتے وہ صرف یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بخت نصر کے سال بتاتے ہیں اور یہ خیال کہ
سن انکی حکومت کی ابتدا کا سال ہی ہے [illegible] واجب التسلیم ہی نہیں۔

جناب حزقی ایل نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں سنہ گرفتاری یکونیاہ کو سنہ بھی کہا ہے
ظاہر ہے کہ سنہ بخت نصر کے علاوہ اور کسی دوسرے بادشاہ کا سنہ جلوس نہیں ہو سکتا، اس سے
ثابت ہوا کہ بخت نصر یکونیاہ کی گرفتاری سے ۲۵ برس پہلے اور یروشلم پر استیلا سے ۱۷ برس پہلے
سے بابل کا حکمراں تھا، اور اس کی حکومت کا زمانہ کم از کم ۶۲ برس ہے۔

(۱) یروشلم پر استیلا سے پہلے ۱۷ برس
(۲) یکونیاہ کی گرفتاری تک ۹ برس
(۳) گرفتاری کے بعد ۳۶ برس
جملہ ۶۲ برس

بخت نصر کے بعد ادیل مرودک تخت پر بیٹھا اس کے ایام حکومت بائبل میں مذکور نہیں اسلئے
مسیحیوں نے صرف ایک برس فرض کیا ہے، تاکہ دانیالی زمانہ طویل نہ ہو۔ دانیال کی کتاب میں دارا
مادی اور بیلشفر دو بادشاہوں کا اور ذکر ہے دارا مادی کے ایام حکومت مذکور نہیں، اس کو بھی مسیحیوں
نے صرف ایک سال فرض کیا ہے، بیلشفر کے ایام حکومت ۳ سال مذکور ہیں (دانیال)

مجبوراً ہم بھی بخت نصر کے وارثوں کے ایام حکومت کو وہی سال فرض کر لیتے ہیں، حالانکہ
اس کے جانشین دو ایک اور بھی گزرے ہیں اور انکی حکومت بھی مسیحیوں کی غالباً دانستہ غلطی سے
بہت گھٹ گئی ہے۔

بہر حال ۵۸ ۶ میں ۶۷ اور جوڑ دیں تو بخت نصر کا سال حکومت سنہ ۶۲۵ ق م ہو جائے گا
یہ کم سے کم مدت ہے ورنہ بخت نصر کا سنہ جلوس کسی طرح سنہ ۶۱۶ ق م یا سنہ ۶۴۷ ق م سے ادھر
نہیں ہو سکتا۔

بطلیموس نے مجسطی میں سنہ بختنصری کا حساب درج کیا ہے، اس لئے ابتدا کا بیان ہے

کہ انہیں مورخین اور نجومیوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ابتدائے ملک بخت نصر تا ہجرت نبوی تک ۱۳۶۹ سال گزرے۔ ابو الفدا نے ان ۱۳۶۹ سالوں کی تشریح حسب ذیل طریقہ سے کی ہے۔

(۱) ابتدائے ملک بخت نصر سے ابتدائے سن سکندری ۴۳۵ سال

(۲) ابتدائے سن سکندری سے پیدائش مسیح تک ۳۰۳ "

(۳) پیدائش مسیح سے ہجرت تک ۶۳۱ "

جملہ ۱۳۶۹ "

اس تفصیل میں ابو الفدا سے ایک سہو یہ ہوا ہے کہ پیدائش مسیح کا سال ۳۰۳ میں تو شامل ہی تھا ۶۳۱ میں بھی مکرر ہو گیا ورنہ جملہ صرف ۱۳۶۸ سال ہونگے۔

ابو الفدا نے ہجرت سے پہلے کے سال کا نام ۶۳۱ء رکھا ہے، حالانکہ آج کل جو حساب رائج ہے اسکی رو سے یہ سال ۶۲۱ء تھا لیکن یہ کوئی اہم فرق نہیں ہے جو لوگ حضرت مسیح کی پیدائش ۳۰۳ سکندری بتاتے ہیں انکے نزدیک حضرت مسیح ابتدائے سنہ مسیحی سے ۱۰ برس پہلے پیدا ہوئے، موجودہ سنہ مسیحی کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ حضرت مسیح واقعہ صلیب سے ۳۲ برس پہلے پیدا ہوئے۔

ابو الفدا کے اس بیان کی بنیاد بطلیموس کے بیان پر ہے، اس نے مجسطی میں سنہ بخت نصری کا حساب درج کیا ہے اور اس کو استعمال کیا ہے۔

افسوس یہ کہ ہمارے پاس مجسطی کا کوئی نسخہ نہیں، یہ کتاب ابتک غالباً چھپی نہیں اسکا ایک قلمی نسخہ گورکھپور کے ایک رئیس مولوی سبحان اللہ کے پاس تھا، انہوں نے اپنا سارا کتب خانہ علیگڑھ یونیورسٹی کو دیدیا ہے۔ غالباً یہ کتاب اب وہیں ہوگی۔

اگرچہ مجسطی کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا لیکن اتنا تو ایرخ کی ہر کتاب میں مذکور ہے کہ سن سکندری کی ابتدا ۴۳۵ بخت نصری میں ہوئی اور یہی سال سنہ سکندرانی ہے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقفہ بہت قلیل ہے۔ غرض یہ کہ سکندرانی سن کی ابتدا سن بختنصری کی ابتدا سے (۱۵۹۱۰۱۱) دن کے بعد ہوئی۔ بختنصری سال صرف ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا۔ سنہ بختنصری میں معلوم ہوا کہ اصل مقدار سال کی ۳۶۵¼ دن ہے۔ چنانچہ میں جب سنہ سکندری شروع ہوا تو جس روز بختنصری سنہ کا ۴۳۶ واں سال ختم ہوتا تھا اس سے ۲۹ دن پہلے یونانی سال شروع ہوتا تھا اس لئے سنہ سکندرانی سے پہلے کے ۴۳۶ سال بختنصری صرف (۴۳۶×۳۶۵-۲۹) یعنی ۱۵۹۱۰ دن یعنی ۴۳۵ سال ۲۱۶ دن کے رہ گئے۔

سنہ مسیحی کی ابتدا سن سکندرانی کی ابتدا سے ۱۱۳۶۴۴ دن بعد ہوئی۔ اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ سن مسیحی کی ابتدا سن سکندرانی سے ۳۱۱ سال ۹۵ دن بعد اور سن بختنصری سے ۷۴۷ سال ۲۱۴ دن بعد ہوئی اور سنہ ہجری کی ابتدا سنہ سکندرانی سے ۹۳۲ سال ۲۸۷ دن بعد اور سن بختنصری سے ۱۳۶۸ سال ۳۳۶ دن بعد ہوئی۔

یعنی یہ کہ سنہ بختنصری ۷۴۷ ق م یا ۱۳۶۹ ق ھ کے مطابق تھا۔ (باقی آئندہ)

تاریخ عالم کی تعبیر

اوسوالڈ اشپنگلر نے یورپ کی علمی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے اُن کی کتاب "زوال مغرب" موجودہ صدی کی سب سے اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ موصوف نے ہمیں اجازت دی ہے کہ اس کتاب کا جو حصہ عرب تمدن کے متعلق ہو اُسکا ترجمہ جامعہ میں شائع کرلیا۔ مگر ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس سے قبل اُس حصے کا اقتباس قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں جس میں انہوں نے تاریخ عالم کی تعبیر کے متعلق اپنا نظریہ بیان کیا ہے۔ آئندہ نمبروں میں انشاء اللہ انکے خیالات عرب تمدن کے متعلق اور اُن کی پیشین گوئی زوال مغرب کے بابت بھی شائع کیجائے گی۔ عابد

بادی النظر میں تاریخ عالم کا جو نقشہ ہمیں نظر آتا ہے وہ یہ ہے۔ بیشمار تصویروں کا لا متناہی سلسلہ جو کبھی دکھائی دیتا ہے، کبھی چھپ جاتا ہے، کبھی ابھر آتا ہے اور کبھی دب جاتا ہے۔ بے تعداد رنگوں اور روشنیوں کا طلسم جو ظاہر میں محض بے ربط، بے ترتیب اور اتفاقی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جو آنکھ حقیقت کی گہرائی تک پہونچتی ہے وہ اس بظاہر بے معنی دفتر سے ان اصولوں کو ڈھونڈ نکالتی ہے جن پر نسل انسانی کی نشوونما مبنی ہے۔ شاہد معنی لاکھ نقابوں میں چھپے سعی و تلاش کا دستِ شوق ان حجابوں کو اٹھا ہی کر رہتا ہے۔

کائنات کی مجموعی روداد ایک فلک رفیع ہے جس کے آفاق بے تعداد ہیں — اجرام آسمان کی نشوونما، سطح زمین کا قائم ہونا۔ جاندار مخلوق کا پیدا ہونا، انسان کا ظہور۔ فاؤسٹ[1] کی

---

(۱) فاؤسٹ گوئٹے کے مشہور ڈراما کا ہیرو ہے جو تمام کائنات کا علم حاصل کرنے کا شوق رکھتا ہے۔

آنکھ اس سب کو دیکھنا چاہتی تھی لیکن ہمارے پیش نظر محض نسل کا ایک عشر عشیر یعنی آباد کرۂ ارضی کی داستان ہے۔ اس میں سے بھی ہم صرف ترقی یافتہ انسانوں کی ۶ ہزار سال کی تاریخ کو لیتے ہیں جس کی طرف بوڑھے گوئٹے کو ذرا بھی توجہ نہ تھی یہ اہم مسئلہ کہ ارتقائے عالم کے مختلف آفاق میں کس حد تک یکسانی ہے ہم چھیڑنا نہیں چاہتے۔

جس چیز سے تاریخ عالم کے خواب پریشان کی تعبیر ہوسکتی تھی اور جو اب تک "واقعات" اور "سنہ و سال" کے بے ترتیب انبار میں چھپی ہوئی تھی وہ بڑے تمدن کا ظہور ہے۔ جب تک ہم انسانی نشو و نما کی ان اصل صورتوں کے خط و خال کا مشاہدہ، احساس اور احصار نہ کرلیں اسوقت تک ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم نے نسل انسانی کی تاریخ کی حقیقت اور اندرونی ماہیت اور اسکے اور تاریخ فطرت کے فرق کو سمجھ لیا ہے۔ ان تمدنوں پر گہری اور وسیع نظر ڈالنے کے بعد ہم فلسفۂ تاریخ کا نام لے سکتے ہیں۔ اسی صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہم ہر تاریخی واقعہ کو، ہر خیال کو، ہر آرٹ کو، ہر تاریخ کو، ہر جنگ کو ایک "علامت" کے طور پر سمجھ سکیں اور تاریخ پر محض اس حیثیت پر نظر نہ ڈالیں کہ وہ گزرے ہوئے واقعات کا ایک مجموعہ ہے جس میں نہ کوئی ترتیب ہے نہ اصول بلکہ اُسے ایک نامی جسم کی حیثیت سے دیکھیں جس کی ساخت مستحکم ہے جس کے اعضا کی تقسیم معنی اور منشا رکھتی ہے، جس کی نشو و نما کے مشاہدے میں ہم اپنے زمانے کے "حال" کو ماضی سے جدا نہیں کرسکتے اور مستقبل کو لامعلوم اور غیر متعین نہیں کہہ سکتے۔

دنیا کے مختلف تمدن اجسام نامیہ ہیں۔ تاریخ عالم ان کی مجموعی سوانحعمری کا نام ہے چین یا یونان و روما کا قدیم تمدن صورت کے لحاظ سے ایک مثنیٰ ہے ایک انسان کی ایک جانور کی، ایک درخت کی یا ایک پھول کی زندگی کا۔ یہ بات فاؤسٹ کی سی ہمہ گیر نظر رکھنے والے کیلئے کوئی تحقیق طلب مسئلہ نہیں بلکہ ایک تجربہ ہے اگر انسان اس اندرونی "صورت" کو پہچاننا چاہتا ہے جو طرح طرح کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو اس کیلئے حیوانات اور نباتات کی ساخت کے تقابل نے راستہ صاف کر دیا ہے۔ پوری تاریخ انسانی متفرق تمدنوں کی رام کہانی کا نام ہے۔

جو ایک دوسرے سے بے نیاز تھے بہ پہلو بہ پہلو نشو و نما پاتے ہیں کبھی کبھی آپس میں مل جاتے ہیں
کبھی ان میں کا ایک دوسرے پر چھا جاتا ہے یا اسے برباد کر دیتا ہے اور اگر انسان ان کی تمثیل
کو جنہیں اب تک سطحی اور بے مغز "تاریخ عالم" نے چھپا رکھا تھا چشم بصیرت سے دیکھے تو یقیناً اس
میں کامیابی ہوگی کہ وہ ساری فضولیات سے قطع نظر کر کے تمام ظلمات کو ہٹا کر تمدن کی اصلی صورت
دیکھے جو تمام متفرق تمدنوں کا نصب العین ہے۔

میرے نزدیک کسی تمدن کا یعنی اس کے اندرونی امکانات کا تصور دوسری چیز ہے اور اس کا
محسوس مظہر جو تاریخ میں دائمی حیثیت سے نظر آتا ہے دوسری چیز ہے ان دونوں میں وہی تعلق
ہے جو روح کو عالم مرئی میں اپنے مظہر یعنی جسم سے ہے۔ کسی تمدن کی تاریخ اس کے امکانات کے
بتدریج قوت سے فعل میں آنے کا نام ہے تکمیل کے معنی ہیں موت۔ یہ نقشہ ہم کو یونان کے قدیم
تمدن میں نظر آتا ہے جو اپالو سے مشابہ روح کا مظہر تھا اور جس کے وہ آثار جو آنکھ کو اور ذہن کو میسر
آتے ہیں اب تک آثار قدیمہ، علم اللسان اور جمالیات کے ماہرین کا موضوع تحقیق ہیں۔

تمدن ساری گزشتہ اور آئندہ تاریخ عالم کا موضوع اصلی ہے۔ ہم گوئٹے کے گہرے "زندہ
فطرت" کے خیال کو جس کی کسی نے اب تک قدر نہیں کی اس کے صحیح معنی میں ان تمام تاریخی تمدنوں کے
مشاہدہ میں استعمال کریں گے جو پختہ ہو کر فنا ہو گئے یا عین پختگی کی حالت میں برباد ہو گئے یا نیم پختہ
ہو کر مٹ گئے یا بن کھلے مرجھا گئے۔ یہ طریقہ تحلیل اور تجزیہ کا نہیں بلکہ احساس اور مشاہدہ کا ہے
"عقل انسانی کی بلند ترین منزل حیرت ہے۔ اس لئے اگر انسان کو اشیاء کی "صورت اصلی"
حیرت میں ڈال دے تو اسے اسی پر قناعت کرنا چاہئے۔ اس سے زیادہ بلندی اسے میسر نہیں
آسکتی اور اس پردے کے پیچھے نظر ڈالنا اس کے لئے بیکار ہے۔ یہی اس کی حد پرواز ہے"
"صورت اصلی" وہ ہے جس میں انسان کو عین ارتقا صاف اور خالص دکھائی دے۔ گوئٹے
کی چشم بصیرت کو ہر ایک پودے میں خواہ وہ موجود ہو یا ممکن "اصلی پودے" کا عین صاف نظر
آتا تھا۔

[illegible] اس نے تجربے سے جو علم پرو رکھا تھا اس میں اپنے دریافت کردہ اصول
کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے "ایسے قانون کا اطلاق سب زندہ چیزوں پر ہوتا ہے" وہ اشیا
کو اس نظر سے دیکھتا تھا جس کی قدر لامرتز کر سکتا تھا۔ ڈارون کی صدی میں ہونے کے باوجود آپ
اس عہد کے خیالات سے انتہائی بعید تھا۔

لیکن تاریخ کی ایسی تعبیر جس میں ڈارون کا رنگ یعنی بانتظام اور علت و معلول پر مبنی سائنس
کا دخل نہ ہو ابھی تک نہیں کی گئی۔ کسی کو بالارادہ یہ خیال تک نہیں آیا کہ سنے طریقے سے تاریخ کی ایک
صحیح اور واضح علم حیات پر مبنی تفسیر کیجائے جس کے ذرائع معلوم اور جس کی حد معین ہو۔ یہی بیسویں
صدی کا سب سے بڑا کام ہے کہ ان مظاہر نامیہ (یعنی انسانی تمدنوں کی اندرونی ساخت پر غور
کرے جو تاریخ عالم کا موضوع ہیں اُنکے اہم اور ضروری عناصر کو غیر ضروری عناصر سے الگ
کرے واقعات کے اصل معنی معلوم کرے اور کائنات کی لسان مرموز کی کنجی تلاش کرے۔

(باقی آئندہ)

[illegible]

...ستی کی بنیاد موجودہ نسل کے ارادہ

ترکیۂ جدید میں تمدنی تحریک

(۳)

دنیا کی طرف سے جو رویہ ترک قوم رکھتی تھی اور اس کی جو تفسیر کرتی تھی اس کے بدلنے کیلئے فرد اور جماعت کے باہمی تعلقات اور جماعت کے نئے تخیل میں تبدیلی ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس دوسرے تغیر کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جماعت کی تاریخی شکل کو مسترد کر دیا جائے کہ اس میں فرد جذب ہی نہیں فنا ہو جاتا تھا لیکن یہ مخالفت اسلام کے تصور جماعت یا خود ملت اسلامی کے خلاف نہ تھی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اس نئی تمدنی تحریک نے نشوونما پائی تو ایسے حالات موجود تھے جو حکومت کے لئے ہر طرح ناساعد تھے اور یہ تمدنی تحریک جو جماعتی اعتبار سے بھی اسلامی تصور کائنات کے زیر اثر تھی۔

لیکن آخر اسلام کا یہ جماعتی تصور ہے کیا؟ اگر اسکا جواب ہماری تمدنی تحریک کے بہت سے مظاہر کے سمجھنے کے لئے ازبس ضروری نہ ہوتا تو میں اس سوال پر اس جگہ نظر نہ ڈالتا۔

اسلام کے تصور جماعت میں روح اور جسم کی طرح فرد اور جماعت ایک ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک ہی کل کے جزو ہیں۔ عقیدہ مذہبی میں توحید کے ساتھ ساتھ اسلام میں ایک دنیاوی تحریک ایک جماعتی توحید بھی موجود ہے۔ اسلامی خیال سے جماعت اہل ایمان کی جماعت کا نام ہے۔ اسلامی دنیا صحیح معنوں میں "مدینۃ اللہ" ہے جسکا حقیقی حکمران اور شریعت ساز خدا ہے فرد کے حقوق و فرائض بھی خدا ہی کے یہاں سے متعین ہیں۔ دنیاوی حکمران اس عالم میں خدا کے نائب ہیں اور فرد کے ان حقوق و فرائض میں [illegible] کمی کر سکتے ہیں نہ بیشی خود حکمران کی دسترس کی حدود شریعت میں متعین ہیں لیکن یہی حدود ہر فرد واحد کے لئے بھی ہیں۔ اس جماعت میں حد فاصل [illegible]

حاکم ہوتا ہے نہ محکوم۔ جو خطیر ترد کو لکھا تھا آئین میں اپنے دریافت کر دہ

یہ وہ تصورات ہیں جن سے پیروان اسلام سب زندہ مینوں پر چھا سے خیالات کے خاکے تیار ہوئے ہیں۔ اسکے نتائج سب کو معلوم ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام میں حریت اور مساوات کے تصورات موجود نہیں۔ اور سچ یہ ہے کہ انکے یہاں موجود ہونیکی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ اسلام پر ایمان لانے سے حریت بھی حاصل تھی، مساوات بھی۔ اور یہ ایک بدیہی بات تھی۔ حریت و مساوات مسائل کی صورت وہاں اختیار کرتے ہیں جہاں انسان انسان پر حکمراں ہو یعنی حکومت خالص دنیاوی حیثیت رکھتی ہو۔ مگر جہاں آئین جماعت و حکومت الہی ہو جہاں حکمراں خدا کے سامنے معمولی انسان کے برابر ہو وہاں حریت اور مساوات کا "مسئلہ" پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ پیروان اسلام میں قوم اور وطن کا تصور یکسر مفقود ہے "مذہب اور قوم ایک ہیں" یہ وہ تعلیم ہے جو مذہبی سوال و جواب کی کتاب میں ملتی ہیں۔ مسلمان اپنے کو مملکت اسلامی کا شہری جانتا ہے۔ اسکا وطن ساری اسلامی دنیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی جماعتیں حکومتیں، مملکتیں سب بڑی جمعیۃ اسلامی اور عام شریعت اسلامی کے زیر نگیں سمجھی جاتی ہیں جبتک کہ اسلامی قومیں، خلافت کی مذہبی جمہوریت کے ماتحت رہیں اور عالم اسلامی عظیم الشان حکومتوں سے عبارت رہا اس وقت تک یہ تصورات و خیالات زندہ رہے۔ لیکن اسلامی تاریخ کی پہلی صدی ہی میں اس صورت حال میں تغیر رونما ہونے لگا اور تاریخ نے انسانی و دنیاوی شکل اختیار کی۔ مگر ایک چیز ضرور باقی رہی یعنی فرد اور جماعت کی یگانگت و ہمنوائی اور توحید جمعیۃ پر ایمان۔

ملل اسلامی میں فرد کی جماعتی حیثیت اور اس کے تاریخی ارتقا کے جو نتائج ہوئے وہ سب پر ظاہر ہیں ہم یہاں اس رد عمل کا ذکر کریں گے جو ان نتائج کے خلاف رونما ہوا اور اسمیں مندرجہ ذیل چار پہلوؤں سے نظر ڈالیں گے: (۱) تصور حریت (۲) تصور وطن (۳) تصور مساوات

(۳) تصور وطنیت اور تصور نشاۃ اسلام ثانیہ

تصور حریت کی بنیاد موجودہ نسل کے ان جذبات حیات میں ہے جنہیں اس ترقی تمدنی تحریک نے اور خصوصاً قدیم نظام جماعت کے درہم برہم ہونے نے پیش کر دیا ہے۔ اس وجود انسانی کی تکمیل جو اپنے اثبات حیات اور ذوق عمل کے ساتھ اس نئے تصور زندگی میں ایک غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے صرف حریت ہی کی فضا میں ممکن ہے طبیعتیں یونہی تیار تھیں کہ مغربی تمدن سے واقفیت اور انقلاب فرانس کے خیالات سے آگاہی نے ان میں اور بھی آگ لگادی۔ کمال پہلا شخص ہے جس نے اپنی نظموں میں اس آزادی کے گیت گائے اور اپنے مضامین میں اس کی تلقین کی۔ یہاں صرف اس کے "وطن شاقیسی" اس کے مشہور قصیدہ، اور اس کے مضمون "حریت افکار" کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ اس کے نقش قدم پر حامد چلا ہے۔ جس نے اپنی نظم "کعبہ اشتیاق" میں حریت کو "نور انسانیت" سے تعبیر کیا ہے اور جس نے اپنے متفرق ڈراموں میں تصور حریت کا شاعرانہ اظہار کیا ہے اور اپنی متعدد نظموں میں اس کے راگ گائے ہیں۔ نکہت آیین اور عاکف سب کے کلام میں اس جذبہ حریت کی صدا سنائی دیتی ہے۔

جدید حکومت نے اپنے اعلانات و دستور اساسی میں حریت کو ہر شہری کا بنیادی حق قرار دیدیا ہے۔ سعید حلیم پاشا نے جو نئی مذہبی تحریک کے قائد ہیں اپنی تصنیف "اسلام لشماق" میں حریت کو فرض مذہبی ظاہر کیا ہے اور لکھا ہے کہ "آزاد ہونا ہر مسلم کا فرض ہے"۔

گرچہ یہ سب لوگ جنکا ذکر ہوا نہایت غیر معمولی شخصیتوں کے لوگ تھے لیکن پھر بھی حریت کا تصور انکے یہاں انفرادیت سے کسی طرح نہ ملتا تھا حتی کہ خود مغرب پسند نکہت کے یہاں بھی نہیں۔ ان سب میں نہایت قوی احساس جماعت اور جدید جذبہ حب وطن موجود تھا اور یہ بات زیادہ تر اس توحید جماعتی کے عقیدہ کا نتیجہ تھی جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اور جو ظاہر ہے کہ مغرب پسندوں میں نہیں پایا جاتا۔

تصور وطن حریت کے پہلو بہ پہلو آج ذہنوں پر سب سے گہرا اثر رکھتا ہے۔ اس کا بھی

سب سے پہلا اور نام آور پیرواسی کمال تھا۔ تصانیف حاضرہ کا ایک ناشر سلیمان نظیف نے جن کا ذکر پہلے ہی آچکا ہے، اس کی مختصر سی کتاب "الہام وطن" پر جس میں حامد کی وطنی نظمیں ہیں ایک مقدمہ لکھا ہے جس کا موضوع یہی ترکوں میں تصور وطن کی نشوونما ہے۔ میں ذیل میں اسکے ایک جزو کا لفظی ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:

"ہمارے ملک کی موجودہ تباہی میں سب سے بڑا عنصر یہ ہے کہ ہمارے وطن میں تصور وطنیت بہت دیر میں اور بہت ناکمل طور پر باہر سے آیا ہے۔ باہر سے، میں ارادۃً کہتا ہوں چاہے ہماری قومی خودداری پر یہ بات کیسی ہی گراں کیوں نہ گزرے لیکن ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ تصور خود ہماری قوم کی روح، اس کے وجدان اور ارادہ سے پیدا نہیں ہوا۔"

مغرب کی ذہنی تخلیقات نے ہمارے ملک میں اور خصوصاً ہماری شاعری میں اس تصور کو داخل کیا اور ہمارے ذہنوں پر اسکا اثر ڈالا۔ جذبہ وطنیت کے وجود اور اس کی ضرورت کو ہم نے اسی وقت تسلیم کیا جب ہم مغرب کی تخلیقات ذہنی سے آشنا ہوئے۔ ہم اپنے ان مشاہیر کی یقیناً عظمت کرتے ہیں جنہوں نے بے حد و نہایت جذبہ ایثار کے اثر سے اپنے جسموں کو قربان کردیا اور آج ہماری حدود سے دور سپرد خاک ہیں یقیناً جب ہم کبھی انکا خیال کرتے ہیں نہایت گہری عقیدت اور شکرگزاری کے ساتھ لیکن ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ انہوں نے جو اپنی جان قربان کی تو جذبہ شجاعت کے اثر سے یا دوسری دنیا میں آسایش دامن کی خاطر جنک اصلی بہشت کی طرف سے نظریں پھری رہیں اور ایک آنے والی موعودہ بہشت کا طلسم اس پر غالب ہو تو ظاہر ہے کہ قربانی کا خون اسی مقام رجعت کی خاطر بہایا جائے گا نہ کہ دنیاوی وطن کے لئے لیکن وطن کا مقصد آخرت نہیں یہی دنیا ہے۔ وہ تمدن کو برباد نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسکی تعمیر چاہتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہونا چاہئے کہ زندہ رہنا فرض ہے اس لئے کہ وطن کی حیات برقرار رہے کہ یہ اس سے زیادہ عظیم الشان اور زیادہ ضروری فرض ہے۔"

ترکی کی موجودہ حالت زار کو حب وطن کے فقدان سے اس طرح منسوب کرنے کے بعد

کہتا ہے:

"وہ جو امت کے رہنما اور معلم بننا چاہتے تھے انہوں نے قوم کے جذبات اور اعمال کے لئے صدیوں تک ایک ایسا دور افتادہ مقصد مقرر کیا اور اس طرح کیا کہ اس پیغمبر اعظم کی روح جن کا مقدس نام لیکر گفتگو کرتے تھے یقیناً اس پر ناراض اور بیزار ہوتی ہوگی۔ اس پیغمبر نے تو بار بار اور نہایت زور سے یہ کہا ہے کہ اس دنیا کا تمدن اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ اس دنیا کے لئے عبادت۔ لیکن یہ لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے قول و فعل سے امت محمدی کو دنیا سے بیزار کر دیا"

"وطن کو پس پشت ڈالنے اور اسکی محبت کی تعلیم سے گریز کرنے کے گناہ میں ہمارے شعرا بھی اسی قدر آلودہ ہیں جس قدر کہ صاحبان جبہ و دستار"

"نامق کمال نے اپنی قوم کی شاعری کو اسی پراگندگی کے حال میں پایا۔ نامق کمال ہی پہلا شخص ہے جس نے وطن کے حسن اور وطن کے مصائب کا گیت اپنے شاندار اور پر اثر انداز میں گایا"

"ہمارے سیاسی اقتدار کا سنگ بنیاد سلطان عثمان نے رکھا تھا لیکن اقتدار ادبی کا نامق کمال نے رکھا ہے۔ وہ وطن کا بانی تھا یعنی حب وطن کا"

مجھے سلیمان نظیف کے ان الفاظ سے بڑی حد تک اتفاق ہے اور اس موقع پر میں ان میں کچھ اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ کمال کے بعد تو ہمارے تمام کے تمام شعرا نے وطنیت کے گیت گائے ہیں۔ ان سب کا سردار حامد ہے جس نے اپنے کلام میں ہر جگہ وطن کے لئے اظہار محبت کے تمام دلفریب انداز وقف کر دئے ہیں۔

غرض اس طرح وطن کا تصور ترکیہ جدیدہ کی نئی ذہنیت کے لئے ایک بڑی طاقت بن گیا اور اس نے ایک ایسی قومی قدر مقدس کی حیثیت اختیار کر لی کہ آج ہمارے بہترین دل و دماغ اس کے لئے جیتے اور اس کے لئے مرتے ہیں۔

وطن کے ساتھ ساتھ قوم کا تصور بھی پیدا ہوا۔ لیکن قوم پرستی کے آخری مراحل تک یہ تصور کچھ [illegible] رہا اور اسمیں کوئی خاص معنی پیدا نہیں ہوئے مثلاً کمال کے کلام

[illegible] ملت، امت، کے الفاظ ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ اور کمال کے ذہن میں [illegible] کے جو اجزائے ترکیبی تھے ان سے اس بات کی تشریح بھی ہو جاتی ہے لیکن تاہم جب کمال یہ الفاظ استعمال کرتا ہے تو اس کے پیش نظر عثمانی قومیت ہی کا تصور ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے یہاں تو شدید احساس نسل تک کا پتہ چلتا ہے۔ اپنے اس قصیدہ میں جس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں وہ اس "معزز عثمانی نسل" کا ذکر کرتا ہے "جس نے ایک قبیلہ سے ایک سلطنت بنالی"

حامد کے کلام میں 'وطن' کے ساتھ ساتھ 'ملت' کا لفظ بھی آتا ہے کہیں کہیں اس سے مطلب عثمانیوں یا ترکوں سے ہے لیکن عموماً ملت اسلامی مراد ہوتی ہے۔ ۱۹۱۳ء کی لکھی ہوئی ایک نظم میں وہ کہتا ہے کہ "مذہب ہی کچی قومیت ہے" (الہام وطن ص ۹۰) اپنے ڈراما طارق میں اس نے پہلی مرتبہ جب قوم (ملت سیوداسی) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک عرصہ تک خصوصاً تنظیمات کے زمانہ میں ملت سے مراد حکومت عثمانی کی تمام رعایا سے تھی اور اسمیں مختلف حصوں کی تفریق کے لئے لفظ قوم استعمال کیا جاتا تھا یعنی یہ ایک سیاسی تصور تھا۔ ترکی قوم پرستی کی تحریک نے اس میں تغیر پیدا کیا اور لفظ 'ملت' کو ایک خاص معنی دے یعنی اسے ترکی قوم کا مرادف بنایا (ضیا۔ کوک الپ 'ملت و وطن')

چونکہ عہدنامہ سیورے کے بعد سے ترکی ایک قومی حکومت ہو گئی ہے اس لئے ملت کا یہ تصور بھی مستقل معلوم ہوتا ہے۔ جمعیۃ اسلامی کے لئے ملت سے مفہوم تمام اسلامی برادری ہے ("اسلام بین الملل") اور اگرچہ مذہبی حلقوں نے بھی نئے تصور کو تسلیم کر لیا ہے تاہم وہ لفظ 'ملت' کو کل جماعت اسلامی کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں قوم اور قومیت کے الفاظ رکھتے ہیں لیکن 'قوم' کے بحیثیت ایک حیات باقی اور جماعتی ہستی کے یہ بھی قائل ہیں اور اسکے علیحدہ وجود اور مخصوص حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس طرح 'وطن' اور 'قوم' کے تصور سے نیا تصور جماعت پیدا ہوا ہے۔

اب کچھ نئے تصور مذہب کے متعلق تفصیلات بالا سے یہ گمان پیدا ہو سکتا ہے کہ یادی

تعلق رکھنے والوں کے ذہن کے ساتھ [illegible] اسلام کی [illegible]
گمان بس ایک حد تک ہی صحیح ہے۔ اور وہ یوں کہ ہر جگہ جہاں نہیں اسلام سے [illegible]
وہ موجودہ اسلام نہیں جس کی آج فرمانروائی ہے بلکہ ایک خیالی تصوری اسلام ہے کہ [illegible]
اپنے تمام تصورات اور مطالبات کی بنیاد اسلام کو بتاتا ہے جب حامد اسلام کا ذکر کرتے ہیں
تو ان دونوں کا مطلب اس اسلام سے نہیں ہوتا جو انکے سامنے موجود تھا یعنی انکی مراد تاریخی [illegible]
سے نہیں ہوتی۔ ہمارے انقلاب کی ذہنیت اس تاریخی اسلام کے بالکل خلاف ہے جس پر جمود
طاری ہے جو توہمات سے پرانے اور رانے خیالات سے لبریز ہے۔ جو زندگی اور دنیا سے بیزار [illegible]
ہیں۔ جماعت کا نیا تصور تعلیمات اسلامی کے مطابق مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے اگرچہ خود کمال اور
حامد کو اسکا احساس نہ تھا۔ اقوام اسلامی کی زندگی میں مذہب کی جو حیثیت ہے وہ معلوم ہے
اسلام تو کل انسانی زندگی کا شخصی ہو کر جماعتی ایک مکمل نظام بنا چاہتا ہے اور آجتک کم و بیش
اس حیثیت سے رہا ہے اور ہے۔ یہ ایک ہی وقت میں محدود معنوں میں مذہب بھی ہے اور
نظام قانون و اخلاق بھی۔ چنانچہ آج جو مذہبی اصلاح ہو رہی ہے اس میں وہ ایسی نظریہ کا
کا مخالف ہے جیسے مذہب و اخلاق کی علیحدگی، مذہب و سیاست کی جدائی، مذہب و حکومت کی [illegible]
چونکہ اسکے نزدیک حقیقی زندگی میں ان چیزوں کا نہ کوئی مستقل وجود ہے نہ جداگانہ اقتدار تمام
تمدنی زندگی ایک کل ہے اور اسلام اسکا واحد نظام۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ اسلام ہرچند اسلام کی دراصل یہ حالت نہ تھی تمام
تاریخی ارتقاء نے اسے محض عبادات کا مذہب بنا دیا تھا اور اس کے پیروؤں کی زندگی زیادہ
انہیں عبادات ظاہری کے لئے وقف تھی۔ نیا انسان جس کا ذوق عمل اپنے لئے میدان [illegible]
اور جس کی نظر اس دنیا کی طرف لگی ہوئی تھی اس صورت حال کو کیسے مان سکتا تھا چنانچہ خود حامد
کے کلام میں ہی ایک خالص عقیدہ کے مذہب کی ابتدا دکھائی دیتی ہے مثلاً اس کی نظم تہلیل
میں اور اس کی دوسری نظم بر واعظ بر موعظہ میں۔

مزید یہاں یہ کہ نئی حکومت کو نئے حالات کے لحاظ سے نئے قانون کی ضرورت ہوئی جو کچھ تو اسلامی شریعت پر مبنی تھا اور کچھ اس سے جدا تھا۔ اُدھر شریعت اسلامی میں اضافہ و اجتہاد کا دروازہ کوئی عرصہ سے بند تھا۔ چنانچہ طرح طرح کی مشکلات پیدا ہو رہی تھیں کہ مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ ترک مذہب کے مغربی تصور سے بھی آشنا ہوئے۔ خصوصاً دو مثالوں نے بڑا اثر ڈالا۔ ایک تو لوتھر کے کام نے دوسرے انقلاب فرانس کی سیاست مذہبی نے۔ مغرب میں حکومت اور کلیسا کی علیحدگی سے انہیں مذہب و سیاست کو جدا کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن مغربی خیالات کے اثر نے یہیں بس نہیں کیا۔ فرانس کی نئی روشنی، حکمت طبیعی کی مادہ پرستی، اور انیسویں صدی کی مذہب دشمن فلسفہ ان سب کا عمل دخل ترکوں کے دماغوں میں شروع ہوا۔ اسلام پر اہل مغرب نے جو نکتہ چینی کی ہے وہ بھی بے اثر نہ رہی۔ بہتوں نے تو اس نکتہ چینی کو اپنا لیا، اور بہتوں نے اس کی وجہ سے خود غور و فکر شروع کیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب انفرادی عقیدہ کی بات ہے اور اسے سیاست و اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن یہ خیال جس کی تلقین مغرب پرستوں نے کی اور جسے بعد میں قوم پرستوں نے اختیار کیا اس قدر انتہائی تھا کہ بہت جلد اس کی مخالفت و تردید شروع ہوگئی۔ مذہبی حلقے جو شریعت اسلامی کے حامی تھے اس ترقی کے ساتھ ساتھ آگے نہ بڑھے تھے اس لئے پہلے پہل تو وہ اس نئی صورت حال کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن جب سر پر یہ مقابلہ آن ہی پڑا تو وہ بھی تیار ہو گئے اور انہوں نے اصلاح مذہب کی طرح ڈالی۔ اس طرح مذہب کے عام تصور نے بدلکر اسلام کے تصور کی شکل اختیار کی جس کی رو سے اسلام اس دنیا کا مذہب ہے، عقیدہ کا مذہب ہے، اور اخلاق حسنہ کا مذہب ہے جس میں عبادات ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اس پر زیادہ تفصیل کے ساتھ دوسری کتاب میں بحث کیجائے گی۔

امریکہ انگریز مصنفین کے زاویہ نگاہ سے[1]

"میرا خیال ہے کہ میں اپنے دماغ میں ایک شریف اور طاقتور قوم کو دیکھتا ہوں جو خواب راحت کے بعد ایک قوی آدمی کی طرح کھڑی ہو رہی ہے اور اپنی ناقابل تسخیر قیود پر غالب آ رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں اسے ایک شہباز کی طرح اپنی شہزور جوانی کا رنگ اختیار کرتے ہوئے اور اپنی چکا چوند ہونے والی آنکھوں کو شعاع نیم روز سے روشن کرتے ہوئے دیکھتا ہوں"

ملٹن

یہ نہایت افسوسناک بات ہے کہ مابین انگلستان و امریکہ ادبی مخالفت روز بروز ترقی پذیر ہے ممالک متحدہ امریکہ کی نسبت حال میں بہت دلچسپی پیدا ہو گئی ہے اور لندن کے مطابع جمہوری سلطنت کے سفرناموں سے پر ہیں لیکن انکا منشاء واقفیت کی بجائے غلط فہمی پھیلانا معلوم ہوتا ہے اور وہ اس بارے میں اسقدر کامیاب ہو گئے ہیں کہ دونوں قوموں کے متواتر ربط و ضبط کے باوجود دنیا کی کوئی قوم بھی ایسی نہیں ہے جس کے بارہ میں برطانیہ کی آبادی کے ایک بڑے حصے کو اس قدر

---

(۱) یہ مضمون واشنگٹن ارونگ کی کتاب اسکیچ بک سے ترجمہ کیا گیا ہے جو ۱۸۲۰ء میں شائع کی گئی تھی۔ ممالک متحدہ امریکہ ۱۷۷۶ء میں انگلستان کے پنجہ سے آزاد ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے دونوں ممالک میں حسد و رقابت کا بازار گرم تھا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ اس مضمون کا دونوں ممالک پر کیا اثر ہوا لیکن اس کے بعد حسد و رقابت کی آگ ضرور سرد ہو گئی اور ارونگ نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ امریکہ انگلستان کی مصیبت میں اسکا ہمدرد و رفیق ثابت ہو سکتا ہے وہ جنگ عظیم میں ایک صدی بعد پوری ہوئی اور انگلستان کو امریکہ کی بدولت جرمنی سے (دیکھو صفحہ

کم صحیح معلومات ہوں یا اس قدر کثیر التعداد تعصبات اُس کے دل میں جاگزیں ہوں۔

دنیا میں انگریز سیاح بہترین بھی ہیں اور بدترین بھی۔ جب غرور یا نفع کا خیال دل میں موجود نہ ہو تو عمیق اور فلسفیانہ سیاحی خیالات میں یا بیرونی اشیار کی واقعی اور ہوبہو تصویر کھینچنے میں کوئی انکی برابری نہیں کرسکتا۔ لیکن جب اپنے ملک کی شہرت یا بہبودی کسی دوسرے ملک سے تصادم کرتی ہے تو وہ مخالفت کی انتہائی سرحد پر جا پہنچتے ہیں اور اپنی صداقت اور دیانت کو جو اُنکا معمول ہے ناملائم طعن تشنیع اور بدمذاق تمسخر سے لطف اندوز ہونے میں فراموش کرجاتے ہیں پس اُن کی سیاحت اسی قدر صحیح اور درست ہوگی جس قدر کہ وہ ملک جس کا وہ حال بیان کریں اُن سے دور ہوگا۔ میں ان ممالک کے حالات کی نسبت جو دریائے نیل کے آبشاروں سے اُدھر واقع ہیں یا غیر دریافت شدہ جزائر کے بارہ میں جو بحیرۂ زرد میں ہیں، یا ہندوستان کے اندرونی حصص یا کسی دوسرے قطعہ زمین کی بابت جس کو دوسرے سیاح اپنے تخیل کی بلند پروازی سے دکھلانے کیلئے تیار ہوں ایک انگریز کے بیان پر فوراً اعتماد کرلوں گا لیکن میں اُس کے قریبی ہمسایہ یا ان قوموں کے بیان کردہ حالات کو جن سے وہ بہید ملتا جلتا رہتا ہے احتیاط کی نظر سے دیکھونگا۔ بالفاظ دیگر میں اس کی دیانت پر اعتماد کرنے کے لئے کیسا ہی آمادہ کیوں نہ ہوجاؤں لیکن میں اسکے تعصبات پر بھروسہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

ہمارے ملک کی یہ عجیب قسمت ہے کہ اس کو بدترین انگریز سیاحوں سے واسطہ پڑا ہے جبکہ فلسفی اور روشن خیال لوگوں کو انگلستان سے قطبین کا حال معلوم کرنے، صحراؤں کو عبور کرنے اور وحشی قوموں کے عادات و اطوار مطالعہ کرنیکے لئے بھیجا جاتا ہے جن کے ساتھ اُنکے ملک کو کوئی مستقل نفع یا خوشی کا رابطہ نہیں ہے تو یہ کام ٹوٹے پھوٹے تاجر، خیالی پلاؤ پکانے والے شخص، آوارہ گرد مزدور یا نیچر اور برمنگھم کے گماشتے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ امریکہ

(بقیہ نوٹ صفحہ ۳۱) مقابلہ میں شکست حاصل ہوئی۔ تنہا

کے بارہ میں انگلستان کو واقفیت ہم پہونچائے۔ ان ذریعوں سے انگلستان ایسے ملک کے بارہ میں واقفیت حاصل کرنے پر قانع ہے جو اخلاقی اور جسمانی ترقی کی عجیب شاہراہ پر گامزن ہے۔ ایسا ملک جس میں دنیا کی تاریخ کے سب سے بڑے سیاسی تجربوں میں سے ایک پر اس وقت عمل کیا جارہا ہے اور جو فلسفی اور مدبر کے لئے نہایت عمیق اور اہم مطالعہ کا سامان پیش کرتا ہے۔

یہ بات کہ ایسے اشخاص امریکہ کے حالات تعصب کیساتھ بیان کریں تعجب خیز نہیں ہے۔ وہ غور طلب مضامین جو یہ پیش کرتا ہے اس قدر وسیع اور بلند ہیں کہ وہاں تک اُنکی رسائی نہیں ہو سکتی قومی مسلک ابھی خام ہے اور حالت پختگی میں ہے۔ ممکن ہے اس میں جھاگ اور تلچھٹ ہو لیکن اسکے اجزا صحیح اور مفید ہیں۔ اس نے شجاعت اور فیاضی کے ثبوت پہلے ہی سے فراہم کر دئے ہیں اور مجموعی حیثیت سے کسی نہ کسی نفیس شئے میں اس کے تبدیل ہونیکی امید ہے۔ لیکن وہ اسباب جو اُس کو مضبوط اور شریف بنانے میں مصروف ہیں اور اسکی قابل تعریف صفات کا روزانہ اظہار یہ تمام باتیں ان تنگ نظر لوگوں پر کچھ اثر نہیں ڈالتیں اور ان چھوٹی چھوٹی سختیوں سے جو اُس کی موجودہ حالت کا اقتضا ہیں متاثر ہوتے ہیں۔ وہ صرف سفلی معاملات کو سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں، اُن معاملات کو جو اُنکے نجی مفاد اور ذاتی منافع سے متعلق ہیں۔ وہ اُن چھوٹے چھوٹے آرام و راحت کے سامانوں سے محروم رہتے ہیں جو ایک قدیم، خوب آراستہ اور ضرورت سے زائد آباد قوم کی حالت کا حصہ ہوتے ہیں جہاں مفید محنت کے تمام درجے پُر ہو جاتے ہیں اور اکثروں کو خواہش اور تعیش کے توہمات کا مطالعہ کرکے بتکلیف وہ اور ذلیل معاش پیدا کرنی پڑتی ہے۔ لیکن تنگ نظر لوگوں کی نگاہ میں یہ چھوٹے چھوٹے آرام ہی سب کچھ ہیں یا ان کو نظر نہیں آتا یا وہ اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں کہ جن عظیم برکات کا حصہ ہم کو عام طور پر ملا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔

غالباً وہ کسی فوری نفع کی بیجا توقعات میں ناکام رہے ہیں۔ غالباً انہوں نے امریکہ کو ایک سونے کی کان سمجھا تھا جہاں سونا اور چاندی بافراط تھا اور دیسی لوگ فہم و فراست کے حصہ دار

تے اور جہاں وہ یکایک تعجب خیز طریقہ پر کسی غیر متوقع لیکن آسان طریقے سے مالدار ہو جاتے۔
وہی دماغی کمزوری جو فضول توقعات سے پُر ہے مایوسی میں چڑچڑاپن پیدا کر دیتی ہے ایسے
اشخاص اُس ملک کے جانی دشمن بن جاتے ہیں جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جیسا کہ
ہر جگہ کوئی شخص بھی اُس وقت تک فصل درو نہیں کر سکتا جب تک کہ اُس نے بیج نہ بویا ہو
ظاہر ہے کہ ہر شخص محنت اور دماغ سے دولت حاصل کر سکتا ہے اور قدرت کی عام مشکلات
اور ایک ذہین اور حوصلہ مند قوم کی ہوشیاری کا مقابلہ کر کے کچھ کما سکتا ہے۔

شاید غلط فہمی یا ہر قسم کی مہمان نوازی کی وجہ سے یا اجنبی کو ہر وقت خوش اور بشاش
رکھنے کے خیال سے جو میرے ہم وطنوں میں پایا جاتا ہے امریکہ میں اُن کو غیر معمولی عزت
کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور چونکہ وہ تمام عمر اپنے آپ کو عمدہ سوسائٹی سے فرد تر سمجھتے رہے
ہیں اور انہوں نے خود بینی کے غلامانہ احساس میں نشو و نما پائی ہے لہذا وہ تہذیب کے معمولی
استعمال پر مغرور بن جاتے ہیں اور اپنی برتری کو دوسروں کی حقارت میں صرف کرتے
ہیں، اور اُس سوسائٹی کی تحقیر کرتے ہیں جہاں کوئی مصنوعی امتیاز نہیں ہے اور جہاں
ایسے افراد جیسے کہ وہ خود ہیں کسی اتفاق سے بڑے آدمی ہو سکتے ہیں۔

لیکن ہر شخص یہ خیال کریگا کہ اطلاعات ایسے ذرائع سے ایسے مضمون پر جہاں حقیقت
واقعیت نہایت ضروری ہیں مہتممان اخبارات کو وصول ہوتی ہونگی وہ ان کو باحتیاط کام میں
لاتے ہونگے اور یہ کہ ان اشخاص کے مقاصد، انکی دیانتداری، ان کی تحقیق و تدقیق کے
اور صحیح رائے قائم کرنے کی استعداد کو سختی کے ساتھ جانچ لیا جاتا ہوگا قبل اس کے کہ انکی
شہادت کو اپنی ہی جیسی قوم کے خلاف اس کثرت کے ساتھ تسلیم کرتے ہونگے۔ مگر معاملہ ایک
بالکل برعکس ہے اور اس سے انسانی اختلاف رائے کی ایک عجیب و غریب مثال مہیا ہوتی
اُس احتیاط سے جس سے انگریز نقاد ایک سیاح کی صداقت کو جو کسی دور دراز اور نسبتاً
غیر اہم ملک کے حالات بیان کرتا ہے جانچتے ہیں کوئی شے سبقت نہیں لیجا سکتی کیسی ہوشیا

کے ساتھ وہ اہرام مصری کی پیمائش یا کسی سکندر کے حالات کا مقابلہ کرینگے اور کیسی سختی کے ساتھ وہ کسی غلطی پر جو محض عجیب و غریب باتوں کی واقفیت کے متعلق ہو ملامت کریں گے حالانکہ وہ کیسے شوق اور بلا تامل یقین کے ساتھ بھدّے اور گمنام مصنفین کی محض خیالی باتوں کو اُس ملک کی نسبت پڑھتے ہیں جس سے کہ خود اُنکا ملک نہایت اہم اور نازک تعلقات سے وابستہ ہے۔ نہیں وہ ان غیر یقینی جلدوں کو مستند کتابیں بنا دینگے اور جن پر وہ اُس جوش اور قابلیت کے ساتھ اضافہ کریں گے جن کا اس سے زیادہ فیاضی کے کام میں صرف کرنا بہتر ہوتا۔

لیکن میں اس دل اکتانے والے اور بیش پا افتادہ مضمون پر زیادہ بحث نہیں کرونگا اور میں اس مضمون کیطرف قطعی توجہ نہ کرتا اگر میرے ہموطن بیجا دلچسپی کا اظہار نہ کرتے یا یقینی مضر نتائج جن کے پیدا ہونے کا مجھکو خوف ہے قومی احساسات پر اپنا اثر چھوڑ اسلئے۔ ہم ان حملوں کو ضرورت سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ ہم کو کوئی حقیقی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ غلط فہمیوں کا جال جو ہمارے گرد بنا جاتا ہے اُس مکڑی کے جالے کی مانند ہے جو ایک دیوزاد کے اعضا کے گرد تانا جائے ہمارا ملک اس سے برابر باہر نکلتا جا رہا ہے۔ ایک غلط بیانی دوسری دروغ بیانی کے بعد خود بخود زائل ہوتی جا رہی ہے۔ ہم کو صرف زندہ رہنا چاہئے اور ہر روز ہم تردید کی ایک مجلد کتاب پیش کر رہے ہیں۔

انگلستان کے تمام مصنفین یک زبان ہو کر، اگر ہم ایک لحظہ کے لئے یہ فرض بھی کر لیں کہ انکے عالی دماغ اپنے درجہ سے گر کر ایسے ایک فضول کام کے لئے متفق ہو جائیں گے ہماری روز افزوں اہمیت اور بے نظیر مرفہ الحالی کو چھپا نہیں سکتے۔ وہ یہ بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتے کہ یہ دونوں باتیں نہ صرف جسمانی اور مقامی بلکہ اخلاقی اسباب کے تابع ہیں۔ یعنی سیاسی آزادی علم کی عام اشاعت، عمدہ اخلاقی اور مذہبی اصول کی پیروی جو ایک قوم کے مسلک کو طاقت اور استقلال بخشتی ہیں اور جو فی الواقع خود اُنکی قومی طاقت و عظمت کی مسلمہ اور عجیب و غریب مؤید رہی ہیں۔

لیکن ہم انگلستان کی لعنت و ملامت کو کیوں اسقدر خیال کرتے ہیں ؟ ہم کیوں اس توہین اور گستاخی سے متاثر ہوتے ہیں جن سے وہ ہمارے ساتھ پیش آنے کی کوشش کرتا ہے۔ صرف انگلستان ہی کی رائے پر یہ بات منحصر نہیں ہے کہ عزت و آبرو قائم رہے اور شہرت حاصل ہو۔ ایک قوم کی شہرت کا فیصلہ تمام دنیا کے ہاتھ میں ہے۔ اپنی ہزاروں آنکھوں سے وہ ایک قوم کے افعال و اعمال پر نظر ڈالتی ہے اور اُن سب کو مجموعی شہادت سے قومی عظمت یا قومی بے آبروئی قائم کیجاتی ہے۔

لہذا جہانتک ہم لوگوں کا تعلق ہے یہ امر نسبتاً بہت کم اہمیت رکھتا ہے کہ انگلستان ہمارے ساتھ انصاف کرتا ہے یا نہیں۔ غالباً یہ امر خود اُس کے لئے زیادہ اہم ہے۔ وہ ایک نوجوان قوم کے سینہ میں غیظ و غضب کی آگ مشتعل کر رہا ہے جو اُس کی نشو و نما کے ساتھ بڑھتی جائے گی اور اُس کی طاقت کے ساتھ طاقتور ہوتی جائے گی۔ اگر امریکہ کو جیسا کہ انگلستان کے بعض لکھنے والے اس کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ اس کے بعد ایک قابل رشک رقیب اور ایک مہلک دشمن پائے تو اُس کو اپنے ان مصنفین کا شکر گزار ہونا چاہئے جنہوں نے رقابت اور غضبناک دشمنی کا بیج بویا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل علم ادب کا کس قدر اثر پڑتا ہے اور بنی نوع انسان کے جذبات اور آرا ر اس کے کسقدر ماتحت ہیں۔ تلوار کی لڑائیاں عارضی ہوتی ہیں۔ اُنکے زخم صرف گوشت پر لگتے ہیں اور فیاض طبع لوگ اس کو فخر سمجھتے ہیں کہ وہ اُن کو بھول جائیں اور معاف کر دیں لیکن قلم کی طعن و تشنیع دل و جگر کو چیر ڈالتی ہیں۔ اچھے سے اچھے آدمیوں کے اندر بھی اُنکا وجود عرصہ تک قائم رہتا ہے وہ دماغ میں ہمیشہ تر و تازہ رہتی ہیں اور مریض کی طرح نہایت حقیر تصادم پر اُنکا احساس ہوتا رہتا ہے۔ یہ صرف شاذ و نادر ہوتا ہے کہ کسی ظاہری فعل کی بنا پر دو قوموں کے درمیان مخاصمت قائم ہو، زیادہ تر وہی گزشتہ حسد اور بغض و عناد ہوتا ہے اور وہ رجحان طبیعت جو ناخوشگواری پیدا کرتا ہے۔ ان باتوں کے اسباب دریافت کرو اور یہ بکثرت کرایہ پر لکھنے والوں کے حصر خیالات کا نتیجہ پائے جائینگے جو اپنے کمروں میں محفوظ، ذلیل طور پر روٹی کمانے کے لئے اُس زہر کو پیدا کرتے اور پھیلاتے ہیں جو فیاض اور بہادر اشخاص کو بھی مشتعل کر دیتا ہے۔ میں اس امر پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیتا

رہا ہوں کیونکہ یہ بات نہایت تاریک طریقہ سے ہماری خاص حالت پر صادق آتی ہے اخبارات کسی قوم
پر امریکہ کے لوگوں کی نسبت زیادہ قابو نہیں رکھتے کیونکہ غریب سے غریب طبقہ کی عام تعلیم نے ہر
شخص کو پڑھنے والا بنا دیا ہے۔ انگلستان میں ہمارے ملک کے متعلق کوئی تحریر ایسی شائع نہیں ہوتی
جو ہمارے ملک کے ہر حصہ میں نہ پہنچ جاتی ہو۔ انگریزی قلم سے نہ کوئی ایسی ملامت نکلتی ہے اور نہ کوئی
ایسا بیجا طنز کسی انگریز مدبر کی زبان سے نکلتا ہے جو خوشگواری کے حس کو ٹھنڈا نہیں کرتا اور چھپے
ہوئے غضب کے ڈھیر میں آگ نہیں لگاتا۔ پس انگلستان اُس سرچشمہ کا مالک ہوتے ہوئے جس
سے کہ اس زبان کا علم ادب جاری و ساری ہے کسقدر کامل طور پر اس پر قابض ہے اور کس قدر
صحیح طور پر اُسکا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو خوشگوار اور شاندار احساس کا ذریعہ قرار دے۔ ایک
دریا جہاں دونوں قومیں ایک دوسرے سے مل سکیں۔ لیکن اگر وہ اس کو تلخی کے سمندر سے بدلنے
پر مصر ہے تو ایک زمانہ آئیگا۔ اپنی اس حماقت پر افسوس کریگا، امریکہ کی موجودہ دوستی،
ممکن ہے ... جو اس ہے جواب کا کبھی نہ رکھتی ہو لیکن اُس ملک کی آئندہ ترقی میں کوئی شک
ہے۔ وابات انگلستان میں کبھی شائع نہیں ہے پر کچھ شک وشبہات کے بادل نظر آتے ہیں۔ پس اگر تاریکی کا
لیکن وہ ہمارے مصنفین میں جگہ پائے جس سے مغرور مغرور سلطنتیں مستثنیٰ نہیں رہیں۔ تو وہ
علم ادب کی شیریں رفتاری کو تلخ کر دیگا اور اُس قوم کو اپنی بغل سے نکالنے پر جو اُس کے سینے سے
اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ وہ ... ہے باہر کی حقیقی دوستی کے موقع کو ہاتھ سے
کھو ... اثر ہے وہ زہریلے قومی تعصبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ یہ احر ... ایسی ہے جس کا ہونا
ہونا چاہئے چونکہ ہم رائے عامہ کے زیر فرمان ہیں، پس نہایت احتیاط برتنی چاہئے کہ پبلک کا دماغ
صاف وشفاف رہے۔ علم طاقت ہے اور صداقت علم ہے لہذا جو شخص
بوجھکر اپنے ملک کی طاقت کی بنیاد کا خون چوستا ہے۔
سب آدمیوں سے بڑھکر ایک جمہوری سلطنت کے از
اتحاد اہے۔ وہ انفرادی حیثیت سے شاہی دماغ اور شاہی مرض

خاندان کے اعتماد اور مہمان نوازی کے لئے ایک پرداشدہ وار ہی تھا اور ناشکر گزار اور بیکار لوگوں
نے بھی عارضی رواج سے فائدہ اٹھایا۔ تمام ملک میں انگلستان کے خیال کے ساتھ ایک جوش
بھرا ہوا تھا۔ ہم اُس کو محبت اور احترام کے ز احساس کی نظر سے اپنے بزرگوں کا وطن سمجھتے تھے۔
اپنی نسل کے مقبروں اور قدیم یادگاروں کا مخزن۔ ہماری آبائی تاریخ کے سورماؤں اور دانشمند
مقبرہ اور جائے پیدائش۔ ہمارے اپنے ملک کے بعد کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی شان و عظمت سے
ہم زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی عمدہ رائے حاصل کرنے کا ہم کو بیحد خیال ہو
کوئی ایسا ملک نہ تھا جس کی طرف ہمارے دل قرابت اور خون کے جوش سے ایسے مائل ہوں۔ گزشتہ
لڑائی کے زمانہ میں بھی جہاں کہیں نرم احساسات کو پیدا ہونے کا کم سے کم موقع ملا۔ ہمارے ملک کے
فیاض دلوں کو اس میں مسرت ہوئی کہ دشمنی کے زمانہ میں بھی وہ ظاہر کریں کہ اُن میں اتحاد و یگانگت
کی چنگاریاں موجود ہیں۔

کیا ان تمام باتوں کا خاتمہ ہونے کو ہے؟ کیا یہ سنہری اور غضبناک دشمنی کا بیج بویا ہوں میں
اس قدر شاذ ہے ہمیشہ کے لئے ٹوٹنے والا ہے؟ غالباً یہ سب نوع انسان کے جذبات اور آرزو
ہو جائے گا جو ہم کو دماغی غلامی میں رکھتا جو اکثر ہمارے اصلی ہیں۔ اُنکے زخم صرف گوشت پہ لگتے ہیں
مباہات کے نشو و نما میں حائل ہوتا۔ لیکن نسلی رشتہ کو ترک کرنا مشکل اور معاف کر دیں لیکن قلم کی طعن و
احساسات ہیں۔ جو فخر و مباہات کی نسبت سے نیز دیتوں نے اندر بھی اُنکا وجود عرصہ تک قائم رہتا ہے
دماغ میں ہمیشہ تر و تازہ رہتی ہیں اور مریض کی طرح نہایت تصادم پر اُنکا احساس ہوتا رہتا ہے۔
یہ صرف شاذ و نادر ہوتا ہے کہ کسی ظاہری فعل کی بنا پر دو قوموں کے درمیان مخاصمت قائم ہو، زیادہ
تر وہی گزشتہ حسد اور بغض و عناد ہوتا ہے اور وہ رجحانِ طبیعت جو ناخوشگواری پیدا کرتا ہے۔
ان باتوں کے اسباب دریافت کرو اور یہ بکثرت کرایہ پر لکھنے والوں کے حضر خیالات کا نتیجہ پائے جائینگے
جو اپنے کمروں میں محفوظ، ذلیل طور پر روٹی کمانے کے لئے اس زہر کو پیدا کرتے اور پھیلاتے ہیں جو
فیاض اور بہادر اشخاص کو بھی مشتعل کر دیتا ہے۔ میں اس امر پر ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیتا

دسے آور تعصب پیدا کرے اور یہ ہمارے نکلنے والوں میں وسعت کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ ہم کو ایسے مزاج کی خاص طور پر نگہداشت کرنی چاہیے کیونکہ اس سے دگنی خرابی ہو جائے گی بجائے اس کے کہ غلطی کا ازالہ ہو۔ کوئی شے اسقدر آسان اور ترغیب دہ نہیں ہے جس قدر دشنام اور طنز کا جواب لیکن یہ بیکار اور فضول جھگڑا ہے۔ یہ دماغی خرابی کا دوسرا نام ہے جو غیظ و غضب کی بجائے چڑچڑا پن پیدا کرتی ہے۔ اگر انگلستان تجارت کی کینہ رقابتوں یا سیاسی نفرت انگیز دشمنی سے اپنے اخبارات کو دیانت و صداقت سے محروم ہونیکی اجازت دیتا ہے اور رائے عامہ کے سرچشمہ کو زہر آلودہ بناتا ہے تو ہم کو اس کی مثال سے احتراز کرنا چاہیے، وہ اپنا فائدہ غلطی کی اشاعت اور خصومت پیدا کرنے میں سمجھا کرے تاکہ ترک وطن پر لوگ آمادہ نہ ہوں لیکن ہمارا تو کوئی ایسا مقصد نہیں ہے۔ نہ ہم میں قومی حسد کی آگ بھڑک رہی ہے کیونکہ اتبک انگلستان کے خلاف تمام رقابتوں میں ہم ہی کامیاب اور فائدہ مند فریق رہے ہیں۔ لہذا دل کا بخار نکالنے کے سوا جو بدلہ لینے کی محض ایک خواہش ہے جواب کا کبھی خاتمہ نہیں ہو سکتا اور یہ امر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ ہمارے جوابات انگلستان میں کبھی شائع نہیں ہوتے۔ پس وہ اپنے مقصد کی ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں لیکن وہ ہمارے مصنفین میں جھگڑالو طبیعت اور چڑچڑا پن پیدا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے ابتدائی علم ادب کی شیریں رفتاری کو تلخ بناتے ہیں اور اس کی کلیوں میں جھاڑیاں اور کانٹے بوتے ہیں۔ اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ وہ صرف ہمارے ہی ملک میں اشاعت پذیر ہیں اور جہانتک انکا دائرہ اثر ہے وہ زہریلے قومی تعصبات کو مشتعل کرتے ہیں۔ یہ آخری خرابی ایسی ہے جس کا فوراً انسداد ہونا چاہیے چونکہ ہم رائے عامہ کے زیر فرمان ہیں، پس نہایت احتیاط برتنی چاہیے کہ پبلک کا دماغ صاف و شفاف رہے۔ علم طاقت ہے اور صداقت علم ہے لہذا جو شخص

بوجھکر اپنے ملک کی طاقت کی بنیاد کا خون چوستا ہے۔

سب آدمیوں سے بڑھکر ایک جمہوری سلطنت کے اذ...

اتحاد اہے۔ وہ انفرادی حیثیت سے شاہی دماغ اور شاہی...

کے جملہ مسائل کو خاموشی اور غیر متعصبانہ فیصلوں سے طے کرنا چاہیئے ۔ انگلستان سے ہمارے تعلقات
ایک خاص قسم کے ہیں پس ایک مشکل اور نازک قسم کے سوالات بار بار پیش آتے ہیں جو کسی اور
قوم کے ساتھ ہم کو پیش نہیں آتے ۔ وہ مسائل جو نہایت سخت اور مشتعل کرنے والے احساسات پر
اثر ڈالتے ہیں اور چونکہ انکے درست کرنے میں ہمارے قومی پیمانے عام احساس کے لحاظ سے
کلی طور پر طے ہو جانے چاہئیں اور ہم کو تمام پوشیدہ جوش یا تعصب سے پاک وصاف ہو جانا چاہیئے۔
جیسا کہ ہم زمین کے ہر حصہ کے اجنبیوں کے واسطے محتاج خانے بناتے ہیں ہم کو چاہیئے
کہ ہم سب کو کسی تعصب کے بغیر خوش آمدید کہیں ۔ کم از کم ہم کو ایسی ایک قوم کی مثال پیش کرنے پر
فخر کرنا چاہیئے جو قومی مخاصمتوں سے پاک ہو اور مہمان نوازی کے ظاہری افعال ہی سے نہیں بلکہ
زیادہ شاذ ونادر شریفانہ اخلاق کو کام میں لانا چاہیئے جو آزادی رائے سے پیدا ہوتا ہے۔
قومی تعصبات سے ہم کو کیا مطلب ہے ؟ یہ قدیم ممالک کے امراض مزمنہ میں سے ہیں جو جاہلیت
اور وحشت کے زمانہ میں وجود میں آئے تھے جب قومیں ایک دوسرے کا حال کچھ نہ جانتی تھیں
اور اپنی حدود کے باہر دوسروں پر بے اعتباری اور خصومت سے نظر ڈالتی تھیں ، برخلاف اسکے
ہماری قومی زندگی ایک تاباک اور فلسفیانہ عہد میں وجود میں آئی ہے جبکہ آباد دنیا کے مختلف حصص
اور انسانی خاندان کی مختلف شاخیں ان تھک کوشش کے ساتھ مطالعہ کی گئی ہیں اور ایک دوسرے
کو بتائی گئی ہیں اور ہم اپنے پیدائشی حقوق سے بھی محروم ہو جائیں گے اگر ہم قدیم دنیا کے قومی
تعصبات کو دور نہ کریں جیسا کہ ہم مقامی اوہام کو بے بنیاد ثابت کرتے ہیں ۔
لیکن سب سے ضروری یہ امر ہے کہ ہم پر غیظ وغضب کے خیالات کا اثر نہ ہونا چاہیئے اور ہم کو
گزشتہ حسد اور بغض سے اور قابل تعریف امور ہیں اُن سے اپنی آنکھیں بند نہ کرنی چاہئیں ۔
ان باتوں کے اسباب دریافت ناہم دوسروں کی نقل کرتے ہیں اور بڑی حد تک ہم اپنے نمونے
جو اپنے کمروں میں محفوظ ، ذلیل ہوں سے لیتے ہیں ۔ ہمارے مطالعہ کے لئے کوئی ملک انگلستان
فیاض اور بہادر اشخاص کو بھی شامشروطہ کی روح ہمارے آئین حکومت سے نہایت مشابہ ہے۔

وہاں کے لوگوں کے طریقے۔ ان کی دائمی جدوجہد، اُن کی آزادخیالی، اُن کی عادات ان مضامین پر غور کرنے کی، جو نہایت عزیز فوائد اور نجی زندگی کی نہایت متبرک عادتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تمام امریکی شعار سے ملتے جلتے ہیں اور فی الواقع یہ تمام حقیقی عمدہ صفات ہیں کیونکہ برطانیہ کی مرفہ الحالی کی گہری بنیادیں وہاں کے لوگوں کے اخلاق پر رکھی گئی ہیں۔ اور اوپر کی عمارت کیسی ہی پرانی یا برائیوں سے لبریز ہو لیکن کچھ نہ کچھ مضبوطی بنیاد میں ہے اور سامان بھی قابل تعریف ہے اور عمارت کی ساخت استوار ہے جو اس قدر عرصہ تک دنیا کے طوفان میں بغیر جنبش قائم رہی ہے۔

لہٰذا غصہ کے خیالات کو دور کرکے اور برطانوی مصنفین کی تنگ خیالی کا بدلہ لینے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ہمارے مصنفین کا یہ فخر ہونا چاہئے کہ انگریزی قوم کا ذکر تعصب کے بغیر اور سلے شدہ دیانت کے ساتھ کریں۔ جبکہ وہ اُس بلاامتیاز تقلید کو ملامت کی نظر سے دیکھتے ہیں جس سے ہمارے بعض ہموطن ہر اُس چیز کی جو انگریزی ہے محض اس خیال سے کہ یہ انگریزی ہے تعریف کرتے اور نقل کرتے ہیں ان کو آزادی کے ساتھ ظاہر کرنا چاہئے کہ کیا چیز واقعی پسندیدگی کے قابل ہے۔ اس طرح ہم کو انگلستان کو اپنے سامنے حوالہ کی ایک مستقل کتاب کی طرح رکھ کر استعمال کرنا چاہئے جس میں سالہا سال کے تجربوں کے عمدہ نتائج درج ہیں اور جبکہ ہم ان غلطیوں اور فضولیات سے اجتناب کریں جو کتاب کے صفحہ میں تحریر ہوگئی ہوں ہم کو اس سے عملی دانشمندی کے سنہری اصول اختیار کر لینے چاہئیں تاکہ ان سے ہم اپنے قومی شعار کو مستحکم اور خوبصورت بنا سکیں۔

رائے

۱۹۲۸ء کے انگریزی ماہ نومبر کی خدا جانے کس تاریخ کو حضرت قبلہ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب غفران مکان کے ہمراہ برادر مکرم ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب ایم اے بی ایچ ڈی پرنسپل جامعہ ملیہ دہلی ایک بڑی جگہ بیٹھے ہوئے تھے اور ہم بھی حکیم صاحب علیہ الرحمۃ ڈاکٹر انصاری صاحب سے باتیں کر رہے تھے کہ یکایک موصوف کی نظر ہمارے اوپر آپڑی (یہ دور بیٹھنے والے پر نظر جا پڑی کی صنعت ہے آپڑی) ہم نے فوراً ادب سے سلام عرض کیا تو اخافر ماکر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے فرمایا!

"اجی یہ ہیں ملا رموزی"

تو ذاکر صاحب بڑے تپاک سے اٹھے اور ہم سے مصافحہ فرمایا (حالانکہ موقع معانقہ کا تھا) اور یہ بھی فرمایا کہ

"میں تو جرمنی میں بھی آپ کے مضامین سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ آج آپ کی صورت بھی دیکھ لی۔"

ہم یہ سمجھے کہ او ہو ابتو ہمارے مضامین ڈاکٹر سر محمد اقبال کے پیام مشرق اور مثنوی وغیرہ سے بھی بڑھ گئے اور انکی خوبی اور مقبولیت کا اب یہ عالم ہے کہ وہ جرمنی زبان میں بھی ترجمہ ہونے لگے ؟ مگر ڈاکٹر صاحب کے بیان سے یہ حسرت انگیز تردید بھی ہو گئی کہ ۔جرمنی میں مضامین پڑھنے سے قیام جرمنی مراد ہے نہ کہ زبان جرمنی۔ظاہر ہے کہ اس تردید سے ہمارے دل پر ایک ضرب شدید تو پڑی مگر ہم نے خود کو سنبھال کر فوراً رسالہ "جامعہ" کا تذکرہ شروع کر دیا اور ڈاکٹر صاحب کو اپنا یہ احسان جتایا کہ

"ہم نے جامعہ کے علیگڑھی دور میں وہ مضامین لکھے ہیں جو اصطلاح میں "معرکۃ الآرا" کہلاتے ہیں۔"

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "مگر ابتو آپ نے جامعہ کو بھلا ہی دیا"

تو ہم نے بھی تو الحمد یہ عرض کیا "جامعہ تو اب بالکل ہی یتیم اور ملجیٰ و ماویٰ ہو گیا ہے " اور ہمیں تماشے اتنی ہی وحشت ہوتی ہے جتنی ہندوستانی پولیس والوں کو ہڑتالیوں سے "۔

تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "آپ اپنے ہی رنگ میں لکھئے"

اس لئے بہ الفاظ اخبار "ریاست دہلی" ان اوپر کے حالات کی وجہ سے۔ جامعہ میں یہ یتیمی مضمون پیش کرتے ہیں۔ خدا اسے قبلہ مولانا اسلم جیراجپوری کی نظر سے بچائے۔ کہ کہا ہے ؎

گر قبول افتد زہے عز و شرف

اس مضمون کا عنوان ہے: رائے، اس سے مراد کوئی رائے بہادر یا رائے سینا دہلی نہیں جہاں سرجان سائمن ڈیرے جاتے پڑے ہیں۔ بلکہ رائے سے مقصود قدرت کا وہ گراں منزلت انعام و عطیہ ہے جس پر انسانی عروج و ترقی، اصلاح و رہنمائی، امن و سلامتی کا مدار و انحصار ہے، اور اگر یہی چیز برطانوی پارلیمنٹ کو بھی روزی ہوتی تو وہ قیامت تک کمیشن کو ہندوستان نہ بھیجتی جس کی وجہ سے دن بھر اپنے شہروں کی دکانیں بند رکھی گئیں۔ ہمیں جہاں تک یاد ہے "رائے" اس فکری قوت کا نام ہے جو انسان کو انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نہایت درجہ صحیح اور مفید مشورہ دیتی ہے، اور جہاں تک علم ہے یہی وہ قوت ہے جس کے نقدان، کمی، یا غلط روی سے انسان پھر دواخانہ یونانی دہلی ہی کا محتاج ہو جاتا ہے یا پھر اسے کچھ دن کبوتر میں رہنا پڑتا ہے، انفرادی حیثیت سے رائے کی قوت انسان کے مزاجی اعتدال یا عمدہ تندرستی سے طاقتور ہوتی ہے اور اجتماعی حیثیت سے افراد ملک کی رائے اسی حالت میں صحیح رہ سکتی ہے جب وہ کسی جماعتِ قومی کے تابع ہوں یا ان پر کسی منتظم حکومت کا احتساب ہو، بخلاف اس کے جن لوگوں کی صحت میں اعتدال نہیں ان سے یہ قوت سلب ہو جاتی ہے اور انہی سے تلون پیدا ہوتا ہے اور وہ چند دن بھی کسی ایک رائے پر قائم نہیں رہ سکتے، یہی حال ان غلام افراد کی رائے کا ہوتا ہے جن پر اپنی قومی حکومت کا احتساب نہیں ہوتا۔

رائے کی اصابت اور پختگی کا ایک ذریعہ اعلیٰ تعلیم و تربیت بھی ہے مگر یہ اپنے ہندوستان کا بی۔ اے یا ایم۔ اے پن نہیں کیونکہ اس سے تو صرف انگریزی زبان بولنا اور لکھنا آجاتا ہے (یہ ایم۔ اے پن جلاہا پن کے وزن پر ہے) بخلاف اس کے جن لوگوں کو اپنی قومی حکومت حاصل نہیں اُن کی رائے میں اصابت اور پختگی نہیں ہوتی، ہر شخص اپنی اینٹوں والی مسجدوں میں نماز پڑھنے کا طالب نظر آتا ہے اور ایسی ہی قومیں ہوتی ہیں جو عروج دار تقا اور وحدت و جامعیت کا کبھی منہ نہیں دیکھ پاتیں۔ اور اُن میں ہمیشہ افتراق دیرہی موجود رہتی ہے۔ لیکن تم ترکی جامعۂ قومی یا جامعۂ ایران پر ایک نظر ڈالو جہاں مصطفےٰ کمال پاشا اور شاہ رضا خاں کی ایک آواز پر وہاں کے بڑے بڑے ارباب رائے بغیر کسی اختلاف و تردید کے آمادۂ عمل ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے رہنمائے اعظم کے خلاف اپنی کوئی علیحدہ رائے ہی نہیں رکھتے۔ لیکن ایک اپنا ہندوستان بھی ہے جس کے اندر آج ۳۲ کروڑ افراد کی ۳۳ کروڑ قسم کی رائے بھی ہیں۔ جہاں ہر شخص مختار ہے کہ جب چاہے کانگریس، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، ہندو مہاسبھا وغیرہ سے کنارہ کشی کرلے یا لیڈروں میں سے کسی کا مخالف ہو جائے۔ پس اس اختلاف رائے کے اسباب یہ ہیں۔

(۱) کوئی قومی احتساب و سزا نہیں جس کے خوف سے افراد کی رائے ایک متحدہ مرکز عمل کی تابع رہ سکے۔

(۲) صحیح تعلیم و تربیت نہیں جو اُن کو ایک متحدہ مرکز کے تابع بنائے رہے۔

(۳) قوم کے سامنے خود لیڈروں کا کوئی متفقہ مقصد نہیں۔ گویا خود لیڈروں کی بھی کوئی رائے نہیں۔

(۴) قوم کی صحت یقیناً معتدل نہیں، اور اُس میں امراض یا آلام کو کثرت سے دخل ہے جس کے اثر سے اُنکے دماغ معطل نہیں تو متاثر ضرور ہیں۔

(۵) جن لوگوں کی صحت اچھی ہے جو تعلیم یافتہ بھی ہیں اور جو صحیح رائے قائم کرنے کے اہل بھی ہیں اُن پر بھی کوئی سزا یا احتساب عائد نہیں۔ لہٰذا اُنکی رائے بھی صحت کے اعتبار سے ناقص اور

بعض مواقع پر غلط ہو سکتی ہے، جیسے ہندوستانی لیڈر جن کے اعمال پر کوئی گرفت و پرسش نہیں بخلاف اس کے مغربی ممالک میں ایسے آزاد رائے رکھنے والے لیڈر ہلاک کر دیئے گئے ہیں جنہوں نے اظہار رائے میں غلطی کی لیکن ہندوستان میں مذکور غلطیاں یا کمزوریاں موجود ہیں۔

نپولین بوناپارٹ کے متعلق ایک نہایت پرانے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ جب وہ کسی رائے کو ظاہر کرنا چاہتا تھا تو ایک کھلے میدان میں اکڑ کر کھڑا ہو جاتا تھا، پھر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر گردن کو سینہ کی طرف جھکا تا تھا اور کئی گھنٹہ سوچا کرتا تھا، پھر جو رائے وہ اس غور کے بعد قائم کر لیتا تھا اس پر شدت سے عمل کرتا تھا۔ لیکن دنیائے انسانیت کے مصلح اعظم حضور اقدس و اعلیٰ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے بتلایا تھا کہ تم اپنی قائم کی ہوئی رائے پر دوسرے ذی شعور لوگوں سے رائے لیلو تاکہ اس کی پختگی پر تمہیں کامل اعتماد ہو جائے اور اسی کو اصطلاح میں "مشورہ" کہا گیا تھا، اور حضور اقدس علیہ السلام کے اس حکمت فروز کلمہ ہی سے اس امر کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ "رائے" کس درجہ ذمہ دارانہ یا اہم قوت کا نام ہے جس کے لئے اس قدر اہتمام کی ضرورت ہے لیکن ہندوستان میں یہ کچھ بھی نہیں بلکہ یہاں کا کم سن، کم علم اور ناوان طالب علم بھی کانگریس اور جمعیۃ علماء کے اعمال و احکام پر رائے دے سکتا ہے اور اس وہ اپنے ساتھیوں کو بھی متاثر کرتا ہے، بس اخبار کا پڑھ لینا آگیا کہ رائے کی تمام ذمہ داریاں گویا آئینہ ہو گئیں اور حق یہ ہے کہ اجتماعی حیثیت سے بھی فکری آزادی یا آزادیٔ رائے ہی جو ہندوستان کی ہر اجتماعی تحریک کی بربادی کا سبب بنی ہوئی ہے اب ذیل میں ایسے آزاد رائے طبقات کے چند نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

علمائے کرام۔ مسلمانوں کے اعتقادی نقطۂ نظر سے بھی وہ مقدس و محترم طائفہ ہے جس کی رائے پر مسلمانوں کی جملہ تحریکات کا مدار ہے اور اسی طرح از روئے ضوابط اسلامی بھی وہ طبقہ ہے جس پر مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہے لیکن مجھے جرأت سے کہنے دیجئے کہ اس محترم طبقہ

میں رائے کی ذمہ داری کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ گو ایسے بھی قابل احترام علماء موجود ہیں جو رائے کی ذمہ داری کو بطریق احسن محسوس فرماتے ہیں لیکن ایسے بیدار مغز علماء کی تعداد کم ہے، اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی متعدد جماعتیں ہیں جو ایسے علماء کرام کے تابع غیر اصول بلکہ تباہ کن زندگی میں مبتلا ہیں جو اپنی رائے کی ذمہ داری کو محسوس نہیں فرماتے، اور جو اجتماعی اور انفرادی رائے کے فرق اور اثر سے بے خبر تو کیا بے پرواہ ہیں، جہاں کوئی اجتماعی تحریک رونما ہوئی اور علمائے کرام میں اظہار رائے کا مجادلہ شروع ہوگیا جس نے جو چاہا کہدیا۔ ہاں علیگڑھ، اسلامیہ کالج پشاور، اسلامیہ کالج لاہور کے مسلمان طلبہ کے لئے انکے انگریزی لباس کے لئے اُنکی مذہبی ناواقفیت کے لئے انکے انگریزی اخلاق و آداب کے لئے جس قسم کی رائے چاہے خرید لیجائے، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ علمائے کرام اپنی رائے اُن مسائل کے خلاف بھی ظاہر فرماتے ہیں جو مجلس مرکزی یعنی جمعیۃ العلماء ہند کی متفقہ رائے ہوتی ہے اور علماء محترم کا ایسا آزادانہ اختلاف بھی حقیقت میں کسی قومی یا ریاستی احتساب کے فقدان کا نتیجہ ہے، اور ہندوستان میں تو اختلاف رائے نے عقائد تک متاثر کر کر جماعتیں بھی پیدا کر دی ہیں جو اکثر ان بیچاری لیڈروں کے جلسوں میں لٹھ لیکر گھس جاتی ہیں جن کے مظاہرے سلطان ابن سعود کی مخالفت میں کثرت سے دیکھے گئے۔

لیڈروں کی رائے۔ جب سے مسلمانوں نے علوم دین کی تحصیل و تعلیم بغیر انگریزی تعلیم پر اکتفا کرلیا اسوقت سے یہ قابل نفرت اور نقصان رساں خیال مسلمانوں میں جڑ پکڑ گیا کہ۔ دین اور سیاست دو علیحدہ چیزیں ہیں اور یہ سمجھ لینے کا سبب بھی اسلامی حکومت کا فقدان تھا۔ گو یہ خیال ابھی ہندوستان میں جرأت سے ظاہر نہیں کیا جاتا لیکن غیر دینی تعلیم نے اس خیال کو راسخ ضرور کر دیا ہے اور یہ غیر محسوس رفتار سے پوری سرعت سے ترقی کر رہا ہے، اور بعض معاملات میں عملی صورت بھی اختیار کر چکا ہے، ورنہ علماء کرام کے بعد لیڈر کوئی دوسری چیز نہیں تھے، لیکن جب سے دینی کا اثر ہے آج علماء کرام اور لیڈر دو علیحدہ علیحدہ چیزیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ شرعی اور اخلاقی اعتبار سے دونوں کی ذمہ داری ایک ہی ہے۔ بہرحال لیڈر کی رائے بھی بڑی قیمتی شے ہے اور رائے جس ذریعہ مضبوط

اور صائب ہونا چاہئے وہ ظاہر ہے اور یہ صرف اجتماعی حیثیت سے ورنہ انفرادی حیثیت سے تو آج تمام ہندوستانیوں کو حق حاصل ہے کہ وہ کہدیں کہ صبح سویرے بغیر انگریزی چاے پیئے ڈکار لینا بھی حرام ہے۔ یا ہم کہدیں کہ ہندوستانیوں کا موجودہ کثرت کے ساتھ چائے پینا بھی مغربی لوگوں کی تمدنی یا معاشرتی غلامی ہے۔ بس اجتماعی حیثیت سے ملک کے موجودہ لیڈروں کی رائے آج جس درجہ ارزاں اور اختلاف افزا ہوا کرتی ہے ظاہر ہے ان حضرات میں اختلاف رائے کی بڑی وجہ یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے مقابل کی اتباع کو برداشت نہیں کرسکتے اور اسی سے اُن کے مزاج یا صحت کے غیر معتدل ہونے کا علم ہوسکتا ہے۔ یقین نہ ہو تو قبلہ مکرم حکیم محمد احمد صاحب کو نبض دکھا کر معلوم کرلیجئے۔ اسی طرح اظہار رائے میں جو عجلت اس طبقہ کی طرف سے ظاہر ہوتی ہے وہ بھی لیڈری کی ذمہ داری کے منافی ہے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہے کہ عوام میں ذہنی استعداد نہ ہونے کے باعث اس اختلاف رائے کو بھی اُسی طرح قبول و اختیار کیا جاتا ہے جس طرح علماء کرام کی جماعتوں میں دکھایا گیا ہے، اور یہ لیڈروں کے اختلاف رائے ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ملک میں بے شمار انجمنیں اور کانفرنسیں نظر آتی ہیں جو کسی صحیح مرکز سے وابستہ نہیں، ورنہ اصولاً ہونا یوں چاہئے تھا کہ مسلمانوں کی تمام جماعتیں جمعیۃ علماء سے وابستہ ہوتیں کہ ہر اعتبار سے یہی مجلس مسلمانوں کے تمام مسائل کی ذمہ دار ہوسکتی ہے، اور مجلس خلافت مجلس تبلیغ، اور مسلم لیگ اس کی شاخیں سمجھی جاتیں، اسی طرح ہندو بھائیوں کے ہاں، ہندو مہا سبھا کو مجلس اعلیٰ بنایا جاتا اور اسکا اقتدار۔ شدھی سبھا، آریہ سبھا، ہندو آدی سبھا، اور گورکھشا وغیرہ پر ہوتا۔ لیکن ایسا چونکہ نہیں ہورہا وہ اسی لئے کہ لیڈروں کی رائے پر بھی کوئی احتساب و سزا نہیں یہ ہر جگہ لفظ سزا کے معنی آپ بعبور دریائے شور والی سزا نہ سمجھ لیجئے بلکہ اس سے مقصد اعمال کی پرسش یا گرفت ہے۔ یا خوف پرسش، مثلاً یہ جو انگریزوں کے خلاف باغیانہ مضامین لکھنے میں ہم انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں سو اسی لئے کہ کہیں ذراسی غلطی پر کوتوال صاحب ہم سے ملاقات کو نہ آجائیں یا لالہ لاجپت رائے کوئی باغیانہ کتاب لکھنے میں جو تامل کرتے ہیں سو اسی لئے کہ

کہیں جلاوطنی کا معاملہ پھر شروع ہو جائے۔ لیکن انگریزوں سے بے خوفی اور عدم پرستش کی آزادی دیکھنا ہو تو اپنے مولانا محمد علی و شوکت علی مدظلہم کو دیکھ لیجئے کہ جو انگریزوں کے خلاف یہی لکھتے رہتے ہیں کہ۔

"ڈرنا برحق نہیں مرنا برحق ہے"

غرض لیڈروں کی رائے کی ذمہ داری خود لیڈروں کے ذہن میں نہیں اور اسی لئے ملک بے شمار جماعتوں پر تقسیم ہو چکا ہے۔

ایڈیٹروں کی رائے۔ علما کرام اور لیڈروں کے بعد ایڈیٹروں کی جماعت ہے جس کی رائے اجتماعی حیثیت سے بے حد عظمت و اثر کی مالک ہے ورنہ انفرادی حیثیت سے تو اپنے اپنے اخبار کے ایڈیٹر صاحب بھی زندہ ہیں پس اس جماعت کی رائے میں بھی بے حد اصابت، وحدت، اتباع اور سنجیدگی کی ضرورت تھی لیکن اس جماعت میں تعلیم و تربیت کے نقائص زیادہ کارفرما ہیں اور کوئی ایڈیٹر نہیں جو کسی دوسرے اخبار کی پختہ اور صحیح رائے کی اتباع کو پسند کرتا ہو اور اسی لئے اسلامی جرائد کے سامنے کوئی متفقہ مقصد نہیں، بلکہ الٹی ترکیب یہ اختیار کر لی ہے کہ بجائے رہنمائی کے عوام کے ذوق کی پیروی کرتے ہیں اور جو کبھی اظہار رائے کا موقع آجائے تو پھر اس کثرت سے رائیں شائع ہوتی ہیں کہ اُن سے "باہتمام مولوی مقتدیٰ خاں شروانی" ہزاروں کتابیں شائع کر سکتے ہیں، اسی طرح اظہار رائے میں انتہائی عجلت سے کام لیا جاتا ہے گویا اخبار کا مقصد ہی یہ ہوا کہ اگر وہ روزانہ ہے تو روزانہ ایک نئی رائے کے اشاعت بھی اخباری فرض ہے اور یہ اسی بے اصول رائے زنی کا اثر ہے کہ ناظرین اخبارات میں بھی کسی اجتماعی رائے کی اتباع کی صلاحیت نہیں بلکہ خود ناظرین اخبارات میں بھی اہل الرائے ہونا ہر خریدار کے لئے ضروری چیز ہو گیا ہے اور یہ طے شدہ معاملہ ہے کہ اخبار کا ہر مضمون پڑھ کر اس پر اظہار رائے بھی کیا جائے جیسا کہ جنگ یورپ میں جرمنی فتوحات پر ناظرین اخبارات میں اظہار رائے ہوا کرتا تھا اور یہ اخبار بیں طبقہ ہی کی رائے تھی کہ جرمنی مصر کو فتح کر چکا اور قیصر جرمنی جمعۃ الوداع کی نماز جامع مسجد

دہلی میں پڑے گا۔ کیونکہ وہ مسلمان ہو چکا ہے، اس وقت ہم نے بھی رائے دی تھی کہ دیکھنا قیصر جرمنی مسلمان ہونے کے بعد اگر مرید ہو گا تو اپنے خواجہ حسن نظامی کا ورنہ وہ بے پیرا ہی پھرتا رہے گا اس بے راہ روی اور فکری آزادی کا نتیجہ یہ ہے کہ خود اخبار نویسوں اور اخبار بین حضرات کی رائے میں وحدت نہیں، اور یہ بھی نتیجہ ہے عدم احتساب کا۔

ہماری رائے ۔ اس معاملہ میں جہانتک تجربہ ہوا ایسی ایک ہم بہت محتاط انسان ہیں، قوم تو قوم انفرادی حیثیت سے بھی ہم کبھی اپنی رائے ظاہر نہیں کرتے اور اس کے "جملہ حقوق بحق جمعیۃ العلماء محفوظ رکھتے ہیں، اسکا بڑا فائدہ تو یہی دیکھا کہ آجتک ہم قوم کی نظر میں "بے وقوف قرار نہ پائے" اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ خدا کے بے گناہ بندے ہماری رائے کی غلطی سے محفوظ رہے۔ مگر وہ جو فارسی زبان میں کہا ہے ؎

خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

سو ہمارے دوستوں میں ایک دوست مولوی سید محمد عسکری وکیل مصطفےٰ آبادی بھی ہیں جو علاوہ ایک بے مثل قانون داں ہونیکے "اہل الرائے" بھی ہیں، وکیل صاحب آج کل ریاست بھوپال میں وکالت کرنے تشریف لے گئے ہیں مگر ایک زمانہ تھا جب آپ کو علامہ شبلی اور اکبر الہ آبادی کے قریب تر بیٹھنے کا فخر حاصل تھا اور محمد حسین مغفور کی یہ انہی علمی، ادبی، تاریخی، و معاشرتی صحبتوں کا ماہوار اثر ہے کہ وکیل صاحب موصوف کو ہم سے اس وقت سے محبت ہے جب ہماری افلاس کی وجہ سے امیر آدمی ہماری عزت ذرا کم کیا کرتے تھے۔ مگر وکیل صاحب اُس وقت بھی ہمارے پاس یہ کہکر تشریف لاتے تھے کہ

ملا صاحب!

"جس طرح ارباب ذوق و اصحاب علم و فضل علامہ شبلی اور اکبر کی خدمت میں کسب فیض کے لئے جاتے تھے میں بھی اسی حیثیت سے آپ کے پاس حاضر ہوتا ہوں۔"

وکیل صاحب کے اس خیال میں ایک بات انکے فائدے کی بھی تھی یعنی وہ خود

ہی سے ارباب ذوق و اصحاب علم و فضل کے ہم پایہ سمجھکر ہمارے پاس آتے تھے۔ وکیل صاحب کا دوسرا خیال یہ بھی ہے کہ میں علاوہ قانون دانی کے مذہب اور سیاست دانی میں بھی فرد ہوں گویا گاماں پہلوان سے لڑنے والے زبسکو بھی ہیں جو وکیل تھا اور پہلوان بھی، غرض وکیل صاحب کی ملاقات کا خلاصہ یہ ہوا کرتا تھا کہ ہر بات کے شروع میں وہ فرماتے تھے کہ

"مگر میری رائے میں تو کانگریس کا وجود ہی بے کار ہے"

تو ادھر ہر بات کے خاتمہ پر ہم فرماتے تھے کہ

"جی ہاں مگر میری رائے میں بھی یہ اسلامیہ کالج قوم کی ذہنی حالت کو تباہ کرنے والے ہیں اور میری رائے میں اخلاق و مذہب تو ان کالجوں کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے"

غرض لفظ "میری رائے میں" کا ہم دونوں اس کثرت سے استعمال کرتے تھے کہ ایک دوسرے کو تفضیلت اور فسخ کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا تھا۔ مگر آخر میں وکیل صاحب نے ایک بصیرت فروز نکتہ یہ بتلایا کہ

ملّا صاحب!

"یہ جو کچھ اظہار رائے ہوتا ہے اسے صرف "خانگی" ہی رہنے دیجئے"

پہلے تو ہم نے کسی قدر غصہ سے اس "خانگی" پر غور کیا مگر فوراً ہی سمجھ گئے کہ وکیل صاحب کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص پر فرض ہے کہ وہ اپنی رائے کو صرف ایک ذاتی خیال سمجھے اور قومی و ملکی مسائل میں ہمیشہ اپنے لیڈروں اور اپنی ملکی و قومی مجالس کی رائے کو قابل اتباع سمجھے تاکہ قوم کے متفقہ اور اجتماعی مسائل میں افتراق و برہمی پیدا ہو۔ مگر یہ تو ہوا اس لئے کہ ہم دونوں قابل ترین انسان تھے لیکن ان باقی ۳۳ کروڑ ہندوستانیوں کا کیا بندوبست ہوگا جو ہر ایک اپنی ذاتی رائے کے موافق اجتماعی مسائل میں رخنہ انداز ہوتا ہے ترکیب یہ ہے کہ جب تک سوراج نہ ملے اس وقت تک قوم کے متفقہ فیصلہ کو اپنی تنہا رائے سے ٹھکرا دینے والوں کا مقاطعہ عرف "بائیکاٹ" کیا جائے جس کے خوف سے وہ

کسی متفقہ فیصلہ کے خلاف اپنی رائے ظاہر نہ کرسکیں اور جب سوراج مل جائے تو پھر ایسے لوگوں کے لئے وہی۔ وارنٹ۔ گرفتاری، حوالات، گالیاں، چانٹے، گھونسہ، بید، چالان، قید با مشقت بے نمک مرچ کا سالن۔ پھر بعبور دریائے شور اور آخر میں گلے میں باریک سا پھندا۔

خدا ان سزاؤں سے ہمیں اور بڑے مولوی صاحب کو بچائے۔ آمین ضرورت ہے کہ قوم و ملک کے متفقہ فیصلوں پر پورے غور و احتیاط سے اظہار رائے کیا جائے اور بہتر یہ ہے کہ اتباع کی کوشش کیجائے۔

یورپ اور ایشیا

اقتباسات

(۱)

عجیب اتفاق ہے کہ ایشیا اور یوروپ کی تہذیبیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے پر غالب رہی ہیں۔ ایشیا اور یوروپ مختلف دور میں اپنا کام کرتے ہیں، انکے مختلف خصائص ہیں۔ ایشیا کا میلان یوروپ کی واقعیت کے خلاف عینیت کی جانب ہے۔ ایشیا نرم رو ہے یوروپ تیز گام ایشیا کی مدت حیات یوروپ سے زیادہ لمبی ہے۔ اس کی قوت سائنس میں ہے اُس کی مذہب میں۔

ہم زندگی پر بلا واسطہ نظر نہیں ڈالتے۔ اسکے مادی نتائج کے ذریعہ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ زندگی اور فطرت اپنے اپنے طریق عمل میں مماثل ہیں یوروپ اور ایشیا کی زندگی بھی، اپنے چشمہ حیات، اپنے اظہار نمود، اور اپنے رفتار ترقی اور موسم حرکت وحیات کے لحاظ سے بعض فطری مظاہر سے مشابہ ہے۔ یہ دو ندیاں ہیں، ایک اپنی حرکت وحیات کے لئے بارش کی منتظر رہتی ہے تو دوسری فلک بوس پہاڑوں کے برف کی۔

ایشیا کی زندگی کا منبع پہاڑ کی چوٹیوں پر، برفستان میں ہے، یہیں سے گرمیوں میں ندی بہہ نکلتی اور سرزمین کی سرسبزی کا باعث ہوتی ہے ایشیا کی زندگی کا سرچشمہ مذہب ہے جو پہاڑ کی بلندی کے برف کی مثال، آسمانوں سے قریب تر، مصفا اور پاکیزہ ہے۔ جاڑوں میں یہاں خزاں ہوتی ہے گرمیوں میں بہار۔ زندگی کی لہر یہاں سے بہتی اور تمام نواح کو شاداب بناتی ہے جاڑوں میں یہ چشمہ بند ہو جاتا ہے، ایشیا اس موسم میں برف کا پہاڑ ہے۔ یہ اپنے بہار (گرمی) میں بھی بہت نرم رفتار ہے اور دیکھنے والوں کو اپنے سکون کا یقین دلاتا ہے،

یوروپ کی زندگی بارش کی ایک منتظر ندی کی سی ہے۔ وہاں ایشیا کی طرح برف کا کوئی خزانہ

موجود نہیں۔ بادل امنڈ امنڈ کر آتے اور زمینوں کو ہرا بھرا چھوڑ جاتے ہیں۔ یونان آفتاب ہے تو مصر آرٹ اور علم حکمت کی بارش کر دیتا ہے۔ یونان اپنے علم و حکمت کا وارث روما کو بناتا ہے احیائے علوم ہوتے ہی یورپ قدیم لازوال موتی برس پڑے یورپ کی زرخیز زمین میں یہ بیج کو بلیں لائے۔ اور سائنس کی ایک عمدہ فصل تیار ہو گئی۔ لیکن وہی پانی جسنے کھیتی کو سیراب کیا اب اس کو بہالیجانا چاہتا ہے۔ گرمیوں میں ندی اپنے منبع پر خشک ہو کر ایک ساکن چشمہ یا پرنالہ بن جاتی ہے عہد وسطی میں یورپ پر یہی کچھ گزرا بعض مفکرین کے نزدیک بارش اور طغیانی کے بعد یورپ کا یہی حشر ہونے والا ہے۔

اس وقت یورپ اور ایشیا بہت سی باتوں میں باہم مختلف نظر آتے ہیں، یورپ ایک وحدت رکھتا ہے جو ایشیا میں نہیں لیکن بہار میں جو گرمی کا موسم ہے ایشیا حیات کا ایک دائں اور لبریز چشمہ ہوتا ہے۔ ہندوستان چین اور دوسرے ملکوں کا تمدن اتنا ہی مکمل اور حیات افروز اور اتنا ہی متنوع تھا اور اسی وحدت کے ساتھ جیسا کہ اب یورپ کا ہے۔

جاڑوں میں (ایشیا کی خزاں) یورپ ایک تیز بہنے والا دریا ہے۔ ایشیا اس وقت ایک گلیشیر ہوتا ہے۔ گرمیوں (موسم بہار) میں بھی ایشیا آہستہ رو ہے۔ یورپ کا تمدن جب زندہ ہوتا ہے تو رفتار بہت تیز ہوتی ہے مگر ایشیا آہستہ آہستہ چلتا ہے یہی وجہ ہے کہ ایشیا کی حرکت زیادہ دیرپا ہوتی ہے۔

یورپ اور ایشیا حیات عالم کے مختلف موسم میں حرکت کرتے ہیں۔ تمثیل کی رو سے یورپ دنیا کی سردی (یا موسم برسات) میں حرکت پذیر ہوتا ہے، ایشیا دنیا کی گرمی (برسات نہ ہو) میں۔ ایشیا کی برف اس وقت پگھلتی ہے جب زمین خشک ہوتی ہے یورپ کے دریا بارش کے موسم میں بہتے ہیں، ایشیا کے کیسہ حرکت و خیال میں یورپ کی بہ نسبت زیادہ کچھ باقی رہتا ہے جب زندگی کی بہار جاتی رہی ہو، زمین پیاسی اور خشک ہو تو اس وقت ایشیا کے پہاڑوں کے برف پگھلتے ہیں یہاں طلب و رسد، کا توازن قائم رہتا ہے۔ یورپ میں زمین ہی میں پانی موجود ہوتا ہے۔

اور جتنی زیادہ ہوبالی کی ضرورت کم ہوتی جاتی ہے مگر یورپ کے دریا زیادہ پانی لیتے ہیں اس سے یورپی تمدن طغیانی میں ہے۔ یوروپی فاضلیت افراد سے خود اپنے لئے ایک خطرہ بنتی ہے ایشیا کی فاضلیت قابو کے اندر ہوتی ہے اور ایک اندازے کے ساتھ۔ اس کا خطرہ اس کی قوت کی کمی ہے۔

(۲)

جنگ۔ جنگ کے نام نہاد ناگزیر اسباب اور اس کی ہولناکی پر آئے دن یوروپ میں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں جنگ عظیم سے قبل ہی یوروپ میں اس مسئلہ پر بہت بڑا لٹریچر جمع ہو گیا تھا۔ اور اب اس پر نہایت تیزی کے ساتھ مزید اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جنگ سے پہلے جرمنی، فرانس، انگلستان میں آنے والی جنگ ایک عام موضوع گفتگو بن گئی ہے کیپٹن ہامان، برن ہارڈی وغیرہ جیسے مصنفین کے خیالات بحیثیت امور مسلمہ کے تسلیم کئے جاتے تھے، آخر الذکر کے اس قول نے کہ جنگ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے، ایک قانون فطرت ہے، جس سے مفر نہیں انگلستان میں فریڈریک ہیریسن، جیسی عافیت خواہ اور امن پسند شخصیت کو بھی آنے والے خطرہ سے آگاہ کردیا تھا انہوں نے بھی آخری جنگ کے لئے برطانوی تیاریوں کو حق بجانب قرار دیا۔ جنگ کے خلاف کسی نے نہایت پرزور آواز بلند کی تو وہ مسٹر نارمن انجل تھے انہوں نے اپنی مشہور عالم کتاب "فریب عظیم" میں جنگ پر ایک نئے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی انہوں نے دکھلایا کہ جنگ ایک ناگزیر چیز ہے انکے نزدیک جنگ جن اغراض کو پیش نظر رکھکر کی جاتی ہے وہ ظفر مندی کے بعد بھی پورے نہیں ہوتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اتحاد کے رشتے اختلاف کے رشتوں سے زیادہ استوار اور مستحکم ہیں۔ اور دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے چند نظریوں کے پیچھے وہ جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتی۔ اشتراکیت، تحریک عمال، سرمایہ داری کی تحریکیں جو دن بدن بین الاقوامی رنگ اختیار کرتی جاتی ہیں جنگ کے انسداد میں سب سے بڑے موانع ثابت ہونگی، نارمن انجل کی آواز، صدا بصحرا ثابت ہوئی اور یوروپ جنگ عظیم کی آگ میں

کو دیا۔ جنگ عظیم جو تمام جنگوں کا خاتمہ کرنے والی تھی، ایک عرصہ ہوا کہ ختم ہو چکی۔ لیکن کیا آئندہ کے لئے جنگوں کا امکان بھی ختم ہو گیا؟ اسکا جواب خود مشرق مدجارج کی زبان سے جنہوں نے جنگ عظیم جیتی، نفی میں ملتا ہے۔ اور اس وقت ہم پھر ۱۹۱۴ء میں ہیں۔ یورپ میں ہر طرف جنگ کے بادل امنڈ لا رہے ہیں۔ امریکہ کا بیس سالہ بحری پروگرام فضا کو اور بھی مکدر کر رہا ہے۔

یورپ اور ایشیا میں روس برطانیہ کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہا ہے۔ دونوں اپنے اپنے مقاصد میں ایک دوسرے کے سخت ترین دشمن ہیں۔ خصوصاً گزشتہ سال سے ان دو ملکوں کے تعلقات بہت نازک ہو گئے ہیں اور مستقبل قریب میں جنگ کا احتمال قوی تر ہے۔ بحیرۂ روم میں ایطالیہ موسیولینی کی قیادت میں جارحانہ اقدام کے لئے مضطرب ہے۔ فرانس اور ایطالیہ اس وقت دونوں رقیب ہو رہے ہیں، اتحاد اور جارحانہ اتحاد کا سلسلہ جاری ہے؛

اب تک یہ دو مستقل محاذ جنگ تھے، مگر جنیوا کانفرنس نے جو تخفیف اسلحہ کی غرض سے منعقد ہوئی تھی اور برطانیہ کی روش سے ناکام ہوئی، امن عالم کے لئے ایک تیسرا خطرہ پیدا کر دیا ہے۔ امریکہ اب دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہو جانا چاہتا ہے، جس کو وہ اپنا جائز حق سمجھتا ہے۔ اتحاد نسل، اتحاد زبان، یہ چیزیں امریکہ اور انگلستان کی دو عظیم الشان قوموں کو متحد کئے ہوئے تھیں، لیکن اس کانفرنس نے بجائے اتفاق و اتحاد کے اختلافات پیدا کر دیئے برطانوی مدبر علانیہ اعتراف کرنے لگے ہیں کہ مستقبل میں برطانیہ اور امریکہ کے درمیان جنگ ہونا ضروری ہے۔

امن عالم میں خلل انداز ہونے والے یہ تین خطرے ہیں، دیکھئے امن کے حامی اور شیدائی ان خطرات کو کیونکر دور کرتے ہیں۔

یورپ میں اب پھر ان مسائل پر گفتگو ہونے لگی ہے۔ کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ کہیں کوئی کسی ملک کو ملزم قرار دیتا ہے کہیں کوئی کسی دوسرے کو۔ کوئی تخفیف اسلحہ پر زور دیتا ہے

کوئی اثر نہ ہوا اقوام پر۔ ابھی حال میں لفٹنٹ کمانڈر کنیور ردی نے اپنی کتاب "کیا تمدن مٹ جائے گا؟" میں اتحاد کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب جنگ میں خطرہ عارضی خلل کا نہیں رہا بلکہ اُس کے جبلکات کا ہے، اس کی قیمت کا ہے جو فاتح اور مفتوح دونوں کو دینا پڑتی ہے۔ جنگ سے خطرہ اب صرف ملکوں اور قوموں کو نہیں بلکہ تمدن کو ہے۔ ہوا پر قابو پا لینے کے ساتھ ہمیں جنگ پر بھی پوری فتح حاصل کر لینا چاہئے۔ دنیا کے سامنے اب جنگ اور امن کا سوال نہیں رہا بلکہ جنگ پر فتح پانے یا ہر اُس شے کی جو زندگی کو بامزہ بناتی ہے تباہی وبربادی کا سوال ہے۔ سائنس کی ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ رقبۂ جنگ کی نامحدود توسیع خود جنگ کے خاتمہ کا اعلان ہے یا متمدن انسان کی تباہی کا۔ تمدن وتہذیب کی خاطر کسی بڑی طاقت کو قربانی کے لئے آمادہ ہوجانا چاہئے۔ اُسے چاہئے کہ تخفیف اسلحہ کے معاملہ میں خود اقدام کرے۔ اگر کسی بڑی طاقت نے یہ مثال قائم کردی تو موصوف سمجھتے ہیں کہ تمدن شاید تباہی سے بچ جائے"

(۳)

یورپ اور مذہب! دو متضاد چیزیں ہیں۔ مشرق میں زندگی کی جان مذہب ہے اور اس کے ہر شعبہ میں سمایا ہوا ہے۔ یورپ میں لامذہبیت ہے۔ وہاں کے کسی موقر رسالہ یا کسی باوقعت اخبار کو اٹھا لیجئے، مذہب اور مذہب کی روح کا فقدان ہے اور وہ چیز جسے ہم مشرقی مذہب کہتے ہیں وہاں اگر ہے تو ایک بے کیف صورت میں ہے۔ مشرق میں مذہب کی بیجا دست درازی نے ترکی یا اور چند ممالک میں ردعمل کی ایک لہر پیدا کردی ہے۔ یورپ میں لامذہبیت نے طغیانی پیدا کردی ہے اور اب وہاں نجات کا سہارا مذہب سمجھا جانے لگا ہے۔ یورپ میں ایک جماعت اس فردوس گم گشتہ کی جانب لوٹنا چاہتی ہے، اسکا مذہب سیاست ومعیشت ہے۔ اس تگ ودو میں ناکامی کے بعد اب یورپ مذہب کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ برلنڈ شائے اخبار کے نامندے سے مذہب کی ضرورت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میں مذہب کے بغیر نجات کا تخیل نہیں کرسکتا۔ مذہب سے ناآشنا اخلاقی حیثیت سے بزدل ہوتے ہیں۔ تمدن بھی اپنی آبیاری

کے لئے مذہب کا محتاج ہے۔ الوہیت کو خواہ ہم کسی نام سے تعبیر کریں، روح حیات، روح عالم، مبداء ارتقا کسی نام سے پکاریں۔ زندگی کو اگر ایک بے معنی سلسلہ اتفاقات کی نوعیت سے بچانا ہے تو ہمیں مذہب کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ نجات کا تخیل صرف مذہب کے ساتھ ممکن ہے۔

بیسویں صدی ایک سائنٹفک صدی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس صدی میں ایک سائنٹفک مذہب کی ضرورت ہے۔ (ارتقائے تخلیقی) اس قسم کا ایک مذہب ہے اور مسٹر شا کہتے ہیں میرا مذہب یہی ہے۔ ارتقا ایک سلسلہ خفی اور ڈاروینیت ایک میکانکی نظریہ ہے جس نے مذہب اور اسکی روح کو فنا کر دیا تعمیر کے میدان میں ڈارونیت ناکام رہی۔ اس نے اخلاقی اور سیاسی (وقتیت پرستی) کو عملی رنگ دیدیا اور کل ہی ہم نے دیکھ لیا، یوروپ عالمگیر جنگ کی مصیبت میں گرفتار ہو گیا، یوروپ سائنٹفک مذہب کی تلاش میں کہاں تک کامیاب ہوگا خود اس کی صداقت و دیانت پر منحصر ہے۔ کامیابی کی ضمانت صدق طلب ہے۔ یوروپ کی عام ذہنیت ابھی بدلی نہیں، وہ کوئی تبدیلی چاہتا ہے تو محض اس وجہ سے کہ موجودہ حالت سے بیزار ہے اور دراصل تمام انقلابی خواہشات کے لئے یہ موجودہ بیزاری لازمی شے ہے۔ یوروپ نے مذہب کی سچی مسرت کو ابھی محسوس نہیں کیا۔ مگر یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ یوروپ میں ایسے افراد موجود ہیں، جو ایک حد تک اس سے آشنا ہیں، اور اپنی اپنی جگہ پر اس مذہب کی جستجو و تلاش میں مصروف ہیں۔

ہندوستانی یا غیر برطانوی کے ساتھ ساتھ اب انگریز اہل قلم بھی، ہندوستان میں مروجہ طرز تعلیم کے نقائص کا علانیہ اعتراف کرنے لگے ہیں۔ ذریعہ تعلیم، مدت تعلیم، اور اس کی قیمت (صحت اور روپیہ) یہ کھلے ہوئے چند موٹے موٹے عنوان ہیں جن کے تحت میں انہیں جمع کیا جا سکتا تھا مگر خوش قسمتی سے یہ بھی محسوس کرنے لگے ہیں کہ تمدنی حیثیت سے بھی یہ تعلیم سراسر غیر مفید ہے۔ ایک منصف مزاج مصنف نے ہندوستان کے تعلیمی حالات کا گہرا مطالعہ کرنیکے بعد مندرجہ ذیل پانچ امور پر خاص طور پر توجہ دلائی ہے۔ موصوف نے نقائص کے ذکر کے ساتھ ہی چند مناسب تجویزیں

بھی پیش کی ہیں جن پر کار بند ہو کر حکومت، ملک کو بہت فائدہ پہونچا سکتی ہے۔

(۱) ہندوستان میں ہماری تعلیم نے چند مادی و سیاسی فوائد تو پہنچائے ہیں مگر تمدنی و تہذیبی ترقی میں بجائے معاون ہونیکے حارج ہو رہی ہے۔ بے شبہ ہندوستان میں علم کی رفتار تو بڑھ گئی۔ مگر کیا ہم نے زندگی کو پر لطف بنانے کے لئے بھی کوئی سعی کی؟

(۲) ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش اور اسکا بہاؤ مشرق و مغرب کی زندگی اور طرز خیال کے اتصال کے خلاف ہے۔

(۳) تعلیم مذہب سے علحدہ ہو کر دلوں کی گہرائیوں تک پہنچ نہیں پائی اور نہ معاشرتی اصلاح کی تحریک میں مدد ہو سکی۔

(۴) اعلیٰ تعلیم کو جہانتک ہو سکے، حکومت کے اثر و اقتدار سے بالکل آزاد ہونا چاہئے ابتدائی تعلیم اور خصوصیت کے ساتھ عام تعلیم حکومت اپنے ہی ہاتھ میں لے۔ اس معاملہ میں اقدام حکومت کی جانب سے ہونا چاہئے۔

(۵) ہندوستان کو بلا سرکاری واسطہ کے، انگریز ماہرین تعلیم کی ضرورت ہوگی اور بالخصوص مستقبل میں ہندوستانی اس ضرورت کو بہت محسوس کرینگے۔

صاحب موصوف کے یہ خیالات بیشتر درست ہیں ماہرین تعلیم کی ضرورت سے کس کو انکار نہیں ہر تعمیر نو میں ایک نئی ابھرنے والی قوم کے لئے اس قسم کے خارجی امداد و معاونت کی ضرورت ظاہر ہے۔ رفتار زمانہ کے دوش بدوش چلنا، صرف اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے۔ ہندوستانی یقیناً نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کے تمام ملکوں سے اس قسم کے مشاورت کا رشتہ قائم کرنیکے لئے آمادہ ہونگے

ہندوستان میں قومیت کی موجودہ روش سے متعلق آپکا خیال ایک حد تک بالکل صحیح ہے اور یہ لازمی نتیجہ ہے اس کوشش کا جو ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے ماضی سے نفرت پیدا کرنیکے لئے عمل میں لائی گئی۔ اور انہیں اسپر تعجب بھی نہیں ہونا چاہئے کیونکہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ تعلیم نے ہندوستانیوں کی تہذیب و تمدن کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا، قومیت خود ایک

تمدنی مظہر ہے، ہمارے خیال میں جس چیز کو وہ قومیت سے تعبیر کرتے ہیں وہ قومیت نہیں بلکہ نفرت ہے۔ ہر تمدنی پیداوار کی طرح قومیت کی تعمیر بھی تعلیم ہی سے ہوتی ہے۔ ہندوستان قومیت سے بیگانہ ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت نے اس کی نشوونما میں حصہ نہیں لیا۔ امریکہ میں اول وقت سے تعلیم نے قومیت کی تعمیر میں بنیادی حصہ لیا ہے۔ فرانس اور جرمنی میں اسی طرح ہوا ہے۔ تعلیم ہی ایک واحد ذریعہ ہے جو قوم میں تمدنی احساس پیدا کرا سکتا ہے۔ ہمارے مروجہ نظام تعلیم نے کبھی اس مشہد تمدنی مظہر کو جو قومیت کہلاتا ہے، نہیں چھیڑا۔ ہماری ضرورت ایک فلسفۂ وطنیت تھی۔ تعلیم و عمل کی ایک بانگ درا جو ہمیں دنیا کی حرکت حیات میں پورا پورا حصہ لینے کے قابل بناتی۔ ہمارے مدارس و کالج کو معاشرتی معمل ہونا چاہئے، ہندوستان میں ساری خرابی شروع سے یہ رہی ہے کہ تعلیم کے مفہوم ہی کو نظرانداز کر دیا گیا، ہونا یہ چاہئے تھا کہ انفرادی و اجتماعی مفاد کے مفروضہ تناقض دور کرنے کی کوشش کی جاتی، تعلیم تو دراصل اس کوشش کا نام ہے جو اجتماعی و انفرادی مفاد میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا چاہتی ہے اور یہ کوشش سرے سے یہاں مفقود ہے اس لئے قومیت کا ہونا معلوم۔ اس مخالفانہ روش کی شکایت بجا ہوتی اگر حکومت نے اس چیز کی پرورش میں حصہ لیا ہوتا۔ یہ احساس کہ قومیت خود ایک بڑے کل انسانیت کا جزو ہے، بعد کی چیز ہے۔

انجام بخیر

مصنفہ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

در ۱۸۲۲ء

مترجمہ ملک محمد اسلم خاں بی۔ اے، کیمبرج، سابق متعلم جامعہ

ولاڈی میئر میں ایک نوجوان سوداگر رہتا تھا، جس کا نام تھا آئیوں ڈمٹریچ ایکسا یاناف، اُس کی دو دکانیں تھیں اور ایک رہائشی مکان۔

ایکسا یانات حسین تھا، بال اُس کے بھورے رنگ کے تھے، اور گھونگر والے۔ اور طبیعت بشاش ہر وقت گاتے رہنے کا اُسے بہت شوق تھا۔ عنفوان شباب میں اُسے شرابخواری کی لت رہی تھی، اور جب بہت وہ مخمور ہوتا تو الھڑپن کی باتیں کرتا۔ شادی کے بعد اُس نے شرابخواری چھوڑ دی، پھر بھی کبھی کبھی "روزا بردشب ماہتاب میں" پی لیا کرتا تھا۔

گرمیوں کے موسم کا ذکر ہے وہ ایک روز ازنی کے میلے کو چلا۔ جب وہ بیوی کو الوداع کہہ رہا تھا تو وہ بولی "آئیوں ڈمٹریچ، آج روانہ نہ ہو، میں نے تمہاری بابت بُرا خواب دیکھا ہے۔

ایکسا یاناف ہنسا اور کہنے لگا "تمہیں ڈر ہے کہ میں جب میلے پہونچا تو خوب شراب پیوں گا"

اس کی بیوی کہنے لگی" یہ میں خود نہیں جانتی کہ ڈر کاہے کا ہے، میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں نے بُرا خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ شہر سے جب تم لوٹے اور تم نے اپنی ٹوپی اُتاری تو تمہارے بال سب کے سب سفید ہو چکے تھے۔"

ایکسا یاناف ہنسا، اور بولا " یہ تو نیک فال ہے، دیکھ لینا میں سارے کا سارا مال بیچ آؤں گا

اور تمہارے لئے بہت سے تحفے لے کر لوٹوں گا"

اپنے گھر والوں کو الوداع کہتا ہوا، وہ بیلے کو چل دیا،

جب وہ نصف راستہ طے کر چکا تھا، تو وہ ایک سوداگر سے ملا جسے وہ جانتا تھا، اور وہ دونو رات بسر کرنے کے لئے ایک ہی سرائے میں مقیم ہو گئے، پہلے تو انہوں نے ساتھ ساتھ چائے پی، پھر وہ دو کمروں میں جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جا کر سو رہے۔

ایکسا یانا ف کو دیر تک سونے کی عادت نہ تھی اور اس خیال سے کہ سویرے سویرے سفر طے ہو جائے، اُس نے طلوع آفتاب سے پیشتر ہی اپنے کوچبان کو جگا کر گاڑی جوتنے کا حکم دیا۔

پھر سرائے کے مالک کی جھونپڑی کی طرف گیا جو سرائے کے پیچھے تھی اور اس کا حساب چکا کر روانہ ہو گیا۔

جب وہ کوئی پچیس میل جا چکا تو گھوڑوں کو دانا کھلانے کے لئے اُس نے گاڑی کو رکوایا، خود ذرا دیر سرائے کی ڈیوڑھی میں بیٹھا، پھر برامدے کیطرف جا کر سرائے کے خادم کو ایک ساوار میں چائے گرم کرنے کا حکم دیا اور اپنی سارنگی نکال کر بجانے لگا۔

اچانک ایک تین گھوڑوں والی گاڑی جس کے گھنگھروں کی جھنکار دور سے سنائی دیتی تھی، آموجود ہوئی اور اُس میں سے ایک افسر برآمد ہوا جس کے پیچھے پیچھے دو سپاہی تھے، وہ ایکسا یانا ف کے پاس آیا اور اُس سے سوال کرنے شروع کئے کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو، ایکسا یانا ف نے ہر سوال کا معقول جواب دیا اور یہ بھی کہا "میرے ساتھ چائے نہیں پیجئے گا؟"

لیکن وہ افسر پھر بھی سوال کرتا رہا اور اس نے پوچھا "گزشتہ شب تم کہاں تھے؟" "تم اکیلے تھے یا کوئی اور سوداگر بھی تمہارے ساتھ تھا؟" "تم نے اس سوداگر کو آج سویرے دیکھا یا نہیں؟" "تم اتنے سویرے کیوں سرائے سے چل دئے؟"

ایکسا یانا ف حیرت میں تھا کہ اُس سے یہ سوال کیوں پوچھے جا رہے ہیں، لیکن اُس نے جو جو کچھ ہوا تھا پورا پورا کہہ دیا اور پھر ساتھ ہی اس بات کا بھی اضافہ کر دیا "آپ مجھ سے اس طرح

سے کیوں سوال کرتے ہیں، کیا میں کوئی چور یا ڈاکو ہوں؟ میں اپنے کام سے جا رہا ہوں۔ آپ کو مجھ سے اس طرح جواب سوال کرنے کا کوئی حق نہیں۔

پھر افسر نے سپاہیوں کو بلا کر کہا "میں اس ضلع کا پولیس افسر ہوں، اور میں تم سے جواب سوال اس لئے کر رہا ہوں کہ جس سوداگر کے ساتھ رات تم تھے اس کا گلا کاٹ گیا ہے۔ ہم تمہاری تلاشی لینا چاہتے ہیں۔"

وہ مکان کے اندر چلے گئے، سپاہیوں اور پولیس افسر نے ایکسایانف کا اسباب کھولا اور اس کی تلاشی لینی شروع کر دی، اچانک افسر نے ایک تھیلے میں سے ایک چھرا نکالا اور چلا کر پوچھنے لگا "یہ چھرا کس کا ہے؟"

ایکسایانف نے ادھر نگاہ دوڑائی، اور جب اس نے دیکھا کہ اس کے تھیلے سے ایک خون آلودہ چھرا نکالا ہے تو وہ ڈر کے مارے سہم گیا،

"اس کی کیا وجہ ہے کہ یہ چھرا خون آلودہ ہے"

ایکسایانف نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا، ہکلا ہکلا کر اس نے جواب دیا "م۔ مجھے تو م۔ مع ـــ معلوم نہیں۔ م۔ میرا نہیں"

پھر پولیس کے افسر نے کہا "آج سویرے سوداگر اپنے بستر پر مقتول پایا گیا، سوائے تمہارے کسی پر اس جرم کا شبہ نہیں ہو سکتا، گھر کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا، اور وہاں تمہارے سوا بھی کوئی نہیں، یہ خون آلودہ چھرا بھی تمہارے ہی سامان سے نکلا ہے، اور تمہارے چہرے اور تمہارے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ مجرم تم ہی ہو، تو بتاؤ تم نے اسے مارا کس طرح اور روپیہ کتنا چرایا؟"

ایکسایانف نے ہزاروں قسمیں کھائیں کہ میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ چائے پینے کے بعد سوداگر کو دیکھا تک نہیں۔ اس نے کہا کہ میرے پاس سوائے آٹھ ہزار روبل (سولہ ہزار روپیہ) کے جو میرا ذاتی ہے اور کوئی روپیہ نہیں اور نہ یہ چھرا میرا ہے۔ لیکن اس کی آواز میں لکنت آ گئی تھی، اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا، اور وہ ڈر کے مارے کانپ اس طرح رہا تھا، جیسے وہ سچ مچ مجرم ہو۔

پولیس کے افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اکیسایانف کی مشکیں باندھ کر اسے جکڑے میں ڈال دیں، جب انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کے اسے جکڑے میں پھینکا تو اکیسایانف کو خدا یاد آ گیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ اُس کا روپیہ اور مال اسباب اُس سے چھین لیا گیا اور وہ قریب کے شہر میں لیجا کر قید کر دیا گیا۔ ولاڈی میرمیں اس کے چال چلن کی بابت تفتیش کی گئی، وہاں کے سوداگروں اور دیگر باشندوں نے کہا کہ ابتدا میں وہ شراب پینے کا عادی تھا، اور آوارہ گردی کیا کرتا تھا، لیکن اب وہ شریف آدمی بن چکا تھا، پھر مقدمہ کی پیشی کا وقت آیا، اُس پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اس نے ریاضان کے ایک سوداگر کو قتل کیا ہے اور اُس کے بیس ہزار روبل (چالیس ہزار روپیہ) چرائے ہیں،

اُس کی بیوی انتہائی مصیبت میں تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے یقین کرے یا نہ کرے اُسکے بچے سب کے سب چھوٹی عمر کے تھے، بلکہ ایک تو ابھی دودھ پیتا تھا، ان سب کے ساتھ لے کر وہ اُس شہر میں گئی جہاں اُسکا خاوند جیل میں تھا، پہلے تو اُسے خاوند سے ملنے کی اجازت ہی نہ ملی لیکن جب اُس نے بہت منت ساجت کی تو افسروں نے اُسے اجازت دے دی اور وہ خاوند سے ملی، جب اُس نے خاوند کو جیل کے لباس اور بیڑیوں میں چوروں اور مجرموں کے ساتھ ساتھ دیکھا، تو وہ بیہوش ہو کر گر پڑی اور بڑی دیر تک اُس کو ہوش نہ آیا، پھر اُس نے اپنے بچوں کو اپنے قریب کر لیا اور اُس کے ساتھ بیٹھ گئی، اُسے گھر کا حال بتایا اور اس سے پوچھا کہ اُس پر کیا گزری یہ معلوم کر چکی تو اُس نے پوچھا، "اب ہم کیا کر سکتے ہیں"

اکیسایانف: "زار روس سے درخواست کرنی چاہیئے کہ ایک بے گناہ شخص کو موت سے بچائے"

اس کی بیوی نے اُسے بتایا کہ وہ زار کے ہاں تو ایک درخواست بھیج چکی تھی لیکن اُس کی شنوائی نہ ہوئی۔

اکیسایانف نے جواب تو نہ دیا لیکن پژمردگی اس کے چہرے سے ظاہر تھی

پھر اُس کی بیوی نے کہا "میرا خواب غلط نہ تھا کہ تمہارے بال سفید ہو گئے، تمہیں یاد ہے

تمہیں اُس روز روانہ نہ ہونا چاہیئے تھا" اور اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں دے کر وہ کہنے لگی " دمیتا، میری جان، اپنی بیوی کو سچ سچ بتا دو، کیا تمہیں نے قتل کیا تھا؟"

" اچھا، تو تم کو بھی مجھ پر شک ہے"، ایکسیانوف نے جواب دیا، اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا کر وہ رونے لگا اس وقت ایک سپاہی آیا اور اس نے کہا کہ بیوی بچوں کو اب جانا چاہیئے اور ایکسیانوف نے اپنے خاندان کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہی۔

جب وہ جا چکے تھے، ایکسیانوف کو سب کچھ جو کہا گیا تھا یاد آ گیا، اور جب اُسے یاد آیا کہ اس کی بیوی کو بھی اس معاملہ میں اُس سے بدظنی تھی، تو وہ اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہنے لگا " معلوم ہوتا ہے کہ حق کو صرف خدا ہی جانتا ہے، ہمیں اپنی التجائیں اسی کی حضور میں لے جانی چاہئیں اور رحم کی توقع بھی اسی سے رکھنی چاہیئے"

اور ایکسیانوف نے اس کے بعد کوئی اور عرضیاں نہ لکھیں، سب امیدیں ترک کر دیں اور صرف خدا کی حضور میں دعا کرتا رہا۔

ایکسیانوف کو یہ سزا سنائی گئی کہ اس کے درّے لگائے جائیں اور وہ کان کھودنے کے لئے بھیجا جائے۔ چنانچہ پہلے دُرّوں کی سزا دی گئی اور جب دُرّوں کے زخم اچھے ہو گئے تو دوسرے قیدیوں کی ہمراہی میں وہ بھی سائبیریا بھیج دیا گیا۔

چھبیس سال تک ایکسیانوف قیدی کی حیثیت سے سائبیریا میں رہا کیا، اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے اور اُس کی داڑھی لمبی اور پتلی اور سفید ہو گئی، اس کی بشاشی رخصت ہو چکی تھی، اسکی پیٹھ کبڑی ہو گئی، اور رفتار سست، وہ بولتا چالتا کم تھا، ہنستا کبھی نہیں تھا، لیکن دعا میں اکثر مصروف رہتا۔

جیل میں ایکسیانوف نے جوتے بنانے کا کام سیکھا، اور کچھ تھوڑی بہت نقدی جمع کر لی اس سے اس نے ایک کتاب خریدی جس کا نام تھا "اولیا اللہ کی سوانح عمریاں" جب جیل میں کافی روشنی ہوتی تھی تو وہ یہ کتاب پڑھا کرتا تھا۔ اتوار کے دن وہ جیل کے عبادت خانہ میں جا کر پڑھا

کرتا تھا اور عبادت میں شریک ہوتا تھا، آواز اُس کی ابھی تک نہایت شیریں تھی۔

جیل کا سارا عملہ ایکسا یا ناف سے اُس کی نرم دلی کی وجہ سے نہایت مانوس تھا، اور اُس کے قیدی رفیق اسکی بہت عزت کرتے تھے اور اُسے " دادا " اور " ولی " کہہ کے مخاطب کیا کرتے تھے، جب جیل کے عملے سے انہیں کوئی درخواست کرنی ہوتی تھی تو اپنی سفارت وہ ہمیشہ ایکسا یا ناف ہی کے سپرد کیا کرتے تھے، اور جب قیدیوں کا آپس میں کوئی جھگڑا ہوتا تو اسے چکانے کے لئے اور اُسکا فیصلہ کروانے کے لئے وہ ہمیشہ اسے ایکسا یا ناف ہی کے پاس لایا کرتے تھے۔

گھر کی ایکسا یا ناف کو کبھی کوئی خبر نہ پہونچی، وہ اب یہ تک نہیں جانتا تھا کہ اُسکے بیوی بچے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ایک روز نئے قیدیوں کی ایک ٹولی جیل میں آئی۔ شام کے وقت پُرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد حلقہ بنا کے بیٹھ گئے اور اُن سے پوچھنے لگے کہ وہ کس کس شہر یا گاؤں کے ہیں اور کن کن جرائم کی بنا پر قید ہوئے ہیں، دوسروں کے ساتھ ہی ساتھ ایکسا یا ناف بھی نئے قیدیوں کے قریب آ بیٹھا، اور پژمردگی کی حالت میں جو جو کچھ کہا گیا سُنتا رہا۔

ایک نیا قیدی جو بہت طویل قامت اور مضبوط ڈیل ڈول کا تھا، جس کی داڑھی خشخاشی تھی اور عمر کوئی ساٹھ سال، دوسروں کو بتا رہا تھا کہ وہ کیونکر قید ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

" دوستو۔ میں نے ایک گھوڑا لیا تھا جو ایک گاڑی کے ساتھ بندھا ہوا تھا، مجھ پر چوری کا الزام عائد کیا گیا۔ میں نے کہا کہ میں نے گھوڑا محض جلدی پہونچنے کے لئے لیا تھا۔ اور پھر اُسے چھوڑ دیا تھا۔ علاوہ اس کے، اسکا کوچوان بھی میرا ذاتی دوست تھا اور اس لئے میں نے کہا کہ " اس میں حرج کی کوئی بات نہیں" لیکن جواب مجھے یہی دیا گیا کہ " نہیں، تم نے گھوڑا چرایا "، یہ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس طرح اور کیونکر میں نے گھوڑا چرایا۔ ایک دفعہ میں نے واقعی ایک سنگین جرم کیا تھا، اور اُسکی وجہ سے مجھے یہاں مدتوں سے ہونا چاہئے تھا لیکن اس دفعہ تو مجھے کسی نے نہیں پکڑا۔ اب کے بلا سبب ہی میں یہاں بھیج دیا گیا ہوں، . . . نہیں نہیں دوستو،

میں سب کچھ جھوٹ تم سے کہہ رہا ہوں۔ میں سائبیریا ایک دفعہ پہلے بھی آچکا ہوں لیکن اُس وقت میں زیادہ مدت تک یہاں نہیں رہا "

کسی نے پوچھا، "تم کہاں کے ہو"

"ولاڈی میئر کا۔ میرا خاندان وہیں بستا ہے، میرا نام ماکار ہے، اور لوگ مجھے سیمیونچ بھی کہتے ہیں "

ایکسایاناف نے سر اٹھایا اور کہا "سیمیونچ، مجھے یہ تو بتاؤ تم ولاڈیمیر کے ایکسایاناف تاجروں کو بھی جانتے ہو یا نہیں؟ کیا اُن میں سے کوئی ابھی زندہ بھی ہے؟ "

"کیا خوب، بھلا نہ جاننے کی کیا وجہ ہے، ایکسایاناف تو بڑے دولتمند ہیں، گو اُنکا باپ یہیں سائبیریا میں ہے اور معلوم ہوتا ہے ہماری ہی طرح مجرموں میں سے ہے، ہاں اور باواجان یہ تو فرمائیے آپ یہاں کیونکر تشریف لائے "

ایکسایاناف نہیں چاہتا تھا کہ اپنی بدبختی کا ذکر کرے، اس نے محض ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا "میں اپنے گناہوں کے بدلے میں گزشتہ چھبیس سال اس قید خانے میں رہا ہوں"

"ماکار سیمیونچ نے پوچھا "کن گناہوں کے"

ایکسایاناف نے جواب دیا " ہاں، ہاں، میں شاید اسی کا مستحق تھا" وہ تو نہیں چاہتا تھا کہ اور کچھ ذکر کرے، لیکن اُس کے ساتھیوں نے نووارد کو بتلا دیا کہ ایکسایاناف کیونکر سائبیریا آیا تھا۔ کسی نے ایک تاجر کو قتل کر دیا تھا، اور جس چھرے سے قتل کیا تھا وہ اُس کے سامان میں رکھ دیا تھا، اور سزا بے انصافی سے ایکسایاناف کو مل گئی تھی،

جب ماکار سیمیونچ نے یہ سرگزشت سنی، اس نے ایکسایاناف کی طرف دیکھا، اپنے گھٹنے پر زور سے ہاتھ مار کے بلند آواز میں بولا "دوستو، حیرت انگیز ہے یہ بھی واقعی حیرت انگیز، لیکن باباجان آپ بوڑھے کس قدر ہو گئے ہیں "

دوسرے اُس سے پوچھنے لگے کہ تم کو اتنی حیرت کیوں ہوئی ہے، اور ایکسایاناف سے تم

پہلے سے کہاں ہو، لیکن ماکار سیمو نچ نے جواب نہ دیا۔ اس نے بس اتنی بات کہی "دوستو ہمارا یہاں ملنا واقعی حیرت انگیز ہے"

ان الفاظ نے ایکسایانف کے دل میں یہ شبہ پیدا کیا کہ شاید یہ آدمی جانتا ہے کہ تاجر کو دراصل کس نے قتل کیا تھا، اور اس نے کہا "سیمونچ، شاید تم نے اس واقعہ کی بابت کچھ سنا یا شاید تم نے مجھے کہیں دیکھا ہو؟"

"میں سنتا کس طرح نہ؟ دنیا افواہوں سے بھری ہوئی ہے، لیکن اس واقعہ کو مدتیں گذر گئیں، اور مجھے تو یاد بھی نہیں میں نے کیا کیا سنا۔"

ایکسایانف نے کہا "شاید تم نے سنا کہ تاجر کو قتل کس نے کیا"

ماکار سیمونچ ہنسا، اور بولا "وہی ہوگا جس کے سامان سے چھرا برآمد ہوا، لیکن اگر چھرا وہاں کسی اور نے رکھا تو مشکل ہے "جب تک کوئی پکڑا نہ جائے وہ چور نہیں" لیکن جب تمہارا تھیلا تمہارے سر کے نیچے تھا تو کوئی کیونکر چھرا اس میں رکھ سکتا تھا۔ تم جاگ نہ پڑتے؟"

جب ایکسایانف نے یہ الفاظ سنے تو اُسے یقین ہوگیا کہ اسی شخص نے تاجر کو قتل کیا تھا، وہ اٹھ کر چل دیا، اس روز ایکسایانف تمام رات جاگتا رہا، اس کی طبیعت بہت غمگین رہی اور طرح طرح کی تصویریں اُس کے دماغ میں آتی اور جاتی رہیں، اُس کی بیوی کی تصویر جس روز وہ میلے جانیکے لئے اُس سے جدا ہوا ایکسایانف کی آنکھوں میں اس طرح پھر گئی گویا وہ خود موجود ہے اُسکا چہرہ اور اُس کی آنکھیں بھی اُسے نظر آگئیں، اور اُسے ہنستے اور گفتگو کرتے بھی اس نے سن لیا، اپنے بچے بھی اُسے یاد آگئے، ننھے ننھے جیسے کہ وہ اس زمانے میں تھے، ایک تو ایک چھوٹا سا کوٹ پہنے اور دوسرا اپنی ماں کی چھاتی پر، پھر اُسے اپنی پرانی زندگی بھی یاد آگئی، وہ کس قدر نوجوان طبیعت اور کس قدر بشاش رہا کرتا تھا، اس کو یاد آگیا کہ جب وہ گرفتار ہوا وہ کس طرح سے سرائے کے برآمدے میں سارنگی بجا رہا تھا، اور کس قدر بےفکری میں اُس کا وقت کٹا کرتا تھا، جہاں پر اُسے دُرے مارے گئے تھے وہ جگہ اور جلاد اور اردگرد جو تماشائی کھڑے ہوئے

تھے اُن کی تصویریں بھی اُسے نظر آنے لگیں، اُس کی زنجیریں، اور دوسرے قیدی اور وہ چھبیس سال جو اُس نے قید میں گزارے تھے، اور اُس کا قبل از وقت بڑھاپا، سب کچھ اُسے یاد آ گیا۔ ان سب خیالات نے اُس کی حالت اتنی بُری کر دی کہ وہ اپنے آپ کو مار ڈالنے کے لئے تیار تھا۔

ایکسایانف کے دل میں خیال آیا "اور یہ سب اس بدمعاش کی کارستانی ہے" اور ماکار سیمیونچ پر اس کو اس قدر غضب اور غصہ آ رہا تھا کہ وہ انتقام کے لئے بیتاب ہوا جاتا تھا چاہے اُسکی اپنی جان ہی اس میں ضائع کیوں نہ ہو جائے، تمام رات وہ دعاؤں میں مصروف رہا لیکن اطمینان قلب اس کو حاصل نہ ہوا، دن بھر وہ سیمیونچ کے پاس نہ گیا اور نہ اُس کی طرف نگاہ تک کی۔

اسی طرح سے چودہ روز گزر گئے، ایکسایانف راتوں کو سو نہ سکتا تھا، اور اس قدر مغموم تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔

ایک رات جب وہ قید خانے میں پھر رہا تھا اُس نے دیکھا کہ جن تختوں کے نیچے قیدی سوتے تھے، اُن میں سے ایک کے نیچے میں سے تھوڑی تھوڑی مٹی باہر آ رہی تھی، وہ یہ دیکھنے کے لئے کھڑا ہو گیا کہ بات کیا ہے، اچانک ماکار سیمیونچ تختے کے نیچے سے اچھل کر باہر نکل آیا اور سہمے ہوئے چہرے سے ایکسایانف کی طرف دیکھنے لگا، ایکسایانف نے چاہا کہ بن دیکھے اس کے پاس سے گزر جائے، لیکن ماکار نے اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور اُسے بتلانے لگا کہ میں نے اس دیوار کے نیچے سے ایک سرنگ کھود لی ہے، مٹی نکلتی تھی اُسے میں اپنے جوتوں میں بھر لیتا تھا اور جب قیدی اپنے کام کے لئے چلے جاتے تھے میں نظر بچا کر اُس کو سڑک پر پھینک دیتا تھا۔ پھر کہنے لگا۔

"بڈھے خبردار کسی سے کہنا نہیں میں تم کو بھی بھاگنے میں مدد دے سکتا ہوں، لیکن جو تم نے میرا راز فاش کیا، تو میں تو دُرّوں سے نیم جان کر ہی دیا جاؤں گا۔ لیکن تمہیں بھی قتل کئے بغیر نہ چھوڑوں گا۔"

ایکسایاناف اپنے دشمن کی طرف دیکھ دیکھ کر غصہ سے کانپ رہا تھا، اُس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا: "مجھے بھاگنے کی کوئی خواہش نہیں، نہ تمہیں کوئی ضرورت ہے کہ مجھے قتل کرو، تم نے مدت ہوئی مجھے قتل کر ڈالا تھا۔ . . . رہا تمہارا راز افشا کرنا، سو میں جو کچھ خدا کا حکم ہوا وہ کروں گا۔ ممکن ہے بتا دوں ممکن ہے نہ بتاؤں"۔

دوسرے روز جب قیدی کام کے لئے جا رہے تھے، پہرہ دار سپاہیوں نے دیکھا کہ کسی قیدی نے جوتوں سے کچھ مٹی نکال کر باہر پھینکی، قید خانے میں تلاش کی گئی، اور سرنگ مل گئی، داروغہ نے آکر سارے قیدیوں سے ایک ایک کرکے پوچھا تاکہ معلوم ہو سرنگ کس نے کھودی، سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی، جو جانتے بھی تھے انہوں نے بھی ماکار سیمو نیچ کا راز فاش نہ کیا کیونکہ جانتے تھے وروں سے اس کو نیم مردہ کر دیں گے، آخر داروغہ ایکسایاناف کی طرف جس کو وہ ایماندار جانتا تھا متوجہ ہوا، اور کہنے لگا۔

"تم ایک راست گو پیر مرد ہو، خدا کو حاضر ناظر جانکر مجھ سے تم ہی کہو کہ سرنگ کس نے کھودی"

ماکار سیمو نیچ اس طرح سے کھڑا تھا گویا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اور داروغہ کی طرف دیکھ رہا تھا، ایکسایاناف کی طرف اس نے دیکھا تک نہ تھا۔ ایکسایاناف کے ہونٹ اور ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے، اور بہت دیر تک اُس کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا، اس نے سوچا "میں کیوں اس شخص کی پردہ پوشی کروں جس نے میری زندگی برباد کر دی، کیوں نہ اس کو اُن مصائب کا بدلہ دوں جو میں نے جھیلے ہیں، لیکن جو میں بتا دوں تو اُس کی یہ کھال ادھیڑ دیں گے، اور ممکن ہے میرا یہ شبہ کہ مجھے اسی نے پھنسایا تھا غلط ہو، اور آخر مجھکو اس سے فائدہ کیا ہوگا"

داروغہ نے دُہرایا "اچھا تو بڈھے، کہو نا، سرنگ کس نے کھودی ہے؟"

ایکسایاناف نے ماکار سیمو نیچ کیطرف دیکھا اور داروغہ سے کہا "حضور میں نہیں بتا سکتا کس نے کھودی ہے۔ خدا کی مرضی نہیں کہ میں بتاؤں، مجھے جو سزا چاہے دیجئے، میں آپ کے

گرداگرد مہ نے بہت کوشش کی مگر اکیسایانف نے اور کچھ نہ کہا، اور یہ معاملہ یوں ہی کھٹائی میں رہ گیا۔

اُس شب کو جب اکیسایانف اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا، اور اونگھنا شروع کر چکا تھا کوئی شخص دبے پاؤں آیا اور اس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اندھیرے میں دیکھا اور ماکار کو پہچان لیا اور اس نے کہا۔

"اور اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، یہاں تم کیوں آئے ہو"

ماکار سیمیونیچ خاموش رہا، اس لئے اکیسایانف بیٹھ گیا اور کہنے لگا "تم کیا چاہتے ہو چلے جاؤ ورنہ میں پہرہ والے کو بلاؤں گا"

ماکار نے اکیسایانف کیطرف جھک کر بہت آہستہ آواز میں کہا "آئیون دمتریچ! مجھے معاف کر دو"

اکیسایانف نے پوچھا "کون قصور"

"میں نے ہی اُس تاجر کو قتل کیا تھا اور چھرا تمہارے سامان میں چھپا دیا تھا میں تم کو بھی قتل کر دینا چاہتا تھا لیکن باہر سے مجھے ایک آہٹ سنائی دی، اس لئے میں نے چھرا تمہارے تھیلے میں چھپا دیا اور خود کھڑکی کے رستے نکل گیا"

اکیسایانف خاموش تھا۔ اور نہ جانتا تھا کہ کیا کہے، ماکار بستر سے اُٹھ کر دو زانو ہو گیا اور کہنے لگا "آئیون دمتریچ مجھے معاف کر دو، تمہیں خدا کی محبت کا واسطہ، مجھے معاف کر دو۔ . . . میں اقبال کر لوں گا کہ تاجر کو میں نے ہی قتل کیا تھا، اور تم رہا ہو سکو گے اور پھر گھر جا سکو گے"

اکیسایانف نے کہا "تمہارے لئے باتیں بنانا بہت آسان ہے لیکن میں نے پچھلے چھبیس سال تمہاری بدولت مصیبتیں برداشت کی ہیں، اب میں کہاں جا سکتا ہوں؟ میری بیوی مر گئی، میرے بچے مجھے بھول گئے، میرے جانے کو اب کون جگہ رہ گئی"

ماکار سیمیونیچ اٹھا نہیں لیکن وہ فرش سے اپنا سر ٹکراتا رہا اور کہتا تھا "آئیون دمتریچ

مجھے معاف کردو، جب مجھے درے مارے گئے تو انہیں برداشت کرنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا اس پشیمانی کا برداشت کرنا جو تمہاری صورت دیکھ کر مجھے ہوتی ہے . . . پھر بھی تم نے مجھ پر رحم کیا اور بتایا نہیں، اللہ کے لئے مجھے بخش دو، میں بڑا بدبخت ہوں" اور روتے روتے اُس کی سسکی بندھ گئی۔

جب ایکسایانف نے اُسے سسکیاں لیتے سنا تو اس کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل پڑے اُس نے کہا، "خدا تمہیں معاف کریگا، میں تو شاید تم سے بھی سیکڑوں درجہ برا ہوں" اور ان الفاظ سے اُس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا، اور گھر کے لئے اسکے دل میں جو بیتابی بھی تھی وہ یکایک رفع ہو گئی، اب اسے قید خانہ چھوڑنے کی مطلق کوئی خواہش نہ تھی بلکہ اپنی عمر کی آخری گھڑی کا منتظر تھا۔

ایکسایانف نے جو کچھ کہا تھا اس کے باوجود ماکار سیمیونچ نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا، لیکن جب اُس کی رہائی کا حکم آیا تو ایکسایانف کو موت پہلے ہی قید حیات سے آزاد کر چکی تھی۔

غزل

مصورِ جذبات جناب مرزا ثاقب لکھنوی مدظلہ العالی

دل اچھا چاہیے مقبول عام ہو کہ نہ ہو
اگر درست نگیں ہے تو نام ہو کہ نہ ہو

حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہِ الفت پر
سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو

یہ قیدِ الفتِ گل کم نہیں ہے اے صیاد
پھنسا ہوا ہوں ازل سے میں دام ہو کہ نہ ہو

بنا لیا ہے نشیمن محبتِ گل میں
یہ اپنی سعی تھی دیکھوں مقام ہو کہ نہ ہو

نہیں ہے فاصلہ مابین انحطاط و عروج
غروبِ مہر ضروری ہے بام ہو کہ نہ ہو

کمان لیے ہوئے ہے قسمتِ قدر انداز
ہدف ہوں میں فلکِ نیل فام ہو کہ نہ ہو

عوض جفا کے جفا دل سے ہو نہیں سکتی
حرامِ عشق تو ہے وہ حرام ہو کہ نہ ہو

جہان میں آتے ہی چھیڑا ہے دل نے قصۂ غم
مگر طویل ہے دیکھوں تمام ہو کہ نہ ہو

زمینِ قبر بھی ملکیتِ مقیم نہیں
یہاں بھی دیکھیے اپنا مقام ہو کہ نہ ہو

شراب نوشیِ الفت میں میکدہ نہیں شرط
لہو کا پینا ہے آسان جام ہو کہ نہ ہو

چراغِ داغ ابھی سے جلا دیے میں نے
نصیب میں تری دعدے کی شام ہو کہ نہ ہو

قریب رہ کے نہ سننا دلیلِ الفت ہے
پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو

غروبِ مہر کے ہمراہ دل بھی ڈوبا ہے
شروعِ شام ہے دیکھوں تمام ہو کہ نہ ہو

ابھی سے سن لے میں محتاجِ عفو و رحمت ہوں
کہ تیرے سامنے تابِ کلام ہو کہ نہ ہو

یہ جو ہے دامنِ کاغذ پہ قلبِ ثاقب کا
لہو ضرور ہے سودائے خام ہو کہ نہ ہو

ولہ

کہوں کیونکر کہ میں کچھ بھول آیا ہوں نشیمن میں — مرا صیاد کہتا ہے کہ کیا رکھا ہے گلشن میں

وہ کانٹے جن کو چن لاہوں میں وادیٔ وحشت سے — نکالوں گا اگر وسعت ہوئی صحرا کی دامن میں

غنیمت ہی قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہی گلشن میں

چراغ ہو شمع کیا روداد کہتے اہلِ مرقد کی — وہ ظلمت تھی کہ کوئی روشنی اُتری نہ مدفن میں

مرے دل کی لگی کب زندگی میں بجھنے والی تھی — دبا دی دوستوں نے مدتوں کی آگ مدفن میں

ولہ

کل وحدتِ فرقت کا سماں ہوش رُبا تھا — نالہ بھی مرے منہ سی نکلتے ہی ہوا تھا

آتے تو سوادِ شبِ غم تم کو دکھاتے — وہ سب تھا جو کچھ اپنے مقدر میں لکھا تھا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شبِ فرقت — وہ جوشِ نرآنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

وہ کر گئے تھے مجھکو بلاؤں کے حوالے — سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا تھا

دعوائے محبت تھا وہ جس نے مجھے مارا — بس اسکے سوا کچھ نہ کہا تھا نہ سنا تھا

دل سوختگانِ لحد اچھے تو ہیں یارب — اک ابر سا کل گورِ غریباں سے اٹھا تھا

ثاقبؔ انہیں کیا حال شبِ ہجر سناؤں
خود اُن پہ جو یہ رات گزرتی تو مزا تھا

تنقید و تبصرہ

اسلام اور تعداد ازدواج | مولوی ابوالفیض محمد سلیمان صاحب فاروقی بی۔ اے اڈیٹر رسالہ الفیض امرتسر نے یہ کتاب لکھی ہے، اس میں مسئلہ تعداد ازدواج پر نہایت سیر کن بحث ہے۔ اسلام میں تعداد ازدواج کی اباحت کی جو حقیقت ہے وہ دکھلائی ہے، پھر اس مسئلہ پر فطری حیثیت سے بحث کی ہے اور اس کے جواز کی ضرورت ثابت کی ہے۔ کتب قدیمہ اور انبیاء سابقین کے طرز عمل سے بھی ثبوت دیا ہے۔ اس کے بعد ویدک دھرم سے تعداد ازدواج کو ثابت کیا ہے۔ حکماء یورپ و فلاسفہ اہل نظر کے اقوال اس مسئلہ کے متعلق فراہم کئے ہیں۔ الغرض اس مبحث پر بسط و تفصیل کے ساتھ ہر پہلو سے گفتگو کی ہے اور بڑی خوبی کے ساتھ معترضین کا جو اسلام کے اس مسئلہ پر اعتراض کرتے ہیں جواب دیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے متعلق بھی بہت شافی وکافی بحث ہے اور معقولیت کے ساتھ اس کی وجوہات بیان کر دئے ہیں جس کے بعد کسی اعتراض کی مطلقاً گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

سلسلۂ کلام چونکہ مناظرانہ ہے اس لئے مناسب یہ تھا کہ عبارت خطیبانہ نہ ہوتی۔ لیکن نوجوان مصنف اپنے جوش کو جو اسلام کی محبت اور مخالفین کے غلط اعتراضات سے اس کے دل میں پیدا ہو گیا تھا ضبط نہ کر سکا۔ اور اس کے بیان میں باوجود معقولیت کے بھی جذبہ کا جوش نمایاں ہو گیا۔ اس کے ساتھ بعض غیر ضروری چیزیں بھی معرض بیان میں آگئی ہیں کا اس میں موقع نہ تھا۔ مثلاً ایک پورا باب "اسلام اور علماء فرنگ" اس کتاب کے مبحث سے غیر متعلق ہے اس کو اس میں درج کرنے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی۔

کتاب کی قیمت ۱۲ ؍ ہے۔ اور ملنے کا پتہ۔ الفیض دارالاشاعت، چوک فرید۔ امرتسر (پنجاب)۔

خلافت بنی اُمیہ | تاریخ الامت حصہ سوم کا ترجمہ ملیالم زبان میں تیسرا حصہ ہے کہ شائع ہو کر ہمارے پاس موصول ہو گیا اب مترجم صاحب حصہ چہارم کے ترجمہ میں مشغول ہیں۔

ہم کو ایک ملیباری علمی انجمن کے سکرٹری صاحب کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تاریخ الامت کے حصص کے تراجم کناری زبان میں بھی ہو رہے ہیں۔ انہوں نے وعدہ بھی کیا ہے کہ اُن کو ہمارے پاس بھیجیں گے۔

دیوان ولایت | مطبوعہ ابو العلائی اسٹیم پریس آگرہ۔ حجم ۲۸۲ صفحہ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ سید محمد احسان علی صاحب سوداگر ہانسی روڈ۔ مقابل گرجاگھر۔ کانپور

پنج رقعہ ولایت | مطبوعہ ادبی پریس لکھنؤ۔ حجم ۶۲ صفحہ قیمت درج نہیں غالباً جناب مصنف محمد عزیز الدین شاہ عزیز معروف بہ ولایت علیخاں صاحب ولایت کدہ قصبہ صفی پور ضلع اناؤ سے مل سکتی ہیں۔

منشی ولایت علیخاں صاحب ایک کہنہ سال بزرگ ہیں جو موجودہ زمانہ کے شور و شر سے دور ایک کنج عافیت میں تصوف اور شاعری کی قابل رشک زندگی بسر کرتے ہیں۔ موصوف کی ذات ہمارے قدیم ایشیائی تمدن کا ایسا خالص اور پاکیزہ نمونہ ہے جس کا مثل اسوقت ہندوستان میں مشکل سے ملے گا۔ ایسے بزرگوں کو دیکھنے کے لئے کچھ دن بعد ہماری آنکھیں ترسا کرینگی اس لئے ہمارا فرض ہے ان سے جتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اسوقت اٹھالیں۔ موصوف کو فارسی زبان پر پورا قابو ہے اور آپکے اشعار میں لطف زبان کے علاوہ درد و حسرت اور صوفیانہ وقت نظر سننے والے کے لئے ذوق و بصیرت کا سرمایہ ہے۔ پنج رقعہ کی نسبت اتنا لکھدینا کافی ہے کہ اسے غالب مرحوم نے سہ نثر ظہوری پر بدرجہا مرجح قرار دیا ہے اسکے ساتھ سید اشرف علی صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل بی نے موصوف کی زندگی کے حالات تتمہ کے طور پر لکھدئے ہیں جن حضرات کو فارسی زبان سے مذاق ہو ممکن ہے ان دونوں کتابوں کا مطالعہ بہت دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔

شذرات

اجمل خاں میموریل فنڈ کے لئے چندہ کی وصولی کا کام دہلی میں شروع ہو گیا۔ ۱۲ر فروری سے ۱۹ر فروری تک کا ہفتہ اجمل خاں ہفتہ کے نام سے موسوم کر کے چندہ کی وصولی کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ہفتہ ختم ہونے تک بیس ہزار کے وعدے ہو چکے تھے لیکن شہر کے بعض حصے باقی رہ گئے تھے اس لئے مدت میں توسیع کی گئی۔ امید ہے کہ رمضان کے آخر تک دہلی سے ایک معقول رقم وصول ہو جائے گی۔ بعد رمضان ملک کے مختلف حصوں میں وفود بھیجے جائیں گے۔

اردو اکادمی کے ممبروں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ ۲۰ر فروری تک ۸۰ درخواستیں آ چکی تھیں اور اس کے بعد بھی برابر آ رہی ہیں۔ رسالہ جامعہ اور پیام تعلیم ممبروں کے نام جاری کر دیا گیا ہے۔ دو نئی کتابیں یعنی خواجہ عبدالحی صاحب کی تفسیر پارہ عم موسوم بہ "ذکر لے" اور نذیر نیازی صاحب کا ترجمہ "عربوں کا تمدن" اسی مہینہ میں تیار ہو جائیں گی اور مارچ میں ممبروں کے پاس بھیج دی جائیں گی۔ مولانا اسلم جیراجپوری کی تاریخ الامت کا چھٹا حصہ جو تاریخ مصر پر ہے وہ بھی ابتدائے مارچ میں تیار ہو جائے گا لیکن چونکہ یہ کتاب ایک سلسلہ کی کڑی ہے اس لئے ہم اسے ممبروں کے پاس بھیجنا نہیں چاہتے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ ہم ان حضرات کے ساتھ تجارتی چال کر کے انہیں بقیہ پانچ حصوں کی خریداری پر مجبور کر رہے ہیں۔ البتہ جو صاحب خود خواہش کریں گے اُن کو دوسری سہ ماہی کا وی پی کا وصول ہونے کے بعد یہ کتاب بھی بھیجدی جائے گی۔

دسمبر کا آخری ہفتہ ہندوستان میں کانفرنسوں کا زمانہ ہے، اکثر سیاسی، اقتصادی، معاشرتی تعلیمی انجمنیں اس زمانہ میں اپنا اجلاس کرتی ہیں۔ بعض لوگ اس پر افسوس کرتے ہیں

کہ قریب قریب یہ سب جماعتیں محض تحریکوں اور تقریروں پر اکتفا کرتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ انکا وجود محض بیکار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کانفرنس کا اصلی مقصد تو یہی ہے کہ ہر تحریک کی تعمیل ہو اور ہر تقریر تاثیر دکھائے لیکن موجودہ صورت میں بھی اگر ان کانفرنسوں میں قومی زندگی کے مختلف مسائل پر وہ لوگ جو اس کے اہل ہوں محض نظری غور و فکر کریں تو بہت کچھ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ابھی ہمارے ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار لوگ جو اجتماعی مسائل سے دلچسپی بھی رکھتے ہوں، بہت کم ہیں۔ وہی چند صورتیں جو سیاسی جلسوں کی شمع محفل ہیں عموماً اور سب انجمنوں میں بھی رونق افروز ہوتی ہیں۔ دوسرے گرمئ محفل کے لئے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ حاضرین کی تعداد زیادہ ہو اور ان کی دلچسپی کے لئے پرجوش تقریروں کے بغیر کام نہیں چلتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت سی کانفرنسوں کی روداد اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ کچھ مقرر جن میں سے اکثر کانفرنس کے موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایک مجمع کے سامنے تقریریں کرتے ہیں جس میں زیادہ تر افراد کو تقریر کے موضوع سے زیادہ مقرر کی صورت، لباس، ڈیل ڈول اور آواز کی طرف توجہ ہوتی ہے۔

ممکن ہے کہ سیاسی انجمنوں کے لئے موجودہ صورت ناگزیر ہو کیونکہ انہیں اس وقت پیچیدہ مسائل حل کرنے سے زیادہ عام سیاسی احساس پیدا کرنے کی ضرورت ہے لیکن تعلیمی اور معاشرتی، انجمنوں کے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ وہ محفل مشاعرہ کا سماں پیش کریں۔ تعلیم اور اصلاح معاشرت کی ضرورت کا احساس ملک کے بہت بڑے طبقہ میں پیدا ہو چکا ہے۔ اب موقع اس کا ہے کہ ارباب فکر اس احساس کی صحیح رہنمائی کریں۔ بجائے اس کے کانفرنسوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اصولی باتوں پر بالکل غور نہیں کیا جاتا اور فروعی چیزوں پر چند فصلی اور زیادہ تر دوامی رزولیوشن پاس ہو جاتے ہیں۔

مسلم تعلیمی کانفرنس کا اجلاس مدراس اس لحاظ سے تو کامیاب رہا کہ صوبہ مدراس کے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق بہت سے ضروری رزلیوشن پاس ہوئے (اگرچہ ان میں بھی حکومت سے درخواست کیجاتی ہے کا فقرہ نتیجہ ہے بے نیاز کرنیکے لئے کافی ہے) مگر مسلمانوں کی تعلیم کے پیچیدہ اصولی مسائل کی طرف یہاں بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ گزشتہ سال کانفرنس نے جو کمیٹی ماہرین تعلیم کی بنائی تھی اس کے سپرد اس بارہ میں سوائے ایک تعلیمی رسالہ نکالنے اور چند کتابیں چھپوانے کے کوئی کام نہیں کیا گیا اور سچ تو یہ ہے کہ جس فضا میں یہ کانفرنس ہوتی ہے اُس میں سوائے رزولیوشنوں اور بے مغز تقریروں کے کسی اور چیز کی گنجایش ہے بھی نہیں۔

البتہ صدر کانفرنس سر عبدالقادر کے قابل قدر خطبہ میں ایک فقرہ ملتا ہے جسے کانفرنس کے سخن فہموں نے تو برائے بیت سمجھا لیکن ممکن ہے کہ "بطن شاعر" میں یہ معنی سے خالی نہ ہو "اب وہ وقت آگیا ہے کہ آپ کو اس تعلیم پر اکتفا نہ کرنا چاہیے جس کا مقصد محض معمولی معیار کی حرف شناسی اور اس سے بھی نیچے درجہ کی عام معلومات ہے۔ آپ کو اپنے مدرسوں کے نصاب میں ایسی تبدیلیاں کرنا چاہیے کہ آپ کے طلبہ حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے سے بے نیاز ہو کر اپنی روزی کمانے کے قابل ہوجائیں"۔

ہمیں یقین ہے کہ جب فاضل صدر نے یہ الفاظ ادا کئے تھے اس وقت اگر حاضرین بیدار ہوتے تو کانفرنس کا یقیناً وہی نقشہ ہوجاتا جو علامہ اقبال کے " دیوانہ " نے " کارگہ شیشہ گر " میں پیدا کردیا تھا۔

ہمیں نہایت خوشی ہے کہ کانفرنس میں اس مرتبہ شعبہ اصلاح تمدن کا علیحدہ اجلاس ہوا۔ جس کے صدر ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب تھے۔ ممدوح کا خطبہ صدارت جس میں زیادہ تر تعلیم نسواں اور نسوانی زندگی کی عام اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ ہماری معاشرتی حالت کا آئینہ ہے۔ خدا کرے

جو کام خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے شروع کیا تھا اُسے اعجاز شاہ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ تکمیل تک پہونچا ئیں۔ ہمیں یقین ہے کہ موصوف نے رہ منزل لینے میں قدم رکھنے سے پہلے تمام مراحل کا اندازہ کر لیا ہے اور "شرط اول قدم" قبول کر لی ہے۔

ہمعصر ماڈرن ریویو نے اپنے فروری نمبر میں اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے ہڑتال میں شریک ہونے کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ مدارس کے منتظمین طلبہ کو اُن سیاسی مظاہروں سے تو سختی کے ساتھ روکتے ہیں جو حکومت کے خلاف ہوں لیکن حکومت کی حمایت میں مظاہرے کرنے کے لئے اُنہیں ہر طرح کی ترغیب دلاتے ہیں۔ واقعی اُنکا یہ طرز عمل نہ صرف اصول منطق کے خلاف ہے بلکہ دیانتداری کے بھی منافی ہے۔ سیاسی جلسوں اور مظاہروں کی شرکت سے جو نقصان ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کی ناہموار طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہو جاتا ہے جس سے اُنکے ارتقائے دماغی کی سلامت روی قائم نہیں رہ سکتی وہ دونوں صورتوں میں یکساں ہے۔

حقائق اسلام

مصنفہ مفتی انوار الحق صاحب ایم۔ اے (محکمہ تعلیمات بھوپال)

اس کتاب میں اسلام کے مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اسلامی مسائل کی عقلی تشریح کی ہے۔ نیز ان غلط عقائد کو جو مسلمانوں میں پیدا ہو گئے ہیں جتایا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اگر مسلمان چاہتے ہیں کہ اسلام کے روشن چہرے پر سے ان بدنما داغوں کو دور کر دیں جو معترضین کی نکتہ چینیوں اور مخالفین کی حرف گیریوں نے اس پر لگا دئے ہیں اور جن سے حقیقت میں اسکا دامن بالکل پاک ہے۔ تو انہیں چاہئے کہ باطل خیالات کو جلد دور کر دیں اور سچے مسلمان بن جائیں یہ کتاب انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے خاص طور پر مفید ہے۔ ۲۰۲ صفحے قیمت دو روپئے (عار)

الفوز الکبیر حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دہلوی وہ اولین بزرگ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو کتاب و سنت کیطرف توجہ دلائی اور قرآن کریم کے اسرار و معارف معلوم کرنیکے لئے اصول تفسیر پر یہ عدیم النظیر رسالہ لکھا جس کے مطالعہ سے ہر مسلمان قرآن کریم کے مباحث پر حادی ہو سکتا ہے۔ اس رسالہ کے چار ابواب ہیں۔

(۱) پہلا باب ان علوم پنجگانہ کے بیان میں جن کی طرف قرآن عظیم نے صراحت کے ساتھ رہنمائی کی ہے اور گویا کہ قرآن مجید کے نزول کا مقصد دراصل وہی علوم پنجگانہ ہیں۔

(۲) دوسرا باب وجوہ خفا نظم قرآن کے بیان میں اور ان وجوہ کا علاج نہایت وضاحت کیساتھ۔

(۳) تیسرا باب نظم قرآنی کے لطائف اور اس کے اسلوب بدیع کی تشریح۔

(۴) چوتھا باب فنون تفسیر کے بیان میں۔

اصل فارسی سے مولانا رشید احمد انصاری مرحوم نے اردو میں ترجمہ کیا قیمت عمر

جامعہ

زیرادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے پی ایچ ڈی

جلد	بابتہ ماہ شوال ۱۳۴۶ھ مطابق مارچ ۱۹۲۸ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

حسن بن صبّاح[1]

(ماخوذ از معتقدات عجم (زیر طبع) مصنفہ مولوی محمد مسلم صاحب عظیم آبادی)

حسن بن علی بن محمد بن جعفر بن حسین بن صباح الحمیری کا خاندان کوفہ کا متوطن تھا۔ ہفتم صدی ہجری کا مشہور سیاح مارکوپولو اسکا نام اور ولدیت علاؤ الدین محمد بن الحسن بتاتا ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے اواخر میں اس کا باپ طوس میں آیا اور یہیں حسن پیدا ہوا۔ اپنا سلسلہ نسب کسی یمنی عرب صباح حمیری سے ملا کر اس نے اس نام کو مشہور انام کر دیا۔ اسکا خاندان اور یہ خود اثنا عشری شیعہ تھا۔ بقول بعض اسکا باپ سنی تھا اور اس نے اسکی تعلیم پر خاص توجہ صرف کی معلوم ہوتا ہے کہ دینیات کے علاوہ حکمت و فلسفہ میں اس نے غیر معمولی مہارت حاصل کی تھی۔

اس کے عہد طالبعلمی کے متعلق ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ عمر خیام قیام الدین (نظام الملک) طوسی اور حسن بن صباح لڑکپن کے لنگوٹیے یار اور نیشاپور کے مدرسہ میں ہم سبق تھے ایکبار ان تینوں ذہین و فطین بچوں نے آپس میں یہ طفلانہ معاہدہ کیا ہم میں سے جو کوئی بڑا ہو کر کسی بلند مرتبہ پر پہنچ جائے وہ باقی دونوں یاروں کی امداد کرے۔ قسمت اور قابلیت نے قیام الدین کو سلجوقیوں کی وزارت دلوا کر نظام الملک بنا دیا۔ اس نے حسب معاہدہ عمر خیام کو دس ہزار دینار

---

[1] مولانا شرر مرحوم کا رسالہ حسن بن صبّاح طبع آخری اس حیرت انگیز شخص کی سوانح اعتقادات اور عجیب و غریب کارناموں کا ایک مرقع ہے۔ اس کے ساتھ مولانا کے ناول فردوس بریں نے باطنیوں اور کارستانیوں کی تصویر میں جان ڈال دی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ محققانہ تذکرہ صرف آمیزش عشق و حسن کے جرم میں اُس نگاہ قدر سے محروم ہے جس کا یہ واقعی مستحق ہے۔ باطنیوں کی تصویر شاید کسی زبان میں "فردوس بریں" سے زیادہ صحیح اور کامل نہیں کھینچی گئی۔ یعنی اس شخص کے تذکرہ کے زیادہ تر انہیں حصوں سے بحث کی ہے جن کا تعلق تاریخ معتقدات عجم سے ہے۔ باقی حالات زندگی کے لئے جو بجائے خود نہایت دلچسپ ہیں۔ میں ناظرین کو "فردوس بریں" کی طرف خاص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

سالانہ وظیفہ دلوایا۔ حسن بن صباح کو بھی ایک اعلیٰ عہدہ دیا گیا مگر اس نے رشک و حسد سے نظام الملک کو بادشاہ کی نظر سے گرانے اور خود وزیر اعظم بننے کی سازش کی جو ناکام رہی اور جان بچا کر مصر بھاگا۔ اکثر تذکرے جنہیں جامع التواریخ مؤلفہ رشید الدین فضل اللہ جو آٹھویں صدی ہجری کی تالیف ہے اس روایت کی شہرت عام کے ذمہ دار ہیں۔ مگر عمروں کے مقابلہ سے یہ تینوں نامورانِ تاریخ ہمجولی نظر آتے ہیں۔ سنین ولادت معلوم نہیں۔ سال وفات نظام الملک کا ۴۸۵ھ/۱۰۹۲ء، عمر خیام کا تقریباً ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء، اور حسن بن صباح کا ۵۱۸ھ/۱۱۲۴ء اور تینوں نے عمر طبیعی پائی۔ نظام الملک اگرچہ ایک باطنی فدائی کے ہاتھ شہید ہوا مگر ۷۴ سال کی عمر میں۔ اس حساب سے حسن بن صباح اور عمر خیام تو ہمعصر تھے مگر نظام الملک کم سے کم پچیس تیس سال ان تینوں میں بڑا تھا۔ لہٰذا ان میں یہ طفلانہ معاہدہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتا[1]۔

حسن بن صباح کی طبیعت فطرۃً نہایت حوصلہ مند اور کیاد واقع ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب باطنی داعی مختلف اوضاع و لباس میں ممالک اسلامیہ میں پڑے پھرتے تھے۔ قاہرہ انکا مرکز تھا۔ حکومت فاطمیہ کیطرف سے یہ نقیب خفیہ سازشوں میں سرگرم کار رہتے تھے۔ انکی کثرت اور ریشہ دوانیوں سے کسی شخص پر وثوق کے ساتھ بھی دینداری کا اعتماد نہ ہوتا تھا۔ دوستوں آشناؤں بیٹوں، بھائیوں پر بھی بھروسا نہ تھا۔ کیونکہ بہتیرے لوگوں کا یہ حال تھا کہ ظاہری مذہب کچھ ہوتا تھا اور باطن میں کچھ۔ پوشیدہ طور پر یہ کوشش بڑے پیمانہ پر جاری تھی کہ عوام اور ناتجربہ کار جوانوں میں سے جس قدر ممکن ہو اسماعیلیہ مصر کے مطیع و مرید بنالئے جائیں۔ حسن کی اتفاقی ملاقات ایک اسماعیلی داعی[2] سے ہو گئی جس نے حسن کو ایک مفید مطلب دماغ پا کر اُسے اپنے ڈھب پر لگا لیا۔ حسن کو بھی اپنے غیر معتدل حوصلوں کے لئے ایک وسیع جولانگاہ ہاتھ آگئی۔ وہ قاہرہ کے فاطمی دربار

---

[1] مستشرق ہوزمہ کا قیاس ہے کہ حسن بن صباح اور عمر خیام کا تیسرا ہمجولی نظام الملک نہیں بلکہ ایک دوسرا سلجوقی وزیر انوشیرواں بن خالد ہو سکتا ہے جو نظام الملک سے پچیس تیس برس بعد سلجوقی فرمانروا محمود بن محمد بن ملک شاہ کا وزیر تھا جس نے ۱۱۱۸ء سے ۱۱۳۱ء تک حکومت کی۔ دونوں ہی دولت سلجوقیہ کے وزیر تھے اور شاید یہی وجہ التباس ہے۔

[2] بعض مورخ اس فاضل داعی کو ناصر خسرو علوی بتاتے ہیں۔

میں حاضر ہوا اور نہایت عزت و احترام سے لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فاطمی خلیفہ المستنصر کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں مستعلی اور نزار میں خلافت کے لئے رقیبانہ کش مکش تھی حسن نے نزار کا ساتھ دیا جو مشرقی ایران اور شام کا خلیفہ بنا۔ چنانچہ یہی ممالک حسن بن صباح کی جولانگاہ رہے۔ رفتہ رفتہ اس نے وہ اقتدار حاصل کر لیا کہ حکومت میں فاطمیوں کا حریف بن گیا۔

حسن نے اپنے مشن میں سخت سے سخت مصیبتیں اٹھائیں مگر اس اولوالعزم شخص نے حیرت انگیز پامردی کے ساتھ انکا مقابلہ کیا۔ وہ ہمت و استقلال، ذہانت و فطنت کا مجسم نمونہ تھا۔ سلطنتوں کا بنانا اور بگاڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اگر وہ چاہتا تو جیسا بدنامی میں مشہور آفاق ہے نیکنامی میں یکتائے روزگار ہوتا مگر ع درکوئے نیکنامی مارا گزر ندادند۔

جہاز میں سمندری طوفان سے بچتا بچاتا، جلاوطنی کی مصیبتیں اٹھاتا، ملک ملک کی ٹھوکریں کھاتا، وہ سواحل افریقیہ سے شام پہنچا اور ایشیائے کوچک اور ایران کے تمام مشہور بلاد میں مذہب اسماعیلیہ کی اشاعت کرتا پھرا لاکھوں آدمیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنا لیا۔ آخر برسوں کی آوارہ گردی کے بعد قزوین پہنچا اور ایک ویران قلعہ التمونت میں سکونت گزیں ہوا۔

آلہ اموت یا التمونت | یہ کوہ البرز کے سلسلہ میں دوبار کے اُس حصہ میں جسے طالقان کہتے تھے قزوین سے رشت کو جانیوالی سڑک پر ایک پرانا قلعہ تھا۔ موت سے اُجڑا پڑا تھا اور ایسی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں واقع تھا کہ نظروں سے پوشیدہ تھا۔ حسن عیاری سے اس پر قابض ہو گیا اور اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت شروع کر دی۔ اپنی شدید ریاضتوں اور زہد و تقوی سے تمام علاقہ میں اپنا وقار جما لیا۔ کہتے ہیں کہ تیس سال کی خلوت نشینی میں اس نے صرف دو دفعہ زینے سے نیچے قدم رکھے۔ اپنی شریعت و اخلاق کے احکام میں ایسا متقشف تھا کہ ان سے ادنی سے ادنی تجاوز اسکی نظر میں ناقابل عفو جرم تھا جس کی سزا میں کسی قسم کی رعایت و پاسداری روا نہ رکھتا تھا۔ اس کے بیٹے حسین نے ایک اسمٰعیلی داعی کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے قصاص میں بے تامل بیٹے کو قتل کر ڈالا۔ دوسرے بیٹے نے شراب پی تھی۔ صرف اس جرم پر اسے بھی قتل کر دیا جس کی شریعت میں اہم

یا شیخ کی نافرمانی کی سزا قتل تھی۔ اس خونیں سیاست کا نتیجہ یہ تھا کہ اس کے تمام سپاہی، مرید ملازم اسکی ہیبت وجلال سے ایسے فرمانبردار بندے بنے ہوئے تھے کہ ادنی اشاروں پر سب کچھ کر گزرتے تھے۔

یہ جان نثار داعی درویشی کے لباس میں صرف دعوت وارشاد کی خدمات انجام نہ دیتے تھے بلکہ خفیہ چالوں اور زیر آستین خنجروں سے حسن کے دائرۂ اقتدار وحکومت کو وسیع کرتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ طالقان کے چاروں طرف ایک وسیع خطہ بلکہ سارا علاقہ رودبار رفتہ رفتہ انکے دست تصرف میں آگیا۔ حسن کے نائبین نے جابجا قلعہ تعمیر کئے اور سارا ملک انکی دست درازیوں سے خطرہ میں پڑ گیا۔ ملک شاہ سلجوقی کو بھی اندیشہ پیدا ہوگیا اور اسکے کال استیصال کا فیصلہ کرکے اس نے آلہ اموت کا محاصرہ کرلیا۔ اپنی مدافعت میں حسن کے ترکش کے سب تیر ختم ہوگئے تو ایک آخری ہلاکت بار تیر نکالا۔ ایک فدائی کو تعینات کرکے ملک شاہ کے مشہور کار آزمودہ مدبر کبیر السن وزیر نظام الملک طوسی کو قتل کرا دیا۔ پھر ایک ماہ کے اندر اندر خود ملک شاہ سلجوقی کا کام زہر سے تمام کرادیا۔ اس زبردست دشمن سے مطمئن ہوکر حسن نے اپنی قوت کا اجتماع اور حکومت کا استحکام شروع کردیا۔

اسی زمانہ میں صلیبی جنگ چھڑ گئی۔ صلیبی حملہ آوروں کے پہلے سیلاب نے بیت المقدس میں مسلمانوں کا قتل عام مچا دیا۔ دنیائے اسلام میں ایک ہیجان برپا تھا۔ دینی جوش کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ عین اسی وقت حلب کا حاکم رضوان جو درپردہ باطنی ہوگیا تھا عیسائیوں سے مل گیا۔ فدائیوں کی امداد سے اس نے بھی مسلمانوں کو قتل کرانا شروع کیا۔ مسلمانوں کے جوش غضب کی انتہا نہ رہی رضوان تو مرگیا مگر جتنے باطنی فدائی ہاتھ آئے ایک ایک کو تلوار کے گھاٹ اتارا۔ ادھر فدائیوں نے بھی نئے جوش کے ساتھ مسلم حکام وسلاطین کی خونریزی شروع کردی۔ اس وقت خلافت عباسیہ ایک تبرک رہ گئی تھی۔ طوائف الملوکی کا دور تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے فرمانبردار اس قدر خوف زدہ ہوگئے تھے کہ حسن کا مقابلہ درکنار اس کے مطالبہ کے خوف سے اپنے قلعے آپ مسمار کردئے۔

حسن کی بہشت | آلہ اموت یا التمونت کا موقعہ قدرۃً غیر معمولی تھا۔ گردونواح، سبز سبز وادیوں، چراگاہوں اور قدرتی چشموں سے بہشت نگاہ بنے ہوئے تھے۔ حسن نے ان چشموں کو جھیل بناکر خوش قطع مصفا

نہریں نکالیں، وادیوں میں نہایت نفاست سے باغ لگائے۔ عالیشان اور دل فریب قصر تعمیر کئے جن پر زنگسازیوں اور ملمع کاریوں سے لعل و زمرد و نیلم، سونے چاندی کے محل تیار کئے۔ بیش قیمت سامان اور اثاثہ سے انکو آراستہ کیا۔ ماہ جبیں لڑکوں اور پری جمال لڑکیوں کو دور دور سے جمع کرکے ان میں بسایا، انہیں زاہد فریب ناز و انداز اور رقص و سرود کی تعلیم دلوائی۔ فوارے تعمیر کئے وقتاً فوقتاً خالی نہروں کو دودھ، شہد یا شراب سے بھروا کر ان میں خوبصورت کشتیاں چھوڑ دی جاتیں خوشنما، خوش قطع درختوں پر سدھائی ہوئی خوش لحن چڑیاں دلکش ترانے گاتی پھدکتی پھرتیں غرض ایسے سامان مہیا کردئے کہ بیخبر آدمی ایک دفعہ ان میں پہنچ جائے تو اپنے آپ کو سچ مچ بہشت میں سمجھے۔ آلہ اموت کے مدخل پر ایک ایسا مستحکم قلعہ تیار کیا جو بقول مارکو پولو ساری دنیا کی مجموعی طاقت کے مقابلہ میں مدافعت کے لئے کافی تھا اور اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس ناقابل عبور پہاڑیوں سے گھری ہوئی وادی کو نہ تھا۔

فدائیت | یہ زبردست جال اس لئے پھیلایا گیا تھا کہ حسن کے جو نئے شکار ہاتھ آتے تھے انکو راسخ العقیدہ بنایا جائے۔ ان سے دنیا میں بہشت کی سیر کرانے کا وعدہ کرکے حشیش (بھنگ) کا شربت پلایا جاتا اور بے ہوشی کی حالت میں انہیں خود ساختہ بہشت میں پہنچا دیا جاتا۔ ہوش آنے پر وہ اپنے آپ کو بہشتی محلوں اور باغوں میں حور و غلماں کے پہلو میں پاتے۔ دودھ کی نہروں میں حسینوں کے ساتھ کشتی پر سیر کرتے۔ پری جمال محبوبوں کی ہمکناری انہیں سرشار کر دیتی۔ اس پر انکے ہاتھ سے شراب کے جام بے خود بنا دیتے۔

وہ اور مرے پہلو میں! ہے خواب کہ بیداری؟ گرہو یہ غشی یارب تاحشر رہے طاری

اخیر میں حشیش کے پیالے سے بیہوش ہو کر پھر جو آنکھ کھولتے تو اپنے تئیں اسی دارالحزن اور عالم کشمکش میں پاتے۔ بہشت کے مزے اور حوروں کی یاد بے چین رکھتی۔

جیتے جی بہشت کی دوبارہ سیر کسی نہایت سخت شرط پر مشروط رکھی جاتی مگر جانداده حور طالب ہر امتحان و ابتلا پر آمادہ ہو جاتا۔ یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید۔

کسی امیر، وزیر، بادشاہ، عامل، عالم، فقیہ، مفتی کا کام تمام کردینے کی خدمت سونپ جاتی اور یہ جانداد حور بے تامل کر گزرتا۔ اس عیاری سے حسن ایسی ایسی جلیل القدر ہستیوں کی فنا میں کامیاب ہوتا جن کو اپنی راہ میں مزاحم پاتا۔ بے باکانہ خون آشامیوں سے ابنائے زماں کے دلوں میں باطنیوں کی ہیبت چھاجاتی اور ان سے الجھتے یا مزاحمت کرتے ہوئے خوف کھاتے چنانچہ نظام الملک طوسی کی شہادت سے ملک شاہ نے خوف زدہ ہوکر الموت کی مہم ملتوی کر دی۔

الغرض شریعت جاریہ کی بیخ کنی کی تعلیم و تلقین، نئے دین کا قدرتی جوش و غلو، باطنیت کا فریب، حسن کی بظاہر پارسایانہ زندگی کا اثر اس کی سیاست و تعزیرات کا خوف، خود ساختہ بہشت کا عیش و جشن کی چاٹ ان سب کا مجموعی نتیجہ یہ تھا کہ حسن کے پاس اُسکے مریدوں کی ایک چیدہ و برگزیدہ سرفروش فوج تیار رہتی تھی جو اپنی جانبازیوں اور عیاریوں سے بڑے بڑے سورما سپاہیوں کے چھکے چھڑا دیتی تھی۔ ایکبار ملک شاہ کے ایک قاصد کو اپنی طاقت کی نمائش کیلئے اس نے اپنے ایک فدائی کو اشارہ کیا کہ پہاڑ کی چوٹی سے کود پڑے اُس نے فوراً تعمیل کی اور ہڈی پڈی سرمہ ہو گئی۔

حسن کے مریدوں کے تین طبقے تھے۔ داعی۔ رفیق۔ اور فدائی۔ داعی مشنری تھے جو دور دراز اقطاع عالم میں باطنیت کی خفیہ تبلیغ کرتے تھے رفیق مجلس خاص کے معتمد و مشیر تھے اور دین باطنی میں مجتہدانہ امتیاز رکھتے تھے۔ فدائی وہ جاں نثار مرید تھے جن کے ہاتھوں اکابر عہد کی جانیں لینے کی خدمت انجام پاتی۔ یہ گروہ سب سے خطرناک اور حسن کی طاقتوں کا اصلی مرکز تھا۔[1]

عقائد | حسن نے کسی نئے دین یا عقائد کی تعلیم نہ دی اسکا اصلی مطمح نظر سیاسی اقتدار و حکومت تھا جس کے حصول کے لئے وہ زیادہ تر سیاسی چالوں اور عیاریوں سے کام لیتا تھا۔ تبلیغ کے لئے اس کے بیشتر قرامطہ اور اسمٰعیلیوں نے جن تعلیمات کی بنیاد ڈال دی تھی وہ اس کے لئے کافی ہتھکنڈے تھے اسمٰعیلی مسئلہ تاویل میں اتنی لچک موجود تھی کہ اسے جس قسم کے فتووں کی ضرورت ہوتی صادر کر دیتا

---

[1] حسن بن صباح کی بہشت اور طریق کے متعلق مارکوپولو پر میں نے زیادہ اعتماد کیا ہے اس نے یہ حالات الموت کی تباہی کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھے ہیں   مرتبہ   صفحہ ۱۳۹ و ملحقات

ہر حلال ادنیٰ تصرف سے حرام اور ہر حرام حلال کرلیا جاتا سفسطہ سے اسے خاص ذوق تھا۔ اس نے ذات باری تعالیٰ کو مجرد عن المادہ ہی نہیں بلکہ وجود معطل قرار دیدیا۔ یہانتک کہ اس نے ذات باری میں صفات کی ہستی سے بھی انکار کردیا۔ صفات کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت دینے کو اس نے تشبیہ مخلوقیت سے تعبیر کیا، کیونکہ رزاقی، ربوبیت، ستاری، وہابی، غفوری یہ جملہ صفات خصوصیات انسانی اور قابل تغیر و زوال ہیں پس خدا کو ان صفات سے اسی معنی میں متصف کیا جاسکتا ہے کہ اس نے انسان کو یہ قدرتیں بخشی ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ انکا فاعل ہے۔ انتہا یہ کہ وجود کی نسبت بھی خدا کیطرف جائز نہ رکھتا تھا۔ اس امر میں اسکی تشکیک کا یہ عالم تھا کہ خدا کو نہ موجود کہا جاسکتا تھا نہ غیر موجود۔ اس عقیدہ کا مقابلہ اُن وحدۃ الوجودی صوفیہ کے عقیدہ سے کیجئے جو لا الہ کے بعد الا اللہ کہنے کو شرک تصور کرتے ہیں۔

حسن نے ۳۵ برس کی فرمانروائی کے بعد ۱۱۲۴ء میں ایک بے تاج کے مقتدر و جابر بادشاہ کی حیثیت سے اپنے دار الحکومت قلعہ آلہ اموت میں وفات پائی۔ ایک آوارہ، بیکس مفلوک الحال نوجوان اپنی عزیمت، استقلال، علم، قابلیت اور عیاریوں کی بدولت ایک ایسا حکمراں بن گیا جس کے نام سے ممالک مشرقی کے بڑے بڑے سلاطین تھراتے اور جس کے خوف سے کسی مسلمان کو سکھ نیند نصیب نہ تھی لوگ کہتے ہیں دروغ کو فروغ نہیں اور ظالم کی عمر کوتاہ۔ لیکن قرامطہ اور حشیشین کی پونے چار سو برس کی کامیابیوں پر نظر کریں۔ تاریخ میں ایک یہودی النسل یا عجمی نژاد کے فاطمی مشہور ہو جانے پر غور کریں اور دوسرے تاریخی ظالموں کی طویل حکومت پر نگاہ ڈالیں تو ماننا پڑیگا کہ ملکی نحتمندی و اقتدار کے لئے جو قابلیت درکار ہے وہ محض مادی ہے۔ حق و صداقت نہیں۔ اور کامیابی کی درازیِ مدت کسی شخص یا جماعت یا دین یا حکومت کی صداقت یا حقانیت کی دلیل نہیں ہو سکتی۔

دنیا ہماری دماغی کیفیات کا عکس ہے

(ماخوذ از جمیس ایلن)

جیسے ہم ہیں ویسی ہی ہماری دنیا ہے۔ عمل خیال کا محکوم ہے۔ دنیا پر خیال کی حکمرانی ہے یہ ہی نہیں بلکہ عالم ایک بزم خیال ہے، یا ہمارے باطنی تجربات کا ایک شیرازہ۔ جو کچھ ہماری نگاہ کے سامنے ہے یہ سب ہمارے تاثرات قلبی اور واردات دماغی کی سامان طرازی ہے۔ تمام تر اہمیت کی مالک دل و دماغ کی اندرونی کیفیات ہیں کیونکہ تمام بیرونی چیزیں انہیں کیفیات کے آئینہ میں رونما ہوتی ہیں اور انہیں مختلف الالوان کیفیات سے اکتساب رنگ و بو کرتی ہیں۔

جو کچھ ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں وہ ہمارے تجربوں سے مرکب ہے اور جو کچھ ہم آئندہ جانیں گے اسے بھی لازمی طور پر تجربہ ہی کے دروازہ سے گزرنا ہوگا۔ اس طرح یہ سب ہماری ذات کا جزو بن جائے گا۔

خود ہمارے خیالات، ہماری خواہشات اور تمنائیں ہماری دنیا بناتی ہیں اور ہر انسان خود ساختہ دنیا میں رہتا ہے۔ بزم شہود ہمارے دل و دماغ ہی کی جلوہ گری ہے۔ نشاط و حسن یا حزن و ملال اور بصارت سوز کریہ مناظر کی دنیا خود ہمارے اندر آباد ہے۔ انکے وجود کا راز خود ہماری ذات ہے ؎

سالہا دل طلب جام جم از ما می کرد　　　آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

ہماری زندگی کی کامرانی اور نامرادی، ہماری دنیا، ہماری کائنات سب خیال کی کرشمہ سازی ہے اور غالب مرحوم کا دنیا میں خیال کے سوا ہر چیز کی نفی کرنا اور تمام عالم کو "حلقہ دام خیال" کہنا ایک حقیقت کبریٰ کا اظہار ہے۔ ہماری ظاہری اور بیرونی زندگی کی تعمیر ہمارے باطنی تصورات کے مطابق ہوتی ہے۔ ہمارے خیالات روح ہیں اور دنیا جسم ہے۔ یہ دنیا ہمارے خیالات کی مادی صورت

ہے۔ جو خیالات ہمارے دماغ میں پرورش پا رہے ہیں وہ یقیناً ردعمل کے ناگزیر قانون کے ماتحت، جلد یا بدیر، ہماری بیرونی دنیا میں متشکل ہو جائیں گے۔ آغوش حسن مراد اسی کو نصیب ہو سکتا ہے جس نے طہارت نفس اور ایثار سے اپنی روح کو بھی جمیل اور دلاویز بنا لیا ہے۔ اور کیف ارواح وہاں آفات کا لقمہ ہیں۔ یہ فطرت کا دستور ہے اور قدرت کے کارپرداز اس قانون کی بجا آوری میں کبھی خطا نہیں کرتے۔ ہر روح اپنی عادات و خواص کے لحاظ سے ہر شے کو رد یا قبول کرتی ہے اور یہ محال ہے کہ وہ اس چیز کی مالک بن سکے جس کی وہ صلاحیت نہیں رکھتی۔

وہر لبریز مکافات است اما کو تمیز۔ کم کسے اینجا بحال خود ترحم می کند

جس انسان نے اس حقیقت کو پا لیا اس نے گویا آئین فطرت کی ہمہ گیری اور عمومیت کو سمجھ لیا باطنی ظرف کی تنگی اور وسعت کے اعتبار سے حادثات دنیاوی انسانی روح کو متاثر کرتے ہیں۔ ہر روح تجربات اور افکار کا مجموعہ ہے اور جسم انکے اظہار و افشا کی ایک گاڑی جو ہر وقت استعمال کے لئے تیار رہتی ہے۔ اس لئے جو کچھ ہمارے خیالات ہونگے دراصل "ہم" وہی ہیں۔ ہمارے گرد و پیش کی تمام ذی روح چیزیں ہمیں اسی لباس میں نظر آتی ہیں جو ہم انہیں پہناتے ہیں بدھ کا قول ہے کہ ہم اپنے تفکرات اور خیالات کا نتیجہ ہیں، ہماری ہستی کی بنیاد خیالات پر استوار اور پھر ہماری ہستی کی تعمیر بھی خیالات ہی کی رہین ہے۔ حوادثات کی تعمیر و تخریب ہماری خیالی زندگی" پر مبنی ہے اگر انسان خوش ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پُرنشاط تصورات کی دنیا میں رہتا ہے اور اگر وہ غمناک ہے تو اسکا سبب یہ ہے کہ وہ پست اور یاس انگیز خیالات کی دنیا میں رہتا ہے۔ تم خوف اور بے باکی، حماقت و عقلمندی اور اطمینان و اضطراب کی وجہ اپنے ہی اندر تلاش کرو۔ اور اگر تم نے انکو اپنے آپ سے جدا کہیں اور تلاش کیا تو باور کرو کہ تم ضرور ناکام رہوگے۔ ہر شی کی اصل تم ہی ہو اور تم سے باہر کچھ نہیں ہے۔

برقے زد و رد دار و ہنگامہ تجلی ۔ اے بیخوداں بہ بیند دل جلوہ گر نباشد

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کچھ جواب طلب آوازیں یہ کہہ رہی ہیں کہ آیا در حقیقت میرا یہ عقیدہ ہے

کہ بیرونی حالات وحوادث ہمارے دماغوں کو متاثر نہیں کرتے؟ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا لیکن اس کو غیر فانی حقیقت یقین کرتا ہوں کہ بیرونی حالات وحوادث اسی حد تک ہم میں اثر ونفوذ کی صلاحیت رکھتے ہیں جس حد تک ہم انہیں اجازت دیں۔ ہم حوادثات کے سیلاب میں اس لئے بہہ جاتے ہیں کہ ہم خیال اور ارادہ کی اہمیت اور استعمال سے ناآشنا ہیں۔ ہم یقین (یقین کا یہ مختصر لفظ ہی رنج و راحت کا خلاق ہے) کرتے ہیں کہ بیرونی چیزیں ہماری زندگی کو بنانے اور سنوارنے میں دخل رکھتی ہیں اور اس طرح ہم بیرونی چیزوں کے سامنے اپنی سپر ہمت ڈالدیتے ہیں اور اقرار کرلیتے ہیں کہ ہم انکے غلام ہیں اور وہ ہمارے غیر مشروط اور مطلق العنان آقا اور پھر اس طرح ہم ان میں وہ قوت پیدا کردیتے جو پہلے ان میں نہ تھی اور فی الحقیقت ہم صرف حوادث کے مطیع نہیں ہوتے بلکہ ہم اس ظلمت وتعدی یاس و امید یا ضعف وقوت کے ماحول کے فرمانبردار ہوتے ہیں جو ہماری قوت متخیلہ ان حادثات کے گرد ہمیں دکھلاتی ہے۔

میں دو آدمیوں کو جانتا ہوں جن کی برسوں کی کمائی دست برد زمانہ کے ہاتھوں ناگہانی طور پر ضائع ہوگئی۔ ان میں سے ایک شخص کے ہوش وخرد کو اس صدمہ نے سلب کرلیا۔ مایوسی، اضطراب اور ترش روئی جو ایسی حالت کے لوازم ہیں اس کی فطرت بن گئے اور مصائب کی آہن پوش اور غیر مفتوح سپاہ نے یمین و یسار سے اس پر زغہ کرلیا دوسرے شخص نے جب صبح کے اخبار میں یہ روح فرسا خبر دیکھی کہ وہ بینک جس میں اسکا روپیہ جمع تھا ٹوٹ گیا۔ اور اب ایک پائی بھی واپس ملنے کی امید نہیں کیجا سکتی تو اس نے اپنا باطنی سکون قائم رکھا اور اپنے حواس کو اس حادثہ کے نذر نہ کیا۔ بلکہ ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ کہا کہ حزن وملال اس تباہی کو واپس نہیں لوٹا سکتے مگر جان توڑ کوشش سے ان مصیبت کے دنوں کا پھر جانا ممکن ہے۔ اگلے روز اس نے تازہ جوش اور قوی تر عزم کا سرمایہ لیکر اپنا کام شروع کردیا اور قلیل مدت میں اس نے اپنے نقصان کی تلافی کرلی خود اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ مصیبت کا حائل شدہ پہاڑ کس آسانی سے ٹل گیا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ دانشمند اور تجربہ کار تھا۔

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب　　لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

اگر سانحات اور واقعات نحوست اور برکت کے حامل ہوتے تو انہیں تمام انسانوں پر اپنا اثر یکساں ڈالنا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت کہ ایک ہی قسم کے واقعہ کا دو انسانوں پر مختلف اثر ہوا ثابت کرتا ہے کہ بھلائی اور برائی نفس حالات واقعات میں نہیں ہوتی بلکہ صرف اس شخص کے دماغ میں ہوتی ہے جو ان سے دوچار ہوتا ہے۔ ناکامیاں پست خیالی اور غلامانہ ذہنیت کا خمیازہ ہیں اور اتفاقات کو ان میں بہت ہی کم دخل ہے، اتفاقات ہمیشہ نہیں پیش آتے پیہم ناکامی اور متواتر شکست و ہزیمت کی وجہ ہرگز اتفاقات کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جس طرح ہم حوادثات اور سوانح کو اپنے خیالات کے رنگین چشمہ سے دیکھتے ہیں۔ اسی طرح ہم مرئی دنیا کو بھی خیال کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ایک خودرو پھول جس پر ایک معمولی رہرو نگاہ غلط انداز بھی صرف کرنا گوارا نہیں کرتا اور جسے وہ اپنے پیروں کے نیچے روند ڈالتا ہے شاعر کی نگاہ رمز شناس میں عالم غیب کا ایک قدسی صفت قاصد ہے۔ وہ اس پھول کو دیکھتا ہے اور ہنگامہ ہستی کی شرح سمجھتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ

آغوشِ گل کشادہ برائے وداع ہے

بہت سے انسانوں کے خیال میں سمندر صرف پانی کی ایک ناپیدا کنار وسعت ہے جس پر جہاز تیرتے ہیں اور اکثر اوقات امواج کی برہمی کی تاب نہ لا کر لقمۂ آب ہو جاتے ہیں، لیکن یہی قلزم بے پایاں اور محیط اعظم ایک صاحب ذوق کی نظر میں زندہ چیز ہے وہ اس کے تمام تغیرات میں ایک آسمانی نغمہ اور ایک صوت سرمدی سنتا ہے اور وجد کرتا ہے۔ اسکی یہ پہنا اس کے لئے کوئی مہیب چیز نہیں بلکہ اس کے تموج کا شور اس کے لئے نواپرداز ساز ہے۔ گوش محرم کے لئے ہر گل ایک نغمہ ہر پتی زبانِ گویا اور ہر حباب پردۂ مضراب ہے۔ جہاں ایک عام انسان انتشار اور پراگندگی دیکھتا ہے وہاں ایک فلسفیانہ دماغ، اسباب و نتائج، علت و معلول اور فعل و انفعال کا ایک منضبط سلسلہ مشاہدہ کرتا ہے۔ جہاں ایک منکر روح اور مادہ پرست انسان دائمی

اور بے پایاں موت وگمنامی تصور کرتا ہے۔ وہیں ایک عارف حق ابدی اور غیر فانی حیات کی شہادت دیتا ہے۔ ہماری آنکھیں کیوں وہاں کچھ نہیں دیکھتیں جہاں ایک صاحب نظر کو جلوہ محبوب نظر آتا ہے گرمی بزم کا نتیجہ تم بھی رقص شرر سے معلوم کر سکتے اور قطرہ میں دجلہ رجزو میں کل تم بھی مشاہدہ کر سکتے ہو۔ اگر یہ حقائق تمہارے دماغ میں منعکس نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے تعلیم و تربیت سے اپنے دماغ کو جلا نہیں دی ہے۔ اگر دیدۂ بصیرت وا ہو تو تم دیکھو گے کہ دنیا کی ہر شے اور ہستی کا ہر ہنگامہ ایک فلسفہ ہے لیکن ہر انسان نہیں جانتا۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ ۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

فراوانی حسن تو صرف رعنائی خیال کا نتیجہ ہے اور حسن عمل حسن خیال پر مبنی ہے اگر تمہارے دماغ کی شمع روشن ہے تو پھر کسی بیرونی آفتاب کی چنداں ضرورت نہیں۔ مست عرفان کو کسی دوسری شراب کی حاجت نہیں اس کو تو

جز طواف خویش دور ساغرے درکار نیست

دنیا کے راز تم اپنی ذات سے پوچھو کہ تم خود مضراب حقیقت ہو۔ از خود بشنو کہ ترجمانی ہمہ را۔

جس طرح ہماری دماغی کیفیات کا واقعات اور اشیا پر اثر پڑتا ہے اسی طرح ہم دوسروں کے بطون کو بھی اپنے دماغ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ بدگمان ہر شخص کو مشتبہ خیال کرتا ہے۔ کاذب گمان کرتا ہے کہ یہ یقین کرنا حماقت ہے کہ دنیا میں کوئی ایسی عجیب ہستی ہے جس کو راست بازی کا مکمل نمونہ کہا جا سکے۔ حاسد ہر آدمی کو بداندیش یقین کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ دنیا کا ہر متنفس اس کی دولت کی طرف چشم آز سے تاک رہا ہے۔ ایک متمول آدمی ہمیشہ اپنے تکیہ کے نیچے ریوالور رکھکر سوتا ہے اور اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ دنیا مردہ ضمیر کے انسانوں سے آباد ہے جو ہر وقت اس کے لوٹ لینے کے منصوبے باندھتے رہتے ہیں دوسری طرف جو لوگ شیریں اور محبت آمیز خیالوں میں استغراق رکھتے ہیں دنیا کو ہمدردی اور محبت سے لبریز پاتے ہیں اور مغالطہ کے شکار نہیں ہوتے۔ نیک سیرت اور فیاض طبع لوگ دوسروں کی خوش نصیبی پر خوشی مناتے

ہیں اور حسد کے مفہوم سے بھی بیگانہ ہوتے ہیں جو شخص اپنے اندر خدا کو دیکھتا ہے وہ دنیا کی تمام
چیزوں میں حتیٰ کہ درندوں کی شکل میں بھی اُسی کو جلوہ آرا پاتا ہے۔ قدیم اور مشہور ضرب المثل
"کند ہم جنس باہم جنس پرواز کبوتر با کبوتر باز با باز" جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اس سے ہم
تر بصیرت افروز نکتہ اپنے اندر رکھتی ہے۔ دنیائے مادہ اور دنیائے خیال دونوں میں یہ آئین
فطرت کارفرما ہے اور ہر چیز اپنی جنس کی طرف رجوع ہوتی ہے۔

اگر تم ان لوگوں میں سے ہو جو دعا کرتے ہیں اور اس تمنا میں جیتے ہیں کہ قبر کی منزل موجودہ
دور زندگی سے زیادہ خوش فضا ہو تو میرے پاس تمہارے لئے خوشخبری ہے کہ تم اس راحت دنشاط
سے بھی ہم کنار ہو سکتے ہو اور کائنات کا ہر ذرہ اس سے معمور ہے۔ یہ بہار نظر اور وادی جنت
تمہاری منتظر ہے کہ تم اسے ڈھونڈھ نکالو شناخت کرو اور حاصل کرلو۔ ایک عارف کا قول
کہ اگر لوگ تم سے کہیں کہ ادھر دیکھو تو تم اپنی نگاہوں کو انکا تعاقب کرنے سے باز رکھو۔ خدا کی بادشاہت
تو خود تمہارے اندر ہے اور خدا کی جلوہ گاہ خود تمہارا دل ہے تو پھر تم خدا کو اپنے ہی دل میں کیوں
نہیں ڈھونڈھتے۔

گویند کہ کنہ ذات او نتواں یافت۔ ما یافتہ ایم ایں کہ کنہش مائیم

تم اس نکتہ کو اپنا موضوع فکر بنالو پھر تم خود اپنے اندر کعبہ تعمیر کر سکتے ہو جب تم ایک بصیرت سے
دوسری بصیرت تک اور ایک مشاہدے دوسرے مشاہدہ تک گزروگے تو اپنی ذات سے جدا اور بیرونی
چیزوں کی بے بسی و بیچارگی اور خود مختار باطنی قوت کی ساحرانہ قدرت اور اختیار مطلق کی صداقت تم پر
منکشف ہوجائیگی۔ تم اپنے دل و دماغ کو صرف محبوب کے خیالات سے پر کرلو تمہارے قدم خود تمہیں محبوب
کے پاس پہونچا دینگے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپ چلکر تمہارے پاس آجائے۔ انگریزی ضرب المثل ہے
کہ عزم اپنا راستہ خود صاف کرلیتا ہے۔ خیال ہی تو عمل کا محرک ہے اگر تمہارے خیالات بلند ہیں تو کیا وہ
تمہیں بلندی پر نہیں چڑھالیجائیں گے پس ثابت ہوا کہ عظمت اور ذلت کی بنا صرف ہمارے خیالات ہیں
"جیسے "ہم" ہیں ویسی ہی "ہماری دنیا" ہے۔ اور دنیا ہماری "دماغی کیفیات کا عکس ہے"

دانیالی بشارتیں

(۳)

سنہ ولادت

اب جبکہ ہم نے متعین کر دیا کہ بخت نصر کا پہلا سال ۱۳۶۶ش ق م یا ۴۲سنہ ق م تھا تو اب آیئے ہم ان بشارتوں پر غور کریں جن میں آنحضرت صلعم کی ولادت، بعثت، ہجرت وغیرہ اہم ایام زندگی کی خبریں موجود ہیں۔

سنہ جلوس خسرو گشتاسب میں فرشتہ نے دانیال کو خبر دی کہ اب ایران میں چار بادشاہ اور ہونگے، اس کے بعد یونان کا سردار آئے گا جس کے مرنے کے بعد اسکی حکومت چار حصوں میں منقسم ہو کر مٹ جائے گی۔ (۱۱:۱تا۴)

اس کے بعد شاہ جنوب اور شاہ شمال کی جنگوں کا تذکرہ کیا ہے پھر (۱۱:۳۱) میں پیش گوئی ہے شاہ شمال کے ساتھی بیت المقدس کو ناپاک کرینگے اور دائمی قربانی پھر موقوف کر دیں گے اور اس میں تباہ کرنے والی مکروہ چیز دھر دینگے چنانچہ انطوقیوس کے عہد میں یہ ہوا اور خاص الہام گاہ میں اولمپس دیوتا کی مورت نصب کی گئی۔

اس کے بعد بھی شاہ شمال اور شاہ جنوب کی جنگ کا تذکرہ جاری رکھا ہے اور آخر میں فرماتے ہیں کہ

"اس وقت میکائیل وہ بڑا سردار جو تیری حفاظت کے لئے کھڑا ہے اٹھیگا" (۱۲:۱)

میکائیل کی آمد سے مراد یقینی طور پر کسی نبی کی آمد ہے، مسیح حضرت میکائیل موعود حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو سمجھتے ہیں لیکن انصاف تو یہ فرماتا ہے کہ اس سے مراد کوئی اور ہے۔

اسی آیت کی بنا پر عہد نبوت کے یہود ایک پیغمبر کا انتظار کرتے تھے اور اس کی بعثت کی

تاریخ بھی بتایا کرتے تھے ۔ حضرت محمد صلعم جب مبعوث ہوئے تو ایماندار یہود نے آپ کو قبول کیا ، جاہ پسند اور ازلی بدبخت رکے رہے ، کچھ یہود ایسے بھی تھے جو پوری طرح جانچ کر کے وہی موعود میں ایمان لاتے تھے ۔

اس قسم کے لوگ اکثر اپنے علماء سے چند امتحانی سوالات دریافت کر کے آتے اور آنحضرت صلعم کے سامنے پیش کرتے بالآخر صحیح جواب پا کر مان لیتے ۔ اس لئے تیز فہم علمائے یہود نے یہ جانکر کہ یہودیوں کا دانیال باب ۱۲ کے باعث یہ خیال ہے آئندہ پیغمبر پر وحی لانیوالے فرشتہ کا نام میکائیل ہے اور حضرت رسول خدا اپنے فرشتہ کا نام جبرئیل بتاتے ہیں اس لئے انہوں نے کچھ نیم خواں لوگوں کو تعلیم دی کہ محمد صلعم پر ایمان لانے سے پہلے یہ تو دریافت کر لو ان پر کون فرشتہ پیام لاتا ہے ۔ وہ آپ کی خدمت میں آئے اور سوال کیا تو جواب ملا کہ "جبرئیل" مفسرین نے باسناد لکھا ہے کہ یہ نام سنکر انہوں نے کہا کہ میکائیل پیام لاتے تو ہم ضرور ایمان لاتے جبرئیل تو ہمارے دشمن ہیں (یعنی فرشتہ قہر و عذاب ہیں) اس پر ذیل کی آیت نازل ہوئی ۔

قل من کان عدوا لجبریل فانہ نزلہ علی قلبک باذن اللہ مصدقا لما بین یدیہ و ھدی و بشری للمومنین ۔

کہدو کہ جبرئیل کا دشمن جو بھی ہو ، انہیں نے تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے پہلی کتابوں کی تصدیق اور ایمان والوں کی ہدایت اور خوشی کے لئے اس کو اتارا ۔

آیت کا آخری ٹکڑا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کتب سابقہ میں بھی یہ پہلے سے متعین تھا کہ آخری پیغمبر پر جبریل ہی پیام لائیں گے ۔

یہود کی غلط فہمی کی وجہ یہ ہوئی کہ انہوں نے میکائیل کو یہاں علم یعنی ایک فرشتہ کا نام سمجھ لیا حالانکہ یہ لفظ یہاں اسم صفت ہے ۔ یہ لفظ تین لفظوں کا مجموعہ ہے (۱) پہلا عربی لفظ "ما" یا "من" ہے (۲) یہ دوسرا عربی کاف تشبیہ ہے (۳) ایل کے معنی ہیں خدا

اس پورے مرکب کے معنی ہیں وہ جو خدا جیسا (واجب الاطاعت) ہو " اور یہی معنی یہاں مراد ہیں ورنہ خود دانیال کی کتاب سے ظاہر ہے کہ انکے پاس بھی حضرت جبریل ہی پیغام لاتے

تھے، اسی طرح یہی فرشتہ جبریل ہر پیغمبر کے پاس بشارت لایا کیا ہے۔

بہر حال حضرت دانیال فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے ان کو ہیکل کی تباہی اور مسلسل جنگوں کے بعد ایک خدا جیسے واجب الاطاعت بزرگ کے آنے کی بشارت دی اور انکے آنے کے زمانہ کے متعلق فرمایا۔

اور وہ ایسی تکلیف کا وقت ہوگا جو امت کی ابتدا سے اس وقت تک کبھی نہ ہوا تھا (۱:۱۲)

یہ آیت صاف اشارہ کرتی ہے کہ آمد میکائیل کا زمانہ سنہ ء کے بعد ہے کیونکہ سنہ سے پہلے کوئی وقت ایسا نہ گزرا جو یہود کے لئے سنہ ق م سے زیادہ سخت ہو۔

میکائیل موعود کے خاص فرائض یہ ہیں:۔

(۱) نجات ابدی بخشنا چنانچہ فرمایا "اس وقت تیری امت سے ہر ایک جس کا نام کتاب (تقدیر) میں لکھا ہوگا نجات پائیگا (۱:۱۲)

(۲) ابدی زندگی دنیا "بہتیرے جو زمین پر خاک میں سوئے ہیں جاگ اٹھیں گے بعض حیات ابدی کے لئے اور بعضے رسوائی اور ذلت ابدی کے لئے" (۲:۱۲)

(۳) اہل دانش کو چاند سورج اور ستاروں کی طرح چمکانا "اہل دانش فلک کی چمک (منار یعنی سورج) کی مانند چمکیں گے اور وہ جن کی کوشش سے بہتیرے صادق ہونگے ستاروں کی مانند" (۲:۱۲) اصحابی کالنجوم بایہم اقتدیتم اہتدیتم۔

آگے چل کر ۷ ویں، گیارہویں اور بارہویں آیتوں میں میکائیل موعود کی آمد کے مختلف زمانے بتائے ہیں جو آنحضرت صلعم کے سال ولادت سال بعثت اور سال اعلان نبوت پر ختم ہوتا ہے۔

چنانچہ ۱۲ ویں باب کی گیارہویں آیت میں فرمایا کہ "جس وقت سے دائمی قربانی موقوف ہوگی، اور مکروہ چیز جو خیرات کرتی ہے قائم کیجائے گی ۱۲۹۰ دن ہونگے"

"دن" سے مراد مسیحیوں کے نزدیک سال ہے، اور انہوں نے "موقوف ہوگی" اور

قائم کیجائیگی متوجہ کرکے ہم کو مجبور کردیا کہ ۱۲۹۰ دنوں کا شمار اس بربادی سے کریں جس کی خبر دانی ایل نے ۱۱:۳۱ میں دی ہے۔

اس معنی کے لحاظ سے یہ بشارت (نعوذ باللہ) جھوٹی ہوگئی اور موعود زمانہ گذر گیا نہ تو سنہ ق م کے بعد ۱۲۹۰ سال گزرنے پر ۱۲۱۱ء میں اور نہ سنہ ء کے بعد ۱۲۹۰ سال بعد [illegible]ء میں کوئی میکائیل آیا اور نہ اب امید ہے۔

"جس وقت سے دائمی قربانی موقوف کیجائیگی اور مکروہ چیز جو خراب کرتی ہے قائم کیجائیگی" کے بجائے عربی نسخوں میں ذیل کی عبارت ہے۔

من وقت، ازالۃ المحرقۃ الدائمۃ واقامۃ رجس المخرب	دائمی قربانی کے موقوف ہونے اور برباد کرنے والے کی ناپاکی کے قیام زمانہ سے

یہ ترجمہ تو صحیح ہے مگر عربی میں بھی "یوم" کا لفظ اردو کی طرح محدود قرار دیا گیا ہے حالانکہ اصل عبرانی میں یوم کا لفظ عدد کیطرف مضاف ہے اور سامی زبانوں میں جب یہ لفظ کسی واقعہ کی طرف مضاف ہوتا ہے تو زمانہ کے معنی دیتا ہے اور گنتی کی طرف مضاف ہوتا ہے تو کسی سنہ کو نامزد کرتا ہے، دو انکو ۔۔۔ کے مصنف نے لکھا ہے کہ عبری کے علما نے مترجموں کی کمیٹی کو اس آیت کے ترجمہ کیطرف توجہ دلائی مگر انہوں نے یہ تکلیف گوارا نکی، صحیح ترجمہ عبارت کا یوں ہونا چاہئے۔

دائمی قربانی کی موقوفی اور برباد کرنے والے کی نجاست
(مشرکانہ حکومت) کے قیام ہی اسوقت تک ۱۲۹۰ سال کا زمانہ
گزرچکا ہوگا۔

اس ترجمہ کے مطابق ۱۲۹۱ سنہ سیری یکونیاہ وہ زمانہ ٹھہرتا ہے جس میں خدا جیسے واجب الاطاعت کو آجانا چاہئے

ابھی ہم ثابت کر آئے ہیں کہ بخت نصر کا پہلا سال حکومت ۶۰۴ سنہ ق م تھا، دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ابتدائے سنہ ہجری سے ۱۲۲۶ سال و ۱۲۹ دن قبل اس کی حکومت قائم ہوئی۔

ان ۱۲۹۰ سالوں اور دنوں میں سے (۱۲۹۰) برس گھٹا دو تو ۷۰ برس ۳۳۶ دن بچتے ہیں جلوس بخت نصری اور اسیری یکونیاہ کے سنین میں کچھ دن کم یا بیش ۲۶ برس کا فرق ہے کیونکہ یکونیاہ سلسلہ یہویاقیم کے آخری مہینوں میں گرفتار ہوا، اور اس کی گرفتاری سے ۲۶ برس پہلے بخت نصر حاکم بابل ہو چکا تھا۔

۷۰ برسوں میں سے ۲۶ برس نکال دو تو ۴۴ برس کا فرق نکلتا ہے۔

حضور صلعم ۴۰ برس کی عمر میں مبعوث ہوئے بارہ برس تک مکہ معظمہ میں مقیم رہے تیرہویں برس ہجرت کی اس لئے یہ صاف معلوم ہو جاتا ہے ۱۲۹۰ سالہ اسیری یکونیاہ اور حضور صلعم کا سنہ میلاد ایک چیز کے دو نام ہیں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے سنہ مسیحی کی ابتداء سے ۷۴۷ برس اور ۳۱۲ دن پہلے بخت نصری سال شروع ہوتا ہے، اس کے ۲۶ برس بعد ۷۲۱ ق م یکونیاہ گرفتار ہوا، اور خانہ خدا برباد ہوا، ان سنین کے بعد ۱۲۹۰ کا زمانہ ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء پر ختم ہوتا ہے، اور ۵۷۰ء یا ۵۷۱ء میکائیل موعود کی آمد کا زمانہ ٹھہرتا ہے، یہ زمانہ آنحضرت صلعم کے زمانہ ولادت کے مطابق ہے دنیا جانتی ہے کہ آپ نے ۵۷۱ء میں ظہور اجلال فرمایا، فقہا آپ کو عموماً شارع علیہ السلام کہا کرتے تھے، لفظ "شارع" (۵۷۱) گویا آپ کا تاریخی نام ہے۔

افسوس ہم حساب کی غیر دلچسپ الجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتے ورنہ شاید یہ بتا بھی ممکن ہو کہ یہ ۱۲۹۰ کی میعاد عین اس روز اور عین اس وقت ختم ہوتی ہے جس کے بعد والے دن، بلکہ بعد والی ساعت میں حضور صلعم نے دنیا کو منور فرمایا۔

سنہ بعثت

اس باب ۱۲ کی ساتویں آیت حضور صلعم کا سن بعثت بتاتی ہے فرشتہ جب شاہ شمال کے ہاتھوں ہیکل کی ہونیوالی بربادی کی اطلاع دے چکا اور کوہ مقدس پر اس کی کلال بازی کے قیام اور میکائیل موعود کی آمد کا تذکرہ کر چکا تو ایک فرشتے کے سوال پر دوسرے نے کہا کہ یہ باتیں

ایک مدت اور مدتوں اور نصف مدت رہیں گی جب وہ پورا کر چکے گا تو ساری باتیں ہونگی (۱۲ : ۷)

اس مدت کا شمار ۱۱ : ۳۰ میں مذکور شاہ شمال کے ہاتھوں سے ہونیوالی بربادی کے سال سے کرنا چاہئے جو ۱۶۸ ق م میں ہوئی۔

اس موقع پر "مدت" "دور" کا ترجمہ ہے جو ایرانی چرخ کبیش ۱۲۰ ویں گردش کا زمانہ ہے ایران میں ۱۱۹ سال ۳۶۵ دن کا ہوتا تھا۔ ۱۲۰ واں سال کبیسہ کا ہوتا تھا جس میں پچھلے سالوں کے ایام کی کسر کو جوڑ کر ایک ماہ کبیسہ کرتے اور ایک گردش کبیش پوری ہو جاتی ایسی ۱۲ گردشوں کے بعد جب ایک چرخ کبیش پورا ہو جاتا تھا تو موسموں کا حساب بھی از سر نو درست ہو جاتا تھا۔

حضرت دانیال چونکہ اس بشارت کے وقت ایران کے محکوم تھے اور ایرانی سال استعمال کرتے تھے اس لئے انہوں نے ایرانی ہی تقویم کے اصول پر بشارت دی۔

اس موقع پر عربی میں "مدتوں" کے بجائے "زمانین" کا لفظ ہے اس قرأت کے مطابق ۱۲ : ۷ کی مذکور میعاد صرف ۳ ½ دور یعنی ۴۲۰ سال ہوتی ہے

۱۶۸ کے بعد ۴۲۰ سال کی مدت ۲۵۲ء پر ختم ہوتی ہے، ۲۵۲ء میں میکائیل کو آنا چاہئے مگر یہ زمانہ گزر گیا اور کوئی میکائیل نہ آیا۔

فرض کرو ۱۱ : ۳۰ میں ۱۶۸ والی بربادی مذکور ہے پھر بھی ۱۹۴۸ء میں یہ مدت گزر گئی اور کوئی مدعی نبوت نہ آیا۔

اس لئے معلوم ہوا کہ انگریزی، اُردو، ہندی اور فارسی ترجمہ جن میں تثنیہ کے بجائے جمع کا ترجمہ کیا گیا ہے صحیح ہے۔

جمع عبری میں ۳ سے لیکر ۹ تک دلالت کرتی ہے، اس بنا پر ایک اور کئی اور نصف دور کے معنی ۴ ½، ۵ ½، ۶ ½، ۷ ½، ۸ ½، ۹ ½ اور ۱۰ ½ دور میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے، اگر ہم ۱۱ : ۳۰ والی بربادی کو ۱۶۸ کی سمجھیں تو بھی (۷۰ ، ۴ ½ × ۱۲۰ = ۶۱۰) موعود مدت ۱۴۴۲ء پر ختم ہوتی ہے اور اگر ۱۶۸ ق م والی بربادی کو سمجھیں تو بھی (۷۰ ۱ - ۶ ½ × ۱۲۰ = ۶۱۰) مدت

سنہ ۶۱۱ء ہی پر ختم ہوتی ہے اور سنہ ۶۱۱ء آدم میکائیل کا زمانہ ٹھہرتا ہے اور اس سال آنحضرت صلعم مبعوث ہوئے۔

اگر ہم ۴ ½ اور ۶ ½ دور مطلب سمجھنے کے بجائے ۵ ½ دور یا کوئی اور معنی مراد لیں تو میکائیل کا زمانہ ذیل کے سنین میں سے کوئی ایک پڑے گا، ان میں سے کوئی سنہ نہ تو دانیال ۱۲:۱۱ اور دانیال ۱۲:۱۲ میں مذکورہ زمانہ سے مطابق ہوتا اور نہ ان میں سے کسی سنہ میں کوئی میکائیل آیا۔

نقشہ ملاحظہ کیجئے۔

سنہ ۷۱ء سے ۵۴۰ سال بعد والا برس سنہ ۶۱۱ء ہے اسمیں آنحضرت مبعوث ہوئے ۴ ½ دور

〃	۶۶۰ 〃	〃	〃	سنہ ۷۳۱ء	کوئی مبعوث نہ ہوا		۵ ½ 〃
〃	۷۸۰ 〃	〃	〃	سنہ ۸۵۱ء	〃	〃	۶ ½ 〃
〃	۹۰۰ 〃	〃	〃	سنہ ۹۷۱ء	〃	〃	۷ ½ 〃
〃	۱۰۲۰ 〃	〃	〃	سنہ ۱۰۹۱ء	〃	〃	۸ ½ 〃
〃	۱۱۲۰ 〃	〃	〃	سنہ ۱۲۱۱ء	〃	〃	۹ ½ 〃
〃	۱۲۶۰ 〃	〃	〃	سنہ ۱۳۳۱ء	〃	〃	۱۰ ½ 〃

سنہ ۱۶۹ ق سے ۵۴۰ سال بعد والا برس سنہ ۳۷۱ء ہے اسمیں کوئی نبی نہ آیا

〃	〃	۶۶۰	〃	〃	سنہ ۴۹۱ء	〃
〃	〃	۷۸۰	〃	〃	سنہ ۶۱۱ء	آنحضرت مبعوث ہوئے
〃	〃	۹۰۰	〃	〃	سنہ ۷۳۱ء	کوئی نبی نہ آیا
〃	〃	۱۰۲۰	〃	〃	سنہ ۸۵۱ء	〃
〃	〃	۱۱۴۰	〃	〃	سنہ ۹۷۱ء	〃
〃	〃	۱۲۶۰	〃	〃	سنہ ۱۰۹۱ء	〃

اعلان نبوت کا سال (۶۱۵ء)

۱۲ ویں باب کی بارہویں آیت میں میکائیل موعود کی آمد کا جو زمانہ بتایا گیا ہے، اگرچہ بظاہر (۱۲:۱۱ اور ۱۲:۷) میں مذکور مدت کے خلاف پڑتا ہے لیکن آنحضرت کے زمانہ میں آکر اس آیت کا زمانہ آنحضرت صلعم کے اعلان نبوت کے سال پر منطبق ہوتا ہے۔

حضرت دانیال فرماتے ہیں "مبارک ہے وہ جو انتظار کرتا ہے اور ۱۳۳۵ دن تک آتا ہے" اصل عبری کے مطابق صحیح ترجمہ یوں ہونا چاہئے، بشارت ہے اس کے لئے جو انتظار کرتا ہے اور ۱۳۳۵ کے زمانہ میں آتا ہے۔ یہ ۱۳۳۵ گرفتاری بکونیا مطابق ۶۱۵ء ہے جو آنحضرت صلعم کے اعلان نبوت کا سال ہے۔

آنحضرت صلعم دانی ایل (۱۲:۱۱) کی بشارت کے مطابق ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے اور (۱۲:۷) کی بشارت کے مطابق ۶۱۰ء میں مبعوث ہوئے پھر ۱۲ سنہ ۱۳ سنہ ۱۴ میں سال تک فترت وحی اور شعب ابی طالب میں نظر بند رہنے کا زمانہ ہے ۶۱۵ء میں یایہا النبی بلغ ما انزل الیک اور فاصدع ما تومر وغیرہ آیتیں نازل ہوئیں اور آپ نے دعوت شروع کی اس لئے یہ قطعی ہو گیا کہ میکائیل موعود سے مراد یقیناً آنحضرت صلعم تھے۔

سنہ ہجرت

دانیالؑ نے نویں باب میں حضور صلعم کا سنہ ہجرت بھی بتایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے ان سے کہا کہ "اے دانیال! میں اس لئے نکل آیا ہوں کہ تجھے دانش اور سمجھ بخشوں . . . . سو اس بات کو بوجھ اور اس رویت کو سمجھ، ستر ہفتے تیرے لوگوں اور تیرے شہر مقدس کے لئے مقرر کئے گئے ہیں تاکہ اس مدت میں شرارت ختم ہو، اور خطا کاریاں آخر ہو جائیں اور بدکاری کی بابت کفارہ کیا جائے، اور ابدی راست بازی پیش کیجائے اور اس رویت پر اور نبوت پر مہر ہو اور اس پر جو سب سے زیادہ قدوس ہے مسح کیا جائے۔" (دان ۹:۲۴)

اس موقع پر ترجمہ کی ایک غلطی کو سمجھ لینا چاہئے۔ "اس رویت" ترجمہ صحیح نہیں۔ "اس"

کی جگہ عبری میں (ד) ہے اس کی انگریزی (D) اور عربی (دَال) ہے اردو میں اس کے ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان آیتوں میں ۷۰ ہفتے توبہ و استغفار کے لئے مقرر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد سب سے زیادہ قدوس مسیح (خلیفۂ الٰہی) مبعوث ہوگا۔

یہود میں ایک ہفت سالہ عید بھی ہوتی ہے، اس بنا پر اسبوع یا ہفتہ کا لفظ سات برس کے معنی بھی دیتا ہے، اس لیے ۷۰ ہفتوں کے معنی ۴۹۰ برس کے بھی ہوتے ہیں، یہود اور نصاریٰ دونوں اس موقع پر لفظ کے یہی معنی مراد لیتے ہیں، اس لئے اس مفہوم کی صحت ثابت کرنے سے ہم سبکدوش ہیں۔

چونکہ اس آیت میں یہ مذکور نہیں کہ ۴۹۰ دنوں یا ۴۹۰ برسوں کی میعاد کب سے شروع ہو اس لئے بعد کی آیتوں میں فرمایا۔

سو تو بوجھ اور سمجھ، کہ جس وقت سے یروشلم کی دوبارہ تعمیر کا حکم نکلے مسیح بادشاہزادہ تک ۷ ہفتے اور ۶۲ ہفتے (۹ : ۲۵)

مسیحی اس شاہزادہ مسیح اور (۹ : ۲۴) کے سب سے زیادہ قدوس مسیح (خلیفہ خدا) دونوں کو ایک سمجھتے ہیں، لیکن اول تو القاب کی دوئی ثانیاً زمانہ کا اختلاف بتاتا ہے کہ یہ دونوں دو بزرگ ہیں، وہ جو سب سے زیادہ قدوس ہے یوحنا لاہوتی اس کے گواہ ہیں کہ یوحنا کے بعد آنیوالا ہے۔ علاوہ بریں اسی موقع پر یہ مذکور ہے کہ سب سے زیادہ قدوس مسیح تو ۷۰ ہفتے توبہ و استغفار کے گزر جانے پر آئے گا لیکن مسیح بادشاہزادہ، دوبارہ تعمیر کی اجازت سے ۶۹ ہفتوں کے اندر پیدا بھی ہوگا اور اسی مدت کے بعد دنیا سے اٹھ بھی جائے گا کیونکہ فرشتہ نے بتایا

اس وقت بازار پھر تعمیر کئے جائیں گے، اور دیوار بنائی جائے گی مگر تنگی کے دنوں میں اور ۶۲ ہفتوں کے بعد[1] مسیح بادشاہ زادہ قتل کر دیا جائے گا پر نہ اپنے لئے (۹ : ۲۵، ۲۶)

---

[1] "کے بعد" کی جگہ "تک" صحیح ترجمہ ہے، اور عربی کے مطابق ہے۔ (نوٹ کے لئے دیکھو نوٹ ۲۴)

پیش گوئی سنہ ء میں پوری ہوئی۔ اس کے بعد کا نقشہ یہ ہے۔
اور بادشاہ جو آئے گا اس کے لوگ شہر مقدس کو غارت کریں گے۔ اور اسکا آخر آئے گا گویا طوفان کے زور سے اور آخر تک لڑائی رہے گی اور مقرر کی ہوئی خرابیاں ہوں گی (۹: ۲۶)
سنہ ء میں رومیوں نے شہر (یروشلم) اور مقدس (ہیکل سلیمانی کو غارت کیا۔ اس کے جو کچھ ہونے والا تھا، اس کے متعلق فرمایا۔
"اور وہ ایک ہفتہ کے لئے اس عہد کو بہتوں کے لئے قائم کریگا۔
چنانچہ بربادی کے بعد ایک زمانہ تک حکومت روما ، مسیحیوں پر مہربان رہی۔
اور ہفتہ کے بیچ ذبیحہ اور ہدیہ موقوف کرے گا اور فصیلوں پر اُجاڑنے والی کردیگی
(یعنی بت) دھری جائیں گی یہاں تک کہ اس کی بالکل غارت ہو، اور وہ بلا ہنیں بلکہ قضائے مبرم) جو مقرر کی گئی ہے اس اجاڑنے والے پر واقع ہوگی۔
یہ پیش گوئی سنہ ۱۳۱ء کے قریب ایلیا قیصر کے زمانہ میں پوری ہوئی
سنہ ء میں طیطوس نے ہیکل کو مسمار کر دیا اور یہود کو جلاوطن کر دیا ، لیکن قیصر نارون کے عہد میں بنی اسرائیل دوبارہ واپس آکر یروشلم میں آباد ہوئے ۔ طیباریوس قیصر کو جب معلوم ہوا کہ یہود کی تعداد یروشلم میں روز بروز بڑھ رہی ہے تو پھر اس نے انکا قتل عام شروع کیا۔ اس کے بعد اندریانوس قیصر ہوا ، اسکا بیٹا ایلیا بیا رہوا تو اس نے خدا کو خوش کرنے کے لئے پھر سے شہر بیت المقدس کو تعمیر کیا، یہ خبر پاکر کچھ یہود پھر یروشلم میں آبسے ، اندریانوس

(نوٹ صفحہ ۲۴) ؎ یہ ترجمہ ہمارے عقیدہ کے خلاف ہے، عبری میں (تقطع) ہے اور عربی ترجمہ "یقطع" ہے
اصل عبری کے مطابق اس کے دو ترجمے ممکن ہیں۔
(۱) قتل ہوجائیگا۔ (۲) دنیا سے کٹ جائیگا۔

کے بعد جب ایلیا تخت قیصری پر بیٹھا اور اس کو یہ خبر ہوئی کہ یہود یروشلم میں بڑھ رہے ہیں تو اس نے دوبارہ شہر کو مسمار کر دیا اور حکم دیا کہ یونانیوں کے سوا کوئی یہودی یہاں بسنے نہ پائے اور اس نے یونانیوں کو اجازت دی کہ وہ ہیکل کے دروازہ پر برج بنائیں اور اس میں زہرہ دیوی کا بت نصب کریں۔ یہ برج مسلمانوں کے زمانہ تک موجود رہا سنہ ۷۰ء سے پورے ۵۳ برس بعد سنہ ۱۲۳ء میں ایلیار نے دوسری مرتبہ یروشلم کو برباد کیا اور کم از کم اس کے چھ سات برس کے بعد برج ایلیار تیار ہوا ہوگا جس میں زہرہ دیوی کا بت نصب کیا گیا، تقریباً سنہ ۱۳۱ء کا واقعہ ہے۔

اسی سنہ کے بعد سے ۴۹۰ سال انتظار کے بتلائے ہیں، جو تقریباً سنہ ۶۲۱ء یا سنہ ۶۲۲ء پر ختم ہوتا ہے، اور یہ زمانہ حضور صلعم کی ہجرت کا ہے۔

حسرت موہانی کی شاعری

جلیل قدوائی صاحب بی۔اے نے کلام حسرت کا انتخاب کیا ہے جو انشاءاللہ بہت جلد مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع ہوگا۔ یہ مضمون اسکا مقدمہ ہے۔

(مدیر)

جس طرح اُردو شاعری میں اُستاد سخن میرؔ کا مرتبہ مسلم ہے اسی طرح حسرت موہانی کے اعجاز کا بھی موجودہ دور شاعری میں کوئی منکر نہیں ہو سکتا۔ وہ روح عالی جو قید جسم سے آزاد ہو کر آسمانی اور تخیلی فضاؤں میں محو پرواز ہوتی ہے، وہ نغمہ لطیف جو آواز ساز سے ماورا دل کی گہرائیوں اور جذبات کی تہوں میں ارتعاش پیدا کرتا ہے!

شلر کہتا ہے، "ہر آرٹ کا مقصد افزایش مسرت ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ اہم اور سنجیدہ کوئی مسئلہ نہیں کہ انسان کو کس طرح خوش رکھا جائے۔ صحیح آرٹ صرف وہی ہے جو سب سے زیادہ آسایش اور خوشی پیدا کرے" اسی لئے دنیا میں فنون لطیفہ کی بنیاد پڑی جو ہمارے ذوق لطیف اور احساسات رقیق کو متاثر کرتے ہیں اور ہم عالم خیال میں پہونچکر اُن سے ایک ایسا پرکیف اور لذت آفریں لطف اٹھاتے ہیں جو ہمیں عالم واقعات میں حاصل نہیں ہوتا۔ شاعری کو ان فنون لطیفہ میں ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے اور خصوصیات کی بناء پر ان سے زیادہ پر تفوق اور قابل قدر فن ہے، شاعری کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا حل اتنا ہی دشوار ہے جتنا حسن و عشق کی تعریف کرنا۔ شاعری کی مختصر و جامع، طویل و تشنہ اس قدر تعریفیں کی گئی ہیں کہ اگر انہیں مرتب کر دیا جائے تو کئی جلدوں کی ایک مبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے، لیکن ان سب کو پڑھنے کے لئے اگر موقع اور فرصت بھی مل جائے تو بھی یہ سوال کہ شاعری کیا ہے اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے۔ اس لئے اس سوال کو اسی طرح تشنہ جواب چھوڑ کر اپنے

مضمون کے حدود میں ایک دوسرے دروازے سے داخل ہوتا ہوں۔

لی ہنٹ کہتا ہے: "ہر شاعر ایک ناظم ہے، ہر اچھا شاعر ایک اچھا ناظم، اور بہترین شاعر وہ ہے جس کے کلام میں زور، شیرینی، بے تکلفی، تنوع لیکن اسی کے ساتھ یکسانی یعنی ربط سب سے زیادہ پایا جائے" حسرت موہانی اس معیار پر پورے اترتے ہیں، انہوں نے اپنی شاعری کے لئے جو صنف سخن اختیار کی ہے وہ مشرقی ادب میں انہیں خصوصیات کے لئے مشہور ہے

سال بھر ہوا رسالہ معارف اعظم گڑھ میں حسرت کی شاعری کے متعلق ذیل کے خیالات ظاہر کئے تھے:-

اے وہ کہ ترے سخن نے کی ہے	غمازی سوزش نہانی
تیرے جوئے سخن سے اُبلا	سرچشمہ بادۂ جوانی
پژمردہ رگوں میں ہے تری خوں	اور خون میں گرمی روانی
صحرا کو بنا دیا ہے گل زار	اللہ ری تری خوں فشانی
تو رمز شناس عاشقی ہے	ہے درد بھری تری کہانی
ہر نقش میں زخم دل ہویدا	اللہ ری سوزش نہانی
نغموں میں بھی اک تڑپ ہے پیدا	اللہ رے ترا غم نہانی
تیرے ہر شعر میں ہے پنہاں	پیغام حیات جاودانی
نالوں میں ترے نہ کیوں اثر ہو	ہے داغ جگر کی یہ نشانی
تیری رنگینیوں میں پنہاں	انداز نظیری و فغانی
تیری صناعیوں کے آگے	وہم باطل ہے نقش مانی
اس ملک سخن میں تو ہے یکتا	اُردو میں ہے کون تیرا ثانی
اس دل کو ترے سخن کی گرمی	ہے ماحصل حیات فانی
ارباب کمال میں تری قدر	افسوس یہ ہے کہ کم نے جانی

ناقدر شناس ہند میں کون سنتا ہے ترے درد کی کہانی
بے حس ہے ابھی فضائے اُردو ہوگی کبھی تیری قدر دانی
تو خلد بریں کا میہماں ہے اے طوطیِ گلشنِ معانی
پھر روح کو محو ساز کر دے پھر چھیڑ کوئی نئی کہانی
ہو جائیں دلوں سے دور صدمے
خاموش فضا میں بھر دے نغمے!

میں سمجھتا ہوں باوجود کوشش کے حسرت کی شاعری کے متعلق میں اس سے زیادہ کچھ مشکل سے کہہ سکوں گا لیکن ذرا دیکھئے اس اجمال کی تفصیل کیسی حسین ہو سکتی ہے۔

حسرت کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اُن کی شاعری عشق کی شاعری ہے اور جس طرح عشق اپنی ابتدائی کیفیات اور درمیانی منازل طے کرتا ہوا منتہائے اصلی تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح حسرت کی شاعری عشق مجازی سے شروع ہو کر اس کے تمام اخلاقی پہلوؤں پر حاوی ہو کر حسن کے تخیلی پیکر کی تلاش میں آخر روحانیت، وطن، سب سے عشق ملت اور حب قوم پر ختم ہوتی ہے۔ اُنکے عشق میں والہانہ شیفتگی، دیوانگی، جو ہماری ذوق [illegible] ہیں۔ اسی وجہ سے انکا ہر شعر سر تا پا اثر میں ڈوبا ہوتا ہے۔ زمانہ کتنی ہی کروٹیں [illegible] ہے ایک ایسے [illegible] کی ہزار ہا نیرنگیاں ظہور پذیر ہوں اور حسرت کا ترجمہ چاہے کسی زبان میں ہو اُن کے [illegible] ہو تا ہے [illegible] قیمت نہیں کم ہو سکتی، اُن کی شاعری زبان و مقام کی قید سے آزاد ہے۔ حسرت انسانی [illegible] ہے۔ اُن جذبات، اُن لطیف پاکیزہ احساسات کا ترجمان ہے جو رہتی دنیا تک قائم [illegible] دن سے پہلے ختم نہیں ہوتے جب یہ "خاکدانِ اضطراب" جل بھن کر خاک سیاہ ہو [illegible] اور کون جانتا ہے اس کے بعد بھی خاک کو سکون اور آسودگی میسر ہو گی عشق کی زندگی [illegible] شاعری پر ایک پر وجد اور والہانہ کیفیت اور اثر طاری کر لینا حسرت کا کمال ہے۔ محبت [illegible] کوئی ادنےٰ سے ادنےٰ کیفیت ایسی نہیں جس سے حسرت ناواقف ہو اور جس کی ترجمانی ایک [illegible]

شاعری کی زبان میں اُس بُنے نکی ہو۔ اس سلسلہ میں ایک دوست نے کیا پھبتی ہوئی بات کہی حسرت کے پہلو میں اب دل کی جگہ تھوڑی سی راکھ ہوگی!"

حسرت کی شاعری کی جہاں اور بہت سی خوبیاں ہیں وہاں ایک سب سے بڑی خوبی اُنکا انداز بیان ہے، اُن زبان شستہ، رفتہ اور اُنکا طرز بیان، رواں شگفتہ اور خوش نما ہے اُن کی نرالی ترکیبیں، اُنکے بولتے ہوئے فقرے، اُنکے بانکے اور اچھوتے ٹکڑے از بس پرکیف اور وجد آور ہیں جو سننے والے کے دل میں تیر کی طرح اتر جاتے ہیں۔ ٹالسٹائے کے نظریۂ آرٹ کے مطابق آرٹ کا کمال یہ ہے کہ وہ کسی ایک مخصوص طبقہ کی ملکیت نہ رہ جائے بلکہ اُس کا فیض عام وخاص، جاہل و تعلیم یافتہ چھوٹے اور بڑے سب کے حق میں یکساں ہو، اُس سے ہر روح میں روشنی، ہر دل میں سرور اور ہر دماغ میں نشہ یکساں چھائے۔ حسرت موہانی کے کلام میں اُن کی روانی، بے تکلفی، بانکپن، اور پھر ان سب چیزوں کے امتزاج سے ایک خاص قسم کا اثر اس درجہ دل پذیر ہے کہ ہر طبقہ اور ہر مذاق کے لوگوں میں وہ مقبول ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعری کی پرانی رسم کے مطابق حسرت کا جولانگاہ شوق ایک محدود صنف یعنی غزل ہے اور انگریزی مذاق شعر سے متاثر و مرعوب احباب غزل کو کتنا ہی برا کہیں آ...ؤں اور بندشوں کو زبان اور ادب کے لئے کتنا ہی خطرناک خیال کریں کم از کم اُس ...اعری کے لئے جو حسرت کا ہے وہ غزل کی صنف کی پابندی کو ناگزیر ماننے پر مجبور ہوں گے حافظ ...سی محدود زمین پرستانہ وار جادہ پیمائی کی اور اپنے عالم گیر پیام کو غزل میں دنیا تک پہنچایا ...ی نے جو پھول اس خشک اور بنجر زمین میں کھلائے ہیں ابھی تک اُن کی خوشبو سے مشام ...ن و تن معطر ہے۔ غالب نے زندگی کی گتھیاں اور اسرار و معارف کی گرہیں غزل میں سلجھائیں ...ہو انگریزی زبان کے موجودہ دور شاعری میں غزلوں کے کمال کا اعتراف دیکھنا ہو تو مسٹر ییٹس ...لے کر کا کلام پڑھئے۔ جدید مشرق کے سب سے بڑے شاعر اور قوم پرست شاعر نے پیام مشرق کا ایک معتد بہ حصہ غزلوں کے لئے وقف کیا، جو حکیمانہ نزاکت خیال اُن کی غزل کے ایک ایک شعر

میں پائی جاتی ہے وہ اُن کی پوری پوری نظموں پر بھاری ہے۔ حسرت نے بھی اس حقیر صنف میں طبع آزمائی کی ہے اور اپنی خوش بیانی اور خوش فکری سے دنیا کی مسرتوں اور آسائشوں میں اضافہ کیا ہے۔ جو لوگ غزل کی طرف سے اپنی سوءظنی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں فرسودہ، پرانی اور سنی سنائی ہوئی چیزوں کے علاوہ نہ کچھ ہے اور نہ کچھ ہونے کی گنجائش وہ ذرا حسرت کی غزلیں دیکھیں اور تحیر اور استعجاب سے کہیں "کیا ہے جو غزل میں نہیں" خود حسرت کہتے ہیں۔

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا　　　میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

یہ شاعرانہ تعلّی نہیں ایک حقیقت کا اظہار ہے۔ آیئے اب ہم اور آپ دیکھیں حسرت کے اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حسرت کی شاعری عشق کی شاعری ہے۔ عشق ایک وسیع و جامع لفظ ہے۔ آپ دیکھیں عشق کے تمام پہلوؤں پر حسرت کی نظر پہونچ گئی ہے یا نہیں۔

پہلا جلوہ:-

آہ اس نگاہِ مست کی شوخی جو بیخبر　　　خوبی پہ روئے یار کے پہلے پہل گئی

بے خبر پہلے مصرعہ میں جان ہے۔ پہلی نگاہ بغیر جانے ہوئے بلا کسی ارادہ کے ہی پڑتی ہے، یا۔

بھولے سے وہ ادھر بھی جو آنکلے تھے کہیں　　　اُس دن کا بھولتا ہی نہیں ماجرا ہمیں

بھولے سے، بالکل ابتدائی درجہ ہے۔ بے خبری ثابت ہے ابھی اُنکا غیر ارادی طور پر آنکلنا "صرف "ماجرا" کی حد تک ہے۔ یہ "ماجرا" بار بار یاد آتا ہے "بھولتا ہی نہیں" ہے کوئی بات تھے یہ نہیں معلوم نہ عاشق نے پوچھا۔

ہم سے پوچھا بھی نہ گیا نام و نشاں بھی اُنکا　　　جستجو کی کوئی تمہید اٹھائی نہ گئی

لیکن وہ جلوہ پیش نظر ہے۔

بار بار آتا ہے یکس کا خیال	بے خودی بتلا مجھے کیا ہوگیا
امید نہیں ان سے ملاقات کی ہرچند	آنکھوں سے مگر شوق تماشا نہیں جاتا

دل بہر حال کسی نہ کسی طرح محبوب کا سراغ لگا لیتا ہے

کوچہ اُس فتنہ دوراں کا دکھا کر چھوڑا	دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

محبت شروع ہوتی ہے۔ لیکن پیرایہ عجیب ہے۔

نہ مجھکو اس کی خبر ہے نہ خود انہیں ہے خیال	کچھ اس طرح سے محبت بڑھائی جاتی ہے

یہ بے خبری دونوں طرف سے ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے لیکن غیر محسوس طریقہ پر محبت نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اب واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ ایک کا حال دوسرے پر روشن ہوتا ہے۔

تقریب محبت کی کیا خوب تھی وہ ساعت	جو وقت ہوا مجھ سے وہ ماہ جبیں واقف

لیکن کیا دل فریب دور لطف زمانہ ہے، اس طرف حجاب ہے اور تکلف۔

نہ پوچھئے کہ ہوئی حسن کی عجب حالت	سنی جو پہلے پہل عشق ناصبور کی بات
سن کے قاصد سے مرا حال کہا تو یہ کہا	ہیں وہ بدنام کہیں ہم کو بھی رسوا نہ کریں
آہ کہنا وہ ترا پاکے مجھے گرم نظر	ایسی باتوں سے نہ ہو جاؤں میں بدنام کہیں

عشق کی ناصبوری۔

روگ دل کو لگا گئیں آنکھیں	اک تماشا دکھا گئیں آنکھیں
اُس نے دیکھا تھا کس نظر سے مجھے	دل میں گویا سما گئیں آنکھیں

لیکن جذبات صادق بالآخر رنگ لائے۔

آج سن کر میرے نالوں کو زراہ التفات	زیر لب اس نے بھی کھینچی ایک آہ التفات

"آہ التفات" وہ بھی "زیر لب" کے لطف کو عشاق شاد کام سمجھ سکتے ہیں، اس ابتدائی دور کے کیسے کیسے بامزہ اور پر کیف شعر حسرت نے نکالے ہیں۔

یاد ہیں سارے وہ عیش بافراغت کے مزے — دل ابھی بھولا نہیں آغاز الفت کے مزے
وہ سراپا ناز تھا بیگانۂ رسم جفا — اور مجھے حاصل تھے لطف بے نہایت کے مزے
حسن سے اپنے وہ غافل تھا میں اپنے عشق سے — اب کہاں سے لاؤں نا واقفیت کے مزے
میری جانب سے نگاہ شوق کی گستاخیاں — یار کی جانب سے آغاز شرارت کے مزے
یاد ہیں وہ حسن و الفت کی نرالی شوخیاں — التماس عذر و تمہید شکایت کے مزے
صحتیں لاکھوں مری بیماری غم پر نثار — جس میں اٹھے بارہا انکی عیادت کے مزے

اس ابتدائی دور محبت کے اشعار اس قدر مسلسل، مربوط اور رنگین و شگفتہ ہیں کہ مستقل نظم کا دھوکا ہوتا ہے۔

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا — باوجود حسن تو آگاہ رعنائی نہ تھا
عشق روز افزوں پہ اپنے مجھکو حیرانی نہ تھی — جلوۂ رنگیں پہ تجھ کو ناز یکتائی نہ تھا
دید کے قابل تھی میری عشق کی بھی سادگی — جب کہ تیرا حسن سرگرم خود آرائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محو آرزو تھے حسن و عشق — ربط تھا دونوں میں گو ربط شناسائی نہ تھا

وہ دن اب یاد آئے ہیں کہ آغاز محبت میں — نہ چالاکی تجھے اے شوخ آتی تھی نہ عیاری
غضب رنگینیاں تھیں گریہ ہائے ابتدائی کی — ہوئی ہے جن سے دامان محبت پر یہ گل کاری

اس کے بعد معاملات محبت اور واردات قلب کا ایک "کاروبار" شروع ہو جاتا ہے یہ اشعار حسرت کے کلام میں بڑے جاندار اور سحر فن ہیں، وصل و ہجر، شکوہ شکایت، نامہ و پیام حسن و محبت کے لطیف اور نہایت ہی باریک معاملات سب موجود ہیں۔ دیکھئے اور حیرت کیجئے کہ حسرت کی دور رس نظریں کہاں کہاں پہونچتی ہیں اور کیسے کیسے پہلو، معاملات محبت کے وہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہے۔

تجھ سے اب مل کے تعجب ہے کہ عرصہ اتنا — آج تک تیری جدائی کا یہ کیوں کر گذرا
شوق کا حسن عقیدت دیکھنا اکثر ہوا — تیری بے پروائیوں پر اشتباہ التفات

دوستی اس فتنۂ دوراں سے ہے یا دشمنی
جان برباد کرم ہے دل تباہ التفات

کچھ نہ پوچھو حال کیا تھا خاطرِ ناشاد کا
اُن سے جب مجبور ہو کر میں جدا ہونے لگا

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا
داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے پایا

اس سلیقہ سے کیا ذبح کہ دامن اُنکا
خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے پایا

دل کچھ اس ڈھب سے لیا اس نے کہ رسوا کوئی
حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا

اس چشم نے دل بری کے شیوے
سب سیکھ لئے بغیر استاد

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوششِ پرسشِ حالات چلی جاتی ہے

اُس نازنیں سے ہم کو جتنے گزند پہونچے
سب دل پذیر پہونچے سب دل پسند پہونچے

بعض باتیں ایسی لکھی ہیں جو شاید اُردو شاعری کے لئے بالکل نئی ہیں اور حسرت کے سوا کسی نے نہیں لکھیں لیکن وہ حقیقت سے اس قدر قریب ہیں کہ فوراً دل میں کھُب جاتی ہیں۔

لوگ سب جان گئے چھپ نہ سکی شوق کی بات
میں گلی سے جو تری ہو کے مکرر گزرا

ہم سے روٹھو بھی تو لازم ہے کہ اک ناز کیساتھ
قہر بھی ہم پہ کرو تم تو دل آویز کرو

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے
ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

دیکھا جو کہیں گرمِ نظر بزمِ عدو میں
وہ ڈانٹ گئے مجھ کو برابر سے نکل کر

مجھ پر گدا سمجھ کے بھی کرتا نہیں نظر
دیکھے تو کوئی اُس شہِ خوباں کی احتیاط

میں بے خبرِ غم تھا مگر وہ دمِ رخصت
دیکھا کئے مڑ مڑ کے مجھے حدِ نظر تک

معلوم ہو گئی مرے دل کو زراہِ شوق
وہ بات پیار کی جو ہنوز اُس دہن میں تھی

حالانکہ ابتدا بھی نہیں ہے شباب کی
اُن کو کمالِ حسن کا دعوےٰ ابھی سے ہے

اہلِ نظر کی جان ہے جس چیز پر نثار
اک بات اُن میں اور بھی کچھ ہے ورائے ناز

دیکھ لیتے ہیں اب وہ نامۂ شوق
ہے مگر پھر بھی اختصار کی شرط

تمہیدِ صلح شوق کے سامان ہوگئے
جتنے تھے اُن کے جور سب احسان ہوگئے

حالت قبول عذر سے برعکس ہو گئی | میں شوخ ہو گیا وہ پشیمان ہو گئے
تمہید لطف یار کی لذت میں کیا کہوں | شکوے تمام شکر کے عنوان ہو گئے
اُن کی نگاہ قہر کو ہم نے منا لیا | پھر اس طرح کہ خود بھی وہ حیران ہو گئے

یہ چار شعر ہزاروں نظموں کے ہم پلہ ہیں، صحیح جذبات کی اس قدر پُر سحر طریقہ پر مصوری اور پھر تسلسل و روانی، اللہ اللہ!

مل کے ہم سے کبھی وہ مل نہ سکے | باوجود کمال دل سوزی

دوسرا مصرعہ ملاحظہ ہو "باوجود کمال دل سوزی" ہر ہر لفظ کو علٰحدہ علٰحدہ کر کے ٹھہر ٹھہر کے پڑھیے "مل کے" ملاقات نہ ہو سکی باوجود اس کے کہ محبوب محبت کی آگ سے پھنکا جا رہا ہے۔ ہر حرف نشتر ہے "کمالِ دل سوزی" کی وسعت پر غور کیجئے۔ پورا شعر ایک مرقع ہے جذبات کا جس قدر غور کیجئے اسی قدر ایک شریف پردہ نشین محبت کرنے والی کا تخیلی پیکر نظروں کے سامنے صاف و شفاف آ جائے گا۔

عظمت مرحوم (مولوی محمد عظمت اللہ خانصاحب بی اے، سابق مددگار ناظم تعلیمات حیدرآباد جنہوں نے اُردو شاعری میں ایک اجتہادی شان پیدا کی تھی اور جن کے افادات سے افسوس کہ اردو ادب اس قدر جلد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا) نے اپنے شاعری والے مضمون میں ایک مشہور موجودہ انگریز ادب پرست کی سند پر لکھا تھا: "شاعری نام ہے تخیلی پیکر پیدا کرنے کا" اور اسی کے ساتھ مثنوی میر حسن سے کچھ اشعار پیش کئے تھے۔ اگر شاعری کی یہ تعریف صحیح مانی جائے (اور کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کیوں اسے شاعری کی تمام تعریفوں کی صف اول میں جگہ نہ دی جائے) تو غور کیجئے حسرت موہانی نے کیسا پیکر پیش کیا ہے۔ میر حسن نے تو اپنے پیکر کو چوٹی، دوپٹہ، اور کمر کے ذکر سے ایک حد تک محدود کر دیا تھا لیکن حسرت کے اس شعر میں ایک ایسی تصویر پیش کی گئی ہے جو بقول افادی الاقتصادی ایم مہدی حسن مرحوم "اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی" حسرت نے محبوب کے خط و خال کو نہیں پیش کیا اُس کے بجائے محبوب کے اخلاقی وصف اس طرح گنائے

ہیں کہ شعر ہمارے طائر خیال کو پرواز بخش دیتا ہے اور ہم اپنے مذاق کے مطابق اس سے ایک ایسا خاکہ تیار کر سکتے ہیں جو ہمیں مرغوب ہو، دنیا میں معیار حسن مختلف ہیں اور خدوخال کی تشریح سے جو تصویر آنکھوں کے سامنے آئے گی وہ نہیں کہا جا سکتا سب کو یکساں طور پر مرغوب ہو گی حسرت نے ایک زبردست صناع کی حیثیت سے اپنی تصویر کا خاکہ چند نقطوں، چند خطوں اور مدھم خطوط کے مدد سے تیار کیا ہے۔ ان خالی جگہوں کو آپ اپنے خیال سے پر کیجئے اور دیکھئے تو سہی کیسی پاکباز، باحیا جاں نثار شریف خاتون کی تصویر اس میں سے ابھر آتی ہے۔ یہ خالص مشرقی چیز ہے۔

لایا ہے دل پر کتنی خرابی — اے یار تیرا حسن شرابی
پیراہن اسکا ہو سادہ رنگیں — یا عکس مے سے شیشہ گلابی
پھرتی ہے اب تک دل کی نظر میں — کیفیت ان کی وہ نیم خوابی
وہ روئے زیبا ہے جان خوبی — ہیں وصف جس کے سارے کتابی

متعلقات حسن کے انتہائی لطیف جزئیات:-

عجیب اس کی خوشبو ہے کچھ روح پرور — وہ پوشش جو تھی اس تن نازنیں پر
اللہ ری جسم یار کی خوبی کہ خود بخود — رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
اک برق مضطرب ہے کہ اک سحر بیقرار — کچھ پوچھئے نہ وہ نگہ فتنہ زا ہے کیا
اک رنگ التفات بھی اس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہ سحر فن میں تھی

خوشبوئے دل بری، یہ ترکیب سمند خیال کے لئے "تازیانہ" سے کم نہیں۔

اس روئے جمیل میں ہیں یکجا — انوار مغارب و مشارق
محبوبی و رنگینی ہیں جسم و بدن تیری — سرشار محبت ہے خوشبوئے دہن تیری

محبوب کے باطنی اوصاف بھی دیکھئے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے
مجھے شکوۂ جفا کی نہیں آنے پاتی نوبت — وہ ستم بھی گر کرے ہے تو بلطف ہوشمندی

تجھ سے ہے حسن دو جہاں دو جہاں کی رونق | لے تری یاد مرے خانۂ جاں کی رونق
تیرے حسن نظر افروز کے جلوے ای شوخ | ہو گئے ہیں نگہ دیدہ وراں کی رونق

ملٹن شاعری میں تین چیزوں کا طالب ہے "سادگی، جوش، اصلیت" حسرت کی غزلیں آپ پڑھیں تو اس کے جذبات میں یہ تینوں چیزیں آپ کو ملیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ وسعت آج کل کی شاعری میں حسرت کے علاوہ آپ کو کہیں اور مشکل سے ملے گا۔ ملاحظہ ہوں،

کس قدر دشوار تھی ہم پر جدائی آپ کی | بارے پھر اللہ نے صورت دکھائی آپ کی
بدگماں کاہے کو ہوتا آپ کا حسن غیور | ہم نے کیوں تصویر آنکھوں سے لگائی آپ کی
نے نواز عاشقی نے نغمہ ہائے حسن میں | بارہا آواز کانوں کو سنائی آپ کی
رہ گئی اہل ہوس میں یادگار حسن و عشق | ناز برداری ہماری، دل ربائی آپ کی

ذیل کی غزل ملاحظہ ہو، بقول حضرت شاد عظیم آبادی مرحوم،

انہیں غزلوں سے حال آتے ہیں بیخانو نشینوں کو | انہیں شعروں کو سیکش نعرۂ مستانہ کہتے ہیں

برکتیں سب ہیں عیاں دولت روحانی کی | واہ کیا بات ہے اس چہرۂ نورانی کی
شوق دیکھے تجھے کس آنکھ سے اے مہر جمال | کچھ نہایت ہی نہیں تیری درخشانی کی
مجھ سے دو سگ بھی ہے افضل جسے عزت ہو نصیب | آستان حرم یار پہ دربانی کی
جب سنا یاد کیا کرتے ہو تم بھی تو مجھے | کیا کہوں حد نہ رہی کچھ مری حیرانی کی
سعی احباب کو ناحق ہے رہائی کا خیال | اور ہی کچھ ہے تمنا ترے زندانی کی
وہ تبسم بھی قیامت ہے ترا لعد جفا | تو نے دی ہو جسے خدمت نمک افشانی کی

اللہ اکبر، معلوم ہوتا ہے احساسات کا ایک دریا ہے جو موجزن ہے۔ ہمارا خیال ہے حسرت کے تمام کلام میں اس قدر سادہ لیکن پر کار غزل جس کے لفظ لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنے والے کے اعماق دل سے نکلی ہے مشکل سے ملے گی۔

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم | ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

ہوئے محو کس کی تمنا میں ایسے — کہ مستغنی ما سوا ہو گئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا — تو اک پیکر التجا ہو گئے ہم
مٹے عیب سب عشق بازی میں حسرتؔ — نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینہ
دل مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے — گداز غم اگر چاہے تو مجھ کو باخدا کر دے
فکر دنیا سے دل رہا آزاد — اے ترا غم رہے مجھے روزی
مل گیا نور عاشقی سے ہمیں — طرفہ سرمایۂ دل افروزی
محبت نے کی دل میں وہ آگ روشن — کہ ہم ہو گئے جسم خاکی سے نوری
ہو گئے نور عشق سے روشن — دل پہ ارض و سما کے جملہ طبق

یہی وہ درجہ ہے جہاں محبت کسی کی پابند نہیں رہتی، جہاں قیس کو لبنیٰ سے، دشینت کو شکنتلا سے، رومیو کو جولیٹ سے محبت نہیں ہوتی بلکہ عشق کو حسن سے محبت ہوتی ہے، جہاں قیس عامر صحرائے ایلان میں ناقہ سوار لیلیٰ کے لئے دیوانہ وار سرگرداں نہیں پھرتا بلکہ عشق حسن مطلق کی جستجو میں دربدر خاک چھانتا ہے اور ہر حسین چیز کو حسن مطلق کا جزو سمجھتا ہے اور اس پر سر دھنتا ہے اور اس سے اپنی پیاس بجھاتا ہے، تمام قوتیں اسی ایک راہ میں صرف ہوتی ہیں۔

عشق تلاش حسن میں — خاک بسر ہے دربدر
ہر طرف ہیں عیاں نقوش جمال — دیدنی ہے نگار خانۂ روح
ہر صبح جہاں وہ جلوہ گر ہوں — جاتے ہیں وہیں رواں دواں ہم
ضیائے مہر ہے نور قمر ہے — جمال یار ہر سو جلوہ گر ہے

اس راہ میں دل ہلکا اور خفیف ہو جاتا ہے نظر وسیع ہو جاتی ہے، مسرت و غم میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔

جنوں نے دل سے وہ چھین لی شادی — کرے جو امتیاز رنج و شادی

مذمت خلق اور رضا جوئی حق یکساں رہ جاتا ہے۔

پڑھنے اس کے سوا نہ کوئی سبق | خدمت خلق و عشق حضرت حق
امیری میں ہو یا فقیری میں حسرت | بہر حال ڈھونڈیں گے انکی رضا ہم

یہانتک کہ خود قوتِ احساس اُس ایک ذات حق میں منجمد اور فنا ہو کے رہجاتی ہے۔

اب نہ ہم ہیں نہ دل نہ سوز نہ ساز | رہ گئے ذات حق میں ہو کے فنا

حسرت کی شاعری پر خالص شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے اتنا کچھ لکھا اور اُنکی اُستادی اور زبردست قوت بیان کی داد دی لیکن ناظرین کو یہ بھی معلوم ہے کہ حسرت نے عمر بھر صرف شاعری نہیں ہے بلکہ ملک و ملت کی خدمت بھی کی ہے، ایک عمر جیلخانہ میں گزاری ہے ہمیں انکے اس جذبۂ خدمت قوم کا ممنون ہونا چاہیے جس نے انہیں بار بار زندان میں محبوس کیا انکا تمام کلام زمانہ نظر بندی میں لکھا گیا اور مرتب ہو کر ہم تک پہنچا ہے، اُنکے پولیٹکل خیالات کے متعلق مختلف رائیں ہیں کسی کو اُن کی پالٹیکس "عقل و فہم سے بالا" نظر آتی ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جس جذبہ سے حسرت کا سینہ تڑپ رہا ہے اور جس کی خاطر اُس نے اپنی عمر، دولت، اپنا کاروبار، اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے وہ قابل رشک ہے، جس ایثار سے، جس خاموشی اور سکون کے ساتھ حسرت نے مظالم اور مخالفتیں برداشت کیں ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے، دنیا میں جہاں لوگ واقعات اور حقائق کے طالب ہونے کے باوجود اس قدر کورکورانہ کام کرتے ہیں۔ حسرت کے اس جذبہ کی قدر ہو یا نہ ہو لیکن وہاں جہاں ہم اور آپ رائے دینے والے نہیں ہیں جہاں کا متعین ایک عالم غیب ہے جو دلوں کے راز دل اور انسان کے ہر فعل کی حقیقت سے خبردار ہے وہاں جذبات اور نیت کی قدر ہے، ہم فانی انسان کسی کام کو پورا اور سرانجام کرنیکے لائق نہیں جب تک دست ایزدی کی مدد شامل حال نہ ہو لیکن بہر حال ایک خدمت کی آرزو دل میں رکھنا ہماری نجات کے لئے کافی ہے۔

حسرت کے سیاسی عقائد سے علیحدہ ہو کر یہاں اُنکے صرف وہ جذبات پیش کئے

جاتے ہیں جو انکے خیال میں ہماری بیداری اور فتح کے لئے ازبس ضروری ہیں

جان کو محو غم بنا دل کو وفا نہاد کر
بندۂ عشق ہے تو یوں قطع رہ مراد کر

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھکو آرزو
ہمت سربلند سے یاس کا انسداد کر

قول کو زید و عمر کے صدق سوا اہم نہ جان
روشنی ضمیر میں عقل سے اجتہاد کر

حق سے بہ مصلحت جو ہے جو کرے گریز
اُس کو نہ پیشوا سمجھ اُس پہ نہ اعتماد کر

خدمت اہل جور کو کر نہ قبول زینہار
فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زاد کر

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ
کوشش ذات خاص پر ناز کر اعتماد کر

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر

اٹھے ہیں جفا پیشگان مہذب
ہمارے مٹانے پہ تیار ہو کر

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو
کہ ہم بھی رہیں اُن سے بیزار ہو کر

کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو
نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر

وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت
وفا کے ہیں طالب دل آزار ہو کر

غرضکہ حسرت عجیب و غریب شاعر ہیں میں جانتا ہوں کہ آخر میں جو اشعار میں نے انکے لکھے ہیں وہ ایک ایسے مضمون میں جہاں انکی شاعرانہ خوبیاں دکھائی گئی ہوں بے جوڑ سے ہیں لیکن میں کیا کروں میں مجبور تھا کہ اُن چیزوں کو پیش کروں جو حسرت کے دل سے نکلی ہیں۔

اتنا لکھا گیا مگر معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں لکھا، حسرت کے کمال شاعری پر عشر عشیر روشنی بھی میں نہیں ڈال سکا اور اُس کے بیسیوں پہلو ابھی دکھانے کو باقی ہیں، مجھے اپنی کوتاہیوں اور اپنی نااہلی کا اعتراف ہے لیکن مجھ سے زیادہ استعداد والے موجود ہیں وہ اس کام کو کرینگے میں سمجھتا ہوں میرے لئے اس قدر افتخار ہی بس ہے کہ ایک ایسی زبردست و جامع کمالات ہستی کے ساتھ میں نے اپنے نام کو نسبت دی اور اپنے خیالات گو ایک غیر مربوط طریقہ پر سہی ظاہر

گئے۔ میں دیوانہ ہوں لیکن اسکا احساس ہے کہ مجھ سے بڑے دیوانے موجود ہیں۔ خدا کرے
حسرت کی بارگاہ سخن میں میری یہ خفیف آواز ان دیوانوں کو" ہو" ثابت ہو اور وہ اس کے کلام
کو پہچانیں اور دنیا کو مجبور کریں کہ وہ حسرت کے نام پر مٹ جانے کو تیار ہو جائے۔ حسرت کا اپنی
نسبت فیصلہ خود حسرت کی زبان سے سنئے۔

گرفتار محبت ہوں اسیر دام محنت ہوں — میں رسوائے جہانِ آرزو ہوں یعنی حسرت ہوں
عجب انداز ہی میرے مزاج لاابالی کا — نہ ممنون تمنا ہوں نہ مشتاق مسرت ہوں
میری بے تابیوں کا قول ہے ہم جانِ تمکیں ہیں — مری افتادگی کہتی ہے تاج فرق عزت ہوں
مرا شوق سخن پروردۂ آغوش حرماں ہے — میں خود شیدائے غم ہوں لذت درد محبت ہوں
نہیں ہے قدرداں کوئی تو میں ہوں قدرداں اپنا — تکلف بر طرف بیگانۂ رسم شکایت ہوں

کمال خاکساری پر یہ بے پروائیاں حسرت
میں اپنی داد خود لے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں!

نہیں حسرت! یوں مایوس نہ ہو۔ تونے اپنی فطرت اس طرح کھوئی ہے کہ ہم تیری پرستش
کرنے کو تیار ہیں، تو "بیگانۂ رسم شکایت" ہے یہ تیری عالی ظرفی ہے تونے "اپنی داد خود"
بہت دے لی لیکن اردو کو ابھی اپنے جینے کا ثبوت دینا ہے، ہمیں ابھی ثابت کرنا ہے کہ ہم ایک
زندہ زبان رکھتے ہیں۔ اللہ بس باقی ہوس!

بلی کے بچے

از

روسی معجز نگار چیخوف

مترجمہ جلیل احمد قدوائی بی۔اے

صبح سورج کی کرنیں خواب گاہ کی شیشہ دار کھڑکیوں سے چھن کے کمرے کے اندر اور بستر پر آ رہی ہیں۔ وانیا، ایک چھ سال کا لڑکا جس کے بال برابر سے ترشے ہوئے ہیں اور بٹن کی سی ناک ہے اور اُس کی بہن نینا ایک چھوٹی، بھولے گالوں والی، گھونگریلے بالوں والی چار سال کی لڑکی، سو کر اُٹھے ہیں اور بستر پر پڑے پڑے چارپائی کی جالی سے ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔

"اٹھو۔ او۔ او! لڑکو" اُن کی انّا انہیں دیکھکر کہتی ہے "اچھے لڑکے کب کے ناشتہ کر چکے اور تمہاری آنکھ نہیں کھلنے آتی"

سورج کی کرنیں کمبلوں، دیواروں اور انّا کے سایہ کے دامنوں پر کھیلتی اور تھرکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کو اپنے کھیل میں شریک کرنے کی دعوت دے رہی ہیں مگر بچے اس دعوت کو رد کر رہے ہیں وہ سو کے اُٹھے ہیں تو اُنکا مزاج بگڑا ہے اور تیوریاں چڑھی ہیں نینا انگڑائی لیتی ہے اور انّا سے کہتی ہے:-

"نا۔ آ۔ شتہ ۔ ۔ ۔ ۔ انّا، ناشتہ!"

وانیا اپنی آنکھیں چڑھاتا ہے اور شور کرنیکے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے، اُس نے اپنی آنکھیں تلملانا اور منہ کھولنا شروع کر دیا ہے، لیکن اسی وقت ماں کی آواز ڈرائنگ روم سے سنائی دیتی ہے "بلی کو دودھ دینا نہ بھول جانا۔ اُس نے بچے دئے ہیں!"

لڑکوں کے بگڑے ہوئے چہرے پھر اصلی حالت پہ آجاتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ پھر دونوں ایکدم چلانا شروع کر دیتے ہیں، اپنے بستر سے باہر نکل آتے ہیں اور اپنے شور و پکار سے فضا میں جھنکار پیدا کرتے، ننگے پیر دوڑتے، رات کا لبادہ پہنے باورچی خانہ پہونچتے ہیں۔

"بلّی نے بچے دئے!" دونوں چلاتے ہیں "بلّی نے بچے دئے!"

باورچی خانہ میں ایک تپائی کے نیچے ایک چھوٹا ڈبا رکھا ہے جس میں اسٹمن آگ جلانے کے لئے کوئلے لاتا تھا۔ بلی اس ڈبے میں سے جھانک رہی ہے، اس کے اترے ہوئے چہرے پر ناتوانی ہے، اسکی سبز آنکھوں سے جن کے گرد تنگ و تاریک حلقے ہیں، کمزور، شفقت میں ڈوبی ہوئی نظریں نکل رہی ہیں۔ . . . وہ "میاؤں" کرنا چاہتی ہے اور اپنا منہ کھولتی ہے، لیکن اس کے حلق سے صرف اک ناتواں، ہلکی، بے صدا سانس نکلتی ہے بلی کے بچے کل بل کل بل کر رہے ہیں، انکے کلبلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دونوں لڑکے ڈبے کے سامنے ایڑی کے بل کودتے ہیں اور اپنی سانس روکے بالکل بے حرکت بلی کو دیکھتے ہیں . . . وہ متحیر اور خوش ہیں اور ان کے بگڑنے ڈانٹنے کی آوازوں کو نہیں سنتے۔ دونوں کی آنکھیں بے انتہا خوشی سے چمک رہی ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور زندگی سدھارنے میں پالو جانوروں کا بھی کتنا مفید حصہ ہے اس کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے کون طاقتور اور بھاری کتوں، سست ادھ مری کتیوں، پنجرے میں محبوس چڑیوں، کم عقل مگر جوشیلی مرغیوں، حلیم نیک دل بڈھی بلیوں کو نہیں یاد کرتا جنہوں نے، اگر ہم نے کھیل میں انکے دُم پر پیر رکھ دئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے ہمیں معاف کر دیا! بلکہ میں تو بعض وقت فی الواقع یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صبر، رحم، شفقت، وفاداری اور اخلاص جو حیوان پالو جانوروں میں ہوتا ہے بچوں کے ذہن پر کسی بڑے فلسفی یا ماؤں اور استادوں کی تربیت اور تعلیم سے کہیں زیادہ مفید و دیر پا اثر ڈالتا ہے۔

"کیسے ننھے ننھے ہیں!" ننیا اپنی آنکھیں اچنبھے میں خوب کھول کر ہنستی ہوئی کہتی ہے"

"جیسے چوہے ہوں!"

"ایک، دو، تین" دانیا گنتا ہے "تین بچے ہیں، اچھا تو ایک تمہارا، ایک میرا اور ایک کسی اور کے لئے بھی"

"ہائیں، ہائیں،" ماں کہتی ہے "ہائیں . . . "

بلی کے بچوں کو خوب اچھی طرح دیکھ کے دونوں لڑکے انہیں بلی کے نیچے سے اٹھا لیتے ہیں اور اپنے ہاتھوں میں انہیں ملنا شروع کرتے ہیں اور پھر اس سے بھی نہ مطمئن ہو کر انہیں اپنے رات کے لبادہ کے دامنوں میں رکھ لیتے ہیں اور دوسرے کمروں میں دوڑ کر جاتے ہیں۔

"امی، بلی نے بچے دئے!" وہ چلاتے ہیں۔

امی ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکوں کو بغیر منہ دھوئے بغیر صاف کپڑے پہنے، رات کے لبادے کے دامن اٹھائے دیکھ کر وہ گھبراتی ہے اور انہیں خفگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

"دامن گراؤ، بدتمیز کہیں کے،" وہ کہتی ہے "کمرے سے باہر جاؤ نہیں تو پیٹے جاؤ گے"

لیکن لڑکے نہ ماں کی خفگی کی پرواکرتے ہیں نہ اجنبی کی موجودگی کی۔ وہ بلی کے بچوں کو چٹائی پر رکھ دیتے ہیں اور اپنے شور سے کان پھاڑ ڈالتے ہیں۔ بلی ان کے چاروں طرف رحم کی طالب نظروں سے میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ جب تھوڑی دیر بعد لڑکے کپڑے بدلنے کے لئے، منہ دھونے کے لئے یا ناشتہ کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ غیر دلچسپ فرائض جلد ختم ہوں کہ وہ بلی کے بچوں پاس پھر بھاگ کر جائیں۔

انکے روزانہ کے کھیل اور دلچسپیوں کا پروگرام بالکل بالائے طاق ہے۔ بلی کے بچوں نے دنیا میں آکر ہر کام کو پس پشت ڈال دیا ہے اور دن کی سب سے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے ہیں اگر ننیا یا دانیا کو چالیس پونڈ مٹھائی یا دس ہزار کا چیک فی بچہ دیا جاتا تو وہ بغیر ذرا پس و پیش کئے

ایسے سودے کو رد کر دیتے۔ باوجود نانا اور باورچن کے سخت تاکید کے لڑکے مصر ہیں کہ باورچی خانے میں کھانا کھانے کے وقت بلی کے ڈبے کے پاس بیٹھے رہیں۔ اُنکے چہروں سے شوق اور جستجو اور انہماک ظاہر ہوتا ہے وہ بچوں کے حال کے لئے اتنے فکرمند نہیں ہیں جتنا اُنکے مستقبل کے لئے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ اُن میں سے ایک بچہ تو گھر میں اپنی بڈھی ماں کی خبر گیری کے لئے رہے گا اور دوسرا اُن کے گرمی کے مکان میں بھیج دیا جائے گا اور تیسرا مودی خانہ میں رہیگا جہاں چوہے اتنی کثرت سے ہیں۔

"مگر وہ ہماری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہیں؟" ننیا کو تعجب ہوتا ہے "اُن کی آنکھیں بھکاریوں کی طرح اندھی ہیں۔"

دانیا کو بھی تشویش ہے۔ وہ ایک بچہ کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے اور دیر تک اُس کے پپوٹوں کو پھونکتا اور ہوا دیتا ہے، لیکن اس کی کوشش بیکار جاتی ہے اور اس پر بھی دونو بہت متحیر ہوتے ہیں کہ بچے جو گوشت یا دودھ انہیں دیا جاتا ہے اُسے لینے سے انکار کرتے ہیں اُنکے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے وہ اُن کی ماں کھالیتی ہے۔

"اچھا ان کے لئے گھر بنادیں" دانیا رائے دیتا ہے "یہ تینوں علیحدہ علیحدہ گھر میں رہینگے اور بلی ان سے ملنے آیا کریگی۔"

دفتی کے ٹوپی کے ڈبے باورچیخانے کے مختلف کونوں میں رکھدئے جاتے ہیں اور بچے اُن میں بٹھائے جاتے ہیں، لیکن یہ تقسیم ناکام ثابت ہوتی ہے۔ بلی اب بھی رحم کی طالب اور محبت بھری نظریں لئے سب ڈبوں کے گرد جاتی ہے اور اپنے بچوں کو پہلی جگہ پر لے آتی ہے۔

"بلی انکی ماں ہے" دانیا نے کہا "لیکن انکا باپ کون ہے؟"

"ہاں انکا باپ کون ہے؟" ننیا دہراتی ہے

"کوئی ان کا باپ ضرور ہونا چاہئے۔"

دانیا اور ننیا دیر تک سوچتے رہتے ہیں کہ انکا باپ کسے ہونا چاہئے اور آخر میں اُن کی

نظر انتخاب ایک گہرے سرخ رنگ کے گھوڑے پر پڑتی ہے جس کی دم نہیں ہے اور جو میز کے
نیچے کباڑ خانے میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر میں پڑا ہے۔ وہ وہاں سے
اسے باورچی خانہ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں اور اُسے ڈبے کے پاس کھڑا کرتے ہیں۔
"سنتے ہو" وہ اس سے تاکید کرتے ہیں " یہاں کھڑے رہو اور دیکھو کہ بچے کوئی بدتمیزی
نہیں کرتے۔"

یہ سب بڑی سنجیدگی سے کیا جاتا ہے، وآنیا اور ننیا، سوا بچوں کے ڈبوں کے کسی اور دنیا
کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ اُن کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن انہیں تکلیف دہ اور
رنجیدہ لمحوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کھانے سے پہلے وانیا اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں خواب آلودہ نظروں سے
میز کو دیکھ رہا ہے۔ لیمپ کے نزدیک بچھے ہوئے نوٹ پیپر پر ایک بلی کا بچہ رینگ رہا ہے۔
وانیا اس کے حرکات کو خوب غور سے دیکھ رہا ہے اور اُس کے منہ میں پہلے ایک پنسل پھر
دیا سلائی دے رہا ہے . . . ایکدم جیسے زمین کو پھاڑ کر نہ معلوم کہاں سے اُسکا باپ میز
کے پاس نمودار ہوتا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" وانیا ایک غصہ کی آواز میں سنتا ہے۔

"یہ . . . یہ ابا جان بلی کا بچہ ہے . . . ."

"مار تو نہیں کھاؤ گے! دیکھو یہ تم نے کیا کیا! میرا تمام کاغذ خراب کر ڈالا!"

وآنیا کے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اُسکا باپ اس شوق میں
کوئی حصہ نہیں لیتا جو دانیا کو بچہ کے ساتھ ہے اور بجائے بچہ کو دیکھ کر خوش ہونیکے وہ وآنیا کے
کان کھینچتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

"استفن، اس شریر کو یہاں سے لیجاؤ"

کھانے پر دوسرا منظر پیش ہوتا ہے . . . دوسرے دور کے درمیان ایک تیز میاؤں

کی آواز وقفہ وقفہ سے سنائی دیتی ہے۔ وہ اس آواز کا مخرج تلاش کرتے ہیں اور رتنیا کے کپڑوں میں ایک بلی کا بچہ چھپا پاتے ہیں۔

"رتنیا یہ سب میز پر سے اٹھا جاؤ۔ اُسکا باپ خفا ہو کر کہتا ہے "بچوں کو موری میں پھنکوا دوں گا، میں ان گندی چیزوں کو گھر میں نہیں رکھوں گا! . . . "

وآنیا اور رتنیا خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ موری میں پڑے پڑے بچوں کی موت علاوہ بے رحمی کے بلی اور گھوڑے کو جانکاہ صدمہ پہونچائے گی، بچوں کے ڈبوں سونا کر جائے گی، اُنکے مستقبل کے ارادوں پر پانی پھیر دے گی، وہ روشن مستقبل جب کہ ایک بچہ ماں کے آرام کے لئے اُسکے پاس رہے گا، دوسرا دیہات میں رہے گا اور تیسرا کوٹھری میں چوہے پکڑے گا۔ لڑکے رونے لگتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں کہ بچوں کی جانیں بخش دی جائیں۔ اُنکا باپ مان لیتا ہے مگر اس شرط پر کہ وہ دونوں باورچی خانے نہ جائیں اور بچوں کو نہ چھوئیں۔

کھانے کے بعد وانیا اور رتنیا کمرے کمرے ایک بے کلی اور اداسی کے ساتھ پھرتے ہیں۔ باورچی خانے جانے کی ممانعت نے انہیں بے دل کر دیا ہے۔ وہ مٹھائی نہیں لیتے منہ پھیلائے ہوئے ہیں اور ماں سے بگڑے ہوئے ہیں جب اُنکا چچا پروشا شام کو آتا ہے وہ اُسے علحدہ لے جا کر اس سے اپنے باپ کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو نالی میں پھنکوا دیتے تھے۔

"چچا جان، امی سے کہدو کہ بلی کے بچوں کو ہمارے کمرے میں منگا دیں" لڑکے چچا سے خوشامد کرتے ہیں "کہہ دو — د"

"ہاں ہاں . . . . اچھا" چچا جان انہیں چمکار کر کہتے ہیں "اچھا"

چچا پروشا کبھی اکیلے نہیں آتے۔ اُن کے ساتھ اُنکا نیرو، ایک بڑا سیاہ کتا بھی جس کے کان جھکے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی کی طرح سخت دم ہے آتا ہے۔ کتا خاموش

غمگین اور اپنے وقار کو لئے رہتا ہے۔ وہ لڑکوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بلکہ جب اُن کی طرف سے گزرتا ہے تو اُن کے دم مارتا ہے جیسے وہ کاٹھ کی کرسیاں ہوں۔ لڑکے اُس سے بڑی نفرت کرتے ہیں لیکن وقتی ضرورتیں جذبات پر غالب آتی ہیں۔

"سنو، ننیا" وانیا اپنی آنکھیں خوب پھیلا کر کہتا ہے "نیرو کو اُن کا باپ بناؤ، گھوڑے کو نہیں، گھوڑا بے جان ہے اور یہ جان دار ہے، سمجھیں؟"

پوری شام وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ابا جان تاش کھیلنے بیٹھیں گے اور نیرو کو بغیر کسی کے دیکھے ہوئے باورچی خانے لیجانا ممکن ہوگا... آخر کار ابا جان تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ امی سماوار گرم کرتی ہیں اور لڑکوں کو نہیں دیکھ رہی ہیں۔

وہ مبارک وقت آجاتا ہے۔

"آؤ!" وانیا چپکے سے ننیا کے کان میں کہتا ہے۔

لیکن اسی وقت استفن اندر آتا ہے اور خبر سناتا ہے۔

"بیگم صاحبہ! نیرو نے بچے کھالئے۔"

ننیا اور وانیا زرد پڑ جاتے ہیں اور استفن کو خوف سے دیکھتے ہیں۔

"سچ کہتا ہوں اُس نے کھالئے...." نوکر ہنستا ہے" وہ ڈبوں کے پاس گیا اور ہڑپ کر گیا"

لڑکے منتظر ہیں کہ گھر بھر بدحواس ہو جائے گا اور بدمعاش نیرو کو سزا ملے گی۔ لیکن سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں اور اس پیٹو کتے کی بھوک پر صرف حیرت ظاہر کرتے ہیں۔ امی اور ابا جان ہنستے ہیں۔ نیرو میز کے پاس چکر لگاتا ہے، دُم ہلاتا ہے اور اپنے ہونٹ مزے مزے چاٹتا ہے.... بلی ہی ایک ہے جسے چین نہیں ہے۔ اپنی دم ہوا میں اٹھائے وہ کمرے کمرے بھٹکتی ہے اور لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور درد سے کراہتی ہے۔

— سلطان عبدالعزیز — ابھی کہتی ہیں — اب سونے کا وقت ہے۔

وانیا اور سنیا بستر پر لیٹتے ہیں، آنسو گراتے ہیں اور بڑی دیر تک بیارو خصال بلی اور بے رحم و بدتمیز نیرو کے حال پر جسے کوئی سزا نہیں دی گئی کف افسوس ملتے ہیں۔

غزل

مصور جذبات جناب مرزا ثاقب لکھنوی مدظلہ

کل وحدتِ فرقت کا سماں ہوش ربا تھا
نالہ بھی مرے منہ سے نکلتے ہی ہوا تھا

آتے تو سوادِ شب غم تم کو دکھاتے
وہ سب تھا جو کچھ اپنے مقدر میں لکھا تھا

وہ کر گئے تھے مجھ کو بلاؤں کے حوالے
سب جھیل لیں میں نے کہ مرا بھی تو خدا تھا

کیا دیکھتا آثارِ سحر میں شب فرقت
وہ جوش پر آنسو تھے کہ دل ڈوب رہا تھا

دعوائے محبت تھا وہ جس نے مجھے مارا
بس اس کے سوا کچھ نہ کہا تھا نہ سنا تھا

دل سوختگان لحد اپنے تو ہیں یا رب
اک ابر سا کل گور غریباں سے اٹھا تھا

ثاقب انہیں کیا حال شب ہجر سناؤں
خود اپنے جو یہ رات گزرتی تو مزا تھا

مرثیہ

حشر تک اجمل مرحوم کا ماتم ہوگا

از جناب برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی

آج دلی میں قیامت کی سنائی آئی — جس سے ماتم کی گھٹا شہر کے دل پر چھائی
تاربرقی نے یہ غمناک خبر پہونچائی — کہ وطن چھوڑ چلا آج وطن شیدائی
چوٹ غم کی دل ہر اہل وطن کھاتا ہے
کہ وطن چھوڑ کے شیدائے وطن جاتا ہے

کہتے ہیں نام کو باقی ہے نشان دہلی — چل بسے لوگ جو تھے روح رواں دہلی
مٹ چکی گرچہ بہت شوکت و شان دہلی — کچھ ہو۔ تھی ذات مقدس تری جان دہلی
جان دہلی میں نہیں۔ وہ سہی اجڑا سا دیار
آج پھر کس لئے کل ملک ہوا ماتمدار

تجھ سے دلی کی نہیں ہند کی دلداری تھی — ہر رگ و پے میں ترے حب وطن ساری تھی!
دوستداری تھی، رواداری تھی غمخواری تھی — ہاں تعصب سے تری طبع بہت عاری تھی
جن میں ہوں جمع یہ کل وصف وہ کم انساں ہیں
یہی اوصاف حسن حب وطن کی جاں ہیں

ذکر حکمت کا ہے کیا؟ وہ تو ہے گھر کی لونڈی — ہاتھ میں شافی مطلق نے شفابخشی تھی
موت اور زیست تو ہے تابع حکم ربی — معترف خلق ہوئی اُس کی شفابخشی کی
انگلیاں نبض پہ رکھتے ہی مرض دھر پکڑا

شیر نے پنجے میں روباہ کو جیسے پکڑا

فرد تھا مشرقی ملکوں میں وہ ایسا تھا طبیب — یہ حذاقت تو نہیں ہوتی ہر اک کو نصیب

خلق وہ ڈھونڈھ کے نہ پاؤ گے کوئی اس کا نجیب — الغرض۔ ایسا طبیب۔ ایسا نجیب اور ادیب

دوسرا آج زمانے میں کوئی کم ہوگا

حشر تک اجمل مرحوم کا ماتم ہوگا

ایک سر حلقۂ ارباب صفا تھا نہ رہا — ایک روح تن اخلاص و وفا تھا نہ رہا

محفلِ شعر میں جانِ فصحا تھا نہ رہا — خدمت ملک پہ دل جس کا فدا تھا نہ رہا

تو نہ ہوگا تو تری یاد رہے گی دل میں

شمعِ محفل ہو ترا ذکر ہر اک محفل میں

عطر تھا مشرقی تہذیب کا تیرا برتاؤ — روح تھا دلی کی کلچر کا ترا نیک سبھاؤ

کوئی کچھ ہی کہے آتا تھا طبیعت کو نہ تاؤ — ایک تھا تجھکو زمانے کا اتار اور چڑھاؤ

ملک میں ہوتے رہے روز نئے ہنگامے

تھا تو اٹھتے ہوئے طوفان کو روکے تھامے

نام کیا شستہ مذاقی میں تھا مرحوم اجمل — اس کی خودداری میں تھی تمکنت کوہ جبل

پچھلے ایام میں کیا کیا نہ ہوئی جنگ و جدل — نام کو اس کی رواداری میں آیا نہ خلل

دعوت ابنائے زماں کو جو عمل کی دی تھی

لائحۂ کار میں اسکے نہ ہوئی تبدیلی

تھا امیدوں کا کھلا ایک گلستاں دل میں — ملک آزاد ہو تھا ایک یہی ارماں دل میں

گرچہ رکھتا تھا وہ اک کعبۂ ایماں دل میں — تھے برابر اسے ہندو و مسلماں دل میں

ایک آنکھ ان کو بس اس مرد خدا نے دیکھا

کفر و اسلام کا تھا ایک ہی میں لیکھا

گرچہ کہنا کبھی گاندھی کا بھی مانا نہ گیا　　حفظ حق کا وہ مصنوعی بہانا نہ گیا
لب سے تیرے وطنیت کا ترانہ نہ گیا　　تاہم عشق وطن دل سے نہ جانا نہ گیا

غم وطن کا رہا دل میں ترے ارماں ہو کر
یہ گیا بھی تو گیا ہم نفس جاں ہو کر

آن پہ وہ۔ اس پہ سب احرار وطن مرتے تھے　　فرش رہ دیدۂ دل اسکے لئے کرتے تھے
شیخ اور برہمن اسکا ہی تو دم بھرتے تھے　　اس کے ہی نقش قدم پر وہ قدم دھرتے تھے

کم ملے گا تمہیں اس دور میں اجل ایسا
نہیں ممکن کہ ملے جوہر اکمل ایسا

پائیں گے خلق و موالات ترے ہم کس میں　　آخری تیری صدارت ہوئی جس مجلس میں
اتفاق آکے پڑا دیکھئے کیسا اس میں　　صلح ہندو و مسلماں کی ہوئی تھی جس میں

تھیں کھلیں بہتری قوم کی راہیں تجھ پر
جب پڑا وقت تو اٹھتی تھیں نگاہیں تجھ پر

آنشرم صدق و صفا کا جو وہ گجرات میں ہے　　صدر اسکا کہ کشش جس کے مقالات میں ہے
عشق و ایثار بھرا جس کے خیالات میں ہے　　اک قیامت کا اثر جس کی ہر اک بات میں ہے

اُسکی وطنیت اس احرار کے سرنام سے پوچھ
دوستداری و خلوص اُس کا سری رام[1] سے پوچھ

شادی و رنج وطن سینہ میں جاگیر بھی تھا　　عشق رگمبیر بھی دل میں غم شبیر بھی تھا
کام کرنے میں جواں۔ رائے میں وہ پیر بھی تھا　　شدت جوش میں جذبوں کا عنانگیر بھی تھا

دل ستان غم ملت سے بھرا رہتا تھا
تن بدن سوز محبت سے پھنکا رہتا تھا

رہنما راہ ترقی کا ہو۔ رہگیر بھی ہو　　دیش بھگتی کا کلیجہ میں کھبا تیر بھی ہو

---

[1] لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مؤلف تذکرہ خمخانہ جاوید

دل میں آہ سحری، نعرہ شب گیر بھی ہو — درد ہو دل میں اور الفاظ میں تاثیر بھی ہو

جمع یہ وصف تو ہوتے نہیں ہر انساں میں

ہاں یہ موجود بہ حد درجہ تھے اجمل خاں میں

خون رلوائیں گی پسماندوں کو تیری باتیں — وہ دل افزائی کی ہمدردی کی پیاری گھاتیں

فکر میں قوم کی کٹتے ترے دن اور راتیں — ملک میں ایسی نہ نکلیں گی بہت سی ذاتیں

غیر کے درد کو سینہ میں جو اپنے لیں

جان تک نذر جو اس دردِ دلی کو دیدیں

تو ہمیشہ وطنیت پہ فدا رہتا تھا — غم وطن کا نہ کبھی تجھ سے جدا رہتا تھا

سازِ دل زمزمۂ الفت سے چھڑا رہتا تھا — ملک کا درد ترے دل میں بھرا رہتا تھا

جان اس دل پہ فدا ہو کے نہ کیونکر رہتی

دل پر درد کی چوٹوں کو وہ کب تک سہتی

ہیں بہت راگ اخوت کا سنانے والے — قلم اور لب سے طلسمات رچانے والے

قومی خدمت کے تھیٹر کے چلانے والے — کم ہیں جو کہہ دیں وہ کر کے بھی دکھانے والے

دردمندانِ وطن ایسے تو ہوں گے تھوڑے

جن کے دل سوزِ وطن سے ہوئے پک کے پھوڑے

سیکھتا تجھ سے کوئی قوم پہ قرباں ہونا — درد سہنے کو وطن کا، ہمہ تن جاں ہونا

قول اور فعل کا آساں نہیں یکساں ہونا — جوہر انسان کا ہے ہمدردیِ انساں ہونا

سروری چیست بگو خادمِ اخواں بودن

غمِ ابنائے وطن خوردن و شاداں بودن

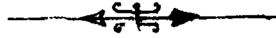
ہے وہ ایثار طلب قوم کی ذمہ داری — شیر دل جن کے ہیں، ہو جاتی ہیں اس سے عاری

خدمت ملک کا ہے بوجھ بہت ہی بھاری — کس سے اٹھتا ہے، اٹھائیں بس اسے انصاری

باوفا دوست کے کاموں کا سرانجام کریں
روح مسرور ہو مرحوم کی وہ کام کریں

بارگاہ صمدی میں ہے دعا با رقت — روح اجمل کو ملے تیرا جوار رحمت
کام چھیڑے تھے جو اس نے وہ چلیں باوقت — اُس کی تقلید کی ہو اہل وطن کو ہمت

اُس کا فرزند جو ہے خلق پدر کی تمثیل
کر عطا بارِ خدایا تو اُسے صبر جمیل!



اقتباسات

لارڈ اکسفورڈ

لارڈ اکسفورڈ کا برطانوی سیاست پر گزشتہ نصف صدی سے بہت بڑا اثر تھا۔ انکی موت سے برطانیہ کو اور خصوصاً لبرل پارٹی کو جو عظیم الشان نقصان پہنچا ہے اسکی تلافی ایک عرصہ تک نہ ہو سکیگی جس دور اندیشی اور قابلیت کے ساتھ انہوں نے متعدد مرتبہ بحیثیت وزیر اعظم فرائض انجام دیے ہیں وہ انہیں برطانیہ کی تاریخ میں ہمیشہ ممتاز جگہ دے گی۔ مسٹر ریمزے میکڈونلڈ نے میوزیشن اور انٹنیم میں ان کی موت پر رقمطراز ہیں کہ "ایکویتھ کا انتقال ہوگیا اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی عظیم الشان یادگار تباہ ہو جائے۔ اس شخص میں غیر معمولی قوت استقلال اور شان تھی۔ اس شخص کی عظیم الشان زندگی تھی جس میں اول سے آخر تک کوئی چیز چھوٹی اور حقیر نظر نہیں آتی۔ نازک ترین موقعوں پر اس نے غیر معمولی کام انجام دئے مصائب سے یہ شخص کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ لیکن ہم اس وقت اسکے کارناموں پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اس حقیقی عظمت کو بتانا چاہتے ہیں جو اس کی شخصیت کا جزو لاینفک تھی۔ یہ الفاظ غیر ذمہ دارانہ استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ ہر شخص نے جسے اس سے سابقہ پڑا اسکی اس عظمت کو محسوس کیا۔"

"اس کی سیاسی فتوحات کا اسقدر جلد صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کی فتوحات کی جگہ انگریزی سیاست کے قدیم میدان کابینہ اور ہاؤس آف کامنس ہی تھے۔ پلیٹ فارم پر وہ بہت زیادہ کامیاب نہ تھا وہ اپنے مزاج اور تربیت سے شہرت طلبی کا مخالف تھا۔ کابینہ میں اس کے خلاف وہ بہت زیادہ کامیاب رہا کرتا تھا۔ یہ ٹھیک کہا گیا ہے کہ پیل کے عہد سے اس وقت تک کابینہ پر کسی نے اس قدر اثر نہیں رکھا حالانکہ پیل کا زمانہ اسقدر مصائب اور پیچیدگیوں کا زمانہ نہ تھا جس قدر کہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ تھا۔ ہاؤس آف کامنس

میں بھی اس سے شاید ہی کوئی بازی لیجا سکتا تھا جنہوں نے ۱۹۰۹ء میں لبرل وزرات کے وقت اور میزانیہ اور پارلیمنٹ ایکٹ پر اس کی تقریریں سنی ہیں وہ اس کی شہادت دیں گے ۔ مصائب میں اس کے انتہائی جوہر دکھائی دیتے تھے ۔ بعض اوقات وہ اپنی تدبیر پر اس قدر اعتماد کیا کرتا تھا کہ آئندہ آنیوالے خطرات سے بھی بے خبر ہو جاتا تھا ۔ غالباً یہی سبب تھا جس نے اس کی پارٹی کو ۱۹۱۲ء میں مصیبت میں مبتلا کر دیا جس سے اسے بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا ۔ "

" یہ افسوس کی بات ہے کہ اس کی زندگی کے آخری ایام غلط فہمیوں کی نذر ہو گئے جس نے اس کے بہترین مداحوں کو اس سے علحدہ کر دیا ۔ ان باتوں نے اسے ضرور رنجیدہ کیا ہوگا ۔ اور کون ایسے واقعات سے رنجیدہ نہیں ہوتا ۔ آپس کے ان تنازعوں نے قوم کو اسکی دانشمندانہ نصائح سے محروم کر دیا ۔ لیکن اس سبب سے ہمارے دلوں میں اس کی عظمت کا احساس کم نہیں ہوا ہے اور ہم اس احسان کو جو اس نے ایک عرصہ تک خدمت عامہ انجام دے کر کیا ہے بھلا نہیں سکتے ۔ ——————— "

" تاریخ میں اس کے لئے ایک ممتاز جگہ قطعی محفوظ ہے چونکہ یہ وہ شخص ہے جس نے ہاؤس آف لارڈس کے اختیارات کم کر کے اس نازک مسئلہ کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا جو ۱۸۳۲ء سے ہر لبرل مدبر کو پریشان کئے ہوئے تھا ۔ بحیثیت وزیر اعظم کے اس نے وہ اجتماعی اصلاحات کی ہیں جس کی ہمت اس وقت تک کبھی پارلیمنٹ نہ کر سکی تھی بہ حیثیت قوم پرست کے اس نے قوم کی تاریخ کے انتہائی مصیبت کے زمانہ میں رہنمائی کی ۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اس کی یاد اس لئے کیجائے گی کہ وہ اعلیٰ ذہن اور اعلیٰ اخلاق رکھتا تھا ایک بڑا دل رکھنے والی شخصیت تھی جس نے دوستوں سے کبھی بے وفائی نہیں کی ۔ جس نے ذمہ داری سے کبھی جان نہیں چرائی اور جس نے کبھی کوئی بعید از شرافت فعل نہیں کیا ۔ "

سر فیروز شاہ مہتا نے انڈین ریویو میں ہندوستان کے لئے اعلیٰ مجلس مقننہ

کی تشکیل پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ اسقدر اہم مسئلہ ہے کہ آئین ہند بناتے وقت ہندوستان
کے بہترین مدبرین کو پریشان کریگا۔ سرفیروز شمنا نے دنیا کی تمام اعلیٰ مجالس مقننہ کی خصوصیات
بتائی ہیں اور ہندوستان کے لے آئرش سینٹ کی تقلید زیادہ مفید تبلائی ہے۔ مسٹر ملینیٹ
نے اپنے کومن ولتھ آف انڈیا بل میں بھی یہی ظاہر کیا ہے کہ ہندوستان کی کونسل آف اسٹیٹ کو آئرلینڈ
کی سینیٹ کی وضع پر ہونا چاہئے عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت ہمارے پیش نظر ایسی انقلاب انگیز تجاویز
ہیں جو آئرش سینٹ کے آئین کو بالکل بدل دینا چاہتی ہیں چونکہ اب ثابت ہوچکا ہے کہ اس آئین کی
نظری خوبیاں کسیقدر کیوں نہوں لیکن علاوہ بالکل ناقابل عمل ہے سینٹ کے انتخابات آئندہ ستمبر میں
ہونیوالے ہیں اور حکومت برابر اسی کوشش میں مصروف ہے کہ ایسے وہ غلطیاں نہ ہونے پائیں جو ۱۹۲۵ء میں
سرزد ہوگئی تھیں۔ اور جس کے سبب بہت دقت اٹھانی پڑی۔ کوسگریو حکومت سینٹ کے
آئین میں دو قسم کی تبدیلیاں کرنا چاہتی ہے۔

(۱) سینٹ کے ممبرون کی تعداد میں تخفیف جس کو حکومت کی مخالف جماعت نے بھی
تسلیم کرلیا ہے

(۲) بلا واسطہ انتخاب کی بجائے بالواسطہ انتخاب۔

وہی خصوصیات جو آئرلینڈ کی مجلس اعلیٰ کے لئے باعث امتیاز تھیں اب اس کی
کمزوریاں ثابت ہو رہی ہیں۔ انتخاب کے لئے تمام آئرلینڈ ایک حلقہ انتخاب قرار دیدیا
گیا تھا۔ ممبرون کا انتخاب ایک مخصوص طبقہ میں سے جس نے بقول سرفیروز ایک عرصہ تک
خدمت عامہ سے قوم کو عزت دی ہے ہوتا تھا یہ خیال کیا گیا تھا کہ اس طرح مقامی تعصبات کو
مفاد کا اثر کم ہوجائے گا اور تمام ملک میں سے صرف بہترین افراد منتخب ہوسکیں گے
لیکن ۱۹۲۵ء میں عملی نتیجہ یہ ہوا کہ پیشہ ور سیاست داں اور اکثر ناکارہ لوگ منتخب ہوگئے
غرضکہ آئرلینڈ کی سینٹ کی تمام خصوصیات جو آئین والوں کو اس قدر مفید دکھائی دیتی
تھیں بالکل بیکار ثابت ہوئیں۔ اصلی مجلس مقننہ کے لئے ضروری نہیں ہے کہ اسکے بلاواسطہ

لوگ منتخب کریں چونکہ اس کا مقصد صرف قوانین پر دوبارہ غور کرکے ترمیم کرنا اور اگر ضرورت ہو تو کچھ عرصہ تک روک رکھنا ہے۔

آئرش حکومت اس پر غور کر رہی ہے کہ سینٹ کے اراکین ایک محدود جماعت میں سے ہوں جس میں تمام ضروری مفاد کی نیابت ہو اور جس کا انتخاب دونوں مجالس مقننہ مل کر کریں۔"

"ہندوستان کی عورتوں کی کانفرنس کا دوسرا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جو اس امر کا شاہد ہے کہ ہندوستان کی عورتیں اپنی صنف کی ترقی میں کس قدر کوشاں ہیں۔ لیڈی ریڈنگ نے اپنی تقریر میں کہا کہ تعلیم کا مقصد زندگی کی عظیم الشان کشمکش کے لئے اخلاق، ذہن اور جسم کی تربیت کرنا ہے۔ ہر اکسلنسی نے کہا کہ ہندوستان میں عورتیں قدیم روایات کی نگہبان ہیں اور دعا کی کہ وہ ان کو ایک عرصہ تک محفوظ رکھیں۔ جن لوگوں کے ذمہ بچوں کی تربیت کا کام اس عمر میں ہے جب کہ انکی طبیعتیں بہت زیادہ اثر پذیر ہوتی ہیں ان کو کم از کم تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہئے۔ لیڈی اردن نے پھر استانیوں کی ضرورت کیطرف توجہ دلائی اور کہا کہ معلمی اس وقت معاش کیلئے ایک پیشہ خیال کیا جاتا ہے جس کے سبب اعلیٰ خاندان کی مستورات اسے اختیار نہیں کرتیں ہمیں اس خیال کو جلد از جلد دور کر دینا چاہئے۔ لیڈی اردن کا یہ قطعی خیال ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے نصاب تعلیم میں فرق ہونا چاہئے اور اس لئے ان کے خیال میں خانگی امور کی عملی واقفیت اور قوانین صحت کا علم لڑکیوں کے نصاب کا ضروری جز ہونا چاہئے۔ آخر میں لیڈی اردن نے کہا کہ کانفرنس کو انتہائی غور و فکر کے بعد تعلیم نسواں کے متعلق اپنی اسکیم پیش کر دینی چاہئے۔

ہر ہائنس بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا کہ تعلیم نسواں جیسے اعلیٰ مقصد نے مذہبوں اور ملتوں کے امتیازات مٹا دیئے ہیں۔ تعلیم نسواں کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل

دہ غربت۔ پردہ اور کم عمری کی شادی ہیں۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ غربت کے متعلق ہرہائنس نے غیر ضروری اخراجات کم کرنے کی ہدایت کی اور آمد و خرچ کا توازن قائم رکھنے کی تاکید کی ہے۔ متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق کہ لڑکوں اور لڑکیوں کا نصاب ایک ہونا چاہئے یا جداگانہ ہرہائنس نے کہا کہ لڑکیوں کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جو خانگی زندگی کو کامیاب بنانے میں معاون ہو۔ استانیوں کے مسئلہ کے متعلق ہرہائنس نے ان عورتوں سے جو تعلیم دے سکتی ہیں اپیل کی کہ وہ اعزازی خدمت کریں۔ آخر میں بیگم صاحبہ نے کانفرنس کو متنبہ کیا کہ وہ صرف چند دل خوش کن تجاویز پاس کرکے اور بڑی بڑی امیدوں کا اظہار کرکے خاموش نہ ہو جائے بلکہ اس کے بعد عمل بھی کرے۔ ہم کانفرنس کو اس کی خوش قسمتی پر مبارکباد دیتے ہیں کہ اسکی صدارت ہرہائنس بیگم صاحبہ بھوپال جیسی تجربہ کار اور دانشمند خاتون نے فرمائی۔"

مسودۂ قانون اُردو شاعری ۱۹۲۸ء

از رپورٹر

مضمون زیر بحث کی مناسبت سے آج مجلس واضعان توانین نے جسے پیار میں اسمبلی کہتے ہیں رات کے وقت اجلاس کیا نشست بجائے کرسیوں کے فرش پر تھی اور جناب صدر ایک مسند زرنگار پر میر فرش بنے بیٹھے تھے۔ جس ممبر کو تقریر کی اجازت ملتی تھی اُس کے سامنے ایک شمع کافوری رکھ دی جاتی تھی اور وہ کھڑا ہو کر نہیں بلکہ بیٹھ کر تقریر کرتا تھا (یا اگر مدراس کا مسلمان ممبر ہوا تو تحریر پڑھتا تھا)

جناب صدر کے حکم سے آنریبل ممبر فنون لطیفہ المتخلص بہ آرٹ پیپر کے سامنے شمع رکھی گئی اور اُنہوں نے نیچے سُروں میں قانون کا مسودہ الاپنا شروع کیا "از آنجا کہ حکومت نے پچھلے ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں تعلیم کو نالۂ عشاق کی طرح ملک کی فضا میں اس سرے سے اُس سرے تک پھیلا دیا ہے۔ جس کے فیض سے دفتر کے کلرکوں سے لیکر ممبران اسمبلی تک حرف آشنا اور معنی فراموش ہو گئے ہیں (سرکاری بنچوں کی آواز: بیشک بیشک سبحان اللہ کیا بلاغت ہے کیا معنی آفرینی ہے) اپنے فرائض اور حکومت کے حقوق کو پہچان لیتے ہیں بلکہ بعض بعض معرفت کے اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں جو "من تو شدم تو من شدی من سر شدم تو کیش شدی" کہلاتا ہے لیکن از آنجا کہ (مخالف سرکار بنچوں کی آواز: یہ لیکن از آنجا کہ "خلاف محاورہ ہے)۔ (سرکاری آواز۔ محاورہ نہیں تھا مگر اب ہو گیا) لیکن از آنجا کہ اس تعلیم میں جمالیاتی تربیت شامل نہ تھی اس لئے فنون لطیفہ میں اہل ہند اب تک لکیر کے فقیر یا کولھو کے بیل ہی رہے اور از آنجا کہ "فنون لطیفہ غلامان" اس اعتبار سے بڑی اہم چیز ہے کہ اسکا جادو دماغ کی سطح سے گزر کر دل کی گہرائی میں اثر کرتا ہے اور خیالات کے علاوہ جذبات و احساسات کو بھی مسحور کر لیتا ہے۔

اس لئے حکومت کے دل میں یہ بات کھٹک رہی تھی کہ معقولات کی طرح اس میں بھی دخل دے کر اپنی عزیز رعایا (مخالف آواز ۔ چوں بارہی بر دعزیزاست) کی تعلیم کا کام تمام کرے پس بہت غور کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ فنون لطیفہ کی ایک علحدہ وزارت قائم ہوا ور چونکہ "اک کمیشن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے " ۔ اس لئے اسی سال سے ابتدا بھی ہوگئی ۔ اور یہ خاکسار جس نے جعفر زٹلی کے دیوان کا ایک مصور ایڈیشن شائع کیا ہے اور کئی " سالنامے " بہ قلم خود نہ سہی بہ قلم دیگراں تصنیف کر چکا ہے ۔ اس بار کا حامل قرار دیا گیا ۔ (سرکاری آواز ۔ حق بہ حق دار ۔ مخالف آواز ۔ " الخبیثات . . . . ") حاصل مختلف فنون کے اساتذہ سے مشورہ اور اصلاح لینے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ سارے فنون لطیفہ میں سب سے خراب حالت اُردو شاعری کی ہے لہذا یہ مسودہ قانون بہ ثبات عقل و ہوش ترتیب دیا تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کے کام آئے ۔

مطلع ۔ اس قانون کا نام قانون اُردو شاعری ۳۶ء ہوگا ۔

حسن مطلع ۔ اس کا نفاذ سارے ہندوستان میں مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک ہوگا ۔

بیت اول ۔ ہر شخص کو جو اُردو میں شعر کہنا چاہے پولیس کی چوکی سے ایک لائسنس حاصل کرنا ہوگا جس کی مدت ایک سال ہوگی ۔

بیت دوم ۔ ہر نظم یا غزل قبل اس کے کہ مشاعرہ میں پڑھی جائے یا کسی رسالہ میں شائع ہو صاحب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ صاحب کی خدمت میں بہ نظر اصلاح پیش ہوگی ۔

بیت سوم ۔ سامعین یا ناظرین کو داد دینے کی ممانعت ہے ۔ داد سرکاری گزٹ میں شائع ہوا کرے گی ۔

بیت چہارم ۔ ہر مشاعرہ میں میر مشاعرہ کوئی ایسا شخص ہوگا جو مجسٹریٹ درجہ اول کے اختیارات رکھتا ہو ۔ اور پڑھنے والوں کا انتخاب فرقہ وارانہ انتخاب کے اصول پر ہوگا ۔

مقطع۔ ہر دیوان یا ایسی کتاب جو اشعار پر مشتمل ہو آرٹ پیپر پر طبع ہوگی۔
یہ مختصر مسودہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور امید ہے کہ میں نے خون جگر کھا کر جو مضامین پیدا کئے ہیں اُن کی آپ پوری قدر کرینگے۔

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد　　　ظلم ہے گر کرو نہ مجھکو پیار

آنریبل ممبر نے جیسی ہی اپنی تقریر ختم کی حامیان سرکار کی بنچوں سے احسنت۔ مرحبا۔ آمنا صدقنا کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور مخالفین کی طرف سے "شعر فہمی حکام بالا دست معلوم شد" کی آواز آنے لگی۔ جب یہ غوغا کسی قدر فرو ہوا تو شمع حریفوں کے لیڈر المتخلص بہ وصلی کے سامنے آئی اور موصوف نے اپنے نتائج افکاریوں سنانا شروع کئے۔

"جناب میر محفل۔ میرے معزز دوست آرٹ پیپر صاحب کا مسودہ قانون جو ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا ایک ایسا دام فریب ہے جس سے طائر دل کا بچنا بہت دشوار ہے مگر خدا کے فضل سے ہماری پارٹی میں ایسے ایسے مرغ قفس دیدہ (جو اصطلاح میں عندیت کہلاتے ہیں) موجود ہیں جنہیں سوائے سلسلۂ زلف کے کسی بند میں گرفتار کرنا ناممکن ہے۔ یہ عقاب المانیہ نہ ہو ایک بار پر نچوا کر بھی نہ جیتا اور پھر مجلس اقوام کے ٹاپے میں بند ہونے کو تیار ہے (سرکاری آواز۔ یہ غیر طرح ہے پڑھنے کی اجازت نہیں، مخالف آواز۔ نالہ پابند نے نہیں ہے) میرا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ ان چالوں میں آنے والے نہیں۔ ہمارے معزز دوست کو خوب معلوم ہے کہ ہم سب اردو شاعری کی عام روش کو ناپسند کرتے ہیں (ایک آواز گل است سعدی و در چشم دشمناں خار است) اور ضرورت سمجھتے ہیں کہ اس پر سخت قیود عائد کریں اس لئے انہوں نے چاہا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایسے اہم شعبۂ زندگی کو حکومت کے اثر میں لے لیں۔ معزز دوست نے جو غزل پڑھی مجھے اس کے ہر بیت کے مضمون سے اتفاق ہے۔ مگر بندش سے کلی اختلاف ہے۔ بیشک شاعروں کے لئے لائسنس ہونا چاہئے اور ان کی غزلوں کا احتساب ہونا چاہئے۔ مشاعرہ اور داد پر خاص قیود عائد ہونا چاہئے لیکن سوال

یہ ہے کہ لائسنس دینے والا، احتساب کرنے والا، قیود لگانے والا کون ہو۔ ہماری پارٹی میں بدقسمتی سے اس معاملہ میں اختلاف ہے۔ ایک جماعت کی رائے ہے کہ اُردو شاعری کی نگرانی سائنس والوں کی ایک مجلس کے سپرد ہونا چاہئے تاکہ اشعار کے ذریعے جو غلط نظریات لوگوں میں قوانین فطرت کے متعلق پھیلتے ہیں انکی روک تھام ہو سکے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ علما کا ایک طبقہ شاعروں کا احتساب کرے۔ تاکہ خلاف شرع باتوں خصوصاً واعظ اور شیخ کی مذمت کا انسداد ہو جائے۔ جو لوگ شدت سے قوم پرست ہیں وہ چاہتے ہیں کہ لیڈروں کی ایک سب کیٹی جس میں صدر محض برائے بیت ہو، ہر شاعر کے کلام کو جانچا کرے اور جو شعر قومی جذبات اور ملکی درد سے خالی ہو اُسے نکال دیا کرے۔ پھر بعض دقیانوسی خیال کے حضرات ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ اشعار کی اصلاح اور انتخاب کا کلام سخن فہم اور باذاق اصحاب کے سپرد ہو تاکہ اچھے شعر شائع ہوں اور برے شعر بطن شاعر میں واپس کردے جائیں۔ غرض اسقدر مختلف خیالات کے لوگ ہماری پارٹی میں موجود ہیں اور ان میں سے ہر جماعت اپنا علٰحدہ مسودہ قانون پیش کرنا چاہتی ہے لیکن الحمدللہ اس پر سب متفق ہیں کہ حکومت کا دخل ہماری شاعری میں ہرگز نہ ہونے پائے ورنہ جس طرح سرکاری سرپرستی میں نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان پیدا ہو رہے ہیں اُسی طرح نیم شاعر خطرۂ زبان پیدا ہونے لگیں گے جن کے کلام کا زہر زبان سے دل میں اور دل سے روح میں پھیل جائے گا۔

جناب صدر ان مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر میں مسودۂ قانون کی مخالفت کرتا ہوں اور امید ہے کہ سب اہل دل میرے ہمزبان ہونگے۔

تقریر کے ختم ہونے پر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ جناب صدر لوگوں کو بہ مشکل خاموش کرتے ہیں۔ رائے لیجاتی ہے۔ مسودہ قانون کثرت رائے سے نامنظور ہوتا ہے۔

تاریخ عالم کی تعبیر

(۲)

انسانی تاریخ کی جو تصویر فاؤسٹ کی نظر میں تھی اس کی لوح پر ہمیں کیا نظر آتا ہے۔ انسانوں کا ایک گروہ تعداد و شمار سے باہر، ایک دریائے بیکراں جو ماضی کی ظلمات سے نکلا ہے، جہاں احساس زمانہ کی ترتیب آفرینی بے دست و پا ہے اور بے چین تخیل۔ یا خوف۔ ہمیں طبقات ارض کی ساخت کا طلسمی منظر دکھاتا ہے تاکہ ہمارے عقدۂ مالاینحل کو اس پردے میں چھپا دے) اور مستقبل کی ظلمات میں جا کر غائب ہو جاتا ہے۔

سنا جو قصۂ ہستی تو درمیاں سے سنا　　نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

اس دریا کی وسیع سطح پر بے شمار نسلوں کا سلسلہ موجوں کے جال کی طرح گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چمکدار لہریں اٹھتی ہیں اور پھیلتی ہیں۔ روشنی کی عارضی کرنیں پانی کی شفاف سطح پر دوڑتی ہیں اسے پریشان اور تہہ و بالا کر دیتی ہیں، اپنا رنگ بدلتی ہیں، ایک آخری چمک دکھاتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں ہم انہیں قرن، قبیلے، قومیں، نسلیں کہتے ہیں اور ان سے تاریخی سطح کے وہ محدود دائرے مراد لیتے ہیں جن میں کئی پشتوں کا ایک سلسلہ شامل ہو۔ جب ان میں قوت تشکیل نہیں رہتی (یہ قوت مختلف قوموں میں مختلف ہوتی ہے اور اسی پر ان کے کارناموں کی خوبی اور مدت حیات کا دارومدار ہوتا ہے) تو ان کی صورت، ان کی زبان اور ان کا ذہن اپنی مخصوص علامات کھو دیتا ہے اور پھر مٹ کر بے نشانی کی ظلمات میں غائب ہو جاتی ہیں۔ آریا، مغل، جرمن، کیلٹ، پارتھیا والے، فرنیک، اہل کارتھیج، بربر، بنٹو، یہ اس قسم کی نسلوں میں سے چند کے نام ہیں جو ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔

لیکن بڑے تمدنوں کی عظیم الشان لہریں اس سطح سے آگے گزر جاتی ہیں۔ وہ یکایک اٹھتی ہیں

دور دور تک پھیلتی ہیں پھر گر کر ہموار ہو جاتی ہیں اور سطح آب کو سنسان اور خوابیدہ چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہیں۔

کسی تمدن کی تخلیق اس لمحہ میں ہوتی ہے جب کوئی بڑی روح بنی نوع انسان کی ازلی طفل طبعی کی حالت سے چونکتی ہے۔ اپنے آپ کو روح اولے سے جدا کرتی ہے یعنی جب نامحدود اور باقی زندگی میں سے کوئی محدود اور فانی شکل جلوہ آرا ہوتی ہے۔ یہ روح زمین کے ایک خطہ میں جس کی صحیح حدود معین کی جاسکتی ہیں، پھلتی پھولتی ہے اور پودوں کی طرح اُس کی زندگی اسی زمین سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس تمدن کو موت اُس وقت آتی ہے جب یہ روح اپنی تمام صلاحیتوں کو اقوام، السنہ، عقائد، فنون لطیفہ، ریاست و حکومت اور علوم کی شکل میں قوت سے فعل میں لا چکی ہو اور پھر روح اولے کی طرف لوٹ جائے۔ اُس کی زندگی یعنی زمانہ کا وہ دور جس میں وہ نشو و نما پاتا ہے اور تکمیل کو پہونچتا ہے ایک نہایت سخت روحانی جنگ ہے جس میں "وہ معین" کی خاطر دو دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے باہر کیطرف ظلماتی قوتوں کا اور اندر کی طرف خود اپنے روح کے لاشعوری پہلو کا۔ صرف آرٹسٹ کو نہیں بلکہ ہر شخص کو ایک طرف مادے اور دوسری طرف اپنی روح کے دشمن عناصر سے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ ہر تمدن کو مادے اور مکان سے جس کے اندر اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنے آپ کو مکمل کرنا چاہتا ہے ایک گہرا معنوی بلکہ پراسرار باطنی تعلق ہوتا ہے۔ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے اسکا عین یعنی اس کی صلاحیتوں کا مجموعہ مکمل ہو جائے اور خارج میں حقیقت کا جامہ پہن لے تو اس تمدن کی حرکت رک جاتی ہے وہ دم توڑنے لگتا ہے، اسکا خون خشک ہو جاتا ہے اور اس کی قوتیں سلب ہونے لگتی ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ وہ "تمدن" سے "تہذیب" بن کر رہجاتا ہے یہی حقیقت ہے جسے ہم اس طرح کے الفاظ میں جیسے مصریت، بازنطینیت، ماندرینیت، محسوس کرتے اور سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک عظیم الشان درخت خشک ہونے کے بعد بھی سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک کھڑا رہتا ہے۔ اس کی مثال دیکھنا ہے تو چین ہندوستان، دنیائے اسلام پر نظر ڈالئے۔ اسی طرح

قیاصرہ کے زمانہ میں روم و یونان کا قدیم تمدن بظاہر جوانی کی آن بان سے موجود تھا اور مشرق کے نوجوان عربی تمدن سے ہوا اور روشنی حاصل کرتا تھا۔

تاریخ میں تمدنوں کے زوال کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان سب کا راز یہی ہے کہ اندرونی اور بیرونی حیثیت سے پختہ اور مکمل ہو جانے کے بعد انحطاط شروع ہوتا ہے۔ یہ دن ہر زندہ تمدن کو دیکھنا پڑتا ہے۔ ان میں سب سے واضح مثال ہمارے سامنے یونانی رومی تمدن کی ہے اور ہم ایک دوسرے زوال کی جو بیسویں صدی کے ابتدائی صدیوں میں رونما ہوگا یعنی "زوال مغرب" کی ابتدائی علامتیں اپنے اندر اور اپنے گرد دیکھ رہے ہیں جو زمانہ اور ترتیب کے لحاظ سے تمدن قدیم کے زوال سے بالکل مشابہ ہوگا۔

ہر تمدن شخص واحد کی طرح عمر کی مختلف منازل سے گزرتا ہے ہر تمدن کے لئے بچپن جوانی، سن کہولت اور بڑھاپا ہوتا ہے۔ ایک نوجوان، حجاب آگیں، روح جو حقیقت کی جھلک پردے میں سے دیکھتی ہے رومانی طرز زندگی اور گوتھک طرز تعمیر رکھتی ہے . . . . . جس سرزمین میں یہ رہتی ہے اس میں موسم بہار کی ہوائیں چلتی ہیں۔ گوئٹے کہتا ہے "پرانے جرمن طرز تعمیر کے نمونوں میں ایک غیر معمولی تمدن کا شباب نظر آتا ہے جو شخص ایک پودے کے اندرونی پراسرار زندگی کا غور سے مطالعہ کرتا ہے کہ کس طرح اس کی قوتوں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور کس طرح آہستہ آہستہ پھول بنتا ہے وہ اس معاملہ کو دوسری آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے اسے سمجھتا ہے" اسی طرح ہومر کے ابتدائی زمانہ کی ڈورک موسیقی آخری مسیحی یعنی ابتدائی عربی دور کے فنون لطیفہ اور ان صناعی کے نمونوں سے جو مصر کی قدیم سلطنت میں چوتھے خاندان کے زمانہ سے ظہور میں آنے لگے صاف بچپن ظاہر ہوتا ہے۔ وہاں دنیا کا اساطیری احساس نفس اور فطرت کی ہر تاریکی کو ایک جرم سمجھتا ہے اور اس سے برسرپیکار رہتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ اس کی تیاری کرے کہ زندگی کو جان بوجھ کر قابو میں لائے اور خالص روشنی میں بسر کرے جوں جوں کوئی تمدن اپنی زندگی کی دوپہر سے قریب ہوجاتا ہے اس کی معینہ "صورت"

میں زیادہ مردانگی بختی ، ضبط اور سیرابی پیدا ہو جاتی ہے احساس قوت بڑھتا جاتا ہے اور
اُس کے خد و خال نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ سب چیزیں دھیمی اور دھندلی تھیں اور ان
پر بچوں کی طرح آرزو اور خوف کا عالم طاری تھا۔ سیکسنی اور جنوبی فرانس کے پرانے گرجوں کے
مخلوط رومانی اور گوتھک طرزِ تعمیر کو دیکھئے اور قدیم مسیحی تحت ارضی مقبروں وغیرہ کو یاد کیجئے۔
وسطی سلطنت کے آغاز کے زمانے ، . . . جسٹینین اول کے عہد ، اصلاح مذہبی کے ردِ عمل کے
دور کو مشاہدہ کیجئے تو اب جب کہ قوتِ تشکیل کا احساس پختہ ہو چکا تھا یہ نظر آنے گا کہ طرز
تعمیر کے ہر جزوی پہلو میں انتخاب ، صحت ، تناسب سے کام لیا گیا ہے اور عجب طرح کا اطمینان
اور بے تکلفی ٹپکتی ہے۔ اس زمانہ میں سب کہیں تکمیل کے روشن نمونے نظر آتے ہیں مثلاً
. . . . . ٹیشین کی تصویریں۔ اس کے بعد . . . . . ڈریسڈن کی عمارتوں
واٹو کی تصویروں اور موزارٹ کی موسیقی میں وہ نزاکت اور باریکی نظر آتی ہے جو اکتوبر
کے آخری دنوں کی دلکشی اور حسرت سے مشابہ ہے۔ آخر کار تمدن کے بڑھاپے میں جو شروع
ہو رہا ہے روح کی آگ بجھ جاتی ہے۔ گھٹتی ہوئی قوت پھر ایک بار جرات کرتی ہے کہ قدیم
تمدن کو زندہ کرے (اس کی مثالیں ہر تمدن میں ملتی ہیں) اور کوئی بڑا کارنامہ دکھائے لیکن
اس میں اسے بہت محدود کامیابی ہوتی ہے۔ روح نہایت حسرت کے ساتھ
اپنا بچپن کا زمانہ یاد کرتی ہے اور اسکا اظہار رومانی تحریک سے ہوتا ہے آخرکار
وہ تھک کر اور ہار کر لطف زیست کھو دیتی ہے اور (جس طرح قیاصرہ روم کے زمانہ میں ہوا تھا) یہ آرزو
کرتی ہے کہ ہزار سال کی روشنی کے بعد پھر اسی روح اولیٰ کی باطنی پراسرار زندگی میں آغوش مادر میں
یعنی قبر میں واپس جائے۔ یہی احیائے مذہبیت کا عمل تھا جس نے یونانی تمدن کے آخری زمانہ میں آئسیس
متھراس اور رسول کے پرستاروں کو پیدا کیا۔ یہ وہ مذاہب تھے جن کے ذریعے سے کسی زمانہ میں مشرق کی
ایک نوخیز روح (مصری تمدن) نے اپنے احساس تنہائی کا خواب آسا اور پرخوف اظہار کیا تھا اور
جس نے ان میں ایک نئی معنویت پیدا کر دی تھی۔

تنقید و تبصرہ

نکات رموزی

شائع کردہ "کتابستان" فرنگ لاہور۔ حجم ۱۲۶ صفحات سائز ۲۲×۲۰، قیمت عہ لکھائی چھپائی اچھی، کاغذ اوسط درجہ کا۔

کسی قوم کے ادبی مذاق کی صحت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے ذوق ظرافت کو دیکھئے۔ اگر اسے بے تکلف، ستھری، معنی خیز ظرافت پسند ہو تو سمجھئے کہ وہ اعلیٰ ادب کے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے لیکن اگر اُس کی ظرافت میں آورد، بازاری پن یا محض تمسخر ہو تو ظاہر ہے کہ وہ ذہنی تہذیب سے محروم ہے اور سچے ادب کا لطف نہیں اٹھا سکتی۔ ہمارے ملک کی دماغی پستی کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ عموماً ظرافت کے نام سے سفاہت کے بدترین نمونے پیش کئے جاتے ہیں جنہیں عوام بلکہ بعض خواص بھی مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ اس کلیہ کے بعض استثنا بھی ہیں۔ ملا رموزی صاحب بھی ان معدودے چند لوگوں میں سے ایک ہیں جنہیں خدا نے یہ جوہر عطا کیا ہے کہ زندگی کے اہم مسائل پر سچی اور پاکیزہ ظرافت کے انداز میں بحث کرتے ہیں اور اپنے ناظرین کو ایک طرف تو ہنسا کر خوش کرتے ہیں اور دوسری طرف غور و فکر کی ترغیب دیتے ہیں۔ مصنف کے بعض مضامین کا مجموعہ نکات رموزی کے نام سے شائع ہوا ہے اور اسمیں متعدد مضامین ایسے ہیں جن کے پڑھنے سے واقعی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں اور پھر لطف یہ کہ ہنسی ہنسی میں انسان ملا صاحب کی "رائے" جو عموماً سچی ہوئی ہوتی ہے معلوم کر سکتا ہے۔ اور خواہ اُس سے اتفاق کرے یا نہ کرے اس کی قدر کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

تعلیم و تربیت - دکمیٹی ماہرین تعلیم آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علیگڑھ کا سہ ماہی رسالہ۔ زیرادارت

ڈاکٹر ظفر الحسن پی ایچ ڈی، ڈی فل۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے پی ایچ۔ ڈی اور خواجہ غلام السیدین صاحب ایم ایڈ علی گڑھ سے شائع ہوتا ہے۔ حجم ۵۰ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اوسط درجہ کا۔ چندہ سالانہ صہ/

خدا کا شکر ہے کہ تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کی مدت کی آرزو پوری ہوئی اور ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے ایک ایسا رسالہ نکلا جو مسلمانوں کے بہترین تعلیمی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔ مسلمانوں نے پچھلے سال میں تعلیم کے لئے بہت کچھ تگ ودو کی لیکن چونکہ ان کی کوششیں کسی اصول کے ماتحت نہ تھیں اور ان کا عمل غور و فکر پر مبنی نہ تھا اس لئے نتائج کچھ قابل اطمینان نہ نکلے۔ اب اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ مسلمان تعلیمی مسائل پر علمی نقطہ نظر سے غور کریں اور خوشی کی بات ہے کہ ایک حد تک ایسا ہو بھی رہا ہے۔ رسالہ تعلیم و تربیت کا پہلا نمبر اس بات کی کافی شہادت ہے کہ مسلمانوں میں بعض افراد واقعی تعلیم پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور مجموعی زندگی کی نسبت سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ رسالہ میں حسب ذیل مختلف عنوانات ہیں۔

۱۔ مضامین خاص
۲۔ نئے تعلیمی تجربات
۳۔ اقتباسات
۴۔ بزم معلمین
۵۔ شذرات

ان کی تحت میں بارہ تیرہ مضامین جو تقریباً سب کے سب نہایت مفید اور دلچسپ سلیقہ اور ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ ہم کانفرنس کو اس رسالہ کے اجراء پر مبارکباد دیتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تمام معلمین اور محبان تعلیم اس رسالہ سے استفادہ کریں گے۔

ہماری اشاعت۔ (سلسلہ انجمن ترقی اردو) مصنفہ سید

اسے۔ حجم ۱۴۴ صفحہ لکھائی چھپائی بہت نفیس ہر صفحہ کے گرد سرخ بیل کی جدول۔ کاغذ عمدہ
قیمت دو روپے)

اردو زبان میں اب تک شاعری کی حقیقت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں غالباً علاوہ مولانا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری اور مولانا شبلی کے مختلف مقالات کے جو شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر میں ملتے ہیں کوئی مستند چیز موجود نہیں۔ خصوصاً ان اعتراضات کے جواب میں جو اہل مغرب یا مغرب پرستوں کی طرف سے اردو شاعری پر کئے جاتے ہیں کوئی معقول بحث ابتک دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی سارے قدردانان اردو کے دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے "ہماری شاعری" کے نام سے ایک ایسی کتاب لکھدی ہے جسے ہم بے تکلف یوروپ کے بہترین نقادوں کی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں شاعری کی عام ماہیت سے محققانہ بحث کی گئی ہے اُس کے بعد یہ دکھایا گیا ہے کہ اُردو شاعری اپنے نظری اور تمدنی ماحول کے اثر سے کیا خصوصیات رکھتی ہے۔ کتاب کے اصل حصہ میں مصنف نے اُن اعتراضات کو ایک ایک کرکے جانچا ہے جو عام اردو شاعری پر کئے جاتے ہیں اور یہ ثابت کیا ہے کہ ان میں سے اکثر اعتراضات شاعری کی حقیقت سے ناواقفیت اور یوروپ کی کورانہ تقلید پر مبنی ہیں۔ آخر میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ہدایت کی ہے کہ انہیں اردو شاعری کے مطالعہ میں کن باتوں کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ادب اردو میں ایسا گراں قدر اضافہ ہے جس سے کسی با مذاق شخص کا کتب خانہ خالی نہ رہنا چاہئے۔

اُرِف اختر۔
[illegible] قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی۔ حجم ۶۰ صفحہ لکھائی چھپائی اچھی کاغذ اوسط

تعلیم و تربیت۔ (کمیٹی ماہرین ذیل پتہ پر مل سکتی ہے۔

اختر منزل۔ قاضی واڑہ۔ جوناگڑھ۔ کاٹھیاوار

قاضی احمد میاں صاحب ان باکمال لوگوں میں سے ہیں جو نظم و نثر پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ یہ مختصر مجموعہ جس میں غزلیں۔ مختلف قطعات۔ مسلسل نظمیں اور بعض مشہور انگریزی نظموں کے ترجمے شامل ہیں نہایت دلچسپ اور قابل مطالعہ ہے۔ خصوصاً انگریزی نظموں کے ترجمے نہایت خوبی سے کئے گئے ہیں۔

استقلال حجاز

مصنفہ اسمٰعیل غزنوی صاحب۔ حجم ۲۰ صفحہ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں

اس کتاب میں ان اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں جو حسین سابق شریف مکہ کے طرفدار ابن سعود کی حکومت پر کرتے ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ اسمٰعیل غزنوی صاحب امرتسر۔

ہنر مند (ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت شیخ محبوب الٰہی صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی پلیڈر لاہور۔ حجم ۴۸ صفحہ۔ قیمت سالانہ ؎)

یہ رسالہ تجارت صنعت و حرفت اور زراعت کی عملی تعلیم دینے کے لئے جاری کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو وہ تدابیر بتاتا ہے جس کے ذریعہ وہ "قومی تنزل اور ادبار" کو دور کر کے خوشحال اور باعزت زندگی بسر کر سکیں۔ ہماری موجودہ حالت کے لحاظ سے یہ رسالہ محض صنعت پیشہ لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ہر شخص کے لئے مفید ہے۔ مضامین اچھے ہیں مگر انکی ترتیب اور رسالہ کی لکھائی چھپائی میں زیادہ اہتمام کی ضرورت ہے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر رسالہ ہنر مند حویلی کابلی مل لاہور۔

امداد باہمی۔ (ماہوار اقتصادی رسالہ زیر ادارت شیخ یعقوب علی عرفانی حجم بڑی تقطیع کے ۴۰ صفحہ۔ لکھائی معمولی۔ چھپائی اچھی۔ کاغذ اوسط درجہ کا۔ قیمت سالانہ ؎ مقام اشاعت تراب منزل

قادیان)

اس رسالہ کا مقصد بھی مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی اصلاح ہے۔ اس کے مضمون نگاروں میں خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کے سے لوگ موجود ہیں جن کے نام سے اردو رسائل کے ناظرین بہ خوبی واقف ہیں۔ مضامین تقریباً سب اچھے ہیں اور ترتیب بھی مناسب ہے مگر باوجود ان سب خوبیوں کے چھ روپیہ چندہ کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

زمانہ (جوبلی نمبر)

زمانہ اردو کے مایہ ناز رسالوں میں سے اور اس اعتبار سے بھی خصوصیت رکھتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے پچیس سال پورے کئے ہیں۔ جوبلی نمبر میں ہندوستان کے بہترین مضمون نگاروں کے ۲۵ مضامین اور مشہور شعرا کی ۴۵ نظمیں اور ۶۵ مختلف تصویریں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض رنگین ہیں۔ تصویریں زیادہ تر اردو کے ممتاز شعرا اور مصنفین کی ہیں۔ اور ہمارے ملک کے بہترین نقاشوں کی صناعی کے کچھ نمونے بھی ہیں۔ رسالہ کا مجموعی حجم ۲۱۶ صفحہ ہے۔ ان سب خوبیوں کے مقابلہ میں عہ قیمت بہت کم ہے۔

مخزن (سالگرہ نمبر)

بڑی تقطیع کے ۱۶۰ صفحہ پر لکھائی معمولی چھپائی اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۱۴ر

مخزن کے دور جدید کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بہت اچھے افسانے اور پاکیزہ نظمیں شائع ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیت سالگرہ نمبر میں بدرجہ اولی موجود ہے۔ کل مضامین ۲۸ ہیں مگر سب تنقید "تصویریں صرف چار ہیں دو آرٹ کی دو مشاہیر ادب کی" یہ شاید کسی کے نزدیک قابل اعتراض بات ہو مگر ہمارے خیال میں مدیر کی خوش مذاقی کی دلیل ہے۔

شذرات

اردو اکادمی کے ممبروں کی تعداد میں اس مہینہ میں بہت کم اضافہ ہوا اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ رمضان کے سبب سے حامیان اکادمی کو فرصت نہیں ملی کہ ممبروں کے بنانے کی کوشش کریں۔ رمضان کے بعد اجمل میموریل فنڈ کے سلسلہ میں جس کا نام اب جامعہ اجمل فنڈ قرار پایا ہے صوبہ متحدہ کے بعض حصوں میں مثلاً بنارس، غازی پور، جونپور، اعظم گڈھ، مرادآباد بجنور، بریلی، شاہجہانپور وغیرہ میں جامعہ کا وفد جائے گا اور ان اطراف میں ارباب ذوق کو ممبر بنانے کی کوشش ہوگی۔

وہ دونوں کتابیں جن کا پچھلے پرچہ میں ذکر کیا گیا تھا یعنی تفسیر پارہ عم موسوم بہ ذکرے اور عربوں کا تمدن تیار ہیں اور اس پرچہ کے پہونچنے سے پہلے ممبران اکادمی کو پہونچ جائیں گی بعض حضرات کو ان کے اصرار پر ذکرے کی جگہ سال گزشتہ کی مطبوعات میں سے تاریخ فلسفۂ اسلام بھیجی جا رہی ہے اگر اتفاقاً کسی ممبر کو اس پرچہ کے پہونچنے تک دو کتابیں اکادمی کی طرف سے نہ پہونچی ہوں تو توقع ہے کہ فوراً اس کی اطلاع دیں گے تاکہ تحقیقات کی جائے کہ نہ پہونچنے کا کیا سبب ہے اور کتابیں دوبارہ بھیجی جاسکیں۔

ہم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کے بہت ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری اس کوشش میں کہ ہر مہینہ کا جامعہ اسی مہینہ کے آغاز میں شائع ہو جائے۔ ہماری بڑی مدد کی۔ موصوف نے اپریل کے پرچہ کی ترتیب اپنے ذمہ لے لی ہے اور اب امید ہے کہ مارچ کا پرچہ حسب معمول ۸ اپریل تک شائع ہونے کے بعد اپریل کا پرچہ قارئین کرام کو ۱۵ اور ۲۰ اپریل کے درمیان

پہونچ جائے گا اور مئی کا انشاء اللہ ۸ رمئی تک نکل سکے گا۔

جامعہ اہل فنڈ کا جو چندہ دہلی میں ہو رہا تھا اس میں وعدوں کی تعداد تیس ہزار روپے تک پہنچ گئی ہے۔ رمضان کے سبب سے وصولی میں پوری کوشش نہ ہو سکی۔ پھر بھی پانچ ہزار سے زیادہ نقد وصول ہو چکا ہے اور بقیہ میں سے انشاء اللہ ایک معقول حصہ آئندہ ماہ میں وصول ہو جائے گا۔ رمضان کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں میں دورہ کا سلسلہ شروع ہوگا اور امید ہے کہ ہر شہر دہلی کا مقابلہ کرنے بلکہ اس سے سبقت لے جانے کی کوشش کریگا۔

رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا رسالہ رقمطراز ہے کہ پروفیسر اے۔ جے۔ ونسنک نے جو لائیڈن یونیورسٹی میں السنہ سامیہ کے پروفیسر ہیں حدیث کی ایک انڈکس شائع کی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس عظیم الشان کام کا حوصلہ کیا ہے کہ یوروپ کے محصلین علوم اسلامی کے لئے احادیث کا ایک مکمل مجموعہ شائع کریں۔ یہ انڈکس اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مؤلف نے کمال عرق ریزی سے یہ انڈکس تیار کی ہے اور یہ التزام کیا ہے کہ ہر حدیث کا ماخذ بھی معلوم ہو جائے۔ اس اعتبار سے یہ ابن اثیر کی نہایہ سے زیادہ مفید ہے۔ حدیث کے مطالعہ کو آسان کرنے میں اس کتاب کا وہی حصہ ہے جو ڈاکٹر اسٹینن کی انڈکس کا قرآن کے بارے میں ہے۔ یہ کتاب لائیڈن کے بریل کے مشہور مطبع نے شائع کی ہے۔

اسی رسالہ میں ڈاکٹر یعقوب صروف مرحوم مدیر المقتطف کی زندگی کے حالات شائع ہوئے ہیں۔ ان کی ولادت ۱۸ رجولائی ۱۸۵۲ء کو لبنان میں ہوئی اور انہوں نے بیروت کی امریکن یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور ۱۸۷۰ء میں بی۔ ایس۔ سی کا امتحان پاس کیا۔ پہلے وہ چند سال

تک شام وغیرہ میں امریکن کالجوں میں لکچرار اور پرنسپل تھے۔ پھر بیروت کی یونیورسٹی میں ریاضی اور سائنس کے پروفیسر ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو ہر طرح کا سائنس کا تجربہ خواہ وہ کیسا ہی خطرناک کیوں نہ ہو دکھلانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔ اس عرصہ میں انہوں نے کیمیا وغیرہ پر کتابیں لکھیں اور بہت سی مفید انگریزی اور فرانسیسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جس میں ایک حد تک ڈاکٹر فریس نمر بھی ان کے شریک تھے۔ سب سے زیادہ شہرت انہوں نے بحیثیت مدیر مقتطف حاصل کی۔ یہ رسالہ انہوں نے اور ان کے دوست نے [illegible]ء میں بیروت سے جاری کیا [illegible]ء میں یہ دونوں بیروت سے قاہرہ چلے گئے اور [illegible]ء میں جب روزانہ مقطم جاری ہوا تو ڈاکٹر فریس نمر اس کے مدیر ہو گئے اور یعقوب صروف مقتطف کا کام کرتے رہے۔ مقتطف انگلستان کے مشہور رسالہ "نائنٹینتھ سینچری" کے نمونہ پر نکالا گیا تھا اور اکثر اس کے مضامین ترجمہ کرکے شائع کرتا تھا۔ اس کے سبب سے مصر اور شام کے لوگوں کو مغربی علوم و فنون سے بہت اچھی واقفیت ہو گئی اور اس نے عربی زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔

انجمن اقوام کے ادارہ اتحاد ذہنی سے ہمیں کئی رسالے موصول ہوئے ہیں جو اس ادارہ کی طرف سے شائع ہوتے ہیں۔ ہم کسی پچھلی اشاعت میں اپنے خیالات اس ادارہ کے متعلق کہہ چکے ہیں۔ پھر بھی قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ادارہ کی کچھ مختصر کیفیت اور اس کے مقاصد بیان کر دئے جائیں۔ انشاء اللہ مئی کے پرچہ میں ہم ایک مضمون اس کے متعلق شائع کریں گے۔

دہلی میں پچھلے مہینہ آل انڈیا خواتین کانفرنس زیر صدارت ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ منعقد ہوئی جس میں تمام ہندوستان کی ممتاز خواتین شریک ہوئیں مختلف مسائل

پر ضمنا تعلیم نسواں پر قابل قدر تقریریں کی گئیں اور مفید تحریکیں پاس ہوئیں۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک کی خواتین میں اتنی بیداری پیدا ہو گئی ہے کہ وہ خود اپنی فلاح و بہبود کی تحریکوں پر غور کرتی ہیں۔ لیکن ہمیں ان سے یہ عرض کرنا ہے کہ بیشک کانفرنس مفید چیز ہے لیکن اس کا فائدہ بہت محدود ہے۔ موجودہ صورت میں اس کا اصل مقصد تبادلہ خیالات ہے اور اس کی بیشک ہماری خواتین کو بہت ضرورت ہے لیکن اس تبادلہ خیالات سے جو نتائج نکلتے ہیں اُن کو عملی جامہ پہنانا بھی بہت ضروری ہے ورنہ خواتین کی کانفرنس کا بھی وہی حال ہو جائے گا جو مردوں کی بہت سی کانفرنسوں کا ہے۔ ہم کانفرنس کو بصد ادب یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ یا تو خود عورتوں کی اصلاح اور ترقی کے لئے مفید تحریکیں کرے یا جو تحریکیں پہلے سے موجود ہیں انہیں اپنی نگرانی میں لے تاکہ اُس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ کانفرنس کو ایک شعبہ اشاعت قائم کرے جو اہل فکر سے خواہ وہ عورتوں میں سے ہوں یا مردوں میں سے ایسے مسائل پر جو خواتین کے لیے اہمیت رکھتے ہیں رسائل اور مضامین لکھوائے اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ جن چیزوں پر اب فوری جوشش اور عارضی جذبات کے ساتھ نظر ڈالی جاتی ہے ان کا غور و فکر اور دل آویزی کے ساتھ مشاہدہ کیا جا سکے۔ اس طرح ترقی پسند خواتین کو خود اپنے خیالات واضح کرنے کا موقع ملے گا اور دوسروں میں اُن کے مقاصد کی اشاعت بھی ہو سکے گی

ہم عصر ماڈرن ریویو نے ڈی۔ ڈی اوک صاحب پروفیسر ولبرفورس یونیورسٹی ولبرفورس، اوہیو ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک تحریر شائع کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں۔

کہ وہ آج کل اپنی کتاب "ہندوستان میں انگلستان کی تعلیمی پالیسی" پر نظر ثانی کر رہے ہیں انھیں ہندوستان کی جدید تعلیمی تبدیلیوں سے واقفیت نہیں ہے اس لئے وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ انہیں ایسی کتابوں، رسالوں رپورٹوں کے نام بھیجیں جن کے ذریعہ سے ہندوستان کے پچھلے چند سالوں کے تعلیمی انتظامات سے واقفیت ہو سکے یا ممکن ہو تو یہ چیزیں پروفسر صاحب کو بھیجدیں۔ اس کتاب میں یہ اضافہ کیا جائے گا کہ ہندوستان کی قومی تعلیم پر اور بعض دوسرے ملکوں خصوصاً امریکہ کے تعلیمی نظام پر تفصیل سے نظر ڈالی جائے گی۔ ہمیں امید کہ ہمارے ناظرین میں سے جو حضرات پروفسر صاحب کی مدد کر سکتے ہیں وہ اس میں بخل نہ کریں گے۔

پروفسر جادوناتھ سرکار کے خطبہائے صدارت عموماً قابل غور اور قابل قدر ہوتے۔ حال میں موصوف نے کلکتہ یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں یونیورسٹی کے مقاصد پر محققانہ نظر ڈالی اور نہایت خوبی کے ساتھ یہ بیان کیا کہ اعلیٰ تعلیم بنی نوع انسان کو تمدنی زندگی کی تشکیل میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔ پروفسر صاحب نے فرمایا کہ یونیورسٹی کا پہلا مقصد یہ ہے کہ قوم کے لئے قائد پیدا کرے جو زندگی کے پیچ در پیچ راستوں میں اس کی راہنمائی کر سکیں اُسکا فرض ہے کہ قابل نوجوانوں کو خواہ وہ کسی طبقے کے ہوں ابھارے اور اقتدار اور ذمہ داری کی بلندیوں پر پہنچائے تاکہ حقیقی مساوات قائم ہو سکے، دوسرا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں سے فرقہ وارانہ تعصبات کو دور کر کے اُن میں وہ اعلیٰ اور شریفانہ جذبہ پیدا کرے جو "انسانیت" کہلاتا ہے۔ تاکہ وہ دنیا کے تمام مہذب لوگوں سے اتحاد ذہنی پیدا کر سکیں۔ اور تیسرا (اور غالباً سب سے اہم) مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں میں صحیح تربیت سے ایسا ضبط نفس پیدا کیا جائے کہ وہ کسی خواہش، کسی جذبے، کسی جوش سے متاثر ہو کر حق و باطل کے فرق کو نظر انداز نہ کریں۔

آخر میں پروفسر صاحب نے حسب معمول نوجوانوں کو اس خطرہ سے آگاہ کیا جو قوم پرستی

کے غلط معنی سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ طلبہ کو چاہئے کہ وہ قوم پرستی نے سے سودہکر اپنی تعلیم کو ادھورا نہ چھوڑ دیں کیونکہ سچا قوم پرست اور خادم ملک بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان پہلے کسی قابل ہو جائے۔

جو باتیں پروفیسر صاحب نے بیان فرمائی ہیں اُن سے کوئی سمجھدار آدمی اختلاف نہیں کر سکتا البتہ جن باتوں سے انہوں نے عمداً یا سہواً چشم پوشی کی ہے ہم ان کی طرف موصوف کو توجہ دلاتے ہیں۔ جہاں آپ نے تنگ خیالی کو ترک کرنے اور وسیع عالمگیر ذہنی اتحاد کی کوشش پر زور دیا ہے وہاں اس پہلو پر بھی نظر ڈالتے کہ فرد کی تہذیب نفس کے لئے اپنے قومی تمدن کا احترام و اپنی قوم کی محبت کس حد تک ضروری ہے۔ اسی طرح جہاں آپ نے طلبہ کو یہ نصیحت فرمائی ہے کہ قوم پرستی کے جوش میں تعلیم کو ترک نہ کریں وہاں یہ کہنا بھی ضروری تھا کہ تعلیم کے نشے میں اسے نہ بھول جائیں کہ وہ ایک جماعت کے افراد ہیں جس کی فلاح اور بہبود ان کی ساری زندگی کا نصب العین ہے یا ہونا چاہئے کیونکہ ایسے طلبہ جو قوم کی محبت میں بجا یا بیجا طور پر اپنے مدرسے چھوڑ دیں کم ہیں اور ایسے جو صحیح یا غلط تعلیم کے غرور میں قوم کو بالکل بھلا دیں زیادہ ہیں۔

شمع
ملاحظہ فرمائیے

کیا جناب کو علم و ادب کا ذوق ہے ؟
کیا جناب کو سیاست سے دلچسپی ہے ؟
کیا جناب کو تاریخ سے شوق ہے ؟
کیا جناب اپنی زبان میں یوروپ کا لٹریچر دیکھنا پسند کرتے ہیں ؟
کیا جناب ہندوستان کے بہترین شعرا کا پاکیزہ کلام ہر ماہ دیکھنا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب اخلاقی و تمدنی مضامین سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب اعلیٰ پیمانہ کے افسانوں سے نیک سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب زمانہ کی جدید ترین ترقیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب جدید ترین معلومات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب مصوری کے لاجواب نمونے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں ؟
کیا جناب تاریخی اور کمیاب تصاویر کے شائق ہیں ؟
کیا جناب اپنے فاضل وقت کو بہترین مشغلہ میں صرف کرنا چاہتے ہیں ؟

اگر آپ ان میں سے ایک بھی خواہش کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو رسالہ "شمع" کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اور آج ہی ۱۰ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب فرمائے۔ لکھائی چھپائی بہترین چندہ سالانہ ۶ ششماہی [illegible] ہے۔ جنوری [illegible]ء سے مصوری کے بہترین نمونوں کے شاہان اودہ کی نہایت قیمتی اور جمیل تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

منیجر رسالہ شمع ، حسن منزل شاہ گنج آگرہ

اعلان

جامعہ ملیہ کا "شعبۂ تصنیف و تالیف" جو بیا انتظام کے بعد "اردو اکادمی" کہلاتا ہے "اکادمی" کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان میں مختلف علوم و فنون پر مستند کتابیں لکھوا کر شائع کرے۔ اب تک یورپ کی مختلف زبانوں سے بہترین کتابوں کے چند تراجم اور متعدد اوریجنل تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ [illegible] کے [illegible] کیا گیا ہے کہ کم سے کم چھ نئی کتابیں ہر سال لکھی جائیں "اکادمی" نے اپنے قدردانوں کی آسانی ار [illegible] امداد کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ طے کیا ہے کہ جو حضرات [illegible] روپیہ سالانہ اکادمی کو عطا فرمائیں ر[illegible]س کے رکن قرار دئے جائیں اور انکی خدمت میں رسالہ "جامعہ" اور "اکادمی" کی سال بھر کی جملہ مطبوعات نذر کے طور پر پیش کی جائیں۔

زرچندہ کی وصول کا یہ طریقہ ہے کہ ہر سہ ماہی کے شروع میں [illegible] کا وی پی بھیجا جائے گا اور اس کے وصول ہونے پر ہر رکن کے نام رسالہ "جامعہ" ماہوار بھیجا جائیگا اور "اکادمی" کی جو کتاب تیار ہوگی وہ فوراً روانہ کیجائیگی، اگر کسی سہ ماہی [illegible] ڈاک کا وی پی وصول نہ کیا گیا اور واپسی کے پندرہ دن کے اندر زرچندہ منی آرڈر سے نہ پہنچا تو مجبوراً رسالہ جامعہ اور کتابوں کی روانگی بند کردی جائیگی۔

اسکا خیال رکھا جائیگا کہ رسالہ جامعہ اور سال بھر کی مطبوعات کی مجموعی قیمت [illegible] سے کم نہ ہو۔ اس کے علاوہ پندرہ روزہ رسالہ "پیام تعلیم" جس کی سالانہ قیمت [illegible] ہے تحفۃً ہر رکن کی خدمت میں حاضر ہوگا۔ جو صاحب ان شرائط پر "اکادمی" کا ممبر بننا منظور فرمائیں وہ اپنا نام معہ پورے پتہ کے مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ فرمائیں۔

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

ناظم اردو اکادمی جامعہ ملیہ قرولباغ۔ دہلی

مطبوعات جدیدہ

عربوں کا تمدن ([illegible])

جس پروفیسر سیونک یونیورسٹی نے عربی تمدن پر ایک مختصر مگر جامع کتاب شائع کی تھی جس کا انگریزی ترجمہ ہر جگہ مقبول ہوا۔ دنیا کی کسی زبان میں تمدن اسلام پر کوئی ایسی مختصر و مفید تصنیف موجود نہیں جسمیں جدید ترین تحقیقات کی بنا پر تمام ضروری معلومات کو۔ تمام وہ حضرات جو مسلمانوں کے قدیم علمی وعملی کارناموں کے مطالعہ کا شوق رکھتے ہیں اس کو اپنے لئے غیر معمولی طور سے مفید پائیں گے۔ مترجم نے کتاب کی قدر نہایت مفید ضمیمہ لکھکر اور بڑھادی ہے۔ یہ تاریخ اسلام پر اپنی جگہ یوں بھی نہایت محققانہ اور بصیرت افروز مقالہ کی حیثیت رکھتا ہے

قیمت صرف دو روپے

ذکری تفسیر پارہ عم جس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے۔ مصنفہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر و ناظم دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ خواجہ صاحب کا سلسلہ تفسیر "الفرقان فی معارف القرآن" کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ یہ کتاب بھی اسی مفید سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں پارہ عم کی تفسیر مصنف نے اپنے مخصوص انداز میں امت اسلام کے لئے پیش کی ہے

قیمت صرف تین روپے (۳ عمر)

تاریخ الامت (حصہ ششم) مصنفہ مولانا اسلم صاحب جیراجپوری۔ اس حصہ میں عباسیہ مصر کی مکمل تاریخ اُنکے اس زمانہ تک کی ہے جبکہ خلافت اُنکے ہاتھوں سے نکل کر آل عثمان کو منتقل ہوگئی تھی۔ شروع میں مختصر طور پر طوفان نوح سے لیکر عباسیہ مصر کی ابتدا تک مصر کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے مصر قدیم کی تاریخ سے بھی واقف ہوجائیں

قیمت صرف دو روپے (عـ۲)

مکتبہ جامعہ قرولباغ۔ دہلی

ضلع لاڑکانہ کا یہ مقام[1] جہاں سے یہ چیزیں برآمد ہوئی ہیں، ایک بہت غیر معروف اور گمنام خطہ ہے۔ اب سے پیشتر کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوا تھا کہ یہاں کسی عالیشان قدیم تہذیب و تمدن کے آثار مدفون ہیں، البتہ روایتہً اس قدر مشہور ضرور تھا کہ اس طرف قدیم زمانہ میں کچھ لوگ بستے تھے جو تباہ اور برباد ہو گئے، اور اب اس طرف رُخ کرنا خود اپنی تباہی و بربادی کے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر صرف اس قدر پتہ چلتا تھا کہ بڑے بوڑھوں نے اس طرف جانے سے منع کیا ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس طرف جانے کی ممانعت رسول اکرمؐ نے کی ہے۔ غرض ایک تو خود اس علاقہ کا غیر معروف ہونا، دوسرے ان خطرناک روایات نے اس خطہ کو اور بھی قعر گمنامی میں ڈالدیا جس سے کوئی شخص اس کی طرف کبھی بھولے سے بھی نظر اٹھا کر نہ دیکھتا تھا۔ اسی حالت میں کسی مقامی ذریعہ سے محکمہ آثار قدیمہ کو یہ اطلاع ملی

---

[1] اسکے گمنام اور غیر معروف ہونے کا اس سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ ابتک اسکے صحیح نام کا ہمکو علم نہیں ہے۔ موہنجو دارو جو علمی طبقہ میں اس کا معروف نام ہے وہ سب سے پہلے اس کام کے شروع کرنیوالے کی ایک اپنی اختراع ہے جو انکے اس علاقہ کی زبان اور حالات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ایک سندھی دوست کا خیال ہے کہ یہ نام موہنجو ڈیرو ہو سکتا ہے اس لئے کہ شہروں کے نام وہاں اس قسم کے اکثر ہوتے ہیں۔ ڈیرو معنی ڈیرہ یا مستقر کے ہیں، اور موہنجو اُس والی یا [illegible] کا نام ہوگا جسکا وہ مستقر تھا، جسطرح صوبہ سرحدی کے بعض اضلاع کے نام ڈیرہ اسمٰعیل خاں، ڈیرہ غازی خاں [illegible] یہ توجیہ صحیح نہیں، موہنجو کے نام ہونے میں اب بھی وہی شک باقی ہے اور اگر یہ کسی شخص کا نام تسلیم بھی کر لیا [illegible] متعین ہے کہ یہ نام اس جگہ کا اس وقت بھی رہا ہو جب اس تہذیب و تمدن کا فروغ تھا۔ یہ ناممکن ہے [illegible] اصل نام اُس وقت سے چلا آتا ہو جبکہ خود وہاں کی ہر چیز تباہ و برباد ہو گئی ہو۔ زیادہ صحیح نام اس کا [illegible] ہو سکتا ہے، جو ایک دوسرے کرم کا خیال ہے۔ 'موئیو' کے معنی سندھی زبان میں 'مردے' کے ہیں۔ 'جو' [illegible] 'اور' 'دڑو' کے معنی 'ڈھیر' کے ہیں، گویا پورے لفظ کے معنی ہوئے 'مردوں کا ڈھیر' جسے انگریزی میں [illegible] mound of the [illegible] کہہ سکتے ہیں اور ان کھنڈرات و آثار کو دیکھتے ہوئے یہ زیادہ قرین قیاس ہے۔

کہ یہاں قدیم عمارات کے کچھ آثار نظر آ رہے ہیں۔ چنانچہ محکمہ کی طرف سے پہلے مسٹر بنرجی ایک بنگالی بھیجے گئے۔ بنگالی بابو کو سب سے پہلی اور نمایاں چیز ایک ستوپ نظر آئی جسے آپ نے موریا عہد کا قرار دیا اور اس سے بطور کلیہ یہ نتیجہ نکالا کہ اور یہاں پر جتنے آثار ہیں سب اسی عہد حکومت کے ہوں گے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد کھدائی کا مزید کام شروع ہوا اور اس وقت جو چیزیں برآمد ہوئیں، اُن سے مفتشین اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہاں قدیم زمانہ میں کسی بہت بڑے تمدن کا وجود تھا۔ غرض اب آخری بار سرجان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمہ آثار قدیمہ کی سرکردگی میں جو کام شروع ہوا ہے اُس میں بہت کثرت سے چیزیں نکلی ہیں اور اس آخری کوشش نے صاف طور پر لاکر لوگوں کے سامنے اس امر کو عیاں کردیا ہے کہ یہ تمدن ایک بہت بلند پایہ اور عظیم الشان تمدن ہے اور اس کا زمانہ حضرت مسیح سے کوئی تین ہزار سال قبل یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار برس پہلے ہے۔

ان کھدائیوں کے دوران میں یکے بعد دیگرے متعدد تہیں نکلی ہیں، جن میں سے ہر ایک تہ پر ایک ایک زمانہ کے آثار نکلتے ہیں۔ سب سے بالائی تہ پر موریا عہد کے آثار پائے جاتے ہیں، اس کے بعد دوسری اور تیسری تہ پر کشن کے زمانہ کی عمارتیں ہیں اور اسی طرح سب سے آخری تہ کی اشیا سب سے قدیم زمانہ کی نشانیاں ہیں۔ چیزیں جو عموماً زمین کے اندر سے نکلتی ہیں، وہ بالکل مسلم اور صحیح حالت میں ہوتی ہیں۔ موہنجو دڑو' میں چیزوں کی تعداد اگرچہ نسبتاً کم ہے لیکن وہ زیادہ صحیح و سالم حالت میں ہیں۔ برعکس اس کے ہڑپا میں چیزیں کثرت سے برآمد ہوئی ہیں لیکن زیادہ شکستہ اور غیر سالم حالت میں ہیں۔ 'موہنجو دڑو' میں جو آثار نکلے ہیں اُن کے متعلق مفتشین نے تین مستقل اور ایک دوسرے سے جدا گانہ شہر ہونے کا فیصلہ کیا ہے جنمیں سے پہلے سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا ابتر حالت میں ہے۔ تینوں شہر نہایت پکی ہوئی اینٹوں کے بنے معلوم ہوتے

لے یہ ایک گنبد نما عمارت ہوتی ہے جس کے اندر گوتم بدھ کی راکھ یا اُن سے منسوب اور دوسری یادگاریں بطور تبرک کے مدفون ہوتی ہیں اور اس وجہ سے یہ عمارت بودھوں میں مقدس و محترم سمجھی جاتی ہے۔

ہیں جنہیں عموماً مٹی کا اور کہیں کہیں کمر یا مٹی اور چونے کا گارا استعمال کیا گیا ہے۔ ان کی بنیادیں نہایت مضبوط اور انہیں دھوپ کی پکی ہوئی اینٹوں کی بھرائی کیگئی ہے۔ عمارات کے مختلف مجموعے جو نکلے ہیں ان سب میں ایک جھرمٹ خاص طور سے نمایاں ہے جو ستوپ کے قریب ہے۔ گمان یہ ہے کہ اس ستوپ کے اندر کوئی مندر رہا ہوگا جس میں گوتم بدھ کی مورتیاں ہونگی اور یہ عمارتیں اسی سے متعلق ہیں۔ ان عمارتوں میں خاص طور سے قابلِ ذکر ایک حمام یا حوض ہے جو مندر کے قریب پوجا پاٹ کی غرض سے نہانے دھونے کے لئے بنایا گیا ہوگا، نیز یہ بھی خیال ہے کہ اس میں مچھلیاں یا دوسرے پانی کے جانور رکھے جاتے ہوں گے جس کا قدیم ہندوستان میں اکثر دستور تھا۔ یہ حوض طول میں ۳۹ فیٹ، عرض میں ۲۳ فیٹ اور گہرائی میں کوئی ۸ فیٹ کے قریب ہے۔ اس کے چاروں طرف برآمدے بنے ہوئے ہیں، سامنے ایک چبوترہ ہے اور پشت پر کئی عمدہ چھوٹے اور بڑے کمرے بنے ہیں۔ باہر کی دیواریں جو چوڑائی میں ۸ فیٹ سے زیادہ ہے، جنوب کی جانب دو بڑے بڑے پھاٹک ہیں اور شمال و مشرق کی طرف کئی چھوٹے چھوٹے دروازے ہیں۔ اس عمارت کے مشرق کی جانب جو کمرے ہیں، ان میں بیچ کے کمرے میں ایک کنواں ہے جس سے اس حمام کا پانی آتا تھا۔ حمام کے دونوں سروں پر پانی تک جانے کے لئے زینے بنے ہوئے ہیں۔ اس کے فرش کی جوڑائی پختہ اینٹوں سے نہایت مضبوطی کے ساتھ کیگئی ہے۔ دیواروں کی تعمیر میں بھی جو چوڑائی میں تقریباً ۸ فیٹ ہیں نہایت ہوشیاری اور کاریگری سے کام لیا گیا ہے۔ ان دیواروں کی تعمیر کے تین حصے ہیں، اندر اور باہر دونوں جانب کی اینٹیں نہایت پختہ ہیں، درمیان کا تیسرا حصہ دھوپ کی پکی ہوئی اینٹوں سے بنا ہے۔ اس غرض سے کہ دیواروں کے اندر پانی نہ رسنے پائے اندر کی جانب اینٹوں کی جوڑائی بجائے مٹی کے چونے کے گا۔ ے سے کیگئی ہے مزید احتیاط کے لئے اندر کی جانب دیوار پر تقریباً ایک انچ موٹا ہنومن کا پلاستر بھی ہے۔ ایک اور خاص چیز جو اس حمام کے سلسلہ میں قابلِ ذکر ہے وہ نالی ہے جو ۶ فیٹ گہری اور اوپر سے ڈھکی ہوئی ہے اس کے ذریعہ تمام گندہ پانی شہر سے باہر بہ جاتا تھا۔

اس کے علاوہ عام رہنے کے مکانات کی بھی ایک بڑی تعداد نکلی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ امن و عافیت کے ساتھ یکجا رہتے سہتے تھے، ان مکانوں کے ساتھ گندگی اور غلاظت کو بہا لیجانے کے لئے متعدد ایک دوسرے سے ملی ہوئی نالیوں کا جو سلسلہ ہے، اُسے دیکھکر اُن کی معاشرت اور زندگی پر اور زیادہ حیرت ہوتی ہے ۔ مکانوں کا تمام گندہ پانی ان نالیوں کے ذریعہ گلی کی حوضوں میں چلا جاتا تھا، جہاں سے بھنگی نکالکر پھینکدیا کرتے تھے ۔

ہڑپا میں جو موہنجو دڑو سے کوئی ۴۰۰ میل شمال کی جانب واقع ہے، کھدائی کا کام اس سے زیادہ وسیع پیمانہ پر ہوا ہے ۔ یہاں یکے بعد دیگرے ۶ یا ۷ تہیں نکلی ہیں اور انہیں سے کوئی تیسری صدی قبل مسیح سے بعد کی نظر نہیں آتی ۔ یہاں جو چیزیں نکلی ہیں ان میں بعض بہ لحاظ زمانہ موہنجو دڑو کی چیزوں سے زیادہ قدیم اور دیرینہ معلوم ہوتی ہیں ۔ یہاں ایک تانبے کا بہت بڑا برتن نکلا ہے جس کے اندر بہت سے تانبے کے آلات اور ہتھیار ملے ہیں مثلاً ایک گرز کا سرا، دو دو رخی کلہاڑیاں، سات تیغے، دو نیزے کے سرے، ۱۶ بھالوں کے سرے، ۲۱ ٹانگیاں، ایک آرہ، دو ٹانگے اور ۱۳ ارکھانیاں ۔ ان میں سے دو تیغوں اور دو ٹانگیوں پر تصویروں کی شکل میں کچھ لکھا ہوا ہے

اسی ابتدائی تہ میں ۵۰۱ سے اوپر مہریں اور تختیاں بھی نکلی ہیں جن میں سے اکثر ان مہروں سے چھوٹی اور شکل میں مختلف ہیں جو اس سے پیشتر اوپر کی تہ پر پائی جا چکی ہیں ۔ ان مہروں اور تختیوں پر تصویروں کی شکل میں کچھ تحریریں ہیں جو اس سے پیشتر کبھی نہیں نظر آئی ہیں ۔ یہ مہریں اور تختیاں پتھر، ہاتھی دانت اور تانبے کی بنی ہوئی ہیں، شکل میں اکثر انہیں سے چوکور ہیں بعض گول اور بعض نصف گول ہیں ۔ ان مہروں کا عمونا رقبہ (۱ ملی میٹر = ۰۴ء) ۳۰ × ۳۰ ملی میٹر یعنی ۱٫۴۴ مربع انچ ہے اور حجم ۶ ملی میٹر سے لیکر ۱۰ ملی میٹر تک ہے ۔ انہیں سے ہر ایک کے اوپر کوندھا ہے جو تحریر کے اوپر عمودی شکل میں ہے ۔ اکثر مہروں پر جانوروں کی تصویریں ہیں جن میں سے بیل کی تصویر سب سے زیادہ نظر آتی ہے ۔ جن مہروں پر تحریر اور تصویر دونوں ہیں ان میں عبارت اوپر کی جانب ہے اور اس کے نیچے تصویر ۔ انہیں سے ایک مہر پر سب سے عجیب چیز جو پائی گئی

ہے وہ سات آدمیوں کا ایک جلوس[۵۱] ہے جو باقاعدہ طور سے کوٹ اور خود پہنے ہوئے ہیں اور ایک قطار میں داہنے سے بائیں کو چل رہے ہیں۔ ایک دوسری مہر پر ایک شخص مچان پر سے تیر کا نشانہ کر رہا ہے، ایک تیسری مہر پر ایک شخص جھنڈا لئے ہوئے اور جھنڈے پر جو نشان بنا ہے وہ ایک ناند کا ہے جس میں بعض اچھی مہروں میں جانوروں کو دانہ کھلایا جاتا ہے[۵۲]۔

ان مہروں کے علاوہ ایک اور عجیب وغریب چیز جو نکلی ہے، وہ تانبے کے برتن پر دو پہیوں کی ایک گاڑی کی تصویر ہے جو اوپر سے چھائی ہوئی ہے اور آگے گاڑی بان بیٹھا ہوا ہے۔ اب تک سمجھا جاتا تھا کہ پہیئے دار گاڑیوں میں رتھ سب سے پرانی قسم ہے جس میں چار پہیئے ہوتے ہیں لیکن اب اس جدید انکشاف سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے قدیم قسم کی گاڑی چار پہیوں کی نہیں بلکہ دو پہیوں کی گاڑی ہے۔

ہڑپا میں مکانات وغیرہ کی قسم سے اور بھی بہت سی چیزیں نکلی ہیں جنمیں سے اکثر زمانہ کی دستبرد سے نہایت خراب وخستہ ہو گئی ہیں لیکن ایک عمارت بالکل صحیح وسالم حالت میں نکلی ہے جو خاص طور سے قابلِ ذکر ہے اور جس کے مقابلہ کی موہنجودڑو میں ابتک کوئی عمارت نہیں برآمد ہوئی ہے۔ اس عمارت کا طول شمالاً وجنوباً ۱۶۸ فیٹ اور عرض شرقاً وغرباً ۱۳۶ فیٹ ہے۔ اس میں متعدد ہال ہیں جنکے آگے غلام گردشیں بنی ہوئی ہیں۔ اس عمارت کے طول وعرض کو دیکھکر یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہال غالباً غلہ یا اسی قسم کی دوسری چیزیں رکھنے کے لئے کھتے کا کام دیتے رہے ہونگے اور بہت ممکن ہے کہ جس زمانہ میں سکے نہیں چلتے تھے اور ادائگی لگان یا تجارت اجناس کے ذریعہ ہوتی تھی، اُس وقت یہ ہال یا تو لگان کا غلہ جمع کرنے کے کام میں آتے رہے ہوں گے یا پھر ان میں مال تجارت کا ذخیرہ رکھا جاتا ہوگا۔

مکانات کے ایسے ہی سلسلے دریائے نیل کے کنارے اور جنوبی عراق کے علاقہ میں بھی

---

[۵۱] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۱۰۳

[۵۲] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۱۰۵

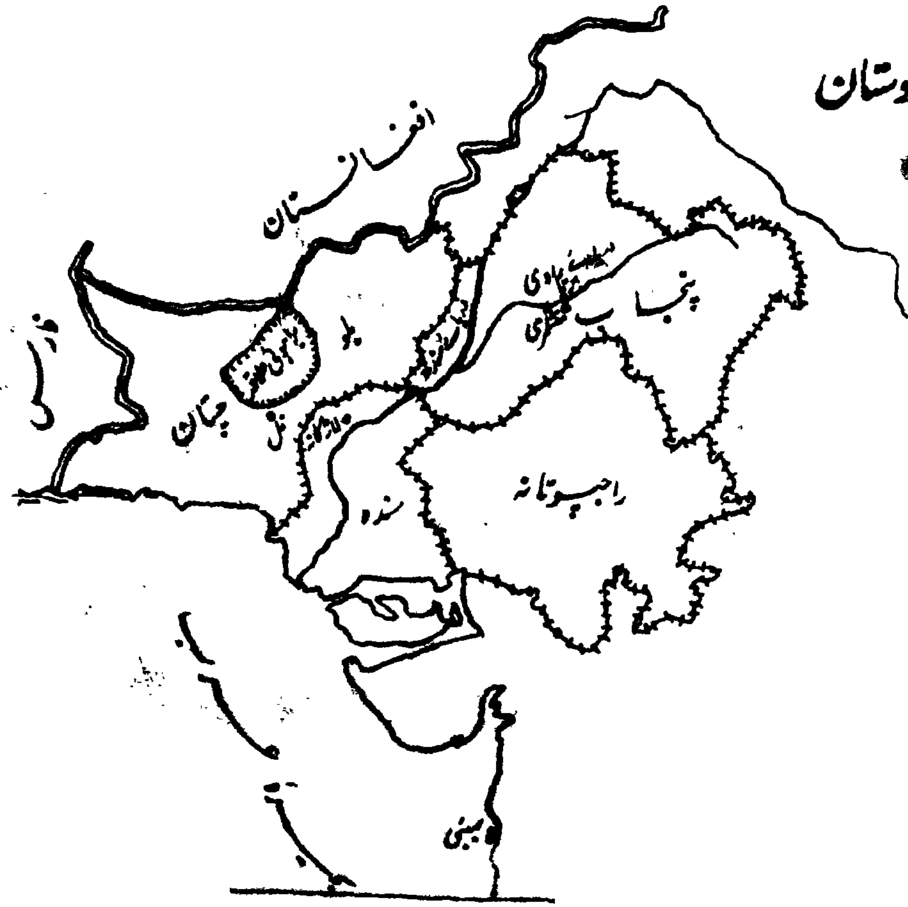
ملے ہیں لیکن تعمیر کی جو خوبی اور شہروں کا جیسا مکمل سلسلہ یہاں نظر آتا ہے، وہ ان عظیم الشان تہذیبوں کے دور میں کہیں نہیں ملتا۔

تصویروں اور ہڈیوں وغیرہ کے ملنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس علاقہ کے اہلی جانوروں میں بیل بہت عام طور سے پایا جاتا تھا جس کے سینگ خاص طور پر بہت لمبے ہوتے تھے اور جس کی گردن پر کوبہ ہوتا تھا اور چونکہ اکثر ان کی ہڈیاں وغیرہ یکجا کثیر مقدار میں ملی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کے گلّے کے گلّے رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹے سینگ کے بیل بھی ہوتے تھے، بھینسے بھی پائے جاتے تھے، ہاتھی اور گھوڑے کے آثار بھی ملتے ہیں۔ دریائے سندھ کی وادی کے گھوڑے عموماً چھوٹے قد کے ہوتے تھے۔ چھوٹے جانوروں میں بھیڑ، سوّر، اور کتا پایا جاتا ہے لیکن اونٹ اور بلی کا اب تک کوئی ثبوت نہیں ملا ہے۔ کتوں کی دو قسمیں پائی جاتی ہیں جنہیں ایک قسم تو عام کتوں کی ہے دوسری قسم ان کتوں کی ہے جسے انگریزی میں Mastiff کہتے ہیں۔ غالباً وہ اسی قسم کے کتے تھے جو دو ہزار برس بعد سکندر اعظم کو نظر آئے اور جن کا ایلین نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ "اگر کوئی کتا شیر کو پکڑ پاتا تو وہ اس پر اپنی گرفت اس مضبوطی سے رکھتا کہ اگر کوئی کتے کی ٹانگ چاقو سے بھی کاٹ ڈالتا، جب بھی وہ اسے اس وقت تک نہ چھوڑتا خواہ درد اُسے کتنا ہی شدت کا محسوس ہوتا جب تک کہ موت اُسے مجبور نہ کر دیتی۔"

ان اہلی جانوروں کے علاوہ وحشی جانوروں کے آثار بھی ملتے ہیں لیکن بہت کم۔ مہروں پر عموماً صرف چیتے، گینڈے اور ہاتھی کی تصویریں ملتی ہیں۔ ان سے یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ میں اس خطہ کی آب و ہوا قدرے مرطوب ہوگی اور نباتات آج کی بہ نسبت زیادہ کثرت رہی ہوگی۔ ان جانوروں کے ساتھ شیر کا کہیں وجود نہیں پایا جاتا جسکی وجہ یہ ہے کہ وہ خشک آب و ہوا کا جانور ہے اور عموماً ایسے خطوں میں پایا جاتا ہے جو بہت زیادہ گھنے اور گنجان نہیں ہوتے۔

علاوہ اُن بڑی بڑی چیزوں کے کہ جن سے وہاں کی عام تہذیب و تمدن کا حال معلوم ہوتا ہے، بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی برآمد ہوئی ہیں کہ جن سے ان لوگوں کی معاشرت اور

نقشہ شمالی و مغربی ہندوستان





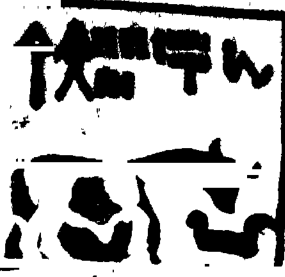
نمبر ۱۔ یہ دھرتی ماتا کی مورتی ہے جو سر پر تاج رکھے ہوئے ہے اور باقی جسم سونے چاندی کے زیورات سے لدا ہے۔

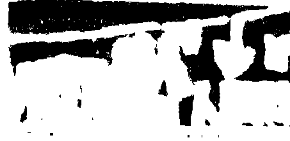


نمبر۲۔ یہ وہ چاندی کا برتن ہے جسمیں بہت سے نقرئی ڈھلائی زیورات رکھے ہوئے ہیں۔



نمبر۳۔ یہ وہ سونے کے ہار ہیں جو عورتیں پہنا کرتی تھیں اور جن کے طرح اور خوبی کو دیکھکر آج بڑے سے بڑے جوہری بھی دنگ ہیں۔

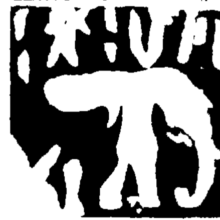




نمبر ۴ - سات آدمیوں کا وہ جلوس جو باقاعدہ وردی پہنے جا رہے ہیں۔

نمبر ۵ - دو سینگوں کا بیل جس کی پیٹھ پر کوبہ بھی ہے





نمبر ۶ - جانوروں میں ہاتھی بھی پایا جاتا تھا جس کی یہ تصویر ہے

نمبر ۷ - اوپر کے نشانات ملا کر دیکھئے باہم کس قدر مشابہت رکھتے ہیں۔



نمبر ۸ - ایک سینگ کا بیل جس کی پیٹھ پر کوئی کوبہ نہیں ہے۔

یہی وہ مہریں یا نمونے ہیں جن کے اوپر عبارتیں ہیں اور نیچے جانوروں کی تصویریں اور انہی عبارتوں کے پڑھنے

زندگی پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس قسم میں منجملہ اور اشیاء کے جو برآمد ہوئی ہیں، ایک بڑی تعداد عام استعمال کے برتنوں کی نکلی ہے جو زیادہ تر مٹی کے ہیں۔ یہ برتن مختلف اغراض کے لئے مختلف شکلوں کے بنے ہوئے ہیں، انہیں ایک سب سے عجیب بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جنہیں پکڑنے یا اٹھانے کے لئے دستے وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز نہیں لگی ہے۔ یہ ظروف عموماً سادہ اور بغیر کسی نقش و نگار کے ہیں لیکن رنگین اور منقش برتن بھی بہت کافی تعداد میں نکلے ہیں جن کے نقوش عام طور پر سیاہی مائل سرخ زمین پر سیاہ رنگ کے بنے ہوئے ہیں اور یہ بیشتر پھول پتیاں ہیں، کہیں کہیں جانوروں کی تصویریں بھی آجاتی ہیں۔ ایسے ہی سرخ اور سیاہ رنگ کے ظروف سر آرل اشٹائن[1] کو شمالی بلوچستان، وزیرستان کے سرحدی علاقوں اور کہیں کہیں سیستان میں بھی ملے ہیں۔ موہنجو دڑو میں سرخ، سفید، سیاہ غرض مختلف رنگوں کے نمونے پائے گئے ہیں، یہاں اور ہڑپا دونوں جگہوں میں سادہ گلی اور نقشی طرز کے ظروف نکلے ہیں جن سے کبھی عراق اور بلوچستان کے ساتھ تعلقات ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بعض تصویریں اور مجسمے وغیرہ جو ہاتھ آئے ہیں، اُن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعلیٰ طبقہ میں مردوں کا لباس عموماً دو کپڑوں پر مشتمل ہوتا تھا، ایک مرزئی یا کرتی ہوتی تھی جو صرف کمر تک ہوتی تھی اور دوسری سادہ یا چھپی ہوئی چادر ہوتی جو بائیں شانے کے اوپر سے دائیں بازو کے نیچے لپیٹی جاتی اور جس سے داہنا ہاتھ بالکل خالی ہوتا۔ ادنیٰ طبقہ میں مرد عموماً ناف سے اوپر برہنہ رہتے تھے اور عورتیں گھٹنوں سے اوپر تک صرف ایک کپڑا پہنتی تھیں اگرچہ ایک رقاصہ لڑکی کا چھوٹا سا ایسا مجسمہ ہاتھ آیا ہے جس میں وہ اس سے بھی بے نیاز ہے۔ ان سب کے باوجود زیورات تمام طبقوں میں پہنے جاتے تھے اور مرد اور عورتیں دونوں طبقے کے لوگ ہار[2] اور انگوٹھیاں پہنتے تھے جو عورتیں خاص کر بالیاں، بازو، کمر زیب اور پازیب وغیرہ استعمال کرتی تھیں۔

---

[1] یہ ایک جرمن محقق ہے جس نے وسط ایشیا میں آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام کیا ہے۔ [2] ملاحظہ ہو تصویر نمبر ۳

مکانات کے اندر جہاں اور بہت سی چیزیں نکلی ہیں جن سے اُن کی وضع قطع اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے، وہاں بہت سی قسم کی ہڈیاں بھی نکلی ہیں جن سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اُن کی کیا غذا رہی ہوگی۔ علاوہ روٹی اور دودھ وغیرہ کے کہ جنکی بیاں اُس زمانہ میں کوئی قلت نہیں معلوم ہوتی، مختلف جانوروں کے گوشت اور بعض دریائی جانور بھی داخل طعام تھے۔ ان ہڈیوں کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ لوگ گائے، بکری اور سور کا بھی گوشت کھاتے تھے، نیز دریائی جانوروں میں کچھوا اور گھڑیاں بھی داخل غذا تھے۔ خشک اور تر دونوں طرح کی مچھلیاں بھی استعمال کیجاتی تھیں۔

انہی زیورات اور آرائش کی چیزوں سے ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں معدنیات میں سے وہ کن کن چیزوں سے واقف تھے۔ امراء کے زیورات عام طور سے چاندی اور سونے کے ہوتے، یا تانبے پر سونے کا ملمع کیا ہوتا تھا اور انہیں ہاتھی دانت، عقیق اور دوسرے مختلف قسم کے رنگین اور منقش قیمتی پتھروں کا جڑاؤ کام کیا ہوتا تھا۔ غرباء کے زیورات عموماً سیپ، گھونگے یا ایک قسم کی بکائی ہوئی مٹی کے ہوتے تھے۔ ہر دو قسم کے زیورات کافی تعداد میں برآمد ہوئے ہیں بالخصوص عقیق اور تانبے کی کردھنیاں جن پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے اور دوسری چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً بالیاں، خالص سونے کی بنی ہوئی جالیاں، کاڑھنے کی سوئیاں، جنکے اوپر کا ملمع آج بڑے بڑے جوہریوں کو بھی حیرت زدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا، پائی گئی ہیں۔ چاندی اور سونے کے علاوہ یہ لوگ تانبے، ٹین اور سیسے سے بھی باخبر تھے۔ تانبے سے عام طور پر آلاتِ حرب، اوزار، زیورات اور خانگی استعمال کے ظروف بنتے تھے مثلاً تیغ، چاقو، کلہاڑیاں، ہنسیے، رکھانیاں، چھینیاں، برتن اور تعویذ وغیرہ۔ ان میں سے اکثر چیزیں ہتھوڑے سے پیٹکر بنتی تھیں، گو ڈھال کر بنانے کی مثالیں بھی ناپید نہیں ہیں۔ تانبا نہایت آسانی سے دستیاب ہوتا تھا، یہ مغرب کی جانب بلوچستان سے آتا تھا، مشرق کی جانب راجپوتانہ اور شمال کی جانب افغانستان سے آتا تھا۔ ٹین البتہ مشکل سے ملتی تھی اور یہ بیشتر خراسان یا اس سے مغرب سے آتی تھی۔ یہ خالص شکل میں نہیں ہوتی تھی بلکہ تانبے کے ساتھ ملا کر بنائی جاتی تھی اور اس صورت میں اس سے

سخت اور تیز دھار کے آلات بنتے تھے مثلاً استرے، کلہاڑیاں، چھینیاں اور آرے وغیرہ۔ اس مرکب دھات سے ظروف، مجسمے، جوشن، مالائیں، بٹن، اور مختلف قسم کے زیورات بھی بنتے تھے۔ کانسی ایک بہت اعلیٰ قسم کی دھات ہوتی تھی جس میں ۲ سے لیکر ۱۲ فی صدی تک ٹین کا جزو شامل ہوتا تھا لیکن باوجود اس کے کہ یہ تانبے سے بہتر خیال کیجاتی تھی پھر بھی اس کی بنی ہوئی چیزیں تانبے سے کم تعداد میں ملتی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ غالباً ٹین کی کمیابی اور گرانی ہو گی۔ باوجود اس کے کہ تانبے کا عام استعمال تھا پھر بھی چقماق کی قسم سے پتھر کے بنے ہوئے چاقو کثرت سے ملتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حجری عہد کا بالکل خاتمہ نہیں ہو گیا تھا۔ یہ ایک نہایت سخت قسم کا پتھر ہوتا ہے جو جلا دینے یا توڑنے کے لئے بٹوں کی غرض سے استعمال کیا جاتا تھا۔ کوڑیاں بھی کثیر مقدار میں ملتی ہیں جو ساحلی علاقوں سے آتی تھیں اور ان سے چمچے، ڈوئیاں، چوڑیاں، ہار اور دوسرے زیورات بنائے جاتے تھے۔ یا پھر ان سے لکڑی کے اندر جڑاؤ کا کام لیا جاتا تھا۔ نیلے رنگ کی ایک دھات جو عراق اور مصر میں بھی اکثر پائی گئی ہے، یہاں زیورات، چھوٹے چھوٹے گلدانوں اور تعویذوں وغیرہ کے بنانے میں کام آتی تھی، اور اسی مسالے کی ایک عمدہ اور سخت قسم ہوتی تھی جو مہروں کی سطح کے ہموار اور چکنا کرنے کے کام میں آتی تھی۔

لیکن جہاں معدنیات اور اُن کے مختلف استعمالات کا یہ حال تھا، وہاں یہ دیکھکر سخت حیرت ہوتی ہے کہ آلاتِ جنگ کے بنانے میں ان سے بہت کم کام لیا جاتا تھا۔ اب تک جو کچھ بھی جنگ کے آلات مل سکے ہیں وہ چند گرزوں کے سرے، کلہاڑیاں، تیغے، تیروں اور نیزوں کے سرے کے علاوہ، اور کوئی بڑے ہتھیار دستیاب نہیں ہوئے ہیں۔ آلاتِ حرب کی اس کمیابی اور عدمِ وجود سے گمان ہوتا ہے کہ یہ لوگ جنگ وجدل کے زیادہ عادی نہ تھے، بلکہ ایک پُرسکون اور پُرامن زندگی بسر کرتے تھے، ورنہ جہاں تمدن اور تہذیب کے دوسرے آثار اس کثرت سے ظہور میں آئے ہیں، وہاں اس کی قلت اور کمی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

انہی آثار سے جہاں ان کے اخلاق و عادات اور بود و باش کا پتہ چلتا ہے، وہاں ان سے

یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کن کن فنون سے واقف تھے۔ کھدائی میں جو مکانات نکلے ہیں اُن میں منجملہ اور چیزوں کے تکلے اور نہایت باریک بُنے ہوئے کپڑوں کی کچھ چیزیں بھی ہیں جن سے یقین ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا بہت کافی رواج رہا ہوگا۔ بابل میں روئی کو 'سندھو' اور یونان میں 'سنڈون' کہتے تھے جس سے ہمیشہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ قدیم زمانہ میں روئی کی پیداوار کا مرکز دریائے سندھ کی وادی کا علاقہ تھا لیکن ان اکتشافات سے اس خیال کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے۔ البتہ ایک شبہ یہ باقی تھا کہ آیا وہ روئی جو بابل اور یونان میں استعمال کی جاتی تھی سیمل کی روئی ہوتی تھی یا کپاس کی۔ موئنجو دڑو کے اس جدید اکتشاف سے یہ شبہ بھی جاتا رہا ہے اور یہ مسلّم ہو گیا ہے کہ وہ کھیتوں کی پیدا شدہ کپاس ہوتی تھی جس کے ریشے سیمل سے بالکل جداگانہ کپاس سے ملتے جلتے ہیں۔

مہروں، تختیوں اور تعویذوں پر جو تحریر کندہ ہے اور نشانات کی کشش اور خم میں جو سلیقہ پایا جاتا ہے اس کی بنا پر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ کے لوگ تحریر و کتابت کے فن سے بھی بخوبی واقف تھے، اور ان مہروں اور تعویذوں کا جو اب تک تقریباً ایک ہزار دستیاب ہو چکی ہیں، ہر گھر میں پایا جانا اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ فن کچھ محدود نہ رہا ہوگا اور اس قدر عام ہونے کی صورت میں اس سے کاروباری اور دوسرے معاملات میں بھی کام لیا گیا ہوگا گو اس امر کا کوئی صحیح پتہ نہیں کہ جسطرح عراق میں مٹی پر لکھنے کا دستور تھا، یہاں لوگ کس چیز پر لکھتے تھے گمان غالب یہ ہے کہ لکڑی یا صنوبر وغیرہ کی قسم سے کسی درخت کی چھال پر یا مصر کی طرح بردی پر لکھنے کا رواج رہا ہوگا، اس لئے کہ ان چیزوں کا علم اسوقت تک ہو چکا تھا۔

علاوہ تحریروں کے انہی مہروں اور تختیوں پر جو جانوروں کی تصویریں بنی ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں ایسی شبیہوں اور تصویروں کا بنانا بغیر اس فن میں کمال حاصل کئے ہوئے ناممکن تھا اور نہ صرف یہی بلکہ یہ فن اسی زمانہ کی دوسری قوموں یعنی عراق اور مصر کے فنون سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ علاوہ

ان کندہ تصویروں کے جو مہروں اور تختیوں پر ہیں مینڈھے، بندر رکھتے اور گلہریوں کے جو چھوٹے چھوٹے مجسمے مٹی کی قسم کی ایک دھات پر ملے ہیں، وہ بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ برعکس اس کے انسانوں کی جتنی تصویریں ملی ہیں، خواہ وہ پتھر، مٹی، کانسی یا کسی اور چیز پر پائی گئی ہوں، نہایت بھدی اور خراب قسم کی ہیں اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ مصور اور سنگتراش جو جانوروں کی شکلیں اس قدر صحیح نور مدہ بنا سکتے تھے، اپنی صورتوں کے معاملہ میں کیوں اس درجہ ظلم سے کام لیتے تھے۔ اس باب میں ان کی کوشش اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی تھی کہ ایک انسانی شبیہ سی پیدا ہو جائے۔

موئنجو دڑو میں دو بڑے ڈھیر انسانی لاش کے ڈھانچوں کے بھی نکلے ہیں، ایک ڈھیر مکان کے اندر ملا ہے اور دوسرا سڑک پر۔ ہر دو مجموعوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ غالباً کسی آفت ناگہانی کا شکار ہوئے ہیں، خواہ وہ آپس کی قتال و جدال کی صورت میں نازل ہوئی ہو یا کوئی وبائی بیماری ہو۔ لیکن اس سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ مُردوں کی تجہیز و تکفین کے معاملہ میں عموماً کیا رواج تھا۔ البتہ ایک مثال ایسی ملی ہے جس میں مردہ جسم کا کچھ حصہ مدفون پایا گیا ہے جس طرح نیسل (بلوچستان) اور سیان (مغربی ایران) میں کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی تدفین کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ لاش کے کچھ حصوں کے ساتھ مٹی کے چند خوشنما ظروف اور بعض اور چھوٹی موٹی ایسی چیزیں جو اس کی ذات سے تعلق رکھتی تھیں، اُس کے ہمراہ رکھدی جاتی تھیں۔ نعش پہلے یا تو گدھوں کو کھلا دی جاتی تھی یا بعض حالتوں میں کچھ عرصہ تک زمین کے اندر مدفون رکھنے کے بعد پھر پرندوں کی نذر کر دی جاتی تھی۔ اس قسم کی تدفین کا طریقہ آیا عام تھا یا مخصوص اس کے متعلق ابھی تک قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہڑپا میں ہندوؤں کے 'سمادھوں' کی طرح اینٹ کی بنی ہوئی ایسی عمارتیں نکلی ہیں جن میں راکھ اور کچھ جلی ہوئی ہڈیاں پائی گئی ہیں، اس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مُردوں کے جلانے کی بھی رسم تھی اور یہ چبوترہ اسی غرض کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ موئنجو دڑو اور ہڑپا دونوں جگہوں میں بعض پتھر کے ایسے گھڑے بھی پائے گئے ہیں جس کے اندر چھوٹے چھوٹے برتن، اور بعض میں راکھ اور ہڈیاں بھی نکلی

ہیں۔ یہ گھڑے بلاشبہ دالہ وغیرہ رکھنے کے برتن ہوں گے۔

لوگوں کے مذہب و عقاید کے متعلق بھی انہیں آثار سے بہت کچھ پتہ چلسکتا ہے۔ ایک قسم کی مورتی[۵] ایک سے زائد تعداد میں دستیاب ہوئی ہے جس کے سر پر تاج وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز ہے اور باقی جسم زیورات سے لدا ہوا ہے، گمان غالب ہے کہ یہ مورتی دیوی ماتا کی ہوگی جو عراق اور دوسرے مغربی ممالک کی مورتیوں سے بہت مشابہت رکھتی ہے، علاوہ اس کے بعض اور مورتیاں بھی نکلی ہیں جو بابل کی مورتیوں سے بہت کچھ ملتی جلتی ہیں۔

ان مورتیوں کے علاوہ ایک اور ثبوت ایک مہر کی صورت میں ملا ہے جس پر ایک قطار میں چار آدمیوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں جو اپنے اپنے ہاتھوں میں جھنڈے لئے ہوئے ہیں اور ہر ایک شخص اپنے جھنڈے پر ایک ایک دیوتا اٹھائے ہوئے ہے جو اسکے قبیلہ کا محافظ مانا جاتا تھا۔ اسی قسم کی تصویریں مصر کے آثار میں بھی پائی گئی ہیں اور ان دونوں میں اسدرجہ مشابہت ہے کہ اگر اس مہر کی پشت پر ایک خالص ہندی تخیل کی تصویر نہ ہوتی تو یہ قطعاً کہا جاسکتا تھا کہ یہ مہر مصر سے آئی ہوگی۔ اس قدر تو صاف ظاہر ہے کہ یہاں 'ٹوٹم' کی پرستش بہت ہوتی تھی اس لئے کہ مختلف ایسے مجسمے اور تصویریں پائی گئی ہیں جنہیں نصف تصویر تو کسی جانور مثلاً مینڈھا، بیل، ہاتھی وغیرہ کی ہے اور باقی نصف حصہ انسان کا ہے۔ دو تصویریں خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کے سر گدھے سے مشابہ ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا یہ لوگ کس نسل سے تھے؟ اور ان کا کیا تعلق تھا؟ ان امور کا پتہ لگانے کے لئے جتنا مواد ابتک دستیاب ہوسکا ہے، وہ افسوس ہے کہ ناکافی ہے لیکن پھر بھی بعض قرائن ایسے ہیں جن سے ایک حد تک اس کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ موئنجو دڑو میں مردہ لاشوں کے جتنے ڈھانچے نکلے ہیں، اُن کے سروں کی ساخت اور لمبائی چوڑائی دیکھکر

---

[۵] ملاحظہ ہو تصویر نمبر

یہ تعین کیا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ علم الانسان کی اصطلاح میں Dolicho Cephalic نسل کے لوگ ہونگے یعنی جنوب ایشیا اور یورپ کی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن علاوہ اس نسل سے تعلق رکھنے کے ان میں بہت کچھ آریوں سے قبل دراوڑی نسل کے لوگوں کا عنصر بھی شامل ہے۔ Brachy-Cephalic قسم کا سر اگر کوئی ہاتھ آیا ہے تو وہ ان جگہوں سے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اور اس سر میں وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو موہنجو دڑو کے ان مجسموں میں پائی جاتی ہیں جن کے متعلق ماہرین کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہ مذکورہ صدر قسم سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ آثار اگرچہ بہت بعد کے زمانہ کے ہیں لیکن پھر بھی جس تہ میں یہ ملے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ اس زمانہ سے قبل کے ہیں جبکہ تیسرے شہر کو لوگوں نے چھوڑا۔ پھر بھی یہ معلومات اس قدر ناکافی ہیں کہ ان کی بنا پر کوئی قطعی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔

اب تک ان مقامات سے جتنی چیزیں نکل چکی ہیں اور اُن کا وہاں کی تہذیب و تمدن پر جو اثر پڑا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہم اور نتیجہ خیز وہ مہریں اور تعویذیں ہیں جو اب تک کوئی ایک ہزار کی تعداد میں برآمد ہوئی ہیں۔ موجودہ اور آئندہ کی معلومات کا بڑا دار و مدار انہیں مہروں اور تعویذوں کے صحیح پڑھنے پر ہے۔ بڑی دشواری یہ ہے کہ ابھی تک یہی طے نہیں ہو سکا ہے کہ ان مہروں کے نشانات کوئی بامعنی عبارتیں ہیں یا وہ خیالات کی تصویریں ہیں۔ بہرصورت ان مہروں پر جو نشانات ہیں وہ یکساں اور برابر نہیں ہیں بلکہ ۲ ملی میٹر سے لیکر ۱۱ ملی میٹر تک مختلف لمبائیوں کی ہیں۔ ان تحریروں کا درست پڑھنا تو بہت دشوار ہے اور اب تک جو کچھ ان کے معانی و مطالب نکالے جا سکے ہیں وہ ایک قیاس کی حیثیت سے زیادہ نہیں ہے لیکن پھر بھی بعض محققین نے ان عبارتوں میں معانی پہنانے کی جو کوششیں کی ہیں وہ قابل توجہ ہیں اور اس لحاظ سے انہوں نے ان مہروں کے نشانات اور تصویروں کی جو تقسیم کی ہے، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ جرمن زبان کے ایک رسالہ زڈ، ڈی، ایم، جی میں اسی موضوع پر ایک نہایت محققانہ مضمون نکلا ہے جس میں فاضل مضمون نگار نے ان مہروں

کی ترتیب وتقسیم اس طرح کی ہے۔

۱	بار آنے والے نشان تعداد میں	۶۷	ہیں
۲	" " " " " " "	۱۹	"
۳	" " " " " " "	۵	"
۴	" " " " " " "	۶	"
۵	" " " " " " "	۳	"
۶	" " " " " " "	۲	"
۷	" " " " " " "	۲	"
۸	" " " " " " "	۱	"
۱۱	" " " " " " "	۲	"
۲۱	" " " " " " "	۱	"
۲۴	" " " " " " "	۱	"

مہروں اور ان کے نشانات کی اس ترتیب وتقسیم کے بعد ان سے معنی ومطلب نکالنے کی
جو کوششیں کی گئی ہیں، وہ بھی عجیب ہیں۔ ایک جرمن محقق کا خیال ہے کہ یہ کوئی عبارت
نہیں ہے بلکہ مختلف خیالات ہیں جو تصویروں کی شکل میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ چنانچہ مذکورہ
بالا نقشہ دینے کے بعد وہ کہتا ہے کہ صرف یہ امر کہ تمام نشانوں میں ۶۷ نشانات ایسے ہیں
جو ایک بار سے زائد نہیں آئے ہیں، میرے اس خیال کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اگر یہ
حروف تہجی سے مرکب کوئی تحریر ہوتی تو ناممکن تھا کہ بار بار آنے والے حرفوں کی تعداد اس
قدر (یعنی ۲۴ بار) رہتی، درانحالیکہ حروف تہجی کا اسوقت کم تعداد میں ہونا اور بھی قرین قیاس ہو۔
اب سے کچھ عرصہ پیشتر اسی میں کی ایک مہر کنگھم نامی ایک انگریز محقق کو ملی تھی جس نے بڑی
کوشش ومحنت کے بعد اپنی مہر کو "لچھمیہ" پڑھا تھا جس سے اُس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ یہ

مہریں سندھی الاصل ہیں اور ان کا باہر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن فلیٹ نے اس بات سے انکار کیا اور اس نے کننگھم کے نظریے کی سخت تردید کی۔ ۱۸۶۳ء میں ایک فرانسیسی محقق تیری دی لاکوپری (Terrien de La Couperie) نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ تحریر یا شو تحریر ہے جو باختر سے تاجروں کے ذریعہ یہاں پہونچی لیکن فوراً ہی ڈیمس (Dames) نے اس کی تردید کر دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سکے ہیں، ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے کہ یہ تعویذ ہیں اور قاعدہ ہے کہ جب کوئی قوم انحطاط پذیر ہوتی ہے تو اس کے قوائے علیہ بیکار ہو جاتے ہیں! ور اسوقت وہ جھاڑ پھونک اور دعا تعویذ کی طرف توجہ کرتی ہے۔ اس قوم کے لوگوں نے بھی اپنے انحطاط کے زمانہ میں بلا شبہ یہی تدبیر اختیار کی ہوگی جسکی یہ نشانیاں ہیں لیکن بنرجی کے خیال کے مطابق جو ابتدا سے اس کام پر لگے ہوئے ہیں اور جن کا ذکر اس سے پیشتر آچکا ہے "نہ یہ سکے ہیں اور نہ کوئی تعویذ وغیرہ کی قسم سے ہیں۔ غرض اصل حالات کے انکشاف کا سب کچھ دارومدار ان مہروں کے پڑھنے پر ہے۔ محققین ایک عرصہ سے اس کی کوششیں کر رہے ہیں اور انہوں نے یکے بعد دیگرے متعدد خیالات پیش کئے ہیں لیکن ابھی تک اُن میں سے کوئی نظریہ ایسا اطمینان بخش ثابت نہیں ہوا ہے جو عام طور سے قابلِ قبول ہو سکے۔

اس مضمون میں جہاں تک برآمد شدہ اشیاء کے حالات کا تعلق ہے وہ سرجان مارشل ڈائرکٹر جنرل محکمۂ آثار قدیمہ کے اُن مضامین سے لئے گئے ہیں جو "ٹائمس اوف انڈیا" کے تین نمبروں میں نکلے ہیں لیکن جہاں تک اُن کے اثرات و نتائج کا تعلق ہے، ان کے متعلق بیشتر ایک جرمن مستشرق کے مضمون سے استفادہ کیا گیا ہے جو جرمن زبان کے ایک رسالہ "زڈ، ڈی، ایم، جی" میں نکلا ہے۔ تصویروں کے بلاک خود اپنے ہاں کے شعبۂ نجاری میں تیار کرائے گئے ہیں جس کیلئے ہم ماسٹر عبدالحیٔ صاحب کے شکرگزار ہیں۔ ان انکشافات کے نتائج و اثرات کی تفصیلی بحث آئندہ نمبر میں ہوگی۔

حقیقت اور افسانہ

میں اس مضمون میں وہ بحث چھیڑ رہا ہوں جسے مشرقی تہذیب نے سنجیدہ اور مہذب تحریر اور گفتگو کے علاقہ سے باہر رکھا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک ذہنی تعصب ہے جس نے ہماری قوم کو بہت نقصان پہونچایا ہے اور اب بھی پہونچا رہا ہے۔ لیکن میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اس تعصب کی ضد میں جس قسم کی کتابیں یورپ میں جنسی مسائل پر لکھی جاتی ہیں اُن کا ایک نمونہ پیش کروں، نہ میرا مقصود دل بہلانا ہے۔ اپنے خیالات ظاہر کرنے میں میرا مدعا — صرف یہ ہے کہ اپنی سوسائٹی کو اُن فرائض سے آگاہ کروں جو اُسے عورتوں کے معاملہ میں پورے کرنے ہیں۔ میں نے اس کی بھی کوشش کی ہے کہ اس مسئلہ پر بحث کرنے کا صحیح نقطۂ نظر اور جو نصب العین ایک سچے مسلمان کو جنسی مسائل پر غور کرتے ہوئے مدنظر رکھنا چاہیئے پیش کروں۔ اگرچہ پردہ کے سوال نے ہماری سوسائٹی کے ذہن میں کچھ کھلبلی مچائی ہے، پھر بھی مجھے یہ کہنا لازم ہے کہ ہم میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو جنسی جذبات کی اہمیت کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں۔ ہمارا عام رجحان خاموشی کی طرف ہے، اور جب کبھی کسی کی کم ظرفی سے یہ سوال ہمارے سامنے آ بھی جاتا ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ اُسے ٹال دیں: رند ہیں تو مسکرا کر، خدا سے ڈرنے والے ہیں تو تیوری چڑھا کر، باضابطہ ہیں تو خاموشی سے لیکن میرا عقیدہ ہے کہ بغیر عورتوں اور مردوں کے رشتہ کو سمجھے ہم اچھے مسلمان نہیں بن سکتے، اور ہماری تعلیم بالکل نامکمل رہجاتی ہے۔

ہمارے اخلاقی رہنما نفس کو ناپاک اور گمراہ کرنے والا بتاتے ہیں، اور انکی ظاہری خواہش کم از کم ضرور ہے کہ ہماری زندگی پر نفس پرستی یا بداخلاقی کا دھبہ نہ لگنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا

چاہیئے تھا کہ وہ ہماری ذہنیت کو سدھارنے کی کوشش کرتے، اور جس حد تک ممکن ہوتا ہمارے جنسی جذبات کو، جن کی وجہ سے ہمارا پیر سب سے زیادہ پھسلتا ہے، ایک روحانی شکل دیتے جس میں اُن کی ساری صورت چھپ جاتی۔ برخلاف اس کے ہماری اخلاقی تعلیم نے اُنھیں یا تو اپنی توجہ کے لائق نہیں سمجھا اور ہمیں اپنی حالت پر چھوڑ دیا، یا اُن سے ڈرا ڈرا کر ہمیں بزدل اور کمزور کر دیا۔ دوزخ کا خوف ممکن ہے چند ہستیوں کو جنسی جذبات کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچالے، عام اخلاق اس بنیاد پر تعمیر نہیں ہو سکتے۔ عام اخلاق کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات کو ایک روحانی حیثیت دی جائے، جو لوگوں کو نیچے اور کمینہ جذبات کی پہونچ سے باہر رکھے۔ آج کل ہمیں شریعت کے احکام صرف رٹائے جاتے ہیں اور عورت کی ہستی سے ناواقف رہنے کی تعلیم دی جاتی ہے، جو ہمارے اخلاق کمزور کرنے کی سب سے بہتر ترکیب ہے۔

مگر قبل اس کے کہ ہم مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر بحث شروع کریں ہمکو یہ چاہیئے کہ اپنی ذہنیت کو اُن وہموں اور غلط فہمیوں سے پاک کرلیں جو ہماری تہذیب میں رفتہ رفتہ شامل ہو گئے ہیں، اور جن کی وجہ سے عورتوں کا سارا مسئلہ نہایت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ میں نے انہیں افسانہ کہا ہے، اور درحقیقت اگرچہ یہ اکثر علمی نظریوں یا مذہبی عقیدوں کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو ان پر گہرا اعتقاد بھی ہوتا ہے، یہ محض افسانہ ہی افسانہ ہیں۔ اِن کا معتقد ہونا کچھ ہندوستانیوں یا مسلمانوں کی خصوصیت نہیں، یہ ہر ملک ہر زمانہ، ہر قسم کی تعلیم کے لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ دنیا کا سب سے پہلا افسانہ، جو منجملہ اور آثار قدیمہ کے مصر میں زمین سے کھود کر نکالا گیا ہے، ایک بھاوج کا قصہ سناتا ہے جو اپنے دیور کو بہکانا چاہتی تھی، اور جب وہ اس میں ناکامیاب ہوئی تو اُسی نے اپنے شوہر سے ایسی شکایت کی کہ اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کا خون اپنے سر پر لیا۔ دنیا کا جدید ترین افسانہ، جو اس وقت یورپ میں بڑی دھوم سے سُنایا جا رہا ہے یہ ہے کہ حسن فیاضی سکھاتا ہے، عورت اپنے حسن میں مست ہوتی ہے، اور اُس کی دلی آرزو ہے کہ وہ یہ شراب دوسروں کو پلائے ــ یعنی صرف مرد نہیں بلکہ عورت بھی عیاشی

کی خواہاں ہوتی ہے، اور وہ مرد بڑے بیوقوف تھے جنھوں نے عورت کو یہ جذبات رکھنے کا اہل نہ سمجھا اور اپنے حسن سے فریفتہ کرنے کی اُسے اجازت نہیں دی۔ مصر کا افسانہ اُسی زمانہ میں لکھا گیا تھا جب مصری قوم تہذیب کی پہلی منزلوں پر تھی، یورپ کا افسانہ ایسی قومیں سنا رہی ہیں جو تمدن اور تہذیب کے عروج پر پہونچ چکی ہیں۔ دوسری قوموں نے بھی اپنی زندگی کے دوران میں اسی طرح افسانے سُنے اور سنائے ہیں، اور ہمیں مقابلہ کرنے سے فوراً معلوم ہو جائے گا کہ دراصل ایک ہی قسم کے افسانے ہیں جنھیں مختلف قومیں اپنے اپنے رنگ پر سناتی ہیں۔

جس زمانہ میں قوم خانہ بدوش ہوتی ہے اُس کو عورت کی اہمیت کا زیادہ احساس ہوتا ہے، اور جیسا کہ قدیم جرمن اور دوسری نوجوان خانہ بدوش قوموں کے حالات پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہے، وہ اپنی عورتوں کی عزت کرتی ہیں، اور قومی معاملوں میں انھیں حصہ لینے کا کافی موقع بھی دیا جاتا ہے۔ مرد معاش اور زمین کی جستجو میں مشغول رہتے ہیں۔ اندرونی انتظام بڑی حد تک انھیں عورتوں کے سپرد کرنا ہوتا ہے، اور عورتیں خود بخود سماج کا مستقل اور پائدار عنصر بن جاتی ہیں۔ مگر جب قوم خانہ بدوشی ترک کرکے ایک مقام پر آباد ہو جاتی ہے تو قومی نظام میں عورتوں کی حاجت نہیں رہتی اور اسی زمانہ میں وہ افسانے تصنیف ہونے لگتے ہیں جنھوں نے عورت کی ہستی کو مٹایا نہیں تو بگاڑ ضرور دیا ہے۔ خاندان بنتا ہے تو اُس کے ساتھ افسانوں کے ذریعہ سے تعلیم دیجاتی ہے کہ وہی عورت جو گھر کو آباد کرتی ہے اُسے ویران بھی کر سکتی ہے، اور خاندان کی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ اُسے پابند رکھا جائے اور اُس کی طبیعت پر بھروسا نہ کیا جائے۔ یہ افسانے عموماً اُس مصری کہانی کے طرز پر ہوتے ہیں جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

آگے چل کر جب قوم میں اپنی طاقت کا احساس اور جوانی کا جوش پیدا ہوتا ہے تو عورت ماں اور بیوی کی بجائے معشوقہ بن جاتی ہے، جنسی جذبات پر راج کرنے کا اُسے حق مل جاتا ہے اور اُس کا حسن مردوں کو دیوانہ کرنے لگتا ہے۔ یہ زمانہ "شیولری" (Chivalry) کا ہے جس کے افسانوں میں عورت اپنی خوبصورتی کو خون کے مول بیچتی ہے، اپنی زندگی کو بیکار اور اپنے

جمال کو بے اثر سمجھتی ہے اگر وہ خون نہ بہا سکے۔ دنیا کی تمام ایپک (Epics) اسی دور میں تصنیف کی گئی ہیں، اُن میں حسن اور جوانمردی کا ڈھنڈورا پٹا ہے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ذہنیت بھی پائی جاتی ہے جو عورت کو نہایت حقیر اور ناچیز ہستی قرار دیتی ہے، اس لئے کہ وہ میدان جنگ میں مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور اُس میں پہلوان بننے کی صلاحیت نہیں۔ چنانچہ درمیانی صدیوں کا ایک انگریز رئیس (nobleman) اپنی بیوی کی تعریف میں کہتا ہے:۔

"A little better than my horse,
A little dearer than my dog."

جسمانی قوت اس زمانہ میں احترام کے لئے شرط تھی، اس لئے عورت کی عزت کرنے کی کوئی اور وجہ نظر نہیں آئی، اور اس وہم نے جڑ پکڑ لی کہ عورت کے لئے حسین ہونا لازم ہے، اور جس عورت کا جسم خوبصورت نہیں اُس کی ہستی نامکمل ہے۔ اس ایک افسانہ نے فطرت کے نظام کو پلٹ دیا ہے اور قوموں کو ایک غیر فطری اور نہایت مضر اصول پر چلایا ہے۔ فطرت نے خوبصورتی نر میں رکھی ہے، اور انتخاب کا حق مادہ کو دیا ہے۔ ہم خوبصورت عورت کو بتاتے ہیں اور پسند کرنے کا حق مرد کو دیتے ہیں۔ اس دانستہ کجروی کا انجام ہر قوم نے بھگتا ہے، یورپ کے اخلاق پر جو اثر ہوا ہے اُس کا اندازہ ہم ٹالسٹائے کی کتاب "کرائٹزر سوناٹا" (Kreuzer Sonata) سے کر سکتے ہیں[1]۔ یہ تو تہذیب کے دوسرے دور میں قوم کے ایک حصہ کا حال ہوتا ہے۔ شاعروں کی

---

[1] ٹالسٹائے نے دکھایا ہے کہ چونکہ مرد انتخاب کرتے ہیں، لڑکیاں اس پر مجبور ہوتی ہیں کہ مردوں کو پسند آنے کی کوشش کریں۔ اُن کو اپنا لباس، اپنے اخلاق، اپنی تعلیم سب چیزیں مردوں کی پسند کے مطابق رکھنا ہوتی ہیں، اور اگر وہ اس میں کوئی کمی کرتی ہیں تو انہیں شادی اور گھرانے کی زندگی سے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لباس میں بے حیائی، اخلاق میں آزادی اور تعلیم میں ظاہری نمائش اُن کے لئے لازم ہو جاتی ہیں۔ عزت کی زندگی بسر کرنا اُن کے واسطے اسی شرط پر ممکن ہوتا ہے کہ وہ عصمت اور عفت سے ہاتھ دھوئیں۔ اُن کے جسم میں کوئی تقدس (ملاحظہ ہو حاشیہ صفحہ)

فتنہ انگیزی اور جواںمردوں کی جنگجوئی سے سبق لے کر قوم کے مذہبی رہنما یعنی اُس کے پنڈت، مولوی، اور پروہت عام لوگوں کو اپنے افسانے سناتے ہیں۔ یہ خوبصورتی کو ایک بلا بتاتے ہیں، جو عورت کو گمراہ اور گنہگار بنا دیتی ہے، خود رائی کو ایک ایسا اخلاقی جرم جس کی وجہ سے دوسرا جنم کیا یعنی زندگی عذاب ہو جاتی ہے، زندگی سے لطف اٹھانے کو شیطان کا ایک فریب جو دینداری بالکل ناممکن کر دیتا ہے۔ اپنی تعلیم میں اثر پیدا کرنے کے لئے وہ زبان اور خیالات میں ذرا بھی اعتدال یا انصاف کا خیال نہیں کرتے، اور جس قدر ان لوگوں نے عورتوں کو ذلیل کیا ہے اور عوام کو بیوقوف بنایا ہے اُس کا مقابلہ بدمعاش یا جرم پیشہ لوگ شاید ہی کر سکیں گے۔

مثال کے طور پر ہم یورپ کی درمیانی صدیوں میں رہبانیت اور کلیسا کی اخلاقی تعلیم لے سکتے ہیں، جس کے اثر سے عورت صرف اُن لوگوں کے لئے نہیں جو خدا کی راہ میں جنسی جذبات کو قربان کرنا چاہتے تھے بلکہ عوام میں بھی ابلیس کی ہمجنس ہو گئی۔ اس وہم کو تقویت دینے کے لئے حضرت آدم کے بہشت سے نکلنے کا قصہ بھی استعمال کیا گیا۔ جب باوجود پیغمبری کا رتبہ رکھنے کے ایک عورت اپنی فطرت سے اس قدر مجبور تھی تو معمولی عورتوں کا کیا اعتبار ہو سکتا تھا، اور جیسے حوا نے آدم کو بہشت سے نکلوایا اور انسان کی ہبوط کی باعث ہوئیں، ویسے ہی ہر عورت مرد کو ورغلانے جھٹلانے، دھوکا دینے پر تیار رہتی ہے، اور کوئی تعلیم اُس کی فطرت کی خامی کو نہیں دور کر سکتی۔

رہبانیت کے اثر کے ضائع ہونے پر بھی یورپ کی قوموں میں بہت سے وہم باقی رہے۔ ان میں سب سے وحشیانہ یہ تھا کہ عورتیں اپنی روحیں شیطان کے ہاتھ بیچ کر جادوگرنیاں (witches) بن جاتی ہیں، اور معصوم لوگوں کو اپنے جادو کے ذریعہ سے نقصان پہنچاتی ہیں۔ یہ الزام ہر عورت

(بقیہ حاشیہ ص۲۱) یا پاکیزگی نہیں باقی رہتی، اُن کا اثر صرف جنسی جذبات کے ذریعہ سے قائم رہ سکتا ہے۔ وہ مردوں کی روحانی آرزوئیں پوری کر سکتی ہیں نہ اپنی فطری خواہشیں، اور آخر کار اُن کی انسانیت اسی طرح تباہ ہو جاتی ہے۔

پر لگ سکتا تھا جیسے بیل بوٹیوں یا دواؤں سے دلچسپی تھی، یا جو ذرا بھی نرالی پاسکی تھی، اور خدا جانے کتنی بیچاریوں کو اس بیرحم خبط نے زندہ جلوا ڈالا۔

اسلام میں رہبانیت کی طرف ترغیب نہیں دلائی گئی ہے، اس لئے ہماری تاریخ پر کوئی ایسا دھبہ نہیں۔ لیکن عورت کے شیطانی عنصر پر جس کا جی چاہے ہزاروں پارساؤں کے لیکچر سن لے، یہ تعلیم، اگرچہ مذہب کے حدود سے باہر ہوتی ہے، رفتہ رفتہ مذہب کا ایک جزو بن جاتی ہے، اور اکثر مذہب کے احکام سے زیادہ احترام کی سزاوار مانی جاتی ہے[۵]۔

دوسرے دور کا وارث ایک نیا زمانہ ہوتا ہے جس میں نہ نگاہ و ناز کے امیدواروں کا خون ندیوں میں بہتا ہے نہ مذہب بدصورتی کو باعث فخر سمجھتا ہے۔ عیاشی بہادروں کا حصہ نہیں رہتی، نہ عاشق مجھانا جوانمردوں کا شغل۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دولت کے ساتھ قوم میں حوصلہ بھی تقسیم ہوتا رہتا ہے، اور متوسط درجہ کے لوگ امیر غریب دونوں سے زیادہ با اثر ہو جاتے ہیں۔ یہ زمانہ قوم کے عروج کا ہوتا ہے، اُس کی ذہنیت آزادی کی خواہش کرتی ہے، اور اُس کا سارا رجحان تعمیر کی طرف ہوتا ہے۔ اس دور کے افسانوں میں ذاتی عنصر زیادہ ہوتا ہے، تجربہ تعلیم کا مدمقابل بن جاتا ہے، اور چونکہ قومی زندگی میں یک رنگی اور یک سوئی نہیں رہتی اس لئے چند بڑے افسانوں کی بجائے بہت سے ذاتی تجربہ اور تخیل کے تصنیف کئے ہوئے افسانے رائج ہو جاتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ ذاتی ہوتے ہیں اور مخلصانہ اور ان کا مقصد محض جوش دلانا یا دل بہلانا نہیں بلکہ اکثر دل کڑھانا اور رلانا بھی ہوتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سچے ہوتے ہیں یا عورت کی ہستی یا مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر کوئی خاص روشنی ڈالتے ہیں۔ وہی عشق جس کے نعروں سے امیروں کے محل گونجتے تھے اب متوسط درجہ کے گھرانوں میں آہ و نالہ کا باعث ہوتا ہے، وہی فتنہ سامان حسن جو سلطنتوں کو تباہ کرتا تھا اب معمولی لوگوں کی جوانی خراب کرتا ہے۔ یعنی اس دور

---

[۵] اس مسئلہ پر پوری طرح سے بحث بعد کو ہوگی۔

کے افسانے وہی قصہ سناتے ہیں جو لوگ پہلے سنتے اور سننا چاہتے تھے ۔ صرف ماحول کی مناسبت کے لئے آرائش بدل دی گئی ہے ۔

ذہنی ترقی بھی اس دور میں پرانے افسانوں میں نئی جان پھونکنے کے لئے ذریعہ دریافت کرتی ہے ۔ عورت کو سمجھنے، اُسے پرکھنے اور جانچنے والے پہلے شاعر، قصہ گو یا "تجربہ کار" لوگ ہوا کرتے تھے، اب اُن کے علاوہ "آرٹسٹ" بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو تصویروں اور مورتوں میں حسن کو نئے نئے رنگوں میں دکھاتے ہیں ۔ عورت کا جسم اُن کی ملکیت ہو جاتا ہے، اُن کے ہاتھوں میں ایک اوزار جس سے وہ جنسی جذبات کی آگ کو جتنا چاہیں بھڑکا سکتے ہیں ۔ فنونِ لطیفہ انسانیت کا ایک جوہر ہیں، اُن کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا ۔ راز و نیاز کی باتیں صرف انہیں کی زبان سے ہو سکتی ہیں ۔ یہی ایک ذریعہ ہو جس سے ایک دل کے لئے دوسرے کو اپنی حکایت سنانا ممکن ہے ۔ مگر یہ صرف اُسی وقت تک جب فنونِ لطیفہ جمالیات کے اوچھے نظریوں کا تماشا گاہ نہ بنیں، اور دین اور دل سے اُن کا تعلق باقی رہے ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان پر بھی پرانے افسانوں کا بہت جلد اثر ہونے لگتا ہے، اور وہ بھی اپنے طور پر انہیں سنانا شروع کر دیتے ہیں ۔

شاعر کی پہونچ صرف خیالات تک ہے، مصور اور صورت گر (Sculptor) خیالات کے ساتھ نظر کو بھی ناپاک کر دیتے ہیں ۔ پرانے افسانوں نے عورت کو مجسمہ حسن، مرد کو اداشناس مقرر کیا تھا اور عشق کے ہنگاموں میں قوم کو یہ بھلا دیا تھا کہ عورت کو مددگار، دوست اور غمگسار سمجھنا چاہئے ۔ فنونِ لطیفہ کا نیا افسانہ اُسے مجسمہ جنسیت اور شہوت بنا کر اُس سے ایک باعزت ماں اور بیوی ہونے کا امکان بھی چھین لیتا ہے، اور علاوہ جنسی جذبات کے اُس کا ہماری زندگی کے اور تمام پہلوؤں سے قطع تعلق کرا دیتا ہے ۔

اگر شاعری، قصہ، فنونِ لطیفہ اتنی روحانیت نہیں رکھتے کہ درمیان میں جو غلط فہمیاں حائل ہیں انہیں دور کر کے بچھڑوں کو ملا دیں، تو کم از کم علم اور عقل سے جو اس زمانہ میں خاص طور سے نشو و نما پاتے ہیں یہ امید کی جا سکتی تھی ۔ لیکن بجائے اس کے عالم اور علم قوم کو اپنے افسانے سناتے ہیں

ہوتے بالکل گمراہ نہیں کرتے۔

ہندوستان میں تعلیم اور خصوصاً انگریزی تعلیم پانے کا لڑکے پر سب سے پہلے یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے، اور اُن سے باتیں کرنا بھی اُسے ناگوار ہوتا ہے، کیونکہ اُس کے خیال میں اُن کی معلومات گفتگو کو دلچسپ اور سنجیدہ بنانے کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ یہی حال ہر قوم کے عالموں کا ہوتا ہے جب تک علم اُن کی نظروں میں ایک نئی اور نادر چیز ہوتا ہے۔ وہ عورتوں کو اپنی ذہنی عظمت کا اندازہ اور علم کی پوری عزت کرنے کا اہل نہیں مانتے، اور تحصیل علم اُن کے اور عورتوں کے درمیان میں ایک ایسی بیگانگی پیدا کر دیتا ہے جسے دور کرنا رفتہ رفتہ نہایت مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اُنہیں بعد کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عورت میں عالم بننے کی صلاحیت ہی نہیں، اور اگر وہ علم حاصل کرنے کی کوشش بھی کرے تو اُس میں غیر عقلی عنصر اِس قدر غالب ہے کہ وہ اُس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اِس افسانہ کے حامی افلاطون جیسے عظیم الشان فلسفی تک ہوئے ہیں۔

افلاطون اور اُس کے ہمخیال فلسفیوں کا نظریہ کہ عورت اپنے غیر عقلی عنصر کی وجہ سے علم اور عقل کو اپنا رہبر نہیں بنا سکتی، ایک حد تک صحیح ہے۔ عورتوں میں واقعی غیر عقلی عنصر مردوں سے عموماً بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن ہمیں اپنی فطرت پر غور کرتے کرتے معلوم ہو گیا ہے کہ دراصل مردوں کی طبیعت پر بھی غیر عقلی عنصر ہی راج کرتا ہے، اور یہ کوئی شرمانے یا افسوس کرنے کی بات نہیں، کیونکہ انسانیت کے معجزہ بھی اسی غیر عقلی عنصر نے دکھائے ہیں۔ افلاطون کا عقیدہ کہ عقل انسان کی رہبری کے واسطے کافی ہے تجربہ اور علم کی ترقی نے غلط ثابت کیا ہے۔ قومیں علمی ترقی کرتی ہیں، اِس سے اُن کی عقلیت بجائے بڑھنے کے اور گھٹتی ہے۔

افلاطون کا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مرد جنسی لحاظ سے بھی خود مختار بن سکتا ہے اگر اُسے جمالیات کی صحیح تعلیم دی جائے۔ یونانی طبیعت پر حسن کا بہت اثر تھا۔ اور "رواقیین" (Stoics) نے، جیسا کہ افلاطون کے فلسفہ سے ظاہر ہے، حسن کامل کو خدائی کا رتبہ دیا ہے۔ جہاں تک کہ انسان کی شکل و صورت سے تعلق تھا، یونانی آرٹسٹ (اور فلسفی) کا نصب العین عورت کا جسم نہیں بلکہ نوجوان

ہوگا تھا۔ یعنی اگر وہ حسن کامل کے تصور کو انسانی جسم میں ادا کرنا چاہتے تو وہ عورت کے جسم کو نہ بناتے،
بلکہ ایک نوجوان مرد کا، جس کے بدن پر جنسیت کے آثار پوری طرح سے نمایاں نہ ہوئے ہوں۔
یونانی جب عورتوں کا نقشہ پتھر پر کھینچتے ہیں تو اُن کی بناوٹ مردانی ہوتی ہے، خوبصورت مردوں
کی مورتوں میں برخلاف اس کے وہ نزاکت اور نرمی پائی جاتی ہے جو دوسرے ملکوں کے فن مصوری
اور عام مذاق کے مطابق عورت کے جسم میں ہونی چاہئے۔ آرٹ کے اس رجحان نے فلسفی کی مدد
کی اور جہاں عورت کے حسن سے انکار کیا گیا تھا وہاں اُس کی ہستی بھی غیر ضروری ثابت کی گئی، مگر
فلسفہ اور فنونِ لطیفہ جیسے دشمنوں کا اتحاد بھی فطرت کے قانون کو نہ بدل سکا۔ اور وہ اخلاقی تعلیم جو
فلسفہ اور جمالیات کا نچوڑ ہونے کا دعویٰ کرتی تھی، شہر سپارٹا کی ایک محض رسم بن کر رہ گئی۔ ایرانی جمالیات
پر ممکن ہے اس تعلیم کا اثر رہا ہو، مگر ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا گیا ہے۔

خود مختار مرد کے افسانہ کے ساتھ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود مختار عورت کے افسانہ کا بھی ذکر کردیا
جائے۔ خود مختار عورت اُس وقت نمودار ہوتی ہے جب قومی زندگی کا آخری دور ہوتا ہے، جب وہ
آرزوؤں اور جستجوؤں سے سیر ہو کر عیاشی میں مست ہو جاتی ہے۔ خود مختار عورت گویا قوم کی موت
کا پیغام لاتی ہے۔

عورت کی خود مختاری کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جنسی لحاظ سے وہ مرد کی ہستی کی محتاج نہیں رہتی
یا جیسے یورپ میں اس وقت، عورت کی تعلیم اس قدر ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت اور افسانہ کا فرق سمجھنے
لگتی ہے، اور اُن افسانوں کے ساتھ جو مردوں کی ناانصافی نے تصنیف کئے ہیں وہ اُن قوانین
کی مخالفت شروع کر دیتی ہے جن پر انسان کی زندگی بنی ہے۔ یعنی مردوں کی طرح وہ بھی آزاد
اور بد اخلاق ہونا اپنا آئین بنالیتی ہے، اور چونکہ فطرت کے فرائض ادا کرنا اس حالت میں مشکل
ہوتا ہے، وہ ماں بننے سے انکار کرنے لگتی ہے یا جیسے مشرقی تمدنوں میں ہوا ہے قوم پر جنسیت کا
بھوت اس طرح سے سوار ہوتا ہے کہ وہ اپنے پُرانے نصب العین، اخلاق، دین اور خدا کو
بھول جاتی ہے، اور مرد اور عورت دونوں اس قدر آزاد ہو جاتے ہیں کہ انہیں اُن حدود کا

خیال نہیں رہتا جو فطرت نے مقرر کئے ہیں، اور قوم کو زندہ رکھنے کے جو ذریعے فطرت نے رکھے ہیں اُس کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔

خود مختار عورت، انسانیت سے بے خبر انسان، یہ دردناک مظاہر (Phenomena) اسی دروغ گوئی اور دانستہ وہم پرستی کا نتیجہ ہیں جو قوم کی عورتوں کو پہلے ذلیل اور بعد کو گمراہ بنا دیتی ہے۔ مگر اُن افسانوں کے ساتھ جو مرد اپنی نفسی خواہشات پوری کرنے کے لئے سناتے ہیں، اُس افسانہ کا بھی ذکر لازم ہے جو شروع سے آخر تک تمام بھلے مانسوں کو زندہ رکھتا ہے، وہم اور دروغ گوئی کے ریگستان میں ایک نخلستان کی طرح پریشان نگاہوں کو تسکین دلاتا ہے، اور جنسیت کے عالم میں محبت، سادگی اور پاک دلی کا آشیانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ افسانہ ہے جس میں لوگ حقیقت کی جھلک دیکھ کر اور دوسرے افسانوں سے بیزار ہو کر پناہ لیتے ہیں۔ یہ عورت پر حسن لازم کرتا ہے نہ دلبری، عشق کے افسانوں سے گھبراتا ہے، جنسی جذبات کے اظہار کو منع کرتا ہے، اور ضرورت ہو تو علم اور عقل کو گھر کے اندر بالائی طاق رکھنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے مرد اور عورت کی زندگی کو امور خانہ داری کا ایک صیغہ قرار دیا ہے، اور جو کچھ گھر کے امن میں خلل پیدا کرتا ہے اُسے وہ اخلاقی گمراہی کہتا ہے۔ عورت کو خوش کرنے کے لئے وہ اُسے گھر کی رانی پکارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے، مرد کو روزی کمانے اور راج کو قائم رکھنے کا فخر عطا کرتا ہے۔ اس کا مدعا بس یہی ہے کہ میاں بیوی ایک دوسرے سے خوش رہیں، اور قوم کی آبادی میں اضافہ کرتے رہیں۔ یہ آرزو پوری کرنے کے لئے وہ سب کی پیٹھ ٹھونکنے پر راضی ہے، اور یہی اُس کو ہر دلعزیز بھی رکھتا ہے۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ محض کھانا پینا اور سو جانا انسان کے تمام فرائض پورے کرنے کے لئے کافی نہیں۔ حیوان کاہل کے لئے یہ نصب العین مقرر کیا جا سکتا ہے، انسان سے اور امیدیں ہوتی ہیں۔ اس افسانہ میں حقیقت کے خلاف جو رجحان ہے وہ یہ ہے کہ یہ روحانی بیقراری اور حق کی جستجو کا کوئی لحاظ نہیں رکھتا۔ اگر دل میں امنگیں رکھنے کی اجازت اس نے دی ہے تو صرف مرد کو۔ عورت کی فلاح اس افسانہ کے مطابق اسی میں ہے کہ چولھا پھونکے، روٹی پکائے

اور ہر سال ایک بچہ دے۔ ممکن ہے کہ صدیاں گزر جائیں اور قوم کی کسی عورت کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اپنی انسانیت سے غافل ہے، لیکن یہ زندگی بے معنی ہوتی ہے، کیونکہ یہ انسانوں کی زندگی نہیں بلکہ حیوانوں کی ہے۔ آدمی کو انسان وہی بیقراری اور آرزوئیں بناتی ہیں جن کی وجہ سے گھرانے کی خوشی، عورت کے لئے کھانا پکانا اور مرد کے لئے کھانا کھا کر سو جانا انسانیت کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ جسے یقین نہ آئے وہ افریقہ کی وحشی قوموں کا حال پڑھ لے۔ وہ صدیوں سے زندہ ہیں، صدیوں تک زندہ رہیں گی، لیکن اُن کی زندگی بالکل ویسی ہی ہے جیسی اُن جانوروں کی جن کے درمیان وہ رہتے ہیں، اور انہیں نہ اپنی خبر ہے نہ اپنے دل کی نہ اپنے خدا کی۔

مضمون کے شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ مردوں اور عورتوں کے تعلقات پر صحیح طور پر ہم غور اُس وقت کر سکتے ہیں جب ہم اپنی ذہنیت کو اُن افسانوں سے پاک کرلیں جو ہم نے سُنے ہیں، اور جن میں سے اکثر پر ہم کو اپنے معمول کے اثر سے خود اعتقاد ہو جاتا ہے مگر ہمیں معلوم ہوگیا ہے کہ محض ایک افسانہ کو اپنا آئین بنا لینا غلط اور مضر ہے۔ اب ہم حقیقت کی جستجو شروع کرتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

امریکہ کی سیاستِ خارجہ

رسالہ جامعہ کی کسی گزشتہ اشاعت میں سلطنتِ برطانیہ کی سیاستِ خارجہ پر ایک دلچسپ اور مفید مضمون شائع ہو چکا ہے۔ سلطنتِ برطانیہ کے دوسرے اندرونی سیاسی مسائل پر بھی اس جریدہ میں مضامین نکل چکے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستانیوں کی قسمت بُری ہو کہ بھلی چونکہ اس سلطنت کے ساتھ وابستہ ہے اس لئے اس کے سیاسی مسائل کو سمجھنا ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔ مگر دنیا سلطنتِ برطانیہ سے بڑی ہے اور ہر اُس شخص کے لئے جو دنیا کی سیاست کو سمجھنا چاہتا ہے ضروری ہے کہ وہ اُن عناصر سیاسی کے عمل اور ردِعمل سے بھی آشنا ہو جو خود اس عظیم الشان برطانوی سامراج کی قسمت پر اثر ڈالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ انہیں عناصرِ سیاسی میں سب سے اہم ریاستہائے متحدہ امریکہ ہیں۔ ذیل کی سطروں میں ہم ان متحدہ ریاستوں کی سیاستِ خارجہ کی تاریخ اور اُس کے مقاصد پر سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

ان کی خارجی سیاست کی تاریخ کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنی نظر ماضی میں دور تک لیجانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر ۱۸۹۳ء تک کے واقعات پر نظر ڈال لیجائے تو یہ تاریخ واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس سے پہلے تو ان ریاستوں کی سیاستِ خارجہ کا ذکر مشکل ہی سے کبھی دنیا کے سیاسی حلقوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتا تھا اور یہ اس لئے کہ اپنے وجود کی پہلی صدی میں امریکی اتحاد کو دنیا کی حکومتوں کی برادری میں کوئی مستقل حیثیت حاصل نہ تھی لیکن ۱۸۹۳ء میں اور اس سے بھی واضح طور پر پانچ سال بعد ۱۸۹۸ء میں اسپین کی نوآبادی قوت ان ریاستوں کے مقابلہ میں ٹوٹی تو اُس وقت یورپ نے حیرت و استعجاب کے ساتھ یہ حقیقت محسوس کی کہ "چچا سام" جن کا ذکر کبھی زیرِلب تبسم کے بغیر نہ ہوتا تھا اپنے عہدِ طفولیت سے نکل چکے ہیں

اور ریاستہائے متحدہ اپنے سن بلوغ کو پہونچکر وہ تمام دعاوی پیش کرنے کو تیار ہیں جو حکومتہائے عالم کی جماعت میں ایک بالغ رکن کا حق ہیں۔

۱۸۹۳ء میں شکاگو کی عظیم الشان نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریت کلیولینڈ نے ریاستوں کے عہد شباب کا اعلان یوں کیا: "ہمارے چاروں طرف امریکن حوصلہ مندی اور محنت کے جو نتائج اس وقت موجود ہیں اور امریکن ہنرمندی اور ذہانت کے جو شواہد ہمارے سامنے ہیں انہیں دیکھنے کے بعد ہمیں ذرا اندیشہ نہیں کہ ہماری تبریک و تحسین کو کوئی مبالغہ آمیز بتا سکے گا۔ آج ہم دنیا کی قدیم ترین قوموں کے دوش بدوش کھڑے ہو کر انہیں اپنے کام دکھاتے ہیں اور اپنی کم سنی کا عذر پیش کر کے اُن سے کسی رعایت کے طالب نہیں۔"

یہ سچ تھا کیونکہ طفولیت اور صغر سنی کے فرائض کو اتحاد امریکہ نے نہایت خوبی سے انجام دیا تھا۔ دونوں سمندروں کے بیچ میں ایک طرف کنیڈا تک دوسری طرف ریو گرانڈ تک تمام رقبہ زمین آباد ہو چکا تھا۔ پردیسیوں کی مدد سے مغرب اوسط اور مغرب قریب کے عظیم الشان میدانوں میں ہل چلنے لگے تھے۔ اور غلہ کی ایسی کاشت شروع ہو گئی تھی کہ ۱۸۸۰ء سے یہاں کی پیداوار کا مقابلہ یورپ کی زراعت کو خوفزدہ کئے ہوئے تھا۔ دھرتی کے پیٹ میں جو خزانے تھے وہ نکالے جا رہے تھے اور اُن سے ایک بہت بڑی صنعت کی بنیاد پڑ گئی تھی۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۹۳ء تک صنعت کو برابر فروغ ہو رہا تھا۔ ۱۸۹۰ء میں میکنلے نے اور ۱۸۹۷ء میں ڈنگلے نے اپنی تامینی سیاست سے صنعت کو اور سہارا دیا اور اس حیثیت پر پہونچا دیا کہ تمام آبادی کی ضرورتیں خود ملک میں پوری ہونے لگیں اور زائد پیداوار کے لئے حدود کے باہر منڈیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۸۹۱ء سے ریاستہائے متحدہ نے جتنا پردیس سے خریدا اُس سے زیادہ پردیسیوں کے ہاتھ بیچا۔

ملک کے دستور اساسی میں جو متنازع فیہ مسائل تھے وہ بھی حل ہو چکے تھے۔ جنگ انفکاک میں شمالی ریاستوں کی فتح اتحادی رجحان کی فتح تھی۔ ادھر غلامی کے سدباب سے نئے

مرکزی یا اتحادی ریاست کا مسئلہ بھی طے کر دیا تھا۔ اور اب وہ ۴۸ ریاستیں جن کے ستارے امریکن پھریرے کی زینت ہیں اگرچہ اپنی اپنی جگہ پر کافی خود مختاری رکھتی تھیں لیکن ان میں سے کسی کو دوسروں سے جداگانہ وجود کا نہ احساس تھا نہ دعویٰ۔

لہٰذا جب ۱۹ ویں صدی کے اواخر میں سیاست عالم کے مسائل تمام کرۂ ارضی پر پیدا ہونا شروع ہوئے اور عالمی سیاست اور پختہ سامراج کا دَور شروع ہوا تو یہ اتحاد امریکی نہایت قوی اور متحد سیاسی طاقت کی حیثیت سے میدان میں موجود تھا اور اُس کی پشت پر نہایت عظیم الشان معاشی قوت تھی۔ یورپ نے دیکھا کہ یہ طاقت اِس کے سیاسی کھیلوں سے الگ نہیں رہنا چاہتی اور اِس کی صنعت نئے بازاروں کی تلاش میں ہے اور ضرورت ہو تو اُن کے حصول کے لئے فوجی قوت کے استعمال سے بھی دریغ نہ کریگی۔ چنانچہ جب امریکن سرمایہ داری کے نمائندوں یعنی صدرِ جمہوریت میکنلے اور روزولٹ نے عالمی سیاست میں امریکہ کو داخل کیا تو اُسی وقت سے اُن کی سیاستِ خارجہ کے اصول بھی یکسر تبدیل ہو گئے۔

جارج واشنگٹن نے جب اپنے ملک کو آزاد کرنے کا کام ختم کر دیا تو ۱۹ دسمبر ۱۷۹۶ء کو اپنے الوداعی خطبہ میں اُس نے اپنی قوم کو یہ نصیحت کی تھی کہ وہ یورپ کے معاملات میں دخل نہ دے۔ "ایک قوم بنو، امریکن بنو، اور خود اپنے نفس کے ساتھ وفادار رہو۔" اِس نصیحت نے گویا سیاست خارجہ کا دروازہ بالکل بند کر دیا تھا اور بعد میں ۲ دسمبر ۱۸۲۳ء کو صدر جمہوریت جیمس منرو نے اِس اصول کو امریکن سیاست کی بنیاد قرار دیدیا۔ اُس نے جب یہ اعلان کیا کہ "امریکہ امریکہ والوں کے لئے ہے" تو جہاں امریکن معاملات میں یورپ کی مداخلت کا دروازہ بند کیا وہیں یورپ کے مسائل میں امریکن مداخلت کو ممنوع قرار دیا۔ اس اعلان میں منرو نے براعظم امریکہ کا نام لیا تھا اور یہ اس آرزو کے اظہار کی ابتدا تھی کہ انگریزی اور ہسپانی امریکہ دونوں مل کر یورپ کے مقابلہ میں ایک وجودِ واحد بنجائیں اور یوں اِس پان امریکی خیال کی بنیاد ڈالی تھی جسے بعد میں ہنری کلے نے بہت فروغ دیا۔ اِس خیال

کی بہت کچھ حمایت ہوئی اور متعدد بار امریکی کانگریس میں ہوئیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اسے واقعی کوئی خاص اہمیت حاصل ہو سکی لیکن یہ ضرور ہوا کہ منرو کا مسلک کہ یورپ براعظم امریکہ کے معاملات میں مداخلت کرنے کا حق نہیں رکھتا رفتہ رفتہ تسلیم ہوتا گیا اگرچہ قانونِ بین الملک میں اس کی کوئی باضابطہ حیثیت نہ تھی۔ ۱۸۹۰ء سے تو خود یورپ کی حکومتوں نے اس اصول کو تسلیم کرنا شروع کر دیا۔

لیکن منرو کے مسلک کی ایک دوسری تعبیر بھی ہوئی۔ اور وہ یہ کہ امریکہ میں دولِ یورپ کی جو نوآبادیاں ہیں وہ بھی ختم ہوجانی چاہئیں۔ چنانچہ یہ کوشش شروع ہوئی کہ ہسپانی۔ امریکی ریاستوں سے تجارتی تعلقات بڑھائے جائیں اور ریاستہائے متحدہ کے لئے وہ تمام حقوق وفوائد حاصل کئے جائیں جو دولِ یورپ حاصل کر رہی تھیں۔ اس نئی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کی یوں کوشش کی گئی کہ سان ڈومنگو اور کیوبا حاصل کرنے گئے اور مشرقی اور مغربی سمندروں کے درمیان ایک نہر بنانے کے حق کو ریاستہائے متحدہ ہی کیلئے محفوظ رکھنے کی کوشش شروع ہوئی۔ لیکن یہ سب باتیں ابھی ابتدائی تھیں۔ آرزوئیں تھیں جن کا پورا ہونا دشواریوں سے خالی نہ تھا۔ نہر کی تعمیر میں کلےٹن اور بلور کا عہدنامہ حائل تھا جو انگلستان سے ۱۸۵۰ء میں ہوا تھا۔ لیکن نقطۂ نظر میں تبدیلی برابر ہو رہی تھی۔ بحر الکاہل میں امریکہ کی دلچسپی برابر بڑھتی جاتی تھی، خود اپنی نوآبادیاں حاصل کرنے کے خیال کی کشش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اور تجارتی اغراض کی خاطر کل براعظم امریکہ کو یورپ سے علیحدہ کرنے کی خواہش قوی ہوتی جاتی تھی۔ لیکن ابھی یہ احساس کسی کو نہ تھا کہ ان خواہشات اور ارادوں میں وہ بنیادی ضرورتیں نہاں ہیں جو آگے چل کر سامراج کو امریکہ کی سیاستِ خارجہ کا بھی طغرائے امتیاز بنانے والی ہیں۔

۱۹ ویں صدی کے اواخر میں امریکی سیاستِ خارجہ میں یہ خصوصیت پیدا ہوگئی۔ اندرونی معاشی طاقت کا احساس جوں جوں بڑھتا جاتا تھا، توسیع کی خواہش میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ ۱۸۹۸ء میں ہسپانیہ سے جو نوآبادیات کی جنگ ہوئی اور اُس میں کامیابی نصیب ہوئی تو یہ

سال امریکن تاریخ کا نہایت اہم سال بن گیا۔ اور اس سال سے امریکہ سمجھنے لگا کہ قدرت نے اب ظاہر طور پر بتلا دیا ہے کہ اس قوم کے لئے مقسوم ہے کہ وہ ایک خود مختار اور فاتحانہ سیاست معاشی دماغی کی حامل بنے۔ اسی وقت سے انہوں نے واشنگٹن کے الوداعی خطبہ اور منرو کے مسلک سیاسی کو پس پشت ڈالنا شروع کر دیا اور یورپ کے معاملات اور معاشی امور میں برابر شامل ہونا شروع کیا جس کا خاتمہ آکر جنگ عظیم میں شرکت کی صورت میں ہوا۔ مغربی جزائر ہند اور وسطی امریکہ، جنوبی امریکہ، بحرالکاہل اور مشرق بعید ان سب میدانوں میں امریکہ کی سامراجی سیاست چلنے لگی۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ ملک کے اندر سیاسی فرقوں کی باہمی رقابت نے ایک طرف اور دنیا میں توازن دول نے دوسری طرف واشنگٹن کے محکمۂ خارجہ کو باوجود اپنی بے حساب قوت کے ۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۴ء تک کوئی قابل ذکر کامیابی نصیب نہیں ہونے دی اور وسطی امریکہ اور مغربی جزائر ہند کے علاوہ اور کہیں قدم بڑھانے کا موقع تک نہ ملا۔

نقشہ علیحدہ ملاحظہ ہو

مغربی جزائر ہند کے قدیم میدان کارزار میں نو آبادیاتی امریکہ نے پورٹو ریکو اور کیوبا فتح

کرکے قدم جمائے تھے اور وہاں انگلستان کے اقتدار کو نقصان پہنچنے لگا۔ کیوبا یوں ہے تو خود مختار لیکن اس کی سیاست خارجہ تمامتر ریاستہائے متحدہ امریکہ کے زیر اثر ہے۔ اس پر مزید اضافہ یہ ہوا کہ نہر پناما کی تکمیل ہو گئی اور اس کے متعلق جو سیاسی مسائل پیدا ہوئے اس میں انگلستان کے مقابلہ میں ریاستہائے متحدہ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ریاستوں نے اپنے کو کلیٹن بلور عہد نامہ سے آزاد کر لیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ نہر پناما امریکہ نے بنائی اور امریکہ کے زیر اقتدار ایک خالص امریکن شاہراہ جہاز رانی بن گئی۔ بلکہ سنہ ۱۹۱۲ء میں تو یہ کوشش تک ہوئی کہ سنہ ۱۹۰۱ء کے معاہدہ کی بھی خلاف ورزی کرکے انگریزی جہازوں پر امریکن جہازوں کو ہر طرح ترجیح دی جائے۔ اور اس سے ہوا کے رُخ کا پتہ چلتا ہے کہ اگر خود ولسن کی جمہوری حکومت قانونی حق کو تسلیم نہ کر لیتی تو انگلستان اس کے خلاف کچھ نہ کر تا نہ کر سکتا۔ اور ولسن نے یہ اس لئے کیا کہ جغرافی موقع کی وجہ سے امریکہ کو جو فوائد حاصل ہیں وہ خود اس قدر کافی ہیں کہ کسی غیر معمولی ترجیح کی ضرورت نہیں۔ نہر پناما کی وجہ سے امریکہ کو غیر معمولی قوت حاصل ہو گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نہر کا مقابلہ بلحاظ بین الاقوامی اہمیت نہر سویز سے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ریاستہائے متحدہ کے لئے اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس کی وجہ سے مملکت کے مشرق و مغرب کا درمیانی فاصلہ بہت کم ہو گیا ہے، اس کی وجہ سے جنوبی امریکہ کی مغربی ریاستیں شمالی امریکہ کے زیر اثر آگئی ہیں اور سب سے بڑھکر یہ کہ اس کی وجہ سے بحر الکاہل میں امریکہ کی قوت جاپان کے مقابلہ میں بڑھگئی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء کو صدر جمہوریت نے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اس نہر کا افتتاح کیا تھا۔ اس نہر کے بعد کو زمین کے دھس جانے سے اکثر رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں لیکن یہ زیادہ قابل لحاظ نہیں اور سنہ ۱۹۱۹ء میں معلوم ہو گیا کہ نہر بڑے سے بڑے جنگی جہازوں کے گزرنے کے لئے کام میں آسکتی ہے۔

اس نہر کے جاری ہونے کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ جمہوریہ پناما تقریباً بالکل ریاستہائے متحدہ

کے ہاتھ میں آگئی اور اس کی حیثیت اس نہر پر "چچا سیم" کے چوکیدار کی سی ہو گئی۔ اُدھر نائیکاراگوا کی نہر کا قصہ ختم ہوا لیکن مزید اطمینان کے لئے ریاستہائے متحدہ نے ۱۹۱۳ء میں حکومت نائیکاراگوا سے ایک عہد نامہ بھی کر لیا جس کی رُو سے انہیں ایک بحری مرکز، مداخلت کا حق اور خارجی سیاست پر پورا قابو حاصل ہو گیا۔

میکسکو سے تعلقات کی نوعیت بھی بدل گئی۔ یوں تو مدت سے تجارت اور روپیہ کے لین دین کی وجہ سے میکسکو برابر ریاستہائے متحدہ کے جال میں پھنس رہا تھا۔ لیکن ۱۹۱۱ء میں جب مٹی کے تیل کے ذخیرے وہاں برآمد ہوئے تو ریاستہائے متحدہ کے لئے میکسکو کے مسئلے نے بھی بہت اہمیت اختیار کر لی۔ پورفیریو دیاز نے بہترین مراعات انگریزوں کی پیرسن کمپنی کو دے ڈالے اور اس کی مخالفت "امریکن اسٹینڈرڈ آئل کمپنی" نے نہایت شد ومد سے کی۔ چنانچہ منجملہ دیگر اسباب کے یہ بھی ایک وجہ تھی کہ ڈیاز کا اقتدار ۳۵ سال تک تقریباً مطلق العنان قایم رہنے کے بعد یکلخت ختم ہو گیا۔ اس وقت سے برابر میکسکو سے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔ اور بارہا یہ نوبت آئی ہے کہ بس اب جنگ ہوئی لیکن کچھ تو یورپ کی متحدہ مخالفت کا خیال کچھ جاپان کا اثر کہ امریکہ نے اس جھگڑے کو ٹالا ہے۔ اور سیاست عالمی کے اوّل دور میں امریکہ کو اس میدان میں معتدبہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

رفتہ رفتہ شمالی امریکہ کا اثر جنوبی امریکہ میں اور بحرالکاہل کے مسئلہ میں بھی بڑھا ہے۔ متعدد کانگریسوں، تقریروں، لسانی تحقیقاتوں، عجائب خانوں غرض طرح طرح کے ذرائع سے براعظم امریکہ میں وحدت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش برابر جاری ہے۔ لیکن پھر بھی جنوبی امریکہ کو اپنے ساتھ ملانے میں بہت سی دشواریاں ہیں۔ لیکن یہ اس وجہ سے نہیں کہ یورپ کو اپنی نوآبادیوں کی وجہ سے ابھی تک وہاں ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ کیونکہ جب کبھی جنوبی امریکہ کی حکومتوں نے یورپ کی قرضخواہ دول کے ساتھ بدمعاملگی کی اور اُن کے سرمایہ دار چلائے ہیں کہ جنگ کر کے اُن کے حقوق منوائے جائیں تو کبھی بھی دول

یورپ نے اِس پر آمادگی ظاہر نہیں کی بلکہ کالوو اور درگو کے مسلک کی رو سے جو رفتہ رفتہ مسلک منرو کا جزو بنگیا ہے، یہ قرار پاگیا ہے کہ بدمعاملگی کے سلسلہ میں کسی غیر امریکن قوت کی جنگی کارروائی حق بجانب نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ ہاں تو شمال اور جنوب میں مغائرت کی وجہ یورپ نہیں ہے بلکہ جنوب کی بڑی بڑی ریاستیں چلی، ارجنٹائن اور برازیل اپنے معاشی اغراض کے اعتبار سے یورپ کی طرف جھکتی ہیں اور مذہبی اور نسلی اعتبار سے شمال سے بالکل جدا ہیں اور نہیں چاہتیں کہ کسی ایسے امریکی اتحاد میں شامل ہوں جسکی قیادت شمال کے ہاتھ میں ہو۔

ہاں۔ امریکن منصوبوں اور مسلک منرو کے اطلاق سے بالکل جدا براعظم امریکہ کا ایک حصہ ہے جو جنگ آزادی میں انگلستان کے پاس رہ گیا تھا اور وہ کینیڈا ہے۔ اِس نے نہیت تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے اور بساطِ سیاست پر یہ امریکن سامراج کے مقابلہ میں برطانوی سامراج کا مہرہ ہے۔ چنانچہ جب سے اورگان کے مسئلہ کے بعد انگلستان اور شمالی امریکہ میں سرحدی تنازعہ کا فیصلہ ہوا ہے تو ریاستہائے متحدہ نے سرحدی معاملہ کو کبھی نہیں چھیڑا اور اسے انگریزی قوت کے قوی باقیات سے تعبیر کرکے خاموشی سے اِس کے وجود کو تسلیم کیا۔ لیکن یہ سوال ضرور پیش کیا جاتا رہا کہ آیا انگلستان اور اِس کی اِس نوآبادی کے نسلی اور سیاسی تعلقات زیادہ قوی ثابت ہوں گے یا وہ جغرافی اور معاشی رشتے جو کینیڈا کو ریاستہائے متحدہ سے وابستہ کرتے ہیں۔ کینیڈا کے شمال و مغربی حصہ میں خاصی تعداد امریکن کسانوں کی آباد ہے اور ریاستہائے متحدہ کی شہری آبادی جوں جوں بڑھیگی اور غلہ کی مانگ خود ملک میں پوری نہو سکیگی تو ظاہر ہے کہ کینیڈا سے غلہ کی مانگ بڑھیگی اور معاشی تعلقات زیادہ گہرے ہوتے جائیں گے۔

امریکن سیاستِ خارجہ کی ایک خصوصیت بحرالکاہل کے مسئلہ میں اُس کی روزافزوں دلچسپی ہے ۱۸۹۸ء میں جزائر ہوائی کا الحاق ہوا اُسی سنہ میں جزائر فلپائن حاصل کئے

گئے اور سنہ [illegible] میں مسئلہ سموا حل ہوا۔ اور ان واقعات نے ریاستہائے متحدہ کو بحر الکاہل کے مسئلہ میں ایک نہایت قوی طاقت بنا دیا۔ اور یہ انگلستان کے (آسٹریلیا) بحر جنوبی میں ہالینڈ کی نوآبادی قوت کے، اور جاپان کے مقابل کی ایک طاقت بن گئیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ چین میں جب سنہ ۱۹۰۰ء اور سنہ ۱۹۰۱ء میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں اور مشرقی ایشیا میں اثر اور تصرف کے مسائل پیدا ہوئے تو امریکہ نے نہایت گہری دلچسپی کا ثبوت دیا۔ یہ چین کی خودمختاری اور "سب کے لئے کھلے دروازہ" کے مطالبہ کا حامی بنا۔ چین میں جو ریلیں بننا شروع ہوئیں اُس میں اُس نے خوب حصہ لیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں امریکن وزیر روٹ اور جاپانی سفیر تاکاہیرا میں جو معاہدہ ہوا اُس کی رو سے دونوں طاقتوں نے چین میں حالات کو بدستور قائم رکھنے اور چین کی خودمختاری کے ضامن بننے نیز سب کے لئے چین کا دروازہ کھلا رکھنے کا تہیہ کیا۔ جنگ عظیم تک اسی معاہدہ نے جاپان اور امریکہ کے تعلقات کو استوار رکھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب چینی شاہی حکومت تباہ ہوگئی اور جمہوریت کے قیام سے جو بے ترتیبی مشرق بعید میں پیدا ہوئی اُس سے امریکہ کی دلچسپی اور بھی بڑھی۔ چار حکومتوں نے ملک چین کو جو قرض دینا چاہا تھا اُس میں یہ انگلستان، فرانس، اور جرمنی کا شریک بنا۔ اور بعد کو جاپان اور روس بھی اس میں شریک ہوگئے۔ ولسن جب برسر حکومت آیا تو اُس نے امریکہ کو اس قرض میں شرکت سے علیحدہ کرلیا۔ اور اس کے بجائے امریکن سرمایہ داروں کی اشک شوئی اس سے کی کہ دوسرے طریقوں سے اُن کے لئے آزاد مقابلہ اور بے روک ٹوک کاروبار کے مواقع پیدا کئے۔ اس طرز عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان سے تعلقات کشیدہ ہوگئے کیونکہ یہ بھی چین کو اپنے حلقۂ اثر میں لینا اور شمال میں اپنا اقتدار جمانا چاہتا تھا۔ یہ مخالفت بڑھتی ہی گئی اور اسمیں نسلی مخالفت اور رنگ کے تعصبات نے اور اضافہ کیا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں پردیسیوں کو کیلیفورنیا میں اراضی حاصل کرنے کی ممانعت ہوگئی اور جاپان نے بھی جنوبی اور وسطی امریکہ میں ریشہ دوانیاں شروع کردیں۔

سیاستِ عالم کے دوسرے میدانوں میں امریکہ کا حصہ زیادہ قابلِ ذکر نہیں رہا۔ دولِ یورپ کی سیاست پر اس کا اثر ضرور بڑھتا گیا لیکن اُن کے اہم معاملات میں مثلاً افریقہ کی تقسیم، ترکی کی قسمت، بغداد ریلوے کی تعمیر وغیرہ میں اِسے کچھ دخل نہیں رہا۔ مجموعی حیثیت سے یہ کہنا چاہیئے کہ معاشی قوت کی ترقی اور سرمایہ داری کے اقتدار کے ساتھ امریکہ نے بھی اپنی معاشی اغراض کے مطابق ایک سامراجی سیاست کی ابتدا کر دی تھی لیکن اس کا میدانِ عمل ہر جگہ دولِ یورپ سے ٹکر نہ کھاتا تھا۔ سامراجی سیاست کے جو نتائج فوج اور بیڑے پر پڑتے ہیں وہ یہاں بھی پڑے۔ صدر جمہوریت روز ویلٹ نے امریکن جنگی بیڑے کو بڑھانے کی پوری کوشش شروع کر دی اور اس میں بہت کامیابی بھی ہوئی۔ لیکن تجارتی جہازرانی میں یہ دولِ یورپ سے پیچھے رہے۔

جنگ سے ۲۰ سال قبل کی اس سیاستِ خارجہ نے اندرونِ ملک میں بھی طرح طرح کے نتائج پیدا کئے۔ سب سے پہلی بات تو یہ محسوس کی گئی کہ سامراج اور جمہوریت کا پورا پورا ساتھ مشکل ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ سامراجی جھگڑوں میں آئین ساز جماعت کا اثر کم ہوتا جاتا ہے اور حکومت کے نفاذی پہلو یعنی صدر کا اثر روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ اور صدر کے روز افزوں اثر کو اس وجہ سے اور بھی محسوس کیا گیا کہ اس کا انتخاب سرمایہ داری اغراض سے بہت کچھ متاثر ہوتا ہے۔ امریکن سیاست میں سامراج کی حامی ریپبلکن (Republican) جماعت ہے اور اس کی مخالف ڈیموکریٹک (Democratic) جماعت۔ سرمایہ داری کے اثرات کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۹۶ء سے ۱۹۱۴ء تک تین صدر اول الذکر اور ایک مؤخر الذکر جماعت سے منتخب ہوئے۔ اور اس ایک نے بھی اگرچہ اخلاق اور جمہوریت کے متعلق باتیں بہت کیں لیکن میکسکو اور جنوبی امریکہ میں بحر الکاہل اور مشرقِ بعید میں اس کی اور مخالفین کی سیاست میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا۔ اور سامراجی سیاست کے خلاف اس کی جماعت کی جد و جہد روز بروز کمزور پڑتی گئی۔

اس سیاست کی بنا پر ۱۹۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ کا رویہ کیا ہونا چاہئے تھا؟ قدیم الایام سے فرانس کے ساتھ تو ان ریاستوں کو خاص ہمدردی تھی، اور انگلستان کی طرف سے بعض حلقے بے تعلق تھے بعض مخالف۔ اس نئی سیاست نے جاپان سے البتہ تعلقات کشیدہ کرا دئے تھے ورنہ ریاستہائے متحدہ ہر طرح آزاد تھیں کہ جدھر چاہیں جھکیں۔ یورپ کے ممالک عام طور پر امریکہ کی معاشی ترقی اور سیاسی اثر کو فکرمند نگاہوں سے دیکھتے تھے ۱۹۰۲ء میں انگلستان کے مشہور صحیفہ نگار ولیم ٹ۔ اسٹیڈ نے اپنی کتاب "دنیا کا امریکانا" میں جو خیالات ظاہر کئے تھے وہ اگرچہ مبالغہ آمیز تھے لیکن یورپ کی ذہنیت کی صحیح ترجمانی کرتے تھے۔ لیکن ۱۹۰۹ء کے بعد سے جرمنی اور انگلستان میں تعلقات برابر کھنچتے جاتے تھے۔ انگلستان نے محسوس کرلیا تھا کہ جرمنی سے جنگ آرہی ہے چنانچہ اُس نے ہر معاملہ میں امریکہ کی طرفداری اور اپنے حقوقِ قانونی تک میں اُس کے سامنے دَب جانا شروع کر دیا تھا۔ پھر لسانی، نسلی، تمدنی رشتے ایسے تھے کہ امریکن صحافت کے ذریعہ اُن سے بہت کچھ سیاسی کام لیا جا سکتا تھا اور لیا بھی گیا۔ اِدھر امریکہ کی معاشی سیاست تامینی اور جرمنی کی سیاسی ابلہی نے اُسی زمانہ میں دونوں ممالک کے تعلقات کو کچھ بہت اچھا نہ رہنے دیا تھا۔ اس معاشی مقابلہ نے امریکہ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ جرمنی کی بڑھتی ہوئی معاشی طاقت سے اپنے کو محفوظ رکھنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ جرمنی نے اس صورتِ حال کو سمجھا اور ۱۹۰۱ء سے کوشش شروع کی کہ امریکہ سے تعلقات دوستانہ ہو جائیں۔ سیاست عالم میں دونوں ملکوں کے ایک سے اغراض پر زور دیا گیا لیکن دونوں ملکوں میں سیاسی ذہنیت اس قدر مختلف تھی، امریکہ کے معاشی حلقوں میں جرمنی سے رقابت کا جذبہ اتنی جگہ پکڑ چکا تھا، اور انگریزی پروپیگنڈا کی بے پناہ سرگرمیاں اس حد تک پہنچ چکی تھیں، اور ان سب پر مستزاد یہ کہ جرمنی سیاسی میدان میں امریکہ کو جو کچھ دے سکتا تھا وہ اس قدر حقیر تھا کہ جب جنگ شروع ہوئی ہے تو درحقیقت امریکہ کی سیاسی طرفداری کا مسئلہ طے شدہ سا تھا۔

جنگ عظیم میں شرکت اور اُس کے نتائج نے امریکہ کو سیاستِ عالم میں پہلے سے بہت زیادہ طاقتور بنا دیا ہے۔ امریکہ کے علاوہ صرف جاپان ہی ہے جو اس جنگ سے معاشی اور مالی لحاظ سے کمزور نہیں ہوا ہے۔ ورنہ فاتح اقوام کی آبادی بھی گھٹی ہے، حکومتوں کا قرض بڑھا ہے، فتح کی وجہ سے ایسی ذمہ داریاں سر پڑی ہیں جن کے لئے اُن کی قومیں ساتھ ساتھ نہیں بڑھیں، انکے مقابلہ میں امریکہ کی قربانیاں بہت کم ہیں اور اُس نے فتح کا سودا بہت سستے داموں کر لیا ہے۔ یہ اپنے ساتھیوں کے مقابلہ میں مطلقاً اور اعتباراً دونوں حیثیت سے آگے بڑھ گیا ہے ریاستہائے متحدہ ساری دنیا کی ساہوکار بن گئی ہیں۔ دوران جنگ میں انہوں نے ۵ ملیارڈ ڈالر کا پرانا قرضہ اُتارا اور اپنے حلیفوں کو ۱۰ ملیارڈ ڈالر اور قرض دئے!

آج امریکہ کے پاس سیاست کے میدان میں اپنے تمام پرانے وسائل موجود ہیں اور انہیں پہلے سے زیادہ تنظیم ہے۔ کئی ملین قواعد داں سپاہی آج اُس کے پاس ہیں۔ بہت بڑا جنگی بیڑا ہے۔ سامان جنگ اور جہاز سازی کی صنعتیں قائم ہو گئی ہیں۔ اور اب حملہ آور مدافعت کا سب سامان خود تیار کر سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں اُس نے ۳۰ لاکھ ٹن وزن کے جہاز بنائے، ۱۹ء میں ۴۰ لاکھ ٹن کے اور انہیں سنوں میں انگلستان نے بالترتیب تقریباً ۱۳ اور ۱۶ لاکھ ٹن کے جہاز تیار کئے۔

غرض امریکہ کی قوت آج ایسی ہے کہ وہ ہر میدان میں اس قوت کے بھروسہ پر اپنے اغراض کے موافق سیاست برت سکتا ہے۔ اسوقت امریکن سیاستِ خارجہ کی توجہ کن مسائل کی طرف ہے وہ مختصراً درج ذیل ہیں:۔

۱۔ کینڈا سے تعلق:۔ اس بارہ میں بھی جنگ کے اثرات امریکہ کے موافق ہی پڑے ہیں۔

۲۔ جزائرِ مغربی ہند کا مسئلہ:۔ یہاں امریکہ نے اپنی قوت کو ڈینمارک کا حصہ حاصل کر کے قوی کر لیا ہے اور مزید تقویت کا امکان اس طرح بھی بتایا جاتا ہے کہ امریکہ نے اپنے حلیفوں کو جنگ میں جو قرض دیا ہے اُسے کُل یا جزوی طور پر معاف کرے اور اُس

کے عوض میں یہ جزائر حاصل کرے۔

۳۔ میکسکو کا مسئلہ:۔ یہ ہنوز بہت پیچیدہ صورت میں ہے اور یہاں تیل کی یافت کے باعث ہر وقت کسی شدید تنازعہ کا احتمال ہے۔

۴۔ جنوبی امریکہ سے تعلق۔ یہاں بھی جنگ نے ریاستہائے متحدہ کو تقویت پہونچائی ہے۔ اس لئے کہ دوران جنگ میں جنوبی امریکہ کی ریاستوں کے تعلقات یورپ سے منقطع سے تھے۔ امریکہ نے اس زمانہ میں انہیں خوب قرض دیا۔ ۱۹۱۳ء میں ریاستہائے متحدہ سے ان ریاستوں میں ۱۴۶ ملین ڈالر کا سامان جاتا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں ۱۱۴ ملین ڈالر کا سامان گیا۔

۵۔ مشرق بعید کا مسئلہ:۔ جاپان سے کشیدگی کم کئے کم نہیں ہوتی۔ کیلیفورنیا میں جو جاپانی جا کر بسے ہیں انہیں باربار قومی خطرہ بنایا جاتا ہے۔ حالانکہ صرف ایک لاکھ جاپانی وہاں آباد ہیں اور انکے پاس ۸۰ ملین ایکڑ زمین ہے۔ جس ملک کے پاس ۵½ لاکھ تیار فوج ہو اور جس کے ڈھائی کروڑ آدمی ضرورت کے وقت میدان جنگ میں آسکتے ہوں اُسے اس تعداد سے نہ ڈرنا چاہئے لیکن دوسرے مقامات پر معاشی و سیاسی اغراض کا تصادم ہے اس لئے رائے عامہ کو ابھارنے کے لئے ان جاپانیوں سے نفرت پیدا کرائی جاتی ہے۔ امریکہ پر اگر جاپان کی ضرب کاری پڑسکتی ہے تو وہ جزائر فلپائن میں۔ اس خطرہ سے بچنے کے لئے ہمیشہ فلپائن کو حکومت خود اختیاری دینے کی تجاویز زیر غور رہتی ہیں۔

لیکن اصل چیز جس کا اثر امریکہ اور جاپان کے تعلقات پر ہے وہ چین کا مسئلہ ہے۔

۶۔ یورپ سے تعلق:۔ اس بارہ میں جیساکہ اوپر ذکر ہو چکا ہے امریکہ منرو مسلک کا پیرو تھا لیکن جنگ عظیم میں وہ یورپ کے سب سے بڑے جھگڑے میں شریک ہوا۔ اب پھر اُس کی کوشش ہے کہ الگ تھلگ رہکر صرف ساہوکار کی حیثیت ہو جائے۔ لیکن

جنکی سیاسی پارٹیاں اِس قدر بڑھ گئی ہیں کہ یہ چنداں آسان نہیں ۔

اِن مسائل میں سے ہر ایک مستقل مطالعہ اور غور کا طالب ہے ۔ امید ہے کہ وقتاً فوقتاً جامعہ کے پڑھنے والوں میں سے کوئی نہ کوئی اُن پر روشنی ڈالتا رہے گا ۔

جنگ کا حق اور موجودہ ضمیر انسانیت

انسان کی زندگی میں یہ ایک عجیب متضاد منظر نظر آتا ہے کہ ہر زمانہ میں اس نے امن کی تمنائیں اور امیدیں قائم کیں اور ہر زمانہ میں وہ آپس میں دست وگریباں ہوا۔ ہر قوم کی تاریخ جنگوں کی ایک مسلسل کڑی ہے جس میں صرف بعض اوقات امن کے قلیل وقفے نظر آتے ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی قوم نہیں ہے جسکی اپنی فتوحات اور اپنی شکستیں نہ ہوں۔

کیا پھر جنگ امن کی ناگزیر شرط ہے؟ وہ امن جو اس قدر قلیل، ادھورا اور نامکمل ہو اور جو ہمیشہ آئندہ مکمل امن کی امید اور تلاش میں نئی جنگ کا سبب ہوتا ہے۔ یا پھر انسانیت ایک چکر میں پھنسا ہے کہ امن کے لئے جس کی وہ اس قدر خواہشمند ہے ہمیشہ جدوجہد کرتی ہے لیکن ہمیشہ جنگ میں مبتلا ہو جاتی ہے جس سے اُسے اس قدر نفرت ہے۔

موجودہ زمانہ کے عملی آدمی، قانونِ فطرت کے مفسر اور حکما جواب دیتے ہیں کہ جنگ ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی چونکہ انسان کی فطرت یہی ہے۔ مورخ تمام دنیا کی جنگوں کو پیش کرکے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں اور دنیا کے قنوطیئن اسے قسمت کا ایک تاریک باب قرار دیتے ہیں۔

موجودہ انسانیت کا ضمیر اس خوفناک جواب سے مطمئن نہیں ہوتا چونکہ اس کا رجحان ہے کہ وہ انسانی ارادے کو غیر محدود تسلیم کرے جو تمام قیود کو توڑ سکتا ہے۔ انسانیت کا ضمیر جنگ پر دو متضاد نقطہائے نظر سے غور کرتا ہے۔ یا تو وہ ایک اچھی چیز ہے جیسے طاقت انتخاب اصلح۔ اجتماعی قوت کی کامیابی وغیرہ۔ اس لئے ہمیں اسے جاری رکھنا چاہئے، یا وہ ایک بدی ہے جسکی بیخکنی کردینی

چاہیئے چونکہ جنگ انتشار ہے جو زندگی اور ملک کو تباہ کرتا ہے، ترقی کو روکتا ہے۔ دونوں نظریے جنگ کو انسانی ارادہ کے تحت تسلیم کرتے ہیں اور اسے انسانی کوششوں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ان متضاد مذاہب کے تمام مقدمات کو تسلیم کئے بغیر ہم اپنے مطالعہ کی خاطر اس نظریے کو تسلیم کئے لیتے ہیں کہ جنگ ان انسانی اعمال سے تعلق رکھتی ہے جو انسانی ارادے کے ماتحت ہیں اور جو انسانی ارادہ سے پیدا اور رفع کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ ارادہ کیا ہے؟

حقیقتاً یہ ایک فرد کا ارادہ نہیں ہو سکتا۔ جنگ ایک اجتماعی مظہر ہے جو منظم انسانوں سے تعلق رکھتا ہے لیکن فرد کا ارادہ یقیناً جماعت کے ارادہ کی تکمیل میں ممد ہوتا ہے۔

سیاسئین کے نزدیک اس اجتماعی ارادہ کا ظہور حکومت کے ارادوں میں ہوتا ہے چاہے وہ (۱) انفرادی ہوں جیسے بادشاہ، ڈکٹیٹر، امیر عساکر، یا مذہبی پیشوا یا (۲) نیابتی جیسے پارلیمنٹ، کونسل، اسمبلی۔ بعض اوقات اس کا اظہار عوام کے ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ اجتماعئین اسے کافی نہیں سمجھتے۔ وہ بہت ٹھیک ارادہ عامہ کا ظہور ان تمام اجتماعی اداروں اور روایات مثلاً خاندان، مذہب اور قانون میں بھی محسوس کرتے ہیں جن میں نسلوں کے جذبات اور ضروریات کے نقشے کھنچے ہوئے ہیں اور اُن کی تشریح کی گئی ہے۔

غرضکہ ہمارے نظریہ کے مطابق جب اجتماعی ادارے اس حد تک پہنچ جائیں گے کہ وہ جنگ کے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں اُس وقت جنگ کا خاتمہ ہو جائیگا۔ آخر میں امن کا اجتماعی ارادہ جنگ کے اجتماعی ارادہ پر غالب آ جائے گا۔

مستقل مسئلہ جسے ہمیں حل کرنا ہے یہ ہے کہ کیا کبھی انسانی جماعت اس قدر منظم ہو سکتی ہے کہ جنگ اس کے قانونی اداروں میں سے خارج کر دیا جائے۔ کیا انسانی جماعت اس حق کو جو اس وقت تک اس کا امتیازی حق رہا ہے چھوڑنے کے لئے آمادہ ہے؟

سب سے پہلے ہمیں جنگ کے حق کے معنی کو بالکل واضح کر لینا چاہیئے۔ اس کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ "حکومتوں کا اپنے تنازعوں کے تصفیہ کرانے کے لئے صلح اور

منظم قوتوں کے استعمال کا حق ہے جبکہ دوسرے مناسب اور مؤثر ذرائع باقی نہ رہیں۔ قانون بین الاقوامی اس حق کو تسلیم کرتا ہے حتیٰ کہ جمعیۃ الاقوام بھی اگرچہ محدود صورت میں اسے تسلیم کرتی ہے۔

اس بات کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے کہ جنگ کی تعریف کرنے میں اور قانون بین الاقوامی کے متعلق گفتگو کرنے میں ہم موجودہ حکومتوں کے اور خصوصاً مہذب حکومتوں کے نقطۂ نظر سے غور کرتے ہیں۔ دوسری قوموں کو جن کا ابھی تک باقاعدہ نظام حکومت نہیں ہے یا جو ابھی تک سفید نسل کے تابع ہیں یا جنہوں نے ہنوز ہمارا التمدن اختیار نہیں کیا ہے اسی راستہ کو طے کرنا ہوگا جسے ہم نے اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لئے اس قدر محنت سے طے کیا ہے۔ اس بات کو فرض کرکے ہمیں مسئلہ کی بنیادی باتوں پر غور کرنا چاہیئے۔

(۲) فلسفی اور قانون داں جنگ کے حق کو تین بنیادی نظریوں سے ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی وہ جنگ جو انصاف کے لئے کیجائے۔ دوسری وہ جو حکومت کی ضروریات کے لئے ہو تیسری وہ جو بقائے اصلح کے نظریہ پر مبنی ہو یعنی جو شہنشاہیت کے لئے کیجائے۔

پہلے نظریہ کا تعلق اخلاقی محرکات سے ہے۔ دوسرے کا سیاسی سے اور تیسرے کا اجتماعی سے۔ پہلا نظریہ جو جنگ مبنی بر انصاف کا ہے بالکل بیکار ہوگیا ہے چونکہ کسی جنگ کو ثابت کرنا کہ وہ انصاف پر مبنی ہے یا نہیں تقریباً ناممکن ہے۔ عملاً حکومتوں اور لوگوں نے صرف انہیں جنگوں کو انصاف پر مبنی سمجھا ہے جو انکی اور صرف انکی تھیں۔

دوسرا نظریہ بھی جو ریاست کے لئے جنگ سے تعلق رکھتا ہے بیکار ہوگیا ہے چونکہ سیاست میں اب یہ ثابت ہوچکا ہے کہ متمدن ریاستوں کے درمیان تنازعوں کا فیصلہ پُرامن ذرائع کے مقابلہ میں جنگ سے زیادہ بہتر طور پر نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے خلاف جنگ عظیم الشان نقصانات پہنچانے کے باوجود نئے تنازعات کی تخم ریزی کردیتی ہے۔

اب صرف تیسرا نظریہ باقی رہجاتا ہے جو معمولی جذبات کے خلاف ہے مگر جس کی تائید بعض علمین

اور سیاستین بڑی شد و مد سے کرتے ہیں جن کے لئے جنگ بقا اصلح کے لئے ضروری ہے، قومی کے لئے اقتدار اور حکمرانی کا ایک وسیلہ ہے۔

حالات کی یہ متضاد اور پیچیدہ صورت ہمیں جنگ کے متعلق مندرجہ ذیل اجتماعی اور تاریخی قانون بتانے پر مجبور کر دیتی ہے :۔

• جنگ کا اسی قدر ظہور ہوتا ہے جس قدر کہ وہ ارادی اجتماعی عادت کا جزو ہے اور جس وقت تک وہ اجتماعی عادت کا جزو ہے۔ ہم اسے قانونی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں بشرطیکہ وہ تمام شرائط جو اس وقت کے عام احساس، گزشتہ معاہدات اور قانونِ بین الاقوام سے متعلق ہوں پوری کیجائیں۔

اجتماعیات کی اصطلاح میں " اجتماعی عادت " اُس چیز کے ظاہری پہلو کا نام ہے جس کو ہم جماعت کا مجموعی ارادہ کہتے ہیں۔

غرضکہ جنگ جو ابتدائی سوسائٹی میں تحفظ اور تقدم کا ایک جبلّی فعل تھا متمدن اقوام میں اپنے قوانین اور ضوابط کے ساتھ ایک قانونی ادارہ بن گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی ارتقار کے ساتھ جنگ کے علاوہ کوئی دوسرا موثر قانونی ادارہ پیدا نہیں ہو سکا۔

لیکن کیا اس انتشار کی حالت کو دور نہیں کیا جا سکتا ؟ کیا سوسائٹی کا ارتقار اس حد تک نہیں پہنچ سکتا جسمیں جنگ کا وجود نہ ہو ؟

تاریخ ہمیں اس کی متعدد مثالیں مہیا کرتی ہے۔ وہ رواج اور ادارے جو ایک وقت ناقابل فنا سمجھے جاتے تھے اور جنکی بنیاد انسان کی جبلت اور اجتماعی ضروریات پر تھی بالکل فنا ہو گئے ہیں۔ انفرادی انصاف، خاندانی اختیارات، افراد کا باہم لڑکر تنازعات کا فیصلہ کر لینا اور کثرت ازدواج وغیرہ قانونی ادارے تھے جو اب متمدن سوسائٹی میں اجتماعی قانون کے خلاف قرار دئے گئے ہیں۔ لیکن اجتماعی ترقی کی بہترین مثال غلامی کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ یہ مختلف صورتوں میں ہزاروں برس قائم رہی اور یہ ہر قوم کے اجتماعی اور معاشی نظام کے ساتھ اس قدر

مربوط ہوگئی تھی کہ ملک اور قانون داں بھی اس کو ممنوع قرار نہ دے سکے بلکہ اسے ضروری قرار دیا۔ وہ
سوسائٹی کا تخیل بغیر غلامی کے کر ہی نہیں سکتے تھے۔

مسیح نے بنی نوع انسان کو مذہبی اور اخلاقی مساوات کی تعلیم دی مگر وہ غلامی کا انسداد نہ کرسکے۔
لیکن انسداد غلامی اُنکی تعلیم کا اُسی طرح جزو ہے جس طرح ظلم اور قوت کے استعمال کی مخالفت
اور جسطرح ہمارا یقین ہے کہ مسیحیت میں انسداد جنگ کی بھی روح موجود ہے۔ اگر سوسائٹی نے
اجتماعی حیثیت سے ترقی کی ہے تو اُس کے لئے ہم بہت کچھ مسیحیت کے ممنونِ احسان ہیں لیکن
اجتماعی اداروں میں ترقی جب ہی ممکن ہے جب اُس کے ساتھ ساتھ سوسائٹی میں بھی تغیر ہوا ہو۔
غرضکہ اس وقت بھی جبکہ مسیحیت مکمل طور پر کامیاب ہوگئی وہ غلامی کا مطلقاً خاتمہ نہ کرسکی۔
اُس نے وہ ہی کیا جو ڈاکٹر کرتا ہے جبکہ وہ خارجی طور پر بیماری کو نہیں روک سکتا تو جسم کو قوی
اور توانا کرتا ہے تاکہ اس طرح مرض کے جراثیم مرجائیں۔ فرسودہ اداروں سے آزادی حاصل
کرنے کے لئے انسانیت ہمیشہ سے عظیم الشان جدوجہد کررہی ہے۔ وہ ہر وقت مادہ کو روح کی
اعلیٰ تمناؤں کے ماتحت کرنے میں مصروف ہے۔

ہمیں مغالطہ میں نہیں رہنا چاہئے۔ غلامی کا اس وقت بھی وجود ہے۔ وہ مختلف صورتوں
میں جلوہ گر ہے۔ متمدن اقوام میں اس کے اثرات پائے جاتے ہیں اور وحشیوں میں وہ اسوقت
تک موجود ہے۔ لیکن کہیں بھی اس کی حیثیت قانونی تسلیم نہیں کی گئی ہے اور نہ اسے موجودہ
معاشی نظام کا جز سمجھا جاتا ہے۔

غرضکہ جب انسداد جنگ کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مفہوم متمدن دنیا کا ایک ایسا عہد
ہوتا ہے جس میں جنگ کے حق کو اسی طرح غیر قانونی تسلیم کیا گیا ہو جسطرح آج غلامی کے حق کو
غیر قانونی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس وقت بھی اقوام کے درمیان مسلح لڑائیاں ہونگی مگر یہ جنگ نہ ہوگی
یعنی جنگ اس مفہوم میں کہ وہ ایک حق ہے جس کو ضمیر انسانیت نے فطری قرار دیا ہے۔ اُسوقت
جنگ ایک وحشیانہ فعل متصور ہوگا۔ بین الاقوامی عہد کی روح کی خلاف ورزی ہوگی لوگوں کے

اخلاقی احساس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوگا۔ چونکہ وہ ایک ایسا فعل ہوگا جس کو متمدن کے عام قوانین نے ممنوع قرار دیا ہو۔ جرمنی اور فرانس اگر اس وقت باہم دست و گریباں ہوں گے تو وہ ایسے ہی نظر آئیں گے جیسے اس وقت انگلستان نظر آئے اگر وہ غلاموں کی خرید و فروخت کے متعلق قوانین بنا کر غلامی کو قانونی تسلیم کرے۔

(۳) پھر یہ کب اور کس طرح ہو سکتا ہے کہ جنگ کا حق اُسی طرح قائم نہ رہے جس طرح آج غلامی کا حق نہیں ہے۔ اجتماعیات ہمیں اس کا جواب دیتی ہے وہ یہ ہے کہ "جب اجتماعی زندگی کو جنگ کے حق تسلیم کرنے کی ضرورت باقی نہ رہے"۔ یہ ایک مبہم سا جواب نظر آتا ہے مگر دراصل ایسا نہیں ہے۔

ہمیں موجودہ سوسائٹی پر غور کرنا چاہئے یعنی تاریخی ترقی کی اُس سطح کا مطالعہ کرنا چاہئے جس کی مظہر اس وقت کی متمدن اقوام ہیں۔

جمعیۃ الاقوام کا قانون ہے کہ کسی ریاست کو جنگ شروع کرنے سے قبل اپنے معاملات کو جمعیۃ کی عدالت، کونسل یا اُس کی اسمبلی کے سامنے پیش کرنا چاہئے۔ عدالت میں معاملہ پیش کرنا ریاست کی مرضی پر منحصر ہے مگر اس کا فیصلہ تسلیم کرنے کے لئے ریاست مجبور ہے۔ کونسل کا فیصلہ اُسی وقت قابلِ تسلیم ہے جب وہ متفقہ ہو۔ اسمبلی کے فیصلہ کے لئے صرف ایک مقرر کردہ اکثریت کافی ہے۔ ان شرائط کی اگر کوئی ریاست خلاف ورزی کرے تو دیگر ریاستوں کو اس کے خلاف جنگ کرنے کا حق حاصل ہے۔ اقوام میں باہم معاہدے بھی ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جمعیۃ کی شرائط کے خلاف نہ ہوں۔ ان تمام معاہدوں کو نیک نیتی سے پورا کرنا چاہئے۔ اگر کوئی ریاست اس کی خلاف ورزی کرے تو وہ سوسائٹی سے خارج ہو جاتی ہے اور اس وقت اسے جنگ کا حق باقی نہیں رہتا۔

لیکن اگر ریاست نے معاہدہ کی تمام شرائط پوری کر لیں تو اُسے جنگ کرنے کا حق حاصل ہو جاتا ہے چاہے دیگر اقوام سے اُس کے کیسے ہی معاہدے کیوں نہ ہوں۔ اس قدر آزادی ریاست کو اس وقت تک حاصل ہے اور یہ آزادی تمام بحری اور بری طاقتوں اور آلاتِ حرب وغیرہ

برقرار رکھنے کے لئے کافی ہے۔ اس طرح انسانیت ہمیشہ مسلح امن اور خطرہ حرب کے چکر میں گرفتار ہے۔
یہ حالت موجودہ اجتماعی زندگی میں تین اسباب سے پیدا ہوئی ہے۔ پہلا ہر حکومت کا دوسری حکومتوں سے تعلقات میں مکمل استقلال کا نظریہ ہے جو بالکل فطری اور غیر محدود سمجھا جاتا ہے۔ ریاستیں اس طرح بالکل جدا جدا ہو گئی ہیں اور وہ جماعت کی آخری اور مستقل مظہر سمجھی جاتی ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ریاست کی حیثیت انفرادی اور خود غرضانہ ہو گئی ہے جو بالکل فطری اور ناقابل تغیر سمجھی جاتی ہے۔

مستبد بادشاہوں نے سب سے پہلے اس حق کا استعمال کیا۔ اس کے بعد اقوام نے اس کا یقین کر لیا کہ وہ مکمل طور پر آزاد اور خود اپنی حاکم ہیں۔

دوسرا سبب حکومتوں کی معاشی پالیسی ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ آزاد تجارت صرف چند دنوں تک چند اقوام میں مخصوص رہی اس کے بعد تا مینی تجارت کا تقریباً ہر وقت دور دورہ رہا۔

تیسرا سبب تاریخی روایات ہیں جو جغرافی حالت، اختلاف نسل و تہذیب، سیاسی رقابت، قوت سے حاصل کردہ اختیارات اور توسیع ملک سے وابستہ ہیں۔ یہ تمام محرکات یورپ کی قدیم اقوام کے لئے جنگ کے حقیقی محرکات ہیں۔

جہاں یہ اسباب موجود ہیں جو ایسی جماعت کی تشکیل میں مانع ہیں جس میں جنگ کا وجود نہ ہو وہاں دوسرے اسباب بھی ہیں جو کسی دوسری سمت کا اشارہ کر رہے ہیں۔

اینگلو سیکسن اقوام نے جو عظیم الشان ریاستیں قائم کی ہیں اُن کے دو مقاصد ہیں (۱) ریاست کے اندر امن قائم رکھنا (۲) دوسری اقوام کو اپنے اثر کے ذریعہ جنگ سے روکنا۔ ممالک متحدہ امریکہ نے متعدد ریاستوں کی ایک ریاست قائم کر کے اندرونی جنگ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا اثر پان امریکن کانگریس کے ذریعہ باقی امریکہ پر بھی ڈال دیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ مختلف ریاستوں میں جنگ کے روکنے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے جب

میکسیکو اور وسط امریکہ کی اقوام میں امن کی روح زیادہ سرایت کر جائے گی اُسوقت امریکن اقوام کے تعلقات اور زیادہ خوشگوار ہو جائیں گے۔

دوسری مثال سلطنت برطانیہ کی ہے۔ ایسی سلطنت کی مثال ہمیں قدیم اور جدید تاریخ میں نہیں ملتی۔ یورپ کی دیگر سلطنتیں یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کس طرح یہ تمام اقوام سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی زنجیروں سے بغیر کسی جبر کے باہم مربوط ہیں۔ اکثر لوگ سلطنت برطانیہ کے تنزل کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن برٹش دولت عامہ کا اخلاقی تعاون اور آزادی کا تجربہ قوموں کی زندگی میں ایک نئی شاہراہ کھولتا ہے۔ اس تجربہ کی کامیابی تاریخی نقطۂ نظر سے اسی قدر اہم ہوگی جس قدر نظام منصب داری کا انسداد یا حقوق انسانی کا اعلان۔

اس وقت تک بھی برطانیہ اور امریکہ قوت اور خصوصاً بحری قوت پر انحصار کرتے ہیں جو اُنکے نزدیک مدافعت کے لئے ناگزیر ہے۔ انھوں نے جنگ کے حق کو اپنے حدود میں غیر قانونی قرار دیا ہے مگر دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں وہ اس حق کو جائز تسلیم کرتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے وہ دوسری ریاستوں کے مخالف ہیں مگر موجودہ بین الاقوامی نظام کے ماتحت اس کے سوا اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

بہرحال جمعیۃ الاقوام موجودہ نظام کی اصلاح کے لئے دو طرح کوشش کر رہی ہے۔ وہ ریاستوں پر کچھ قانونی بندشیں عائد کر کے اور کچھ اسلحہ میں تخفیف کر کے اُن کی جنگی قوت کم کر رہی ہے۔ دوسری طرف وہ ایسا اخلاقی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہے جسمیں جنگ اجتماعی قوانین کے خلاف سمجھی جاوے۔ غرضکہ جمعیۃ الاقوام کا وجود جنگی روح کو کم کرنے میں بہت ممد ہے۔

پھر معاشی ضروریات مفادِ عامہ کا ایک ایسا جال بچھا رہی ہیں جو تنہا کسی ریاست کے محدود دائرہ سے بہت وسیع ہے اور جو نسل، زبان، فاصلہ اور دیگر تمام عناصر پر غالب آ رہا ہے۔ سائنس کی روزانہ جدید انکشافات انسانی مفاد اور کارگزاریوں کو وسیع کر رہی ہیں۔

ہر چیز کسی ریاست کے حدود سے زیادہ وسیع معاشی نظام مرتب کر رہی ہے۔ ہم اس وقت تاریخ کے ایسے زمانہ میں ہیں جبکہ سیاسی حدود وسیع تر ہو رہی ہیں۔ جنگوں کے بعد معاشی تنزل اقوام کے درمیان سمجھوتہ میں معاون ہوگا اور یہ تعاون معاشی حدود سے نکل کر سیاسی حدود میں داخل ہو جائے گا۔

مغرب کی ہزار سالہ تاریخ کے چند ابواب کو اس وقت ہمیں پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ ہم موجودہ حالات کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

ازمنہ متوسطہ کی مختصر زرعی اور خانگی صنعتیں ایک محدود سیاسی دائرہ یعنی اضلاع میں ترقی کر سکتی تھیں۔ اس وقت بادشاہ اور شہنشاہ ریاستوں کے صرف نشانات تھے حقیقتیں نہ تھیں۔ انھیں صرف اس قدر درکار تھا کہ جاگیردار انہیں محصول ادا کیا کریں اور اپنا آقا تسلیم کرلیں۔

تجارت کی افزائش۔ معاشی نظام کی ترقی اور صنعت کی ابتدا کے ساتھ شخصی نظام حکومت کی بنیاد پڑی جس نے برو اور کومیون وغیرہ کا خاتمہ کر دیا۔

طویل سفروں اور نئی دنیا کے انکشافات نے نوآبادیات کے نظام حکومت کی بنیاد ڈالی جس سے بڑے شاہی خاندانوں کی عظیم الشان ریاستیں قائم ہوگئیں۔ امریکہ، فرانس اور انگلستان کے انقلابات کے بعد قومی حکومتوں کی تعمیر نیابتی اور آزاد سیاسی نظاموں کے اجرا ر اور مزدوروں کی تنظیم کا لازمی نتیجہ انیسویں صدی کا عظیم الشان صنعتی دور تھا۔ ریاستوں کی حدود کا خیال رکھے بغیر مفاد کا اشتراک ہمیں جنگ عظیم میں نمایاں نظر آگیا جبکہ قومیں دو عظیم الشان فریق میں تقسیم ہوگئی تھیں۔ اس عجیب وقت میں ریاستوں کی حدود بیکار اور غیر فطری دکھائی دیتی تھیں۔ تنہا ایک ریاست انسانی عمارت کی انتہائی بلند منزل۔ انسانی نظام کا آخری مظہر نہیں نظر آتی تھی۔ جنگ کے بعد قومیت کا ردعمل حدود کی تعین، اقوام کے درمیان نئے اخلاقی اور مادی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش گزشتہ زمانہ کو برقرار رکھنے کی جواب ہمیشہ کے لئے جا چکا

ہے ایک آخری مایوس کوشش ہے۔ کیا احتجاج کی ایک صدا اس ندی کو روک سکتی ہے جو سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے یا اس ہوا کو ٹھہرا سکتی ہے جو میدان کے اوپر چل رہی ہے؟

غرضکہ امریکہ اور برٹش امپائر کے اندرونی آزاد ریاستوں کے نظام، جمعیۃ الاقوام کی پُرامن کوششوں اور بین الاقوامی نظام معاشی نے ریاست کی سیاسی اور حربی قوت کو کم کر دیا ہے اور اس کے کلی استقلال میں بہت تخفیف ہو گئی ہے۔ یہ جدید حالات سیاسی اتحاد کے حلقہ کو وسیع کر رہے ہیں اور اس طرح مفاد عامہ کا دائرہ بڑھ رہا ہے۔ یہ تمام امور اقوام کے درمیان جنگ کے موقعوں کو کم کر رہے ہیں۔ اس طرح حکومتوں کے درمیان جنگ کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے۔

(۴) جب ہم یہ کہتے ہیں کہ اقوام کی اجتماعی زندگی میں ایسی قوتیں موجود ہیں جو جنگ کے موقعوں کو کم اور اس کی اہمیت کو گھٹا رہی ہیں تو اس سے ہماری یہ مراد نہیں ہے کہ لازمی طور پر جنگ کا حق مفقود ہو جائے گا۔ اس کے برخلاف مستقبل کی جنگیں زیادہ بڑے پیمانہ پر اور زیادہ شدت کے ساتھ لڑی جائینگی۔ جس قدر متضاد معاشی مفاد وسیع ہوگا اُسی قدر انسانی کارگزاریوں کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور جنگ کے آلات بھی زیادہ مہلک اور تباہ کن ہونگے۔ جنگیں اُسی قدر عظیم الشان ہوں گی جس قدر عظیم الشان اُس میں شرکت کرنے والی ہونگے۔ وہ کس قدر مہیب جنگ ہوگی جس میں دنیا کی ریاستیں دو فریق میں تقسیم ہو کر آپس میں دست و گریباں ہونگی۔ جس طرح کہ شخصی حکومتوں کے قیام نے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو خود میں جذب کر کے جنگ کے لئے ایک وسیع میدان کر دیا ہے اُسی طرح اقوام بڑے حلقوں میں جذب ہو کر جنگ کو وسیع تر اور زیادہ مہیب کر دینگی۔

لیکن موجودہ ضمیر انسانیت باوجود ان تمام چیزوں کے موجودہ بے چینی کا سبب صرف توسیع حدود کے جذبہ کو قرار نہیں دیتا۔ حقیقتاً اس کی تہ میں جنگ کے حق کی اخلاقی، قانونی اور اجتماعی پہلو کی تبدیلی کا احساس بھی موجود ہے۔ ایک نئی اور مہیب جنگ کا خطرہ بھی اس

احساس کا موجب ہے۔ جمعیۃ الاقوام جو کچھ دنوں قبل ایک بیکار چیز سمجھی جاتی تھی اب آہستہ آہستہ اپنا وجود منوا رہی ہے۔ بدقسمتی سے ہمیں اس کا اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جمعیۃ الاقوام کی عجیب پیچیدہ قانونی حیثیت ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سیاسی حیثیت سے بھی بہت کمزور ہے۔

جمعیۃ کی قانونی پیچیدگی خود اُس کی ذات میں مضمر ہے۔ وہ ریاستوں کا ایک خود ساختہ نظام ہے جس کے اراکین کچھ اجتماعی حقوق و فرائض تسلیم کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اپنے استقلالِ کلی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں۔ جمعیۃ کی سیاسی کمزوری یہ ہے کہ اُس کے پاس اپنا فیصلہ منوانے کے لئے کوئی قوت نہیں ہے۔

اس کمزوری کو رفع کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ جمعیۃ کے فیصلے متفقہ ہوں مگر اس کے ساتھ ہی گزشتہ زمانہ کی طرح خفیہ معاہدے اور ریشہ دوانیاں شروع ہو گئی ہیں۔

ممکن ہے کہ جمعیۃ کی یہ کمزوری اور پیچیدگی اسوقت اس کی قوت کا باعث ہو اسی سبب سے قومی تعصب اور نفس پرستی کو موقع ملگیا ہے کہ وہ جمعیۃ کے عہد طفلی ہی میں اس کا گلا گھونٹ دے۔

جمعیۃ کا کام جو بہت طویل اور صبر طلب اور مشکلات سے گھرا ہوا ہے یہ ہے کہ وہ اپنی اس ابتدائی پیچیدگی اور کمزوری سے آزاد ہو اور ریاستوں کے درمیان کے تنازعات کو بالکل قانونی شکل دیدے جسمیں جنگ کے حق کو مطلق تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

جمعیۃ معاہدہ توڑنے والی حکومت کے خلاف بھی کچھ کارروائی کرتی ہے۔ یہ حقیقتاً کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ابھی کچھ دنوں قبل ایک حکومت قانونِ بین الاقوام کی خلاف ورزی کرنے کے سبب رائے عامہ کے سامنے ذلیل ہوئی۔ بہت بڑی جنگ جرمنی نے اُسی وقت ہار دی جبکہ اُس کے وزراء میں سے کسی نے کہا کہ معاہدے صرف کاغذ کے پُرزے ہیں اور ضرورت کے لئے کوئی قانون نہیں ہے۔ لیکن اُس وقت بالکل جداگانہ حالت ہو گی جب کوئی ایسی مرکزی قوت ہو گی جو قانون کی خلاف ورزی کرنیوالی ریاستوں کو سزا دے سکے گی اور ان کو متمدن اقوام کے احاطہ سے باہر کر دیگی۔ اگر اُسوقت کوئی ریاست جنگ کریگی تو وہ

اس کا حق تسلیم نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ اُس کی طاقت کا ناجائز استعمال ہوگا۔ دیگر اقوام کو ایک کھلا ہوا پیغام مقابلہ ہوگا۔

اس منزل پر پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ تمام تنازعات کے فیصلے جو آپس میں نہ ہوسکیں لیگ کی مجلس منتظمہ کے سپرد کر دئے جائیں اور وہ حتمی اور آخری سمجھے جائیں چاہے وہ مکمل اتحاد رائے سے ہوئے ہوں یا نہ ہوں۔ یہ اس طرح نہیں ہوسکتا کہ موجودہ لیگ کے نظام دستور میں تبدیلی کردی جائے بلکہ یہ صرف سیاست بین الاقوام میں ایک جدید اخلاقی ضمیر کی تعمیر سے ہوسکتا ہے۔ یقیناً یہ بہت بڑی پیش قدمی ہوگی۔ اس وقت تمام ریاستیں جنگ کرنے کے حق سے دستبردار ہوجائیں گی۔ وہ اپنے مقاصد ہتھیاروں کے ذریعہ نہ حاصل کریں گی تاکہ وہ اس مرکزی جماعت سے فیصلہ طلب کرسکیں جس کے وہ ارکین ہیں۔ ہمیں یہ اخلاقی آزادی کے لئے مادی آزادی کی قربانی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن کیا یہ قول متحدہ طور پر تمام اقوام پر صادق آتا ہے۔ یہ مشکل سے کہا جاسکتا ہے۔ حقیقتاً اگر معاشی مفاد اور وسیع اجتماعی محرکات ملجائیں تو متمدن اقوام کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اس اتحاد کو اپنے دائرہ میں امن کا ضامن قرار دلیں۔

اسی طرح جب نیابتی حکومت، سیاسی آزادی اور عام حق رائے دہندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا تو جو اسوقت برسر اقتدار تھے یعنی مستبد سلاطین اور مخصوص طبقوں کو یقین تھا کہ ریاست منتشر ہورہی ہے۔ حقیقت نے جواب دیا کہ ریاست منتشر نہیں ہورہی تھی بلکہ اُن کے ناجائز حقوق غائب ہورہے تھے۔ جو کچھ ہورہا تھا وہ صرف اس قدر تھا کہ سیاسی زندگی کا مرکز تبدیل ہورہا تھا۔ اسی طرح آج بھی لوگ ایک آزاد ریاست کا خیال جو دوسری ریاست سے جنگ نہ کرسکے اس کے سوا نہیں کرسکتے کہ ایسی ریاست تباہ ہوجائے۔ اس کا وجود خطرہ میں ہو اور اُس کے حدود ہمیشہ باہر سے حملہ کے لئے کھلے ہوئے ہوں۔ حالانکہ جو کچھ ہوگا وہ صرف اسقدر ہوگا کہ اجتماعی نظام کی ایک جدید ترتیب ہوگی تاکہ واحد ریاستوں کی بجائے متحدہ ریاستوں کا ایک نظام حق استقلال حاصل کرلے۔

لیکن یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ جمعیۃ کس قوت کے ذریعہ اپنے احکام تسلیم کروائیگی۔ کیا جمعیۃ کے دفعہ ۱۶ میں مندرجہ اختیارات کافی ہیں یعنی یہ کہ معاہدوں کی خلاف ورزی کرنے والی ریاست کا معاشی اور اخلاقی مقاطعہ کردیا جائے۔

علوم طبیعی کی رو سے کہا جاسکتا ہے کہ کسی فعل کے وجود سے اس کا آلہ کار بھی وجود میں آجاتا ہے اور کسی قوت کے استعمال سے اس کے ذرائع استعمال بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

سیاسی نقطۂ نظر سے متعدد ریاستوں کے لئے ایک بہت بڑا خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔ وہ خطرہ یہ ہے کہ قوی اقوام کو اُن کا خودغرضانہ جذبہ اس کی طرف نہ مائل کرے کہ وہ ضعیف اقوام اور اقلیتوں کے معاشی ذرائع اور خام پیداوار پر حاوی ہو جائیں۔

حقیقتاً اولاً یہ خطرہ ایک نفسیاتی خطرہ ہے یعنی یہ کہ مستقبل میں جبکہ جنگ کے حق کا انسداد ہو جائیگا یہ خطرہ زیادہ مہیب نظر آتا ہے بہ نسبت موجودہ زمانہ کے جبکہ یہ حق موجود ہے۔

ہمیں اس کا کافی احساس کرلینا چاہئے کہ قوی اقوام میں برتری کا جذبہ جس طرح آج ہے کل بھی رہے گا۔ یہ اقوام کی زندگی میں وہ کام کیا کرے گا جو اب تک کرتا رہا ہے۔ جسطرح اسوقت قوی جماعتیں اور وہ جماعتیں جنہیں اُن کی قوت کا شکار ہونا پڑتا ہے موجود ہیں۔ اسی طرح قوی اقوام اور کمزور اقوام بھی موجود رہیں گی۔ ممکن ہے کہ ان کے سیاسی اور معاشی حالات میں تبدیلی ہو جائے مگر ان کی یہ خصوصیتیں ضرور موجود رہینگی۔ ہمیں جس چیز کو اپنا مطمح نظر رکھنا چاہئے وہ یہ ہے کہ جنگ کے ذریعوں میں فرق پڑجائے۔ مسلمہ حقوق تسلیم کرلئے جائیں۔ بین الاقوامی روابط اچھے ہوں اور بغیر جنگ کے تنازعوں کے فیصلوں کے امکانات زیادہ بڑھ جائیں۔

ازمنۂ متوسطہ میں امراء اپنے چھوٹے چھوٹے جتھوں کے ساتھ نیزوں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اپنے تفوق کے لئے ایک دوسرے کے خاندان پر حملہ کیا کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو قلعوں کے خوفناک قیدخانوں میں بند کردیا کرتے تھے۔ آجکل امراء کے باہم مقابلے دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں ہوتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں یہ امراء یعنی پارلیمنٹ کے لئے

مختلف طبقہائے انتخاب سے یہ امیدوار اپنی جنگیں تلواروں سے نہیں لڑتے ہیں بلکہ رائے کی پرچیوں کے ذریعہ نبرد آزمائی کرتے ہیں۔

یہ ایک اطمینان بخش بات ہے۔ ممکن ہے وہ وقت بھی آجائے جبکہ فرانس اور جرمنی سیڈان اور مارن میں صف آرا ہونے کی بجائے بین الاقوامی عدالت یا جمعیۃ الاقوام کی اسمبلی میں نظر آئیں۔

جنوا میں ایک حریف کامیاب ہوگا اور دوسرا ناکامیاب۔ لیکن جنگ میں بھی اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ ایک جیتتا ہے دوسرا ہارتا ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کیا جائے کہ جنگ میں ریاست اپنی مسلح قوت پر اعتماد کرتی ہے مگر یہاں اس کو دوسری ریاستوں کی رایوں پر انحصار کرنا پڑیگا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہے اگر فرانس ۱۹۱۴ء میں جرمنی کا صرف اپنی قوت سے تنہا مقابلہ کرتا تو قیصر ولیم کب سے پیرس پر قابض ہوچکا ہوتا۔ جرمنی خود بھی بغیر آسٹریا اور دیگر ساتھیوں کے کبھی جنگ کرنیکی جراٴت نہ کرسکتا۔

آج اور کل کے حالات میں صرف اس قدر فرق ہے کہ اسوقت ریاستوں کے درمیان گفتگو دو کروڑ انسانوں کا خون بہائے بغیر ہوگی۔

آج ہر زمانہ سے زیادہ بین الاقوامی اتحاد نے قانونی شکل اختیار کرلی ہے جو اقوام کو باہم مربوط کئے ہوئے ہے۔ سیاست اور معیشت میں اپنی ضروریات خود پورا کرنے کا اصول اب بیکار ہوگیا ہے اسلئے اب یہ یقینی ہے کہ قومی ریاست اپنی ہستی کو ضائع کئے بغیر حقیقی اور زندہ بین الاقوامی نظام میں داخل ہوجائے گی۔

اب صرف ایک آخری مسئلہ رہگیا ہے۔ ان ریاستوں کا جو جمعیۃ کے اراکین ہیں ایسی ریاستوں کے ساتھ کیا تعلق ہوگا جیسی کہ چین یا روس یا نوآبادیات یا غیر متمدن اقوام کی ریاستیں ہیں۔ جہانتک انکا تعلق ہے جنگ کا خاتمہ نہ ہوگا۔

اس کا حل بہت آسان ہے۔ متمدن ہمیشہ زیادہ متمدن اقوام کی طرف سے کم متمدن

اقوام کی طرف گیا ہے۔ جو ریاستیں جمعیۃ کی ارکین ہیں انہیں جنگ کا خاتمہ کر دیجیے، باقی دنیا میں خود بخود جنگ کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

لیکن نوآبادیات کے لوگوں اور رنگین نسلوں کے مسائل پر جسطرح ہم آجکل غور کرتے ہیں اسمیں ضرور ترمیم کرنی پڑیگی۔ انسانیت کے سامنے جس کی ارتقائی قوت برابر بڑھ رہی ہے اور ترقی کے لئے اخلاقی کوشش ہمیشہ جاری ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی درپیش ہے۔

اجتماعی نظام کی ترقی کے متعلق ہم غلط امید نہیں باندھ رہے ہیں۔ موجودہ ضمیر انسانیت کا جنگ کے متعلق نقطۂ نظر بدل گیا ہے۔ اب یہ قسمت کا ایک تاریک باب نہیں سمجھا جاتا بلکہ انسانی اعمال کا نتیجہ خیال کیا جاتا ہے اس لئے قابل تغیر بھی ہے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ جسطرح تعدد ازدواج، خاندانی اختیارات۔ ڈوئل اور غلامی کو اب متمدن اقوام اپنا حق نہیں سمجھتی ہیں اسی طرح جنگ کو بھی ایک دن حق نہیں تسلیم کیا جائے گا۔

نثر میں شاعری

بھیک

ایک بڑے شہر کے قریب شاہراہ پر ایک بیمار بوڑھا چلا جا رہا تھا۔ اُس کے قدم ڈگمگاتے تھے۔ دُبلے پتلے پیر ٹھوکریں کھا کھا کر، لڑکھڑا لڑکھڑا کر بڑی مشکل سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے یہ اپنی خوشی سے نہ چل رہا ہو بلکہ کسی کے حکم کا بندہ ہو۔ لباس تار تار تھا، کچھ چیتھڑے بدن پر لٹک رہے تھے، سر کھلا ہوا اور سینہ پر جھکا ہوا۔ بدن کی طاقت جواب دے رہی تھی۔

راہ میں ایک پتھر تھا، اُس پر بیٹھ گیا۔ آگے کو جھکا، کہنی کا سہارا لیا، اور دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا۔ اُس کی سوکھی ٹیڑھی ٹیڑھی انگلیوں کے بیچ میں سے آنسو بہنا شروع ہوئے اور خشک زمین پر ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ یہ اپنے گئے دِن یاد کر رہا تھا۔

اِسے یاد آرہا تھا کہ کبھی میں بھی تندرست تھا، مالدار تھا۔ پھر کیسے تندرستی ہاتھ سے گئی۔ دوسروں پر، اچھے بُرے دوستوں پر کیسے اپنی دولت لٹائی؛ اور اب کھانے کو پاس روٹی کا ایک ٹکڑا نہیں۔ سب نے ساتھ چھوڑ دیا: دُشمنوں سے پہلے دوستوں نے۔ کیا اب یہ نوبت بھی آئے گی، یہ ذلت بھی سہنی پڑے گی، کہ ہاتھ پھیلاؤں، بھیک مانگوں؛ یہ سوچتا تھا اور اُس کے دل میں کبھی تلخی پیدا ہوتی تھی کبھی شرم۔ لیکن آنسو تھے کہ بہہ بہہ کر زمین پر ٹپکے جا رہے تھے۔

یکایک ایسا معلوم ہوا کسی نے نام لیکر اُسے پکارا۔ اُس نے اپنا ماندہ سر اُٹھایا اور سامنے دیکھا تو ایک اجنبی شخص کھڑا تھا۔

اجنبی کا چہرہ نہایت متین اور باوقار تھا لیکن اس میں سختی اور درشتی ذرا نہ تھی۔ آنکھیں بہت چمکتی تو نہ تھیں لیکن صاف تھیں نظر گہری جاتی تھی مگر اس میں عیاری نہ تھی۔

"تو نے اپنی دولت اوروں کو دے ڈالی" اُس نے نہایت نرم آواز سے کہا "کیوں اب اپنی خیرات پر پچھتاتا ہے کہ نہیں؟" "نہیں میں نہیں پچھتاتا" بڈھے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "چاہے اسوقت بھوک سے میرا دم ہی کیوں نہ نکل جائے۔ میں نہیں پچھتاتا۔ بالکل نہیں پچھتاتا۔"

اجنبی بولا "اچھا اگر دنیا میں حاجتمند ہی نہ ہوتے جو تیرے سامنے دست سوال دراز کرتے، کسی کو اگر تیری خیرات کی ضرورت ہی نہ ہوتی، تو پھر تو کیسے یہ خیرات کرتا اور نیکی کماتا؟"

بڈھے نے کوئی جواب نہ دیا اور سوچنے لگا۔

"تو پھر غریب بھکاری، تو بھی اس وقت اتنا غرور نہ کر۔ اُٹھ اور ہاتھ پھیلا۔ دوسرے نیک آدمیوں کو بھی موقع دے کہ وہ عمل سے اپنی نیکی کا ثبوت دیں۔"

بڈھا اُٹھا، اِدھر اُدھر دیکھا...... اجنبی غائب ہو چکا تھا لیکن دور فاصلہ پر ایک راہگیر دکھائی دیا۔

بڈھا اُس کی طرف بڑھا اور اپنا ہاتھ اُس کی طرف پھیلایا۔ راہگیر نے نہایت خشونت سے آنکھیں پھیر لیں اور اُسے کچھ نہ دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد ایک اور راہگیر گذرا اور اُس نے غریب بڈھے کو کچھ بھیک دی۔

بھیک کے پیسہ سے بڈھے نے روٹی خریدی اور بھیک کا یہ ٹکڑا کیسا مزہ کا تھا! اُس کے دل پر شرم کی تکلیف بھی نہ تھی بلکہ اُس کے برعکس اُس پر ایک عجیب طرح کی خاموش اور پُرسکون مسرت طاری ہو چکی تھی۔

---

۲ دو دولتمند

میرے سامنے جب کوئی راس چائلڈ کی تعریف کرتا ہے کہ اپنی بے حساب آمدنی میں سے

یہ شخص ہزاروں لاکھوں روپیہ بچوں کی تعلیم پر، بیماروں کے علاج پر، اور بوڑھے یا بچوں کے پیٹ پالنے پر صرف کر دیتا ہے تو گہرا اثر ہوتا ہے اور منہ سے بے ساختہ داد نکلتی ہے۔

لیکن باوجود اس تمام تحسین اور اس تمام اثر کے میرے ذہن سے ایک کسان خاندان کی یاد نہیں ٹلتی جس نے ایک یتیم بچی کو اپنے فلاکت زدہ گھر میں جگہ دی تھی۔

بڑھیا کا خیال تھا: "کاتیا کو گھر میں لینے کو تو لے لو۔ لیکن بس آخری دمڑی تک اس پر اُٹھ جائیگی۔ پھر دال میں نمک کا بھی اللہ مالک ہے۔"

" اچھا تو بے نمک کے ہی دال کھالیں گے" اُس کے شوہر نے جواب دیا۔

راس چائلڈ اور اُس کسان میں کتنا بعد ہے؟

مزدور

مزدور: کیوں، ہم میں کہاں گھسا آتا ہے؟ چاہتا کیا ہے؟ تو ہم میں سے نہیں ہے۔ چل چل لمبا ہو۔

لیڈر: بھائیو! میں تو تمہیں میں سے ہوں۔

مزدور: ابھی کہی۔ ہم میں سے! تجھے سوجھی کیا ہے؟ ذرا دیکھ میرے ہاتھ دیکھ۔ کیسے دکھتا ہے کیسے میلے ہیں؟ گوبر کی سی، تارکوں کی سی بُو آتی ہے۔ اور اپنے ہاتھ دیکھ۔ کیسے سفید ہیں۔ انہیں کا ہکی بو ہے؟

لیڈر (ہاتھ بڑھا کر): لو، سونگھ لو۔

مزدور: یہ کیا۔ یہ تو لوہے کی سی بو ہے۔

لیڈر: ہاں، ہاں، لوہے کی سی۔ میرے یہ ہاتھ پورے چھ سال تک ہتکڑیوں میں رہے ہیں۔

مزدور: آخر کیوں؟

لیڈر: اس لئے کہ میں نے تمہاری بھلائی کے لئے کوشش کی تھی، اس لئے کہ میں تمہیں آزاد کرانا چاہتا تھا، تمہیں، مظلوم بے زبان انسانوں کو؛ اس لئے کہ میں تم پر ظلم کرنیوالوں

کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بغاوت کی تھی........ اس لئے انہوں نے مجھے قید میں ڈال دیا۔

مزدور: قید میں! اچھا تو تجھ سے کہا کس نے تھا کہ بغاوت کر؟

(دو سال بعد)

انہیں مزدوروں میں سے ایک مزدور (دوسرے سے): "پیٹر، سن تو۔ یاد ہے نہ کہ تیورس کی سال وہ ایک سفید ہاتھوں والا بچہ سے بکواس کر رہا تھا؟

دوسرا مزدور: ہاں، تو؟

پہلا مزدور: اُسے آج پھانسی پر لٹکائیں گے۔ ایسا حکم آیا ہے۔

دوسرا مزدور: کیوں، کیا پھر بغاوت کی تھی؟

پہلا مزدور: ہاں، پھر بغاوت کی تھی۔

دوسرا مزدور: بھائی دمتری، ایک بات کہوں، ذرا اس کی فکر رکھنا کہ جس رسی میں اُسے لٹکائیں وہ ہاتھ لگ جائے۔ ایسی چیزوں سے گھر میں بڑی برکت ہوتی ہے۔

پہلا مزدور: بات ٹھیک ہے۔ ضرور اس کا انتظام کریں گے۔

(فاعتبروا یا اولی الابصار)

بڑھیا

میں ایک کھلے میدان میں اکیلا جا رہا تھا۔ یکایک ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ احتیاط سے قدم رکھ رہا ہے۔ کوئی میرا پیچھا کر رہا ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹی سی جھکی ہوئی بڑھیا دکھائی دی۔ میلے کچیلے چیتھڑوں میں بالکل لپٹی ہوئی تھی۔ انہیں سے بس بڑھیا کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ زرد، جھرّیاں پڑی ہوئی، لمبی نوکیلی ناک، منہ میں ایک دانت نہیں۔ میں اُس کی طرف بڑھا، وہ ٹھہر گئی۔

"کون ہو؟ کیا چاہتی ہو؟ بھکارن ہے؟ بھیک چاہتی ہے؟" بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا۔
مَیں اُس کی طرف ذرا جھکا تو دیکھا کہ اُس کی دونوں آنکھوں پر ایک گدلا گدلا سفید سا استر یا
جھڑا سا چڑھا تھا جیسے بعض چڑیوں کے ہوتا ہے تاکہ آنکھ کو تیز روشنی سے بچائے۔
لیکن بڑھیا کی آنکھوں کا یہ جھڑا بالکل غیر متحرک تھا اور اُس کی پتلیاں باہر نہ آسکتی تھیں۔
میں نے خیال کیا کہ یہ اندھی ہے۔
میں نے پھر وہی سوال دہرایا: "بھیک چاہتی ہے؟ کیوں میرے پیچھے پیچھے کیوں آتی
ہے؟" لیکن بڑھیا اب بھی چپ رہی اور ذرا جھکی۔ میں نے اُس کی طرف سے منہ موڑ لیا اور
اپنی راہ لی۔
پیچھے پھر وہی آہستہ آہستہ، نپے ہوئے، ایک سے گھسٹ گھسٹ قدموں کی آہٹ سنائی
دی۔
پھر وہی عورت، مَیں نے سوچا، یہ آخر میرے پیچھے کیوں پڑی ہے؟ لیکن پھر خیال آیا اندھی
ہے، شاید راستہ بھول گئی ہو اور اب میرے قدموں کی آواز پر چل رہی ہے تاکہ میرے ساتھ ساتھ
بستی میں پہونچ جائے۔ ہاں، ٹھیک ہے، بس یہی بات ہو گی۔
مگر رفتہ رفتہ میرے خیالات میں عجیب جھنپی سی پیدا ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ یہ بڑھیا میرے
پیچھے پیچھے ہی نہیں آتی بلکہ مجھے راہ بھی بتلاتی ہے۔ کبھی ایک طرف ٹھیل دیتی ہے، کبھی دوسری طرف
اور میں بلاارادہ مجبوراً اسی کی مانتا ہوں۔
پھر بھی میں آگے چلتا رہا...... دفعتہً ٹھیک میرے راستہ پر ایک سیاہ سی چیز دکھائی دی،
کچھ پھیلتی ہوئی...... ایک خندق سی۔ میرے ذہن میں معاً آیا "قبر" بڑھیل بڑھیل کر یہ مجھے
یہاں لائی ہے۔ مَیں جلدی سے مڑا۔ میرے سامنے پھر وہ بڑھیا آئی۔ لیکن اب تو یہ دیکھتی ہے
بڑی بڑی، شریر، منحوس آنکھوں سے یہ مجھے دیکھتی ہے...... جیسے کسی شکاری چڑیا
کی آنکھیں...... میں اُس کے چہرہ کو، اُس کی آنکھوں کو غور سے دیکھتا ہوں......

پھر وہی گدلا استر، وہی بے روح خاموش چہرہ .... خیال آیا۔ اُفوہ، یہ بڑھیا میری قسمت ہے۔ وہ قسمت جس سے کوئی بھاگ کر نہیں جاسکتا، جس سے کوئی پناہ نہیں۔ کیا واقعی کوئی پناہ نہیں؟ یہ کیسی دیوانگی ہے؟ کیا اندھیر ہے؟ چلو کوشش تو کریں۔ اور میں نے ذرا مڑکر دوسری سمت میں چلنا چاہا۔

جلدی جلدی قدم بڑھائے۔ لیکن وہ قدم بھی جیسے جب ویسے اب میرے پیچھے بہت ہی قریب قریب آرہے تھے۔ اور میرے سامنے پھر وہی تاریک گڑھا تھا۔

پھر ایک مرتبہ میں نے دوسری جانب رُخ کیا۔ پھر میرے پیچھے وہی پیروں کی آہٹ اور سامنے وہی ڈرانی تاریکی۔ اُس خرگوش کی طرح جس کا پیچھا کتے کر رہے ہوں میں نے جدھر رُخ کیا ہر طرف یہی، ہر طرف یہی!

میں نے سوچا ٹھہر۔ اب اِسے دھوکہ دیتا ہوں۔ اِس جگہ سے اب ہلونگا ہی نہیں۔ اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔

بڑھیا میرے پیچھے کھڑی ہے، صرف دو قدم ہٹ کر۔ مجھے سنائی تو نہیں دیتا مگر محسوس کرتا ہوں کہ وہ موجود ہے۔ دفعتہً کیا دیکھتا ہوں کہ وہ تاریک زمین کا ٹکڑا جو دور تھا اب تیرنے سا لگا اور آہستہ آہستہ چلکر ٹھیک میری طرف آرہا ہے۔

یااللہ۔ پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں تو بڑھیا نے اپنی نظر مجھ پر جمالی ہے اور اُس کے پوپلے منہ پر شکنیں پڑی ہیں ——— لیس المفر!

بڈھا

مصیبت اور گرانی کے دن آن پہونچے .... خود اپنا دُکھ درد، اپنے دوستوں کی بیماریاں، بڑھاپے کی سردی اور تاریکی .... وہ سب کچھ جس سے تو محبت کرتا تھا، جس پر تو دل سے فریفتہ تھا، سب مرجھایا جاتا ہے، مٹا جاتا ہے۔ تیرا راستہ پہاڑ کا اُتار ہے۔

اب کیا کرنا؟ شکوہ و شکایت ؟ رنج و غم؟ نہیں اس سے نہ خود تیرا بھلا ہوگا نہ کسی اور کا.....
سوکھتے ہوئے، مرجھاتے ہوئے پیڑ پر پتے کم تو ہوتے ہی جائیں گے لیکن پتے ہیں تو ابھی ہے۔
تو پھر کیا ہے۔ اپنے کو خود اپنے میں محصور کرلے۔ اپنی یاد کو اپنا ساتھی بنا، تیری روح کی
گہرائیوں میں تیرا ماضی، تیری وہ زندگی جو بس تیری ہی ہے، اپنی تمام خوشبو اور تازگی کے
ساتھ اور اس شان کو پہلو میں لئے ہوئے جس سے بہار ٹپکی پڑتی ہو تیرے سامنے جلوہ گر
ہو جائے گی۔

لیکن، خبردار، غریب بوڑھے، خبردار، نظر اٹھا کر آگے نہ دیکھنا۔

ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

عورت

قبل اس کے کہ میں جماعت سازی کی نئی شکل سے بحث کروں چاہتا ہوں کہ اس باب میں اس مسئلہ کا ذکر کروں جسے اور جس کے حل کو اس ارتقا سے بہت قریب کا تعلق ہے جسکا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے یعنی عورتوں کا مسئلہ۔ اس امر میں جدید تمدنی تحریک نے آراء و خیالات میں نہایت وسیع اور گہرا تغیر پیدا کر دیا ہے۔

نظری اعتبار سے اسلام میں عورت کی حیثیت اچھی خاصی ہے۔ بہت سے مسلمان اور بہت سے اہل مغرب یہ رائے رکھتے ہیں کہ اسلام ایشیائی عورت کی بندے آزادی کا مرادف ہے لیکن اسلامی اقوام میں واقعی جو عورت کی حیثیت تھی اُس پر صحیح اسلامی تعلیم کا اتنا اثر نہ تھا جتنا کہ خود اُن قوموں کے مختلف مدارج ترقی کا اور اُن جماعتی حالات وخیالات کا جو ان مدارج سے مطابقت رکھتے ہوں۔ خود آغاز اسلام میں عورت کے مسئلہ کا جو حل کیا گیا اُس پر بھی خالص جماعتی عناصر کا اثر تھا مثلاً تعدد ازدواج کی قرآنی اجازت اُس زمانہ کے عرب حالات کی خاطر ہی کیگئی تھی لیکن جہاں یہ اجازت آئی ہے وہاں (عدل) پر اصرار ظاہر کرتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اچھا راستہ کونسا ہے اور حقیقتاً اس راہ کی جانب اشارہ کرتا ہے جس کی طرف آئندہ ترقی کا ہونا لازمی تھا۔ قرآنی تعلیم کی ساری روح اور پیغمبر اسلام کا عورتوں کے ساتھ سلوک اس تاریخی رویہ کے ساتھ مطابقت نہیں کھاتا جو اسلامی اقوام میں فی الواقع ہمیں دکھائی دیتا ہے لیکن

ہماری تاریخ میں اس صورت حال میں کوئی تغیر رونما نہیں ہوا۔ یہ خدمت دور حاضر ہی کے سپرد تھی
کہ وہ اصلی اسلامی تعلیم کو سمجھے یا اسے ایک نئے معنی دے۔

ترکی قوم کے احساس اخلاق نے نہ پہلے کبھی تعدد ازدواج کو پسند کیا اور نہ اب پسند کرتا
ہے اور ترکی عورت نے ہمیشہ اس کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ
پچھلی صدیوں سے برابر تعدد ازدواج (جو عموماً دو بیویوں تک محدود ہوتا ہے) اگر۔۔ کہیں ہے
تو چھپے چھپائے۔ اس کے خلاف اگر کہیں کوئی صورت نظر آتی ہے اور یہ عموماً دیہاتوں میں ہوتا
ہے تو اس کی وجوہ معاشی ہیں یعنی مزدوروں کی قلت اور افلاس۔

جدید تمدنی تحریک کے ابتدائی مراحل میں کوئی مسئلہ نسواں نہ تھا خود کمال نے جس کا
احساس اور تخیل قدیم اسلامی فضا میں کام کرتا تھا اس معاشرتی مسئلہ پر توجہ نہیں کی۔ اور جہاں تک
میں جانتا ہوں سب سے پہلا شخص رومانی مصنف حامد تھا جس نے اس بارہ میں پیشقدمی کی
اور اپنی قوم کے احساس میں اس معاملہ پر جو چیزیں اپنا کام کرتی تھیں انہیں شاعرانہ انداز سے
ظاہر کیا اور انہیں ایک اچھی شکل دیکر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

اس کا ڈراما " طارق " جس کا مواد عربوں کی فتح ہسپانیہ سے لیا گیا ہے اس اعتبار سے تاریخ
تمدنی کی ایک نہایت قیمتی دستاویز ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ مردوں کے دوش بدوش عورتیں بھی
کس طرح شریک جہاد ہوتی اور زخم کھا کر " غازیہ " کا لقب پاتی ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ طارق کے لشکر
میں ایک چوتھائی عورتیں ہیں۔ ایک غازیہ کہتی ہے " ہم حاکم بھی بن سکتی ہیں اور تابع بھی۔ ہسپانیہ
کی دل بھانے والی حسینوں کی طرح ہم ناچوں اور تفریح گاہوں میں نہیں نکلتیں بلکہ ہم تعلیم گاہوں
اور جنگ کے میدانوں میں اپنے جوہر دکھلاتی ہیں۔" زہرا جو اس ڈراما کی خاص نسوانی شخصیت ہے
اپنے باپ امیر موسیٰ کی طرف سے ایک سرکاری فرمان لکھتی ہے تو اس کے بھائی عزیز اور مروان
فخر سے کہتے ہیں کہ تم غازیہ بھی ہو اور شاعرہ بھی۔ وہ تعجب سے جواب دیتی ہے۔ میں امیر موسیٰ
کی بیٹی ہوں اور عرب قوم سے ہوں۔ کیا یہ کوئی بڑی بات ہے کہ میں غازیہ بھی ہوں اور ادیبہ بھی۔

کیا عرب لڑکیوں میں تم ایک بھی ایسی نکال سکتے ہو جو لکھ پڑھ نہ سکے؟ جس سے مولودی باتوں کا ذکر ہو گا فنونِ لطیفہ کا یا جنگ کا؟" "کیا میں مسلم لڑکی نہیں؟ مسلم شہری نہیں؟ میں کیوں اوروں سے پیچھے رہوں؟ کیا یہ اسلام کا حکم نہیں کہ ہر ایک کو لکھنا پڑھنا جاننا چاہیئے۔ چاہے مرد ہو چاہے عورت؟" ایک اور جگہ حامد زہرا کی زبان سے کہلاتا ہے "تم عورت کو بیکار چیز سمجھتے ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ وہ ایک یتیم ہے جس کے حقوق چھین لئے گئے ہیں۔" طارق جو اس ڈراما کا ہیرو ہے ان الفاظ میں مرد اور عورت کی مساوات کا اعلان کرتا ہے "میں تو اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ ان ذہنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے اعتبار سے جو نوعِ انسانی کو ودیعت کی گئی ہیں عورت کو بھی اتنا ہی حصہ نہیں دیا گیا ہے جتنا مرد کو اور اس لئے میں اس خیال کو محض حماقت جانتا ہوں کہ ذہنی لحاظ سے عورت مرد سے پست ہے۔" ایک دوسری غازیہ عذرا ایک جگہ کہتی ہے کہ ریاستوں اور مذہبوں میں، مردوں اور عورتوں میں مساوات کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔ اسی ڈراما میں حامد کا یہ قول آتا ہے کہ "قوم کی عورتیں اُس کی ترقی کا معیار ہیں"۔ اور یہ قول آج ترکی میں سب سے مشہور ضرب المثل ہو گیا ہے۔ ڈراما کے آخر میں طارق اور زہرا کی شادی اس جدید تخیل کی مادی تصویر پیش کرتی ہے۔

حامد کو تبع نہایت زوردار ملے۔ فکرت نے اپنی نظم "ہمشیرم آتشین" (رباب شکستہ) میں ترکی عورت کے رنج و غم کی داستان سنائی اور ۔ ۔ ۔ برغر مکتبی آتشیں ۔ ۔ ۔ ۔ میں اُس نے تعلیم نسواں کی حمایت کی۔

امین نے بھی عورت کی مصیبت کو مختلف نظموں کا موضوع بنایا ہے خصوصاً اناطولی عورت کو جسے یہ پوری اناطولیہ کا مجسمہ جانتا ہے۔ اپنی نظم "اناطولیہ" میں اُس نے نہایت سخت لیکن سچے اور دل سے نکلے ہوئے لفظوں میں اس سلوک پر ملامت کی ہے جو عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے: "ہم نے اس کے سب حقوق بھلا دئے۔ ہم نے عورت کو جانور کے برابر سمجھا۔ ہم نے تیری بھی ویسی ہی ذلت کی جیسی پہلے تیری ماؤں کی کر چکے تھے تجھے

بھی ہم سے بیکس اور بے بس بنا دیا ...."

اپنی نظم "کوسِ امام" میں عاکف نے نہایت سختی سے اس خیال کی مخالفت کی ہے کہ شریعت عورت کے ساتھ تغافل اور بدسلوکی کی اجازت دیتی ہے اور اس خیال کو اسلام پر بہتان سے تعبیر کیا ہے۔ اُس نے مسئلہ نسواں پر مصری عالم فرید وجدی کی ایک تصنیف کا بھی عربی سے ترجمہ کیا جس میں اس مسئلہ کے متعلق مصری اور ترکی مصلحین کی آراء درج ہیں۔

خصوصاً عاکف کے طرزِ عمل سے اور نیز لوگوں کے خیالات کی وجہ سے موجودہ اسلامی عمل کی مخالفت بڑھی اور اس نے مسئلہ کو مذہبی مسئلہ بنا دیا۔ چنانچہ رسالہ "اسلام مجموعہ سی" میں محمد شمس الدین نے ایک سلسلۂ مضامین لکھا جس میں اسلام میں عورت کی حیثیت سے بحث کی گئی ہے اور موجودہ صورتِ حال کو بالکل غیر اسلامی ثابت کیا گیا ہے۔ افسوس کہ یہ سلسلۂ مضامین آخر تک نہ لکھا جا سکا۔ اس کے بعد اور کئی شخصوں نے اسی موضوع پر مضامین لکھے۔

لیکن اس سب بحث میں وہ اصلی سوال رہ گیا جو سب کے ذہن میں تھا یعنی تعدد ازدواج کے متعلق کیا کیا جائے۔ یہ تعدد ازدواج ہر چند کہ ترکوں میں گھٹتا جاتا تھا تاہم موجود ضرور تھا اور مغربی خیالات اور تنقید کے اثر سے اسی کو تمام قومی عیوب کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ اس سوال کو نہایت دلیری کے ساتھ قوم پسند جماعت نے پیش کیا اور اس کا جواب بھی دیدیا جس کی سب کو توقع تھی۔ یعنی اُس نے " وحدت زوجہ " کا فیصلہ کیا۔ مذکورہ بالا رسالہ "اسلام مجموعہ سی" ہی میں سمرنا کے سابق نمائندہ محمد سعید نے ایک مضمون اس عنوان سے لکھا کہ "اسلام میں تعدد زوجات ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے"۔ اس پر بڑا شور و غل ہوا اور قدامت پسندوں کی طرف سے اس کی بہت مخالفت ہوئی۔ سعید نے اور مضامین میں اپنے نقطۂ خیال کی تائید کی۔ اُس نے دلیل کی بنیاد "عدل" پر نہیں رکھی اگرچہ یہ خود اس کا بھی قائل ہے بلکہ اس سے زیادہ اصولی بات پر۔ اُس نے زور دیا ہے کہ قرآن کی متعلقہ آیت میں کوئی حکم نہیں ہے۔ اس سے وجوب ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف جواز۔ اور حکومت کو "اولوالامر" کی حیثیت سے "جائز" کے منع کرنے کا

حق ہے۔ چنانچہ اس نے ایک قانون کا مطالبہ کیا جسکی رو سے تعدد ازدواج ممنوع قرار پائے۔ اور "وحدت زوجہ" کا حکم نافذ ہو۔ قانون منظور بھی ہوا لیکن یہ اتنا دور رس نہ تھا جتنا کہ سعید کا مطالبہ چاہتا تھا۔ بلکہ اس عارضی قانون کی دفعہ ۴۰ کی رو سے یہ ٹھیک ہے کہ آدمی اس شرط سے شادی کرے کہ پہلی بیوی پر دوسری کا اضافہ نہ کریگا لیکن اگر وہ ایسا کرے تو پہلی یا دوسری ایک بیوی عقد سے باہر ہو جائے اور اس طرح اصلی شرط قائم رہے۔ قوم پسندوں کی حکومت نے جنگ عظیم کے دوران میں اس قانون کو عارضی طور پر نافذ کر دیا تھا لیکن جب یہ حکومت ختم ہوئی تو قدامت پسندوں کے اصرار پر نئی حکومت نے اسے منسوخ کر دیا۔ اس سے ترقی کی راہ میں کچھ تھوڑی سی رکاوٹ پیدا ہو گی لیکن اصل معاملہ کی صورت پر بہت کم اثر پڑے گا۔ ۲ جنوری ۱۹۲۱ء ہی کے اقدام میں فواد شکری نے اس تنسیخ کو ایک مجرمانہ ردعمل سے تعبیر کیا تھا۔

اس کے علاوہ مغرب پرستوں کی ایک جماعت ہے جو ترکی عورت کو سرے سے یورپی عورت بنا دینے کے درپے ہے۔ اس سلسلہ میں جلال نوری کی کتاب (قدنلری مز) یعنی ہماری عورتیں) قابل ذکر ہے۔ جو اگرچہ اس انتہا پسند رجحان کی حامل ہے تاہم نہایت احتیاط سے لکھی گئی ہے۔ اس تحریک کے لئے انگریزی حقوق طلب عورتوں کی جماعت نمونہ ہے۔ ہم بعد میں اس کا اور ذکر کرینگے۔

اقتباسات

ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قائم رہنے کی ایک سب سے بڑی دلیل یہ پیش کیجاتی ہے کہ یہاں مختلف نسلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگ رہتے ہیں اور بالخصوص یہ کہ یہاں سینکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں جس سے آپس میں اتحاد و یگانگت ہونا ناممکن ہے۔ اسی دعوے کی تردید کرتے ہوئے مسٹر جے۔ ٹی سنڈرلینڈ "ماڈرن ریویو" کے ایک تازہ نمبر میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں مختلف زبانوں کا وجود ہندوستان کی آزادی کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا اور نہ اس بنا پر یہاں ایک غیر ملکی حکومت کا ہونا حق بجانب ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر روس کو لیجئے، روس کے آخری دور میں اس سے کہیں زیادہ زبانیں، قومیں اور نسلیں تھیں جتنی آج ہندوستان میں بتائی جاتی ہیں لیکن اس کے لئے کوئی نہیں کہتا کہ روس حکومت خود اختیاری کے نااہل ہے اور اس پر ایک غیر ملکی حکومت کا قبضہ ہونا چاہئے۔ اور نہ صرف روس بلکہ آج ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اندر ہندوستان سے کہیں زیادہ قومیں اور زبانیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں جنوبی اور وسطی امریکہ کی قومیں رہتی ہیں، یورپ کی قومیں جاکر آباد ہو گئی ہیں ان کے علاوہ ایشیا، افریقہ اور تمام بڑے بڑے جزیروں کے لوگ وہاں رہتے ہیں۔ ان تمام قوموں کی زبانوں کا شمار کیجئے اور پھر انہیں ریڈ انڈین قبائل کی زبانوں کو شامل کر دیجئے پھر فیصلہ کیجئے کہ ہندوستان میں زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں یا ریاستہائے متحدہ امریکہ میں۔ اس بنا پر کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ جاپان، روس، فرانس یا انگلستان میں سے کسی کو اس پر حکومت کرنے کا حق پہنچتا ہے؟

تازہ اعداد و شمار کے مطابق کینیڈا میں ۱۰۰ زبانیں بولی جاتی ہیں، ۵۰ قومیتوں کے لوگ رہتے ہیں اور ۹۰ مذاہب پائے جاتے ہیں اور یہ اعداد اس کی آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف اقوام و مذاہب اور زبانوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہیں، باوجود اس

کے کنیڈا آپ اپنے اوپر حکومت کر رہا ہے اور تقریباً نصف صدی سے نہایت خوبی کے ساتھ حکومت کر رہا ہے۔ ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ دعویٰ کس قدر بے بنیاد ہے اور اس کے دلائل کس درجہ کمزور اور لغو ہیں۔

عربی علوم و ادب کے بعض علما کا خیال ہے کہ ایران کا تمام علم و ادب عربی زبان سے ماخوذ ہے اور ایران کے پاس اپنا مستقل سرمایہ کچھ نہیں ہے لیکن آر۔ اے نکلسن صاحب نے جنہیں عربی زبان اور ایرانی ادبیات دونوں سے بیک وقت تعلق ہے اس کے خلاف رائے ظاہر کی ہے اور جنوری سنہ ۳۲ء کے "اسلامک کلچر" میں وہ لکھتے ہیں کہ بارہویں صدی عیسوی کے آخر تک ایران اگرچہ برائے نام عباسی خلافت کی اطاعت کا دم بھرتا تھا لیکن اس کے بعد سے وہ نہ صرف مذہبی اور سیاسی حیثیت سے آزاد ہو گیا بلکہ اس زمانہ میں ایک ایسے وسیع اور مستقل لٹریچر کی تخلیق ہوئی جس میں ایرانی قوم کو اپنی ذہانت و ذکاوت کے ظاہر کرنے کا پورا موقع ملا۔ اس لٹریچر کا سب سے بڑا حصہ شعرا کی ذات سے وجود میں آیا گو یہ صحیح ہے کہ ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے ایران کی ابتدائی شاعری کی بنیاد بالکل عربی شاعری کے انداز پر ہے پھر بھی اس میں جدت اور مزید اضافہ کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ عربی علم عروض میں بہت کچھ ترمیم و تنسیخ ہوئی، نئی نئی بحریں ایجاد ہوئیں، قصیدہ کیساتھ رباعی، غزل اور مثنوی کی طرز ایجاد ہوئی۔ قصیدہ اور غزل میں اشعار کی تعداد محدود ہوتی ہے اور انہیں قافیہ اور مضمون کی بھی قید ہوتی ہے لیکن مثنوی ان تمام قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ فردوسی، نظامی اور جامی اپنی اپنی جگہ پر اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ مدح گوئی میں انوری اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ نظامی کی وفات سے قبل یہ معلوم ہو رہا تھا کہ فارسی شاعری تاریخی اور مدحیانہ انداز چھوڑ کر انسانی جذبات و خیالات کے وسیع میدان میں قدم رکھیگی چنانچہ اس کے بعد خسرو، جامی، فریدالدین عطار جیسے بڑے بڑے شعرا گزرے جنہوں نے مذہبی، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین کو شاعری میں داخل کیا اور یہ واقعہ ہے کہ فارسی زبان کا ہر بڑا شاعر ایک حد تک معلم اخلاق ہوتا ہے۔ بارہویں صدی کے آخر میں شاعری میں تصوف کا رنگ پیدا ہونا شروع ہوا جسکا سب سے بڑا مظہر فریدالدین عطار ہیں۔

"برفاب پری"

ازجناب محمد اکبر صاحب منیر

(برفهای "کهلن مرگ" آب شده از کوه سرازیر و جوی کوچکی را تشکیل میدهد که از سبزه زار گلمرگ میگذرد، این جوی قشنگی را "برفاب پری" اسم گزاشته اشعار ذیل در گلمرگ کشمیر گفته شد)

مهر چو شمشیر خود بر سر کهسار زد — از شکم برفها سر زده چون تو پری

زادهٔ کوهی ولے نیک شناسم که تو — آمدهٔ از فلک پاک ترک گوهری

جلوهٔ تو دلربا نغمهٔ تو دلکشا — می بخرامی بناز جان ز کف ما بری

پاک بود گوهرت صاف بود پیکرت — آئنہ خواند ترا گنبد نیلو فری

لغزش مستانهٔ مار صفت می خزی — جنبش دیوانهٔ تیغ صفت می بُری

طرفه سرودے زنی طرفه خرامے کنی — من بشگفت آمدم این چه بود ساحری

سحر برفتار تو سحر بگفتار تو — از که بیاموختی صنعت جادو گری

غرش تو رعد سا تابش تو برق وار — بارگیٔ رستمی خنجرک حیدری

گرچه شوی ریز ریز باز زنی تیغ تیز — نیک بدانی که چیست کشمکش داوری

گاه مسلماں شوی سجده کنی از نیاز — گاه تراشی بتے ساز دہی کافری

گه صفت آبشار می جهی دیوانه وار — گاه چو جوئے چمن ساز کنی دلبری

شعله فروزی بآب نقش بریزی بسنگ — گاه گلِ آتشی گاه بتِ آذری

چوں ز محبت بشب ماچ کند پیکرت — همچو گماں می برم دخت مه انوری

موج تو دارد بروز نور سرود حیات — نیک بهنگام شب نغمهٔ خواب آوری

تند برانی همی شوق وصال کسے — در ره هر منزلے میکندت رهبری

شعلهٔ اندر نوا شعلهٔ در زیر پا — برق صفت اے پری از بر ما گذری

جلوهٔ تو دیده ام شعلهٔ گل چیده ام
بهر تو افشانده ام گوهر نظم دری

تنقید و تبصرہ

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد (دکن) کی مرسلہ کتابیں

۱۔ خیابان اُردو | نظم و نثر کا انتخاب مرتبہ احمد عارف صاحب (حیدرآبادی)۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
حجم نثر ۲۰۴ صفحہ ۔ نظم ۱۰۰ صفحہ قیمت ؏ ۔

حلقۂ انتخاب بہت وسیع ہے۔ پرانے اور نئے نثاروں اور شاعروں میں سے غالباً کوئی مشہور شخص نہیں چھوٹا۔ مضامین کی ترتیب نہایت خوش سلیقگی سے کیگئی ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ قابل اطمینان ہے۔ مضامین اور ظاہری حیثیت دونوں کے اعتبار سے یہ کتاب اردو کی درسی کتابوں میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

۲۔ اسوۂ حسنہ | جامعہ عثمانیہ کی مجلس میلاد النبی کا انعامی مضمون از احمد عبداللہ المسدوسی صاحب تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ حجم ۲۷ صفحہ قیمت ۸/ ۔

احمد عبداللہ صاحب کا یہ مضمون واقعی انعام کا مستحق ہے۔ چند صفحوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے حالات اسقدر جامعیت کے ساتھ محققانہ انداز میں لکھنا سہل بات نہیں۔ بچوں بلکہ بہت سے بوڑھوں کے لئے بہت مفید کتاب ہے۔

۳۔ اردو کے اسالیب بیان | مصنفہ غلام محی الدین صاحب قادری ۔ ایم۔ اے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۰۴ صفحہ قیمت ؏ ۔

اس کتاب میں نثر اردو کی نشو و نما دکھائی گئی ہے اور اردو کے پرانے اور نئے انشاپردازوں کے اسلوب بیان کی خصوصیات بیان کیگئی ہیں۔

کتاب بہت محنت سے لکھی گئی ہے اور اس کے مطالعہ سے اوسط درجہ کے تعلیمیافتہ لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا خواہ اُس کے مذاق کی ترتیب میں کوئی خاص مدد نہ ملے۔

شذرات

پچھلے پچاس برس سے اسلامی ہند کی تعلیمی کوششوں کا مرکز علیگڈھ رہا ہے۔ سید احمد خاں کی زبردست شخصیت اور اُن کے ساتھیوں کی کوششوں نے اسے عرصہ تک ہندی مسلمانوں کی تمام نئی تحریکوں کا گہوارہ بنائے رکھا۔ اور یہ بات ابھی چند سال سے پیدا ہوئی ہے کہ اس ملک کے مسلمانوں میں ایسی تحریکیں رونما ہوسکیں۔ اور خود ان تحریکوں پر کچھ براہ راست اور بہت کچھ بالواسطہ علیگڈھ کی تحریک کا اثر رہا۔

... ...

اس مرکزی حیثیت کی وجہ سے جب کبھی علیگڈھ کے اندرونی معاملات میں کوئی خرابی پیدا ہوئی ہے تو ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمان بےچین ہو جاتے ہیں۔ تقریباً دس سال ہوئے جب انگریز اساتذہ نے علیگڈھ سے علیحدگی اختیار کی تو تمام ملک میں مسلمانوں نے کارکنان علی گڈھ کالج سے ہمدردی کا اظہار کیا اور اُن کے فیصلہ کا دل سے ساتھ دیا لیکن مسلمانوں کی عام سیاست اور علی گڈھ میں بُعد رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا تھا۔ جس نے ترک موالات کی تحریک کے زمانہ میں نہایت تکلیف دہ شکل اختیار کرلی۔ ہم اس جگہ اس افسوسناک اختلاف کی تفصیلات میں نہیں پڑنا چاہتے اور نہ اس غلط بیانی کی تردید پر وقت صرف کرنا چاہتے ہیں کہ تارکین موالات نے علیگڈھ کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ علیگڈھ کو اگر تارکین موالات نے نقصان پہونچایا تو خود وہ لوگ جو اس پر فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے علیگڈھ کو اس "حملہ" سے بچایا اپنی ناقابل فہم ملت دشمنی اور فرنگی دوستی کے سبب سے کہیں زیادہ نقصان کا باعث ہوئے۔ "حملہ" کی شدت کو اور شدید کرکے انہیں محافظین نے بتلایا تاکہ اس خدمت تحفظ کی قیمت سرکار سے

ابھی وصول کر سکیں۔ علی گڑھ یوں تو شروع ہی سے بوجوہ حکومت وقت کا حلیف تھا لیکن اس آخری دور میں یہ تعلق نہایت ناگوار اس وجہ سے ہو گیا کہ نفس تعلق اور مجرد تقرب مقصود قرار دیدیئے گئے اور حکومت سے دوستی اسلامی ہندی سیاست میں محض ایک عارضی ذریعہ سمجھی جانے کے بجائے ایک قدر مطلق تسلیم کر لیگئی۔ اس تقرب نے قوم سے بُعد بڑھایا اور اس بُعد نے قوم کی طرف سے بے اعتنائی پیدا کی۔ انتظامی جماعتوں کے وہ عناصر جو صحیح نکتہ چینی کر کے ارباب حل وعقد کی میانہ روی کے ضامن تھے، بالکل کنارہ کش ہو گئے۔ اب نہ قوم کی طرف سے علی گڑھ میں کسی خاص دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا نہ ان کی غلطیوں پر نکتہ چینی۔ کارکنان علیگڈہ اطمینان سے حکومت کی دوستی اور سرپرستی کے نشہ میں سرشار جو چاہتے کرتے تھے۔

... ...

یکایک اس پرامن خاندانی زندگی میں مناقشات کی صورت پیدا ہوئی۔ اب مخالفت یونیورسٹی کے تباہ کرنے والوں سے نہ تھی، نہ تارکین موالات کا حملہ تھا بلکہ عشاق کی باہمی تدابیر تھیں اور مخالف فریقوں میں فیصلہ کے لیئے دونوں کی نظر قوم کی طرف نہیں، بلکہ "سرکار" کی طرف تھی۔

یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر نے یونیورسٹی کورٹ کو آگاہ کئے بغیر، خود چانسلر سے استصواب کرنے سے پہلے سرکار دولت مدار کی توجہ یونیورسٹی کی بےضابطگیوں اور بےقاعدگیوں کی طرف منعطف کرائی اور مداخلت کی درخواست کی۔ خدا بھلا کرے یونیورسٹی کی چانسلر بیگم صاحبہ بھوپال کا کہ انہوں نے قوم کو اس بے غیرتی سے محفوظ رکھا کہ لارڈ رِڈنگ (وائسرائے) کوئی تحقیقاتی کمیشن مقرر کر کے دونوں سرکار دوست فریقوں کا جھگڑا چکائے اور مسلم قوم کو ہمیشہ کے لیئے محجوب کر دے۔

بیگم صاحبہ نے خود ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر فرمایا۔ کمیشن نے تحقیقات کی اور اپنی رپورٹ پیش کی جو عرصہ تک صیغۂ راز میں رہنے کے بعد چند ہفتے ہوئے ممبران کورٹ کو بھیجی گئی اور

۱۵ اپریل کو اس پر غور کرنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کورٹ کا جلسہ منعقد ہوا۔

... ...

کمیشن نے اپنی رپورٹ میں جس صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے وہ مسلمانوں کے لئے جسقدر شرمناک ہے اُسی قدر افسوسناک بھی ہے۔ مسلمانوں کی اس قومی امانت کے ساتھ کارکنوں نے جو کچھ کیا اور باغی 'مخالفوں' سے پاک کرکے یہ 'وفادار' ساتھی' جو کھیل کھیلے اُس کا مختصر سا تذکرہ لوگ کمیشن کی رپورٹ میں پڑھ سکتے ہیں۔

کورٹ کے گزشتہ اجلاس میں اس صورت حال کو بدلنے کی تدابیر پر غور کیا گیا۔ کمیشن کی سفارشات کو تقریباً حرف بحرف مان لیا گیا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین ایک ربع صدی سے زیادہ تعلق کے ساتھ اپنی خدمات سے دستکش ہو گئے۔ اور اگرچہ کمیشن کی رپورٹ اور اندرونی حالات کے علم کے بعد ہمارے نزدیک اُنکی علیحدگی یقیناً ضروری تھی لیکن وہ بلا لڑے جھگڑے اور اپنی مضبوط پارٹی کی قوت کو کام میں لائے بغیر جس طرح خاموشی سے الگ ہو گئے وہ بہت قابلِ تعریف ہے اور انھوں نے اس طرزِ عمل سے اپنے اثر میں اضافہ کیا ہے۔

کمیشن نے اصلاح کی جو اور سفارشیں کی ہیں انہیں کورٹ نے تقریباً حرف بحرف تسلیم کر لیا۔ البتہ ترمیم کی کوشش جہاں اور جس طرح کی وہ بہت سبق آموز ہے۔ کمیشن کی سفارش ہے کہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی علیحدگی کے بعد صرف تین سال کے لئے ایک ایسا شخص بطور مخصوص افسر کے مقرر کیا جائے جو مقامی سازشوں اور جماعت بندیوں سے علیحدہ ہو، جسے تین سال بعد خود یونیورسٹی میں رہنے کی توقع نہ ہو تاکہ وہ خود کہیں اپنی جماعت نہ بنائے، اور جو ایسی حیثیت کا آدمی ہو کہ سب اس پر اعتماد کر سکیں۔ کمیشن نے عمداً یہ سفارش نہیں کی کہ یہ افسر یورپین یا انگریز ہو۔ لیکن کورٹ کے ایک نہایت با اثر گروہ نے یورپین اور انگریز افسر کے بلانے پر اصرار کیا اور صاف صاف تسلیم کیا کہ مسلمانوں میں کوئی شخص ایسا نہیں جو اس بارِ عظیم کو اپنے سر لے سکے۔ ان ہمدردوں نے یہ نہ سوچا کہ کسی تعلیمی تحریک کی ناکامی کا اس سے زیادہ اور

ثبوت ہوسکتا ہے کہ پچاس سال کی پیہم کوشش کے بعد وہ خود اپنے قیام و بقا کے لئے کافی افراد نہ پیدا کر سکی ہو۔ بہرحال ان حضرات کا یہی عقیدہ تھا۔ خوش قسمتی سے ایک دوسرا گروہ بھی موجود تھا جس نے اس کی مخالفت کی اور بتلایا کہ انگریز یا یوریین کا بلانا اور اس لئے بلانا کہ وہ اس تعلیمگاہ میں نئی روح پھونکے تا سے اُس راہ پر چلائے جو بانی کے پیش نظر تھی، یہی نہیں کہ قومی بے غیرتی و بے شرمی کی نشانی ہے بلکہ بے معنی بھی ہے۔ علی گڈہ یونیورسٹی اگر خاص مسلمانوں کی تعلیم گاہ ہے، اور تمدن اسلامی کا قیام اور اس کی تجدید اُس کا مقصد ہے، تو اسکی اصلاح اسطرح نہیں ہوسکتی جیسے کسی بیٹھتے ہوئے کارخانہ میں کوئی سخت مزاج اور دیانتدار انگریز مہتمم رکھ دینے سے ہو جاتی ہے لیکن اگر علیگڈہ کسی ایسی کوشش سے - ہے جسکو مسلمانوں کی حیات قومی سے تعلق ہونا چاہئے، جو مخصوص اسلامی مقاصد کی تکمیل کے لئے ہی اگر جاری رکھی جائے تو اسکا جاری رکھنا جائز ہے ! اگر ہندوستانی مسلمانوں کی مخصوص معاشرتی معاشی اور سیاسی ضروریات اور مشکلات کا پرتو اس کوشش میں نظر آنا ضروری ہے، مختصر یہ کہ اگر علی گڈہ مسلمانوں کی قومی درسگاہ ہے تو اس کے اہم مقاصد کے حصول کے لئے کسی غیر مسلم پر بھروسا کرنا جو بو کر آم کے درخت پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہے۔

... ...

خدا کا شکر ہے کہ کورٹ کے ممبروں کی ایک کافی تعداد نے مغرب پرستی کے اس مظہر کی مخالفت کی اور بالآخر یوریین یا انگریز کی شرط ہٹا دی گئی۔ لیکن پھر بھی جس ترمیم میں مسلمان کو ترجیح دینے کا ذکر تھا وہ دوراییوں سے مسترد ہو گئی۔

رپورٹ کی جملہ سفارشات پر عمل کرنے کے لئے ایک کمیٹی کا انتخاب بھی ہوا ہے۔ جس میں ۱۱ ممبر ہیں، ان میں ایک لارڈ رکٹ کا نمائندہ ہوگا اور ایک وزٹنگ بورڈ کا۔ اور ایک یہ مجوزہ افسر خاص۔ احتمال کیا تقریباً یقین ہے کہ یہ تینوں انگریز ہوں گے۔

کاش اس قومی امانت کے امین سمجھتے کہ اصلاح و تجدید کے اس کام میں اس قدر

تو ی عنصر دوسری قوم کا رکھنا کیا معنی رکھتا ہے

دلا تا رائی پروانہ تا کے   نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکی خود را بسوز خویشتن سوز   طواف آتش بیگانہ تا کے

اپریل کی ابتدائی تاریخوں میں گروکل کانگڑی کا سالانہ جلسہ ہوا۔ اس جلسہ کے سلسلہ میں پچھلے سال سے قومی تعلیمگاہوں کے طلبہ کا ایک مشترک مباحثہ بھی ہوا کرتا ہے۔ امسال مباحثہ کا مضمون یہ تھا کہ ”شہنشاہیت تہذیب انسانی کے لیئے فی الجملہ ممد و معاون ثابت ہوئی ہے“۔

جامعہ ملیہ کے طلبہ کو بھی دعوت آئی تھی اور جامعہ کی انجمن اتحاد نے مقابلہ میں شرکت کے لیئے اپنے دو اراکین کو بھیجا تھا۔ ہمیں بہت خوشی ہے کہ جامعہ ہی کے ایک طالب علم کو بہترین تقریر کرنے پر اول انعامی تمغہ ملا اور دونوں مقرروں کے مشترکہ نمبر دوسرے کالجوں کے شرکا کے نمبروں سے زائد رہے اور جامعہ کو اس وجہ سے وہ ٹرافی ملی جو سوامی شردھانند کے نام سے موسوم ہے۔

اس سالانہ جلسہ کے سلسلہ میں ایک ادبی کانفرنس (”سرسوتی سمیلن“) بھی منعقد ہوئی ہے جس کے صدر اس سال ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب شیخ الجامعہ منتخب کیئے گئے تھے۔

جلسہ میں آریہ سماج کے ممتاز اراکین کے علاوہ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو اور پرنسپل کرپلانی بھی شریک تھے اور ہمیں معلوم ہوا ہے کہ ان تینوں حضرات کی شرکت نے جلسہ میں رواداری اور وسعت قلب و نظر کی نہایت خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی۔

جلسہ میں قدرت کی طرف سے بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ جلسہ کے دوسرے ہی روز نہایت شدید آگ لگ گئی جس سے مہمانوں کے عارضی مکانات کا بہت بڑا حصہ جلکر خاک سیاہ ہو گیا۔ تیسرے روز سخت آندھی چلتی رہی لیکن باوجود ان نامساعد حالات کے حاضرین کی تعداد

میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اور چندہ کے وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ چندہ بھی گروکل کی نئی عمارت کے لئے ہو گیا۔

مختلف کانفرنسوں اور مباحثوں میں گروکل کے فارغ التحصیل طلبہ نے حصہ لیکر اپنے مادر علمی کے نام کو روشن کیا۔ اور جلسہ میں جامعہ کے جو حضرات شامل تھے انکا خیال ہے کہ گروکل کی تحریک آریہ سماج کا سب سے بہتر اور مستحکم جزو ہے جس کی تفصیلات سے واقفیت ہر ہندوستانی کے لئے ضروری ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ کسی آئندہ اشاعت میں گروکل کے متعلق مزید تفصیلات ہدیۂ ناظرین کر سکیں۔

روسی انقلاب غالباً دور حاضر کے تاریخی واقعات میں سب سے اہم واقعہ ہے۔ دوسری انقلابی تحریکوں کی طرح اس عظیم الشان انقلاب میں بھی تخیل کی بلند پروازی اور حقیقت کی اٹل دشواریاں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہوئیں اور نتیجہ اگرچہ شروع کے انقلابی اعلانات سے مختلف نکلا لیکن ایک توازن رفتہ رفتہ قائم ہو گیا اور ترقی انسانی کے لئے اور یہی ہر انقلابی تحریک کا مثبت فائدہ ہوتا ہے۔

روسی انقلاب دنیا سے شخصی ملکیت کو مٹانے کے لئے کیا گیا اور اُس نے دنیا کی سب سے بڑی کسان آبادی کے لئے زمین کو کسان کی شخصی ملک بنا دیا۔ وہ صنعتی مزدور کی حکومت قائم کرنے کے لئے اٹھا اور کسان کا اقتدار بڑھا گیا۔ انقلاب پسندی کی روح پھونکنے نکلا اور قدامت پسندی کے سامنے سر جھکانے پر مجبور رہا۔ ٹراٹسکی نے اسے ظفر یاب بنایا اور خود اسٹالین کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔

اس انقلاب کی ابتدائی بے عنوانیوں میں ایک یہ بھی تھی کہ یہ محض جسمانی کام کرنے والوں کو دولت آفریں طبقہ مانتا تھا اور ذہنی کام کرنے والوں کے حقوق کو کسی طرح تسلیم کرنے پر وہ نہ تھا۔ کچھ تو غلط معاشی نظریوں کی وجہ سے دولت آفرینی محض مادی اقتدار کے پیدا کرنے

تک محدود کردی گئی تھی۔ بلکہ یہ بھی تھا کہ شروع انقلابی زمانہ میں ذہنی کام کرنے والوں سے بڑا انقلابی تحریک کو نقصان پہونچایا۔ پہلے تو کھلی مخالفت کی اور جب یہ بروے کار نہ آئی تو خفیہ دغابازی سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جسمانی کام کرنے والوں نے جی کھول کر بدلا لیا۔ اور ہزاروں ذہنی کام کرنے والے اس بدنصیب ملک میں بھوکوں مر گئے۔ اور لاکھوں اپنا وطن چھوڑ کر پردیس میں جا بسے۔

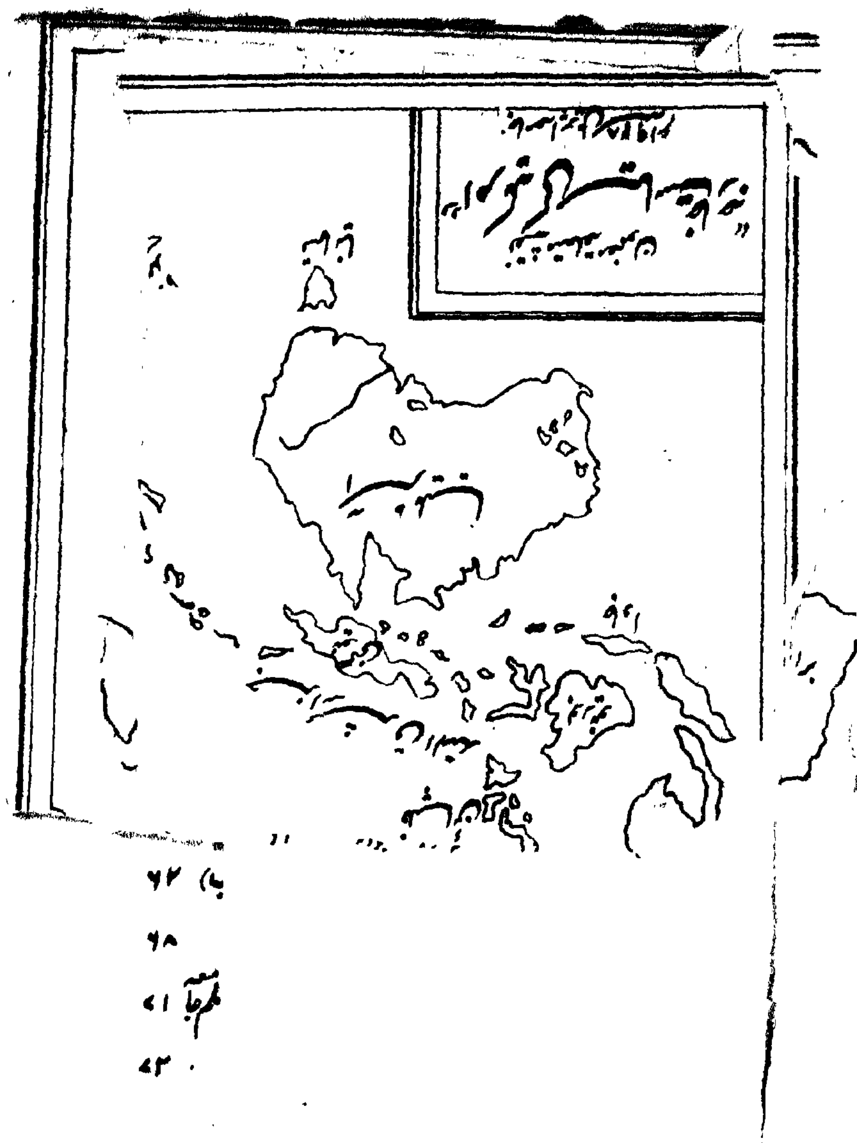
اب کچھ صورت حالات میں تبدیلی شروع ہو گئی ہے اور روسی حکومت نے کئی قوانین کئے ہیں جنسے ذہنی کام کرنے والوں کو کم سے کم وہ درجہ تو حاصل ہو جائے گا جو جسمانی کام کرنیوا کو حاصل ہے۔

مصوروں اور سنگ تراشوں کو اپنے کام کے لئے خاص قسم کے مکانات کی ضرورت پڑتی ہے۔ انکے کرایہ میں رعایتیں کیجائینگی۔

ذہنی کام کرنیوالوں کے بچوں کو دوسرے مزدوروں کے بچوں کیطرح سرکاری مدارس کی فیس وغیرہ میں جملہ مراعات حاصل ہوں گی۔

مکان کے کرایہ کے بارہ میں بھی ذہنی کام کرنیوالوں کے ساتھ وہی رعایتیں کیجائینگی جو مزدور کے ساتھ کیجاتی ہیں۔

اس درجہ سے شاید ہمارے اہل علم مطمئن نہ ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ روس میں مزدور کی حکومت ہے۔ اہل علم کو وہی مراعات حاصل ہو جانا جو مزدوروں کو ہیں ایسا ہی ہے جیسے ہندو میں ہر شخص کو وہ حقوق ملجائیں جو ہر انگریز رکھتا ہے! اور یہ بہت ہیں!!



جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری   ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۱	بابتہ ماہ مئی ۱۹۲۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۴۶ھ	نمبر ۵

فہرست مضامین

پانچ ہزار سال قبل ہندوستان کی تہذیب

سندھ اور پنجاب کے حیرت انگیز انکشافات

(گزشتہ سے پیوستہ)

گزشتہ نمبر میں سندھ اور پنجاب کے ان ہر دو مقامات پر جو اشیا برآمد ہوئی ہیں ان سے ایک حد تک تفصیل سے بحث کی گئی تھی اس نمبر میں زیادہ تر اس تہذیب کے حدود اور اثرات سے گفتگو کیجائے گی۔

اس تہذیب کا رقبہ کہ جس کے آثار موہنجو دڑو اور ہڑپا سے برآمد ہوئے صرف انہی مقامات کے اردگرد تک محدود نہیں ہے بلکہ اگر گردونواح کے اور آثار سے جو وقتاً فوقتاً نکلے ہیں، ان آثار کا مقابلہ اور موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تہذیب و تمدن کا رقبہ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مغرب کی طرف بلوچستان کے علاوہ نل اور جھلوان میں جو کھدائی کا کام ہوا ہے اور جو آثار برآمد ہوئے ہیں، ان کی بنا پر ہارگریوز کا خیال ہے کہ اس تہذیب کا دائرہ بلاشبہ بلوچستان کو بھی اپنے اندر شامل رکھتا تھا۔ مشرق کی جانب جیسا کہ سر جان مارشل کہتے ہیں، یہ دائرہ راجپوتانہ تک آتا ہے۔ اور نہ صرف یہیں تک بلکہ کوئی وجہ نہیں کہ دریائے گنگا کے وادی میں جس تہذیب کے آثار نمودار ہوئے ہیں وہ بھی اسی تہذیب سے ماخوذ نہ سمجھی جائے۔ جنوب میں کاٹھیاواڑ اور گجرات تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال میں پنجاب کا علاقہ اس کے اندر داخل ہی تھا جو کہ موجودہ آثار ہڑپا واقع ضلع منٹگمری سے ظاہر ہے۔ اس طرح ملحقہ نقشہ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بخوبی واضح ہو جائے گا کہ اس تہذیب کا دائرہ اثر جو آج سے تقریباً ۵ ہزار سال قبل دریائے سندھ کے اس وادی میں برسر عروج تھی، مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں

کہانتک پھیلا رہا ہوگا۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تہذیب کا زمانہ کیا تھا ؟ اس کے جواب میں سب سے بڑا ثبوت تو وہی مہریں ہیں جو اور حالتوں میں بھی اپنے سے بڑھکر نظیر نہیں رکھتیں۔ اسی قسم کی چند مہریں سوسا (Susa) اور عراق میں بھی نکلی ہیں جن پر ہندوستانی خیالات و روایات کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، انکے متعلق یہ نہایت آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ انکا زمانہ سارگون اول (Sargon I.) سے قبل کا ہوگا یعنی حضرت مسیح سے ۲۷۰۰ سال قبل۔ اسی قسم کی دوسری مہر اُور (Uhr) میں برآمد ہوئی ہے جس کے بارہ میں بھی یہ قطعی فیصلہ ہے کہ وہ تیسرے ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ ان دو دلائل سے کہ جنکا زمانہ مسلم ہے، یہ آسانی سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ مہریں بھی جو موہنجو دڑو اور ہڑپا میں نکلی ہیں کم و بیش اسی زمانہ کی ہوں گی۔ علاوہ اس کے کھدائی کے سلسلہ میں یکے بعد دیگرے ۷، ۸ تہیں نکلتی چلی گئی ہیں اور نہیں سب سے بالائی تہ پر جو آثار اور نشانیاں دستیاب ہوئی ہیں، وہ کسی طرح تیسری صدی قبل مسیح سے اِدھر کی چیزیں نہیں معلوم ہوتی ہیں، پھر اگر ہر ایک تہ کو ہم ایک عہد کے عروج و زوال کا مظہر قرار دیں جو کسی طرح ۳ صدی سے کم کی مدت نہیں ہوسکتی، تو اس سے بھی سب سے آخری تہ کا زمانہ ۲۷۰۰ قبل مسیح کے لگ بھگ آتا ہے۔ ایک اور بڑا ثبوت اس کی قدامت کا یہ ہے کہ کہیں لوہے کا نام و نشان نہیں پایا جاتا۔ جو ظروف یا آلات حرب ملے ہیں، وہ سب تانبے کے بنے ہیں۔ حجری عہد کا تمدن سے متمدن دور گزرنے کے بعد جب یہ زمانہ آیا ہوگا تو ابھی حدیدی عہد (Iron Age) شروع نہیں ہوا تھا، بلکہ ہر دو زمانوں کے درمیان میں جو ایک دور گزرا ہوگا، یہ تہذیب اسی زمانہ میں برسر عروج رہی ہوگی اور یہ زمانہ زیادہ سے زیادہ کتنا ہی پیچھے ہٹایا جائے، تیسرے ہزار قبل مسیح سے اِدھر نہیں ہوسکتا، ایک اور بڑی دلیل اس تہذیب کے قدیم ہونیکی یہ بھی ہے کہ اس کے آثار و علامات ہندوستان کی دوسری نشانیوں اور آثار سے جو

مختلف جگہوں اور زمانوں میں منصہ شہود پر آئی ہیں، کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ قدیم سے قدیم آثار ہندوستان کی تہذیب کے جو دستیاب ہوئے ہیں وہ آریوں کے زمانہ کے ہیں جن کی آمد کا زیادہ سے زیادہ زمانہ ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح ہو سکتا ہے۔ لیکن آرین تہذیب کے جو آثار و قرائن اس سے پیشتر ملے ہیں ان کو ان چیزوں سے جو موہنجوداڑو اور ہڑپا میں برآمد ہوئی ہیں، دور کی نسبت بھی نہیں ہے اس سے بلا خوف تردید یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس تہذیب کا زمانہ آریوں سے اتنا قبل رہا ہوگا اور ہر دو زمانوں میں آتنی طویل مدت حائل رہی ہوگی کہ ہر دو زمانوں کے آثار اپنے اندر اس درجہ عدم مشابہت اور عدم مماثلت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح سے آگے ہم اس زمانہ کا جو تعین کریں کم ہے۔

ایک دوسرا امکان یہ ہے کہ یہ آریوں کے آنے سے قبل دراوڑی تہذیب ہو سکتی ہے لیکن اس نظریہ کے تسلیم کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ دراوڑی زبان کا ماخذ ششہ ق۔م سے آگے نہیں جاتا اور اس بنا پر اسکا تعلق ۳ ہزار سال قبل مسیح سے قرار دینا کسی طرح بھی قرین قیاس نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس سے مضبوط نظریہ یہ ہے کہ اسکا تعلق بہت ممکن ہے کہ سمیریا یعنی عراق کی تہذیب سے ہو۔ انگلستان کے ایک بڑے ماہر سیاسیات اے۔ ایچ سیاسے H.Sayace کا خیال ہے کہ سوسا اور شمالی مغربی ہندوستان میں حضرت مسیح سے کوئی ڈھائی ہزار بر نہایت گہرے تعلقات تھے۔ بعض دیگر محققین نے بھی اس کی تائید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تعلقات بری اور بحری دونوں راستوں سے تھے خشکی کا راستہ جنوبی ایران اور بلوچستان ہو تا ہوا آتا تھا۔ برٹش میوزیم کے دو بڑے ماہرین گیڈز Gadd) اور سڈنی اسمتھ d ney Smith نے بھی یہی کہا ہے کہ یہ تہذیب یا تو بالکل سومیر اور بابل کی تہذیب سے ماخو ہے یا کم سے کم ان تہذیبوں سے اسکا گہرا تعلق ضرور ہے۔ سب سے بڑا ثبوت اس امر

ان مہروں اور تختیوں کے باہمی مشابہت اور مماثلت ہے جو ہر دو تہذیبوں کے علاقوں میں نکلی ہیں۔ لیکن ایک طرف جہاں ہر دو علاقوں میں یہ مشابہت و مماثلت پائی جاتی ہے، وہاں دوسری طرف اس سے کہیں زیادہ عدم مشابہت اور اختلاف کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ اگر چند مہروں اور تختیوں میں کسی قدر یکسانیت اور مماثلت کا پتہ چلتا ہے تو اسکے ساتھ ۱۰۰ کے قریب ایسی مہریں بھی نکلی ہیں جن سے عراق کی مہروں سے نسبت اور تعلق کا گمان بھی نہیں ہوسکتا۔

چوتھا امکان اور غالبًا سب سے غالب امکان یہ ہے کہ یہ خالص ہندی تہذیب کے آثار ہیں اور اس میں کوئی ضد یا اختلاف نہیں ہے تاجس طرح دریائے نیل، فرات و دجلہ اور دوسرے بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے عظیم الشان تہذیبیں پیدا ہوئیں، اسی طرح بہت ممکن ہے کہ دریائے سندھ کے ساحل پر بھی خالص ہندی نژاد تہذیب وجود میں آکر پھلی پھولی اور پروان چڑھی ہو۔ بعض مہروں کی عراق کی دریافت شدہ مہروں سے مشابہت رکھنے پر اگر اس کے عراقی تہذیب سے ماخوذ ہونیکا گمان ہوسکتا ہے تو سیکڑوں مہروں کی عدم مشابہت اور اختلاف صوری پر اس کے غیر ملکی ہونے کا کیوں نہ یقین کیا جائے۔ یا بقول کننگھم بعض مہروں پر ایسے بیلوں کی تصویریں نظر آنے سے جن کے کوبھ نہیں ہیں اگر یہ آثار اس کے غیر ہندی ہونے پر دلالت کرسکتے ہیں تو اب جدید اکتشافات سے یہ امکان بھی باقی نہیں رہا ہے، اس لئے کہ اب جو مہریں نکلی ہیں ان میں سے ایک پر نہایت صاف تصویر ایسے بیل کی ہے جس کے کوبھ بھی ہے غرض جس طرح اور بہت سے امکانات پیش کئے جاتے ہیں، ہمارے خیال میں اس امکان کے تسلیم کرنے میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہے کہ یہ ایک خالص ہندی مستقل بالذات تہذیب کے آثار ہیں۔ اس قدیم زمانہ میں ایک ایسے خطہ پر جہاں انسانی آبادی کا وجود نہ صرف ممکن بلکہ اس کے قوائے جسمانی و دماغی کے نشو و نما کے لئے زیادہ سے زیادہ مواقع مل سکتے تھے، انسانی تہذیب و تمدن کا شیوع ہوا اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد جب وہ تہذیب اپنی عمر طبعی پوری کرچکی تو فنا ہوگئی۔ اسی طرح

دوسری تہذیبوں کا بھی اپنے اپنے علاقوں میں یہی حال ہوا یہ امر کہ ایک نے دوسری کی جگہ لی یا ایک فنا ہوئی تو دوسری وجود میں آئی کوئی لازمی اور ضروری چیز نہیں ہے۔ بہ یک وقت متعدد تہذیبوں کا اپنے اپنے حدود میں وجود پذیر ہونا کوئی خلاف قیاس امر نہیں۔ علاوہ اس کے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک تہذیب دوسری تہذیب سے سرتاسر ماخوذ ہو۔ باہم دو تہذیبوں میں قدرے مشابہت و مماثلت ہونا بذات خود ایک قدرتی امر ہے، اس لئے کہ طبایع انسانی میں اجزا مشترک ہیں اور پھر اگر کچھ بہت زیادہ یکسانیت و مشابہت پائی بھی جائے تو اس کا سبب باہمی تعلق وارتباط ہے جو بیک وقت موجود رہنے والی دو تہذیبوں میں ممکن ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اگر یہ امر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ایک خالص ہندی نژاد تہذیب کے آثار ہو سکتے ہیں تو چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

ان آثار سے جو موہنجودڑو اور ہڑپا میں نکلے ہیں خواہ اس امر کا یقین ابھی نہ ہو سکے کہ یہ تہذیب دراصل کہاں سے ماخوذ ہے یا اس پر کن کن تہذیبوں کا کہاں تک اثر ہے۔ لیکن اتنا تو کم سے کم بلا کسی رد و قدح کے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان میں اب سے کوئی پانچ ہزار سال قبل ایک نہایت عظیم الشان اور بلند پایہ تمدن موجود تھا۔ اب تک عام خیال یہ رائج تھا کہ ہندوستان میں علم و فن، تہذیب و تمدن، زندگی و معاشرت کی اصل بانی مبانی آرین اور صرف آرین ہوئے ہیں اس یقین کا تو پورے طور پر خاتمہ ہو گیا ہے اور اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ہندوستان میں آرینوں کے آنے سے قبل بھی ایک اعلیٰ اور کسے انکار ہو سکتا ہے کہ ایک اعلیٰ تر تہذیب موجود تھی۔ اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کا سرچشمہ جو تمام تر آرین اور انکی زندگی و معاشرت کو قرار دیا جاتا ہے، اسکا اصل خزانہ دراصل حضرت مسیح سے ڈیڑھ ہزار سال قبل شمال و مغرب سے آئی ہوئی قوم کے پاس نہیں بلکہ اس سے تین ہزار سال قبل دریائے سندھ کا علاقہ تھا۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ آرین ایک نہایت مہذب و متمدن قوم تھی اور جب اس نے ہندوستان کے اندر قدم رکھا

تو اسے ایک نہایت غیر متمدن اور اپنے سے پست تر قوم سے سابقہ پڑا جسے اس نے اپنا غلام بنالیا اور اس رعایت سے اسے "داسو" کہنے لگے جس کے لغوی معنی غلام کے ہیں۔ لیکن ان آثار سے شمالی ہند کے اس علاقہ میں رہنے والوں کے تمدن و معاشرت پر جو روشنی پڑتی ہے اس سے ہرگز یہ یقین نہیں ہو سکتا کہ یہ کوئی معمولی قوم رہی ہوگی جو آسانی سے مطیع ہو کر ان بدیسیوں کی غلام بنگئی ہوگی۔ نیز ان کے قیام و طرز زندگی کے متعلق یہ بھی خیال چلا آتا ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے گانوؤں کے رہنے والے تھے جنہیں "پُرہ" کہتے ہیں۔ مگر سندھ اور پنجاب کے ان حصوں میں یکے بعد دیگرے جو تین عظیم الشان شہر کے آثار مع ان کے تمام لوازمات کے پائے گئے ہیں ان سے ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ آریوں سے قبل ہندوستان کے لوگ شہروں کی متمدن زندگی سے ناواقف محض تھے اور تہذیب و تمدن کا یہ سبق انہیں آریوں نے آکر سکھایا۔

ایک اور مسئلہ پر ان تازہ اکتشافات کا براہ راست جو اثر پڑتا ہے وہ رگ وید اور اتھروید کے باہمی تعلق کا مسئلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رگ وید، اتھروید سے بعد کے "شلوکوں" کے مجموعہ کا نام ہے، اس لئے کہ ان میں رفتہ رفتہ ایسے جانوروں اور چیزوں کے نام ملتے ہیں جو رگ وید میں نہیں پائے جاتے۔ اس پر قیاس یہ کیا جاتا ہے کہ جوں جوں آرین مشرق کی جانب بڑھتے گئے وہ اسی رفتار سے نئی نئی چیزوں سے واقف اور باخبر ہوتے گئے۔ چنانچہ اتھروید جو بعد کے "شلوکوں" کے مجموعہ کا نام ہے، بہت سے نئے نئے جانوروں اور چیزوں کے نام سے بھری ہوئی ہے، مثلاً شیر، ہاتھی اور مچھلی وغیرہ جو رگ وید میں نہیں آتے یا اگر آتے ہیں تو اس کے آخری حصہ کے "اشلوکوں" میں آتے ہیں۔ برعکس اس کے اتھروید میں انکا ذکر بہ کثرت اور بالعموم آتا ہے۔ لیکن ان ہر دو مقامات پر ایسے ایسے جانوروں کی ہڈیاں اور نشانیاں پائی گئی ہیں جو وید کے اخیر

سے اخیر حصوں میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے رگ وید کی قدامت اور دوسرے ویدوں کے ساتھ اس کے تقدم کا جو تخیل تھا وہ سرے سے جاتا رہتا ہے۔ یہاں کتنی مہریں ایسی نکلی ہیں جن میں ہاتھی۔ شیر، بیل اور مچھلی وغیرہ کی تصویریں نہایت صاف اور واضح طور پر نظر آتی ہیں۔

غرض اب تک جتنی چیزیں برآمد ہو چکی ہیں۔ انکے صحیح اور پوری روشنی کا بہت کچھ انحصار ابھی آئندہ مزید اکتشافات پر ہے جن قرائن و اثرات کا ذکر اب تک ہوا ہے، وہ صرف اشارات اور توجیہات ہیں تفصیلات و تصریحات کے لئے ابھی بہت کچھ ہمیں مکتشفین کی آئندہ کوششوں اور نتائج کا انتظار کرنا پڑیگا۔



اُردو اکیڈیمی

جب انسان نے ارتقائی منازل طے کرنیکے بعد انسانیت میں قدم رکھا تو اُس نے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کی ضرورت محسوس کی بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ احساس ہی حیوانیت محض سے اُس کے افتراق اور امتیاز کا باعث ہوا بعض انواع وحوش وطیور کے جماعت نما طرز ماندوبود پر اجتماعی زندگی کا اطلاق نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اُنکا طبعی فعل اور جبلی عمل ہے جتھابندی اور اجتماعی زندگی کے لئے اعضائے قبیلہ اور افراد قوم اور ارکان جماعت کا ایک دوسروں کے ارادوں اور خواہشوں سے واقف ہونا لازمی ہے۔ اس واقفیت کے حصول کا صرف ایک ہی کامل ذریعہ ہے اور وہ زبان ہے۔ اجتماعی زندگی کی غرض وغایت ہے دوسری مخلوقات کے ساتھ جدالبقا میں انسان کی فتح وکامیابی توانین قدرت وقوانین فطرت پر اسکا عبور اور انسانی مفاد وبہتری اور ترقی کے لئے اُنکا استعمال۔ اجتماعی زندگی کا مدار ہے ہمدردی ومشاورت اور معاونت پر۔ اور مشاورت اور معاونت منحصر ہے ایک کو دوسرے کے خیالات ومحسوسات کے معلوم ہونے پر اور دوسروں کے خیالات ومحسوسات کے کماحقہ معلوم ہونیکا صرف ایک ہی وسیلہ ہے اور وہ زبان ہے۔ غرض یہ ادنےٰ غور سے معلوم ہوگا کہ تنازع للبقا میں انسان کی اصلی کفیل اور اُس کی نوعی زندگی اور مدنیت کی اول ضامن زبان ہے۔

قوم وملت کی ترکیب عموماً پانچ عناصر سے ہو سکتی ہے۔ اتحاد زبان۔ اتحاد اغراض سیاسی ومعاشی، اتحاد مذہب اور اتحاد نسل اور اتحاد روایات تاریخی۔ مگر قومیت کے ان اساسی اجزا میں سچ پوچھئے تو اصلی کارکن اور عامل صرف زبان ہی ہے۔

کیونکہ افراد قوم میں سیاسی معاشی مذہبی اور اتحاد نسل کے خیالات اور تاریخی روایات

کے اشاعت وتبلیغ کا ذریعہ اور ان خیالات اور روایات کے متعلق یکسوئی و یک رنگی پیدا کرنیکا وسیلہ عام زبان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مذہب اور سیاسی و معاشی اغراض کا اتحاد اُن کے اصول و فوائد کے علم کے بغیر ممکن نہیں اس علم اور اُس کے ساتھ دوسرے تمام انسانی علوم کی حامل و خزینہ دار زبان ہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے جس پر قوم کا اطلاق ہو سکے قیام کا بغیر ایک عام زبان کے خیال ہی نہیں ہو سکتا۔ اتحاد نسل درحقیقت قومیت پیدا کرنیکے لئے ضروری نہیں۔

آج دنیا میں کوئی متمدن قوم ایسی نہیں ہے جو اتحاد نسل رکھتی ہو۔ یا اُس کی مدعی ہو سکے ہاں عام تاریخی روایات نے اتحاد نسل کا خیال کسی کسی قوم میں پیدا کر دیا ہے۔

اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی کی مجموعی قوت اتحاد مذہب کے عنصر کو بھی غیر ضروری قرار دے سکتی ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی نئی امریکن قومیت بغیر اتحاد مذہب کے پیدا ہوئی ہے اور عہد جاہلیت میں عرب باوجود اختلاف مذہب کے ایک قوم کہلاتے تھے۔ تاریخ ایسی قوم کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے جس کی اجزائے ترکیبی میں ایک سے زیادہ زبانیں شامل ہوں۔ ہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی نے افتراق نسل اور اختلاف مذہب کے باوجود ایک قومیت کو پیدا کیا۔ جیسے قدیم زمانہ میں رومی قومیت کی توسیع اُس کی دوسرے اقوام پر اور موجودہ عہد میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مخلوط النسل اور مختلف المذہب قومیت۔

یہ صحیح ہے کہ اتحاد مذہب سے ایک نئی قومیت کے پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اور قومیت کا قوام بہت جلد اور آسانی سے تیار ہو سکتا ہے۔ مگر اُسکا وجود اس قوام کی تیاری کے لئے لابدی نہیں ہے۔ جیسے انگریز قوم میں اتحاد مذہب کے اثر سے اُس کے مختلف الاصل مختلف الالسنہ اجزا ایک عام قومیت میں بہت جلد جذب ہو گئے مگر انگریز قومیت کی بنا اتحاد زبان اور اتحاد اغراض سیاسی و معاشی پر رکھی گئی ہے۔ جہاں زبان کا کامل اتحاد نہیں ہو سکا وہاں

مذہبی سیاسی و معاشی اغراض کے یگانگت کے باوجود کامل قومیت پیدا نہ ہو سکی۔ اس کی بہی مثال سابق شہنشاہی روسی قومیت ہے روسی شہنشاہیت کے فنا ہونے کے بعد ملک روس میں مختلف قومی سلطنتیں قائم ہو گئیں جیسے بالشویک روس اوکرین لیتھوینیا وغیرہ۔ اس کی وجہ منجملہ اور وجوہ کے یہ بھی ہے کہ ان علاقوں اور قوموں کی زبانیں فنا نہ ہونے پائی تھیں۔ پولی قومیت تو سراسر زبان ہی کی وجہ سے آج دنیا میں قائم ہے۔ ورنہ جرمنوں اور روسیوں نے ہر ممکن طریقہ سے اسکے فنا کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کی بنیاد اتحاد خاندان پر ہے جو وسیع ہو کر اتحاد نسل بن جاتا ہے۔ مگر غور کرنے سے ثابت ہوگا کہ اس کی تہہ میں در اصل اتحاد زبان ہے ایک ہی خاندان یا ایک محدود رقبہ کے اندر رہنے والے اور ضروریات زندگی کے لئے روزانہ باہم ملنے والے متعدد خاندانوں میں جو در اصل ایک ہی خاندان کی شاخیں ہوں گی تبادلہ خیالات مشاورت اور معاونت کے لئے جب زبان پیدا ہوئی ہو گی تب اس کے واضعین کو یہ احساس بھی رہا ہوگا کہ وہ ایک نسل سے ہیں اور ایسا خیال واقعات پر مبنی تھا بھی۔ اس لئے اتحاد نسل یا کم سے کم اشتراک نسل کا اعتقاد ضروری ہے۔ مگر یہ عقیدہ نفس انسانی کا خود ساختہ فریب ہے۔ کیونکہ دنیا کے مختلف متمدن قوموں کی تدریجی ترکیب و تقویم کی تاریخ کے مطالعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوم بھی اتحاد نسل کو قائم نہ رکھ سکی۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ ہمیشہ زبردست جماعتوں نے کمزور جماعتوں کو اپنا محکوم و غلام بنالیا ہے۔ اور بالآخر اپنے میں جذب کر لیا ہے۔ پھر نسل کی اصالت کہاں باقی رہی۔ دنیا کی متمدن قومیں تمامتر مختلف النسل اجزا سے مرکب و ممتزج ہوئی ہیں۔ جیسے انگریز۔ امریکن۔ مصری۔ اطالوی عثمانی۔ ترک وغیرہ کیونکہ زبان حاکم و غالب قوم ہی کی قائم رہتی ہے۔ اس لئے وہ مرکب جماعت اسی غالب جماعت کے نام سے پکاری جاتی ہے غرض ماننا پڑے گا کہ قومیت کا اصلی مرکز اور اسکی حقیقی بنیاد زبان ہی ہے۔

بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم مذہبی قومی خیالات پر غالب نہ ہو سکی۔ بلکہ قومی یگانگت کے خیال

نے مذہبی اتفاق کو بے اثر کر دیا جیسے عیسائی عربوں نے بعض وقت دولت رومیہ مشرقیہ کے خلاف جو اُن کی ہم مذہب تھی مسلم عربوں کی طرفداری کی ہے بمصری عیسائیوں نے رومی عیسائیوں کے خلاف مسلمانوں کی مدد کی ہے یہاں سبب امداد ہم قومی نہیں بلکہ سیاسی فوائد کا یقین تھا۔ ترکوں اور عربوں کی ناموافقت اسلام کے عہد زریں میں فتنہ شعوبی وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ بانی اسلامؐ کے وہ مشہور الفاظ جو آنحضرتؐ نے یہود و مشرکین مدینہ و جوالی مدینہ کے ساتھ عہدنامہ میں استعمال کئے تھے کہ آؤ ہم اور تم مل کر ایک قوم بن جائیں اس نظریہ کا کہ قومیت کے لئے ہم مذہبی ضروری نہیں ایک زبردست ثبوت ہیں مختصر یہ کہ قومیت کے لئے نہ اتحاد نسل کی ضرورت ہے اور نہ اتحاد مذہب کی۔ اتحاد زبان سے قومیت پیدا ہوتی ہے اور سیاسی و معاشی اغراض و مقاصد کے اتحاد سے اُس کی تکمیل ہوتی ہے بشرطیکہ یہ اتحاد ایک کافی عرصہ تک قائم رہے اور کوئی دوسرے اور تفرقہ انگیز اثرات نہ پیدا ہوں۔

۳۔ نوع انسانی کے گروہوں جماعتوں جرگوں اور قوموں میں تقسیم و تفریق کے اسباب ماقبل التاریخ عہد میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ رہے ہوں۔ مگر اب تو اُن کی شناخت و تمیز کے فقط دو ہی معیار ہیں۔ اختلاف زبان اور اختلاف ساخت جسمانی۔ نوع انسان کی اسی تقسیم اور انشعاب نے انسانیت کو ہمیشہ نقصان پہونچایا ہے اور پہنچا رہی ہے اپنے دور وحشت میں جبکہ انسان قانون اصلح کے ماتحت کائنات کی حکومت کے لئے دوسری مخلوقات سے برسرپیکار اور مصروف دمار تھا اُس وقت اُس نے نوعی نفاق کی ضرورت سمجھی اور اُسکی برکت سے کماحقہ فائدہ اٹھایا۔ قدیم و جدید تمام تمدن اسی اتفاق کے عملی نتایج و آثار ہیں مگر افسوس ہے کہ دوسری مخلوقات کو مغلوب و محکوم کرنے کے بعد انسان نے اپنی ہی بنی نوع پر حکومت کی کوشش شروع کی۔ اور دنیا کی تمام تاریخ اسی ناپاک کوشش اور اس کے ناپاک ترحصول کی داستان ہے۔ اس خانہ جنگی نے جس کا سلسلہ موجودہ دور تہذیب و شائستگی میں بھی بند نہیں ہوا ہے۔ انسانیت کے ارتقا میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں کیونکہ وہ طاقت جو جارحانہ و مدافعانہ اپنی نوعی حفاظت و ترقی کے

لئے استعمال ہو سکتی تھی مجادلہ و مقاتلہ میں صرف ہونے لگی۔

۴۔ انسان کی ابتدائی اجتماعی زندگی کا سنگ بنیاد زبان ہی تھی اب نوع انسان کی تقسیم و انشعاب کی ذمہ دار اختلاف ساخت جسمانی کے بعد جس میں رنگ بھی شامل ہے اختلاف زبان ہی ہے۔ اختلاف ساخت جسمانی کا ازالہ قریب قریب ناممکن ہے جب تک موسموں کی موجودہ حالت کرہ زمین کی مختلف سطحی ہیئت اور ان قدرتی اسباب کے ماتحت انسانی غذا میں اختلاف قائم رہیگا تب تک انسان کے جسم کی ساخت کے اختلاف کا مٹنا مشکل ہے۔ بُعد مسافت کی مشکلات جو عہد قدیم اور قرون وسطےٰ میں بلکہ قریب کے زمانہ تک مختلف انسانی جماعتوں کے اختلاط و ارتباط میں مانع تھیں۔ اُن کو اب انسان نے برق کی امداد سے مٹا دیا اور بخار کی تائید سے دھواں بنا کر اڑا دیا ہے۔ اور آج ایک دو دس بیس افراد نہیں بلکہ ایک سالم جماعت دوسری سالم جماعت سے تعلقات و موانست پیدا کر سکتی ہے۔ اور ہم بہت جلد دیکھیں گے کہ مختلف قوموں میں باہم ربط ضبط بلکہ ایک کافی عرصہ کے بعد ازدواجی تعلقات بھی قائم ہو جاویں گے جو بتدریج اتحاد زبان اور زاں بعد اتحاد قومیت کا بیش خیمہ ثابت ہوں گے۔ نوع انسان کی موجودہ لسانی اور صوری تفریق و تقسیم کے اثرات کو زائل یا کم کر کے آپس کی قومی اختلافات کو مٹانا اور اس کی توحد و یکرنگی پیدا کرنیکی کوشش کرنا انسانیت کی بہترین خدمت اور انسان کا اعلیٰ ترین عمل ہوگا وحدت و یکرنگی سے مقصود ہے باہمی خانہ جنگی کا استیصال اور تمام قوائے انسانی کا ارتقائے انسانیت کے لئے استعمال۔ برق و بخار اور نور و حرارت نے اپنے گوناگوں اور کثیر المظاہر خواص و صفات کی مقبوضانہ حیثیت اور مفتوحانہ حالت میں انسان کے لئے وقت اور فاصلہ کے تمام حجابات کو تقریباً رفع کر دیا ہے اور عام اختلاط و ارتباط کے لئے بیحد آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ایک مشترکہ زبان کا اختیار کرنا فی الحال دائرۂ امکان سے باہر نظر آتا ہے ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کرۂ زمین کے مختلف حصوں میں جو بیشمار غیر مکمل زبانیں بولی جاتی ہیں۔ انکی تعداد کم کر کے چند مکمل زبانیں رائج کیجائیں اور اس طرح بجائے لاتعداد کمزور قوموں کے صرف چند طاقتور اور خود مختار

قومیں بنائی جائیں۔ آئندہ جنگوں کے موقوف کرنے کا اس سے معقول تر دوسرا کوئی بندوبست نہیں ہوسکتا جنگ لازمی نتیجہ ہے طاقتور قوموں کو اپنے فائدہ کے لئے محکوم و مطیع بنانیکی ظالمانہ خواہش کا اس خواہش کا انسداد جذبات عدل و انصاف و ہمدردی سے نہیں ہوسکتا۔ اس ناجائز خواہش کو صرف خوف ہی قابو میں رکھ سکتا ہے شکست کھانیکا خوف اور یہ خوف حریف مقابل کے جارحانہ و مدافعانہ قوت اور حربی طاقت سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ کمزور قوموں کو دوسری طاقتور قوموں میں تدریج امن پسندانہ ذرائع سے جذب کرنا جنگ کے امکانات کو زائل کرنا ہے۔ ان امن پسندانہ ذرائع میں سب سے زبردست ذریعہ تعمیم زبان ہے۔ کسی ملک اور اُس کے باشندوں میں وہی زبان عام طور پر رائج ہوسکتی ہے جو اُس کے ایک حصہ کی مادری زبان ہے اور اس ملک کے مختلف حصوں میں بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ اس کے سوا وہی زبان مختلف قوموں کی عام زبان ہوسکتی ہے جو ان کی قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کے اداکرنیکی قابلیت رکھتی ہے۔

۵۔ ازمنہ ماضیہ میں زبان کا اتحاد مختلف امتوں اور قوموں کے جذبہ انسانیت اور صلح پسندانہ رجحانات پر مبنی نہ تھا۔ اور نہ انکے میل ملاپ اور باہمی رضا و رغبت کی پیداوار تھا بلکہ اس کے وجود کی بنا زیادہ تر فاتحانہ اور غالب قوت پر رہی ہے۔ مگر کرۂ زمین پر ایک ملک ایسا بھی ہے جہاں ایک عام زبان بغیر کسی سلطنت یا جماعت کی خاص کوشش کے پیدا ہوچکی ہے اور اس طرح گویا خود قدرت نے ایک نادر موقعہ اتحاد زبان کے ذریعہ ایک کامل قومیت کے بنانیکا دیا ہے۔ میری مراد ہندوستان اور اردو زبان سے ہے۔

ہندوستان صدیوں سے مختلف النسل مختلف المذہب اور مختلف الالسنہ انسانی جماعتوں کا مسکن ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کے باشندوں میں انگریزی راج کی بدولت اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہوگیا ہے۔ اور ایک عام زبان اردو بھی پیدا ہوچکی ہے ایک عام قومیت کی تکمیل کے لئے اتحاد زبان کی کمی رہ گئی ہے۔ جس کا پورا کرنا ہی خواہان ملک و محبان وطن

کا فرض ہے۔

۶- اب دیکھنا یہ ہو کہ اُردو ہندوستان کے کل باشندوں اور پورے ملک کی عام اور قومی زبان ہونیکی صحیح صلاحیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ مختلف الالسنہ جماعتوں کی عام زبان ہونے کی اہلیت صرف اسی زبان میں ہوتی ہے جو ان مختلف جماعتوں کی قومی روایات مذہبی خیالات اور خصوصی احساسات کو آسانی سے ادا کر سکتی ہے۔ یہ قابلیت اردو زبان میں بمقابلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے بدرجہ احسن موجود ہے۔ اردو ثمرہ ہے ہندوستان کے مختلف النسل مختلف المذہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے ارتباط و امتزاج لسانی کا جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ زبان عموماً اس کے بولنے والوں کی ذہنی اخلاقی و روحانی درجات کی مظہر اور ان کی تہذیب و شائستگی کی کاشف ہوتی ہے۔ اس اصول کے ماتحت اردو زبان بھی اپنی ماخوذ زبانوں کے بولنے والوں کے ارتقائے دماغی و روحانی اور اُنکے مختلف مدارج تمدن کی حامل ہے۔ اُسکا ثبوت ہے اُردو میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا وجود اور استعمال اور الفاظ کیا ہیں خیالات و محسوسات مشخصہ اور اُردو میں جدید مذہبی فرقوں کے عقائد و دستور العمل زندگی کی تدوین۔ یہ جدید مذہبی فرقے یا بالفاظ دیگر علحدہ مذاہب دراصل قدیم مذاہب سے مشتقیں ماخوذ ہیں جو نتیجہ ہے ان مذاہب کے پیروؤں کے اختلاط و ارتباط کے غائر مطالعہ کا۔

اُردو میں عربوں ایرانیوں ترکوں حبشیوں اور مختلف اقوام ہنود کے قومی و مذہبی مخیلات یا اُنکے آثار و علائم بصورت اصلی یا بتبدیل ہیئت ہیں۔ اسلام کے مذہبی علوم اردو میں منتقل ہو چکے ہیں اور عیسائیت موجود ہے اور یہودیت کے متعلق بوجہ دعاۃ و مبلغین عیسائیت کے علمی و عملی سرگرمیوں کے اُردو میں کافی معلومات مل سکتے ہیں۔ آریہ سماج، دیو سماج اور دوسرے جدید ہندو فرقوں کے مجاہدانہ و مبلغانہ مساعی اور علمی کوششوں کی بدولت اور صوفیائے کرام کے طفیل فلسفہ ویدانت اور ہندوستان کے دیگر مذاہب فلسفہ اور ہندو بدھ مذاہب کے متعلق اردو میں کافی مواد پیدا ہو گیا ہے۔ کسی دوسری ہندوستانی زبان میں اسلام اور عیسائیت

کے متعلق اسقدر معلومات فراہم نہیں ہوئے ہیں۔ علوم جدیدہ و فنون حدیثہ کی ترجمانی میں بنگالی کے بعد اردو کسی دوسری ہندوستانی زبان سے پیچھے نہیں۔ امید ہے کہ خسرو دکن کی دوراندیشانہ فیاضی اور نتیجہ خیز علوم دوستی کے صدقہ میں جس نے جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی حسین و جمیل صورت اختیار کی ہے۔ اردو بہت جلد بنگالی کو پیچھے چھوڑ دے گی۔ ہندوستان کے ایک بڑے حصہ میں مروجہ مالی و ملکی اصطلاحات و مخصوص الفاظ کی لغات تمام تر فارسی و عربی سے اخوذ ہے۔ ہندوستان کی قدیم و مقدس زبان سنسکرت کے سوا اردو ہندوستان کے باہر کی دو زندہ اور قدیم زبانوں یعنی عربی و فارسی کے جو دنیا کی قدیم ترین متمدن قوموں اور انکی سرزمینوں کی وارث ہیں علمی ترقیوں اور شغلوں سے مستفید ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ دوسری ہندوستانی زبانوں کے لئے یہ راہ استفادہ مسدود ہے۔

اوپر بتلایا جا چکا ہے کہ اُردو کی پیدایش ہندوستان میں مختلف قوموں کے صدیوں کے میل جول اور قرنوں کے ربط ضبط سے پیدا ہوئی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی خاص قوم سے منسوب نہیں کیجا سکتی۔ اپنی پیدایش کے اول تین چار صدیوں تک وہ گھریلو اور بازاری بول چال کا درجہ رکھتی تھی۔ سرکار انگریزی کی دستگیری اور بالائی ہند و دکن کے تعلیم یافتہ باشندوں کی تفریحانہ علمی شغلوں نقالانہ مذاق شاعری نے اس زبان کی صف میں جگہ دلوائی مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہوگا کہ اردو ہندوستانی مسلمانوں کی قومی یا خصوصی زبان نہیں ہے۔

(۱) اردو آزاد اسلامی ہند کی دفتری زبان نہ تھی۔

(۲) انگریزی سلطنت کے استحکام اور سرکار انگریزی کے اُردو کو اپنے ممالک محروسہ کے ایک بڑے حصہ کی دفتری زبان قرار دینے کے بعد بھی ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کی زبان فارسی رہی ہے۔

(۳) انگریزی حکومت اور حکام کی توجہ سے اردو میں علمی شان پیدا ہو جانے کے باوجود ہندوستانی

مسلمانوں نے گویا بطور صدائے احتجاج فارسی میں تصنیفات کی ہیں حالانکہ ان تصنیفات کے اول مخاطب اُنکے اردو بولنے والے ہم وطن ہیں۔ ایک دو نسل آگے کے مسلمان اہل قلم اردو میں لکھنا کسر شان سمجھتے تھے۔ اُسکا اس عہد کی تصنیفات میں اکثر اظہار ہوا ہے۔ خانگی خط و کتابت بھی فارسی میں کیجاتی تھی۔

(۴) مسلمانوں کی دینی تعلیم ابھی تک فارسی اور عربی میں ہوتی ہے۔ عربی تو ناگزیر ہے کیونکہ وہ اسلام کی مذہبی زبان ہے۔ مگر فارسی تو غیر زبان ہے۔ اردو کو مسلمانوں کی مخصوص زبان سمجھنا تاریخ کو جھٹلانا ہے اور اس کے نشو ونما میں غیر مسلم یا ہندو اصحاب علم اور ارباب قلم نے جو زبردست حصہ لیا ہے۔ اس کو بالکل نظر انداز کرنا ہے۔ اُردو کی پیدائش مختلف ہندستانی اقوام کے میل جول سے ہوئی اور اُسکی ترقی واشاعت میں ہندو مسلمان سکھ عیسائی ہر مذہب کے پیرؤں نے حصہ لیا ہے اُردو کا وجود علم الاقوام وعلم الالسنہ کے اس نادر مسئلہ کا ثبوت ہے کہ مختلف النسل مختلف المذاہب اور مختلف الالسنہ جماعتوں کے دوستانہ میل جول اور برادرانہ ربط ضبط سے اور بغیر فاتحانہ تعدم و ترجیح اور حاکمانہ مساعی کے ایک نئی عام زبان پیدا ہوکر اتحاد لسانی کی محرک ہوسکتی ہے۔ صحیح معنوں میں کل ہندوستان کی عام زبان ہونے کا حق صرف اردو ہی کو پہونچتا ہے۔ باقی تمام مروجہ زبانیں مختلف صوبوں کی زبانیں ہیں۔ اردو کی مخلوط اللسانی بنیاد اور اُس کی روز افزوں عمومیت سے انکار کرنا نہ صرف واقعات کی تکذیب کرنا ہے بلکہ نو پیدا ہندوستانی قومیت کی تکمیل و توسیع کے راستہ میں روڑے اٹکانا ہے۔

اب رہا رسم الخط کا اختلاف آخر ہندوستانی زبانوں کے رسم الخط کے سامی الاصل ہونے کا ایک نظریہ ہے جو اگر میرا حافظہ غلطی نہیں کرتا تو ابھی تک معرکۃ الآرا ہے۔ اشوک اعظم کے بعض کتبے سامی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں، جو کافی ثبوت ہیں اس واقعہ کا کہ ہندؤں کے عہد زریں میں بھی ہندوستان کے بعض قوموں میں سامی رسم الخط مروج تھا اُردو کا سامی الاصل رسم الخط برّ اعظم ایشیا افریقہ اور یوروپ کے وسیع علاقوں میں

مستعمل ہے۔ بلکہ امریکہ میں بھی جہاں عربی گو حبشیوں اور سامی عیسائیوں کی خاصی تعداد آباد ہے دنیا کی اسلامی اقوام میں عربی یا اردو رسم الخط رواج پا رہا ہے۔ عربی اور اردو حروف کی کتابت میں بالکل بے حقیقت فرق ہی۔ عربی حروف کا واقف اُردو حروف اچھی طرح پہچان سکتا ہے۔ آج دنیا کی کوئی قوم اور کرہ زمین کا کوئی ملک دوسری اقوام اور دوسرے ملکوں سے قطعی علیحدگی اور بیگانگت کی حالت میں نہیں رہ سکتا۔ لامحالہ دوسری قوموں اور ملکوں سے تجارتی معاشی و سیاسی تعلقات قائم کرنا ہی پڑتا ہے۔ اگر کوئی قوم اور کوئی ملک اپنی خود پسندی اور سیر حاصلی سے گوشہ تنہائی کو پسند بھی کرے تو بین الاقوامی تعلقات کی آفت سے بچ نہیں سکتا۔ ورنہ ثانی بہ ستم ی رسد کا مصداق ہوگا۔ بین الاقوامی تعلقات صحیح قومی زندگی کے لئے لازمی ہیں۔ عہد حاضرہ کے سیاسی واقعات و ملی سانحات کی رفتار سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی اُردو رسم الخط والی اقوام کے لئے ایک جدید شاندار مستقبل طلوع ہونے والا ہے بلکہ طلوع ہو چکا ہی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو ان اقوام سے اتحاد مذہبی حاصل ہے اس اتحاد کے اثر و نفوذ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اس لئے بھی مناسب ہی کہ ان اقوام سے برادرانہ تعلقات پیدا اور مستحکم کئے جائیں رسم الخط کا اتحاد ان تعلقات کو پائدار اور مضبوط کرے گا۔ لہذا ہندوستان کا ناگری رسم الخط کو اختیار کرکے جہاں اس رسم الخط کو بھی عمومیت حاصل نہیں ہے۔ ہمسایہ ممالک اور اقوام سے علیحدگی اور قطعی بے تعلقی کی حالت پیدا کرنے کے بجائے زیادہ مناسب ہے کہ ہمسایہ اقوام کے رسم الخط کی برادری میں شامل ہو جائے۔ بنگالی۔ تلنگی۔ تامل وغیرہ زبانوں کے بولنے والوں کو ناگری حروف کا سیکھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اردو حروف کا سیکھنا۔

(۵) اردو کی عام مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ بغیر مسلمانوں یا کسی منظم جماعت کی ساعی کی ہندوستان کے غیر اردو بولنے والوں میں بتدریج

پھیل رہی ہے۔ مختلف حصص ہند کے سیاحوں سے اس کی تصدیق ہوسکتی ہے۔ غرض بمقابلہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے اردو کل ہندوستان کی عام اور قومی زبان ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اور زیادہ آسانی سے اس کی اشاعت ہوسکتی ہے چونکہ انگریزی راج کی بدولت ہندوستان کی کل اقوام میں اغراض سیاسی و معاشی کا اتحاد پیدا ہوگیا ہے۔ اردو کی اشاعت و ترقی سے کامل اتحاد لسانی حاصل کرنے کی باقاعدہ کوشش ہونی چاہئے تاکہ جدید ہندوستانی قومیت کی تکمیل ہو جائے۔ اردو کو کل ہندوستان کی عام قومی زبان بنانے اور اُس کی ترقی و اشاعت کے لئے مندرجہ ذیل نظام عمل مفید اور کارآمد ہوگا۔

(۱) ہندوستان کی کل زبانوں میں اُردو آموز رسالے تیار کرنا تاکہ ہر شخص اپنی ہی زبان میں اُردو سیکھ سکے۔

(۲) اُردو کے حروف تہجی اور کتابت میں ضروری اصلاح کرنا جیسے ھ کے ساتھ دوسرے حروف کی ضم شدہ آواز کی کتابت معروف و مجہول حروف علت کی کتابت کی تفریق وغیرہ

(۳) اُردو میں ٹائپ رائٹر اور شارٹ ہینڈ جاری کرنا۔

(۴) اُردو میں ٹائپ کا رواج دینا۔

(۵) اُردو میں قومی ڈراما تیار کرنا۔ ہندوستان کی ہر قوم کی شاندار ماضی کے سبق آموز واقعات اور قابل تتبع سانحات کے ناول اور ناٹک اُردو میں لکھنا اور ان ناٹکوں کا کھیل کرانا۔

(۶) ہندوستان کے عظمائے رجال کے سوانح عمری تلاش کرکے عام فہم اُردو میں شائع کرنا خاصکر ایسے بزرگوں کی سیرتوں کی ضرورت ہے جنہوں نے اپنے اقوال و اعمال سے ہندو مسلمانوں یا ذاتوں اور فرقوں کے اختلافات کم کرنے کی مبارک کوشش کی ہے۔ اور نفس انسانی کی شرافت اور تقدس کی تعلیم دی ہے۔ جیسے اکبر۔ دارا۔ ملک عنبر۔ سعداللہ خاں

دادو بابا۔ نانک۔ کبیر داس وغیرہ۔

(۷) ان مشاہیر کے حریت آموز ایثار آگیں جب وطن خیز اعمال و اقوال کو سلیس اُردو دلکش دھنوں میں نظم کرنا تاکہ ہر کس و ناکس انکو ہر جگہ گا بجا سکے اس طرح ہماری سوسائٹی کا ہر طبقہ اُن کے کارناموں سے واقف ہوجائے۔

(۸) قومی گیتیں اور لوریاں بنانا۔

(۹) کامل لغات اور انسائیکلوپیڈیا تیار کرنا ضرب المثل اور محاورات جمع کرنا۔

(۱۰) اُردو زبان میں شروع سے لیکر اب تک جو نثر و نظم کی کتابیں لکھی گئی ہیں انکو جمع کرنا خاص اُردو کتابوں کا ایک بڑا مرکزی کتب خانہ قائم کرنا جس کی شاخیں بتدریج تمام شہروں اور قصبوں میں پھیلائی جاسکیں۔ پرانی کتابوں میں سے مفید کتابیں چھاپکر شائع کرنا۔

(۱۱) مختلف صوبجات ہندوستان کے اردو ٹکسٹ بکس کی اصلاح کرنا از روئے مضامین تمام علوم فنون کی ابتدائی کتابیں لکھنا اور شائع کرنا۔

(۱۲) تمام اردو مصنفین اور مولفین کو ایک رشتہ معاونت و رفاقت میں منسلک کرنا اس کی بڑی ضرورت ہے اہل قلم گویا قومی دماغ کے اجزا ہوتے ہیں۔ ان اجزا کا انتشار ظاہر ہے کہ دماغ کو اپنے وظیفہ طبعی کے ادا کرنے سے روک دیگا جب دماغ ہی برابر کام نہ کرے گا تو انسان کیسے رہ سکتا ہے۔

(۱۳) اس نظام عمل کے سرانجام دینے کے لئے میں ایک تشکیل بنام اردو اکیڈیمی کی تجویز پیش کرتا ہوں اس تشکیل کی اوّل غرض یہ ہے کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں میں رہنے والے اُردو داں اصحاب علم و ارباب قلم کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے اُنھیں تبادلہ خیالات اور باہمی استفادہ کا موقعہ دیا جائے اور اردو مصنفین کی ہمت افزائی علمی مشورہ مالی امداد اور خطابات کے ذریعہ کیجائے۔ اکیڈیمی کا مستقر ہمارے مردان سخن و پہلوانان قلم کے لئے ملجا و ماویٰ کا کام دیگا۔ اور جہاں ہر طرح کا سامان مہیا رہیگا۔ اکیڈیمی کا مستقر و صدر مقام کل ملک کے لئے ادبی مرکز

بن جائے گا جہاں سے ہماری نوپیدا قومیت کے نشو و تکمیل کا کام ہمارے رؤسائے تحریر و تقریر کے ہاتھوں انجام کو پہونچے گا۔

دنیا میں کوئی بھی متمدن قوم نہ ایسی گزری ہے اور نہ ایسی موجود ہے۔ جو ایک یا ایک سے زیادہ علمی و ادبی مرکز نہ رکھتی ہو۔ قومیت کی ترقی اور اُسکے مخصوص تمدن اور تہذیب کی تشریح توضیح و محافظت کے لئے ایسے مرکز یا مراکز کی سخت ضرورت ہو۔ صرف یونیورسٹیاں ہی ایسے مراکز کے قائم مقام نہیں ہو سکتیں کیونکہ اُنکا اول مقصد تعلیم و تعلم ہے۔ اور غیر ماہرین فن اور عام صاحبان دماغ کو اُن کے یہاں بار نہیں مل سکتا۔ یونیورسٹی اگر مرگزہے بھی تو بہت چھوٹے پیمانے پر اور ہندوستان کے غیر قومی یونیورسٹیاں تو مرکزیت کا دعوےٰ بھی نہیں کرسکتیں کسی قوم کے نشو و نما کے لئے علمی و ادبی مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ زوال بغداد سے مسلمانوں کا علمی تنزل شروع ہوا جو آخر کار سیاسی تنزل کا بھی باعث ہوا۔

اکیڈیمی کے شرکا کے یہ اقسام ہوں گے :۔

(۱) رسالہ اکیڈیمی کے خریدار (رسالہ کی قیمت میں چندہ بھی شامل رہیگا) (۲) ارکان

(۳) رفقا (انکو رسالہ مفت ملیگا)

(۴) سرپرست جو پچاس روپے سے لیکر ایک سو روپیہ تک سالانہ چندہ دیں۔

کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ رکنیت کے شرائط حسب ذیل ہوں گے۔

(۱) کلیہ جامعہ عثمانیہ کا ہر طلیسانی

(۲) ہر ایسا گراجویٹ جس کی دوسری زبان اردو فارسی یا عربی رہی ہو۔

(۳) ہر سند یافتہ اور صاحب دستار مولوی اُردو داں پنڈت۔

(۴) ہندوستانی یونیورسٹیوں کے علوم مشرقیہ فارسی و عربی کا ہر سند یافتہ۔

(۵) ہر اُردو اخبار نویس اسمیں موقت الشیوع رسالوں کے رؤسائے تحریر بھی شامل ہیں

(۶) ہر صاحب دیوان شاعر۔

(۷) ہر ایسا مصنف مولف یا مترجم جس نے کوئی اہم یا مفید کتاب تصنیف تالیف یا ترجمہ کی ہو
(۸) ہر وہ شخص جس کو دو ارکان کی تحریک و تائید پر جلسہ عام میں منتخب کیا جاوے۔
چندہ دینے پر رکنیت کے حقوق و فوائد حسب ذیل ہوں گے۔
(۱) اکیڈیمی کا رسالہ مفت ملیگا۔
(۲) اکیڈیمی کی تمام شائع کردہ کتابیں اصلی قیمت پر ملیں گی۔
(۳) اکیڈیمی کے جلسوں میں شرکت کا حق حاصل ہوگا
(۴) حق رائے وصورت حاصل ہوگا۔
(۵) اکیڈیمی کے کتب خانہ سے کتابیں اپنے خرچ پر مستعار لیجا سکینگے (مقررہ پابندیوں کیساتھ)
(۶) ارکان و رفقا اپنی مصنفات کی طباعت و اشاعت میں ہر طرح امداد کے مستحق ہوں گے
رفقا کا انتخاب ارکین میں سے ہوگا۔ خاص قابلیت اور غیر معمولی لیاقت کے اشخاص منتخب ہونگے
اُنکی تعداد ہندوستانیوں کے لئے ۱۰۰ ہوگی اور باہر والوں کے لئے ۲۵ رفاقت کا معیار اتنا
بلند رہیگا کہ اکیڈیمی کا رفیق ہونا ہی غیر معمولی قابلیت کی دلیل ہوگی رفقا کو بھی وہی حقوق اور
فرائض حاصل ہونگے جو ارکین کو ہونگے صرف اتنا فرق رہیگا کہ رفقا سے کوئی چندہ نہیں لیا جائیگا
اکیڈیمی حیدرآباد دکن۔ لاہور۔ دہلی۔ لکھنؤ۔ یا پٹنہ کسی ایک جگہ قائم کیجا سکتی ہے۔

[یہ مضمون ہمیں صوبہ متوسط سے ایک صاحب نے بھیجا ہے۔ مضمون پر نام نہیں تھا اور اس کے ساتھ کا خط جس پر نام تھا بدقسمتی سے ضائع ہوگیا۔ مضمون کو جلد شائع کرنا مقصود تھا۔ تاکہ یہ بحث چھڑ جائے اور جامعہ کی اردو اکادمی کے ارکان اسے پڑھنے کے بعد اظہار رائے فرمائیں۔ اور اکادمی کے مستقل نظام کی تشکیل میں مدد دیں۔ اسلئے ہم یہ مضمون بے نام کے چھاپتے ہیں اور مضمون نگار صاحب سے معافی چاہتے ہیں۔ اگر وہ اسے پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے نام سے اطلاع دینگے تو ہم آگے شذرات میں شائع کردیں گے۔]
(جامعہ)

چاند اور اُسکے متعلق جدید ترین تحقیقات

(ماخوذ از رسالہ المقتطف)

ہماری اس وقت یہ غرض نہیں ہے کہ چاند کے بابتہ کوئی مفصل مضمون لکھیں جبکہ گزشتہ سالوں میں کافی اس موضوع پر لکھ چکے ہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اُن مباحث کا خلاصہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنا ہے جو ابھی حاصل ہوئے ہیں۔

چاند ہماری زمین سے تقریباً دو لاکھ میل دور ہے۔ یہ دوری بمقابلہ دیگر اجرام سماوی کے کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن خود زمین پر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ کو دوری کی نسبت ہے۔ اُس کے مقابلہ میں تو یہ دوری بہت ہی زیادہ ہے۔ کیونکہ زمین کا محیط پچیس ہزار میل سے زیادہ نہیں ہے۔ اور یہ چاند کی دوری کا آٹھواں حصہ ہے۔ باوجود اس بعد مسافت کے علماء فلک بمقابلہ زمین کے بعض بعض حصص کے، چاند سے زیادہ واقف ہیں۔ افریقہ و ایشیا کی درمیانی حالت کا اُنکو کوئی اندازہ نہیں ہے۔ لیکن چاند کی بابتہ وہ قیاس کرتے ہیں کہ اس کے پہاڑوں کی بلندی کس قدر ہے۔ اس کے سمندروں اور نشیب زمین کی کیا کیفیت ہے۔ ان کو معلوم ہے کہ تغیرات کس قسم کے اور کیوں وہاں ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ایشیا اور افریقہ کے اکثر درمیانی ملک کے پہاڑوں کی بلندی اور انکے ملک کی جغرافیائی کیفیت وغیرہ سے وہ بالکل ناواقف و جاہل محض ہیں۔

جب سے دوربین ایجاد ہوئی ہے علمائے فلک برابر چاند کا معائنہ کرتے اس کی تصاویر حاصل کرتے اس کو ذریعہ خطوط عرضی تقسیم کرتے اور اسکی پہاڑوں کی بلندیاں اور اس کے سمندروں کی گہرائی و وسعت کا اندازہ کرتے رہے ہیں۔

لیکن سمندر حقیقت میں سمندر نہیں ہے۔ جیساکہ ہم اس کرہ زمین پر دیکھتے ہیں۔ بلکہ

خالی وسیع زمین کا نام وہاں سمندر رکھا گیا ہے۔ اور پانی کا ایک قطرہ بھی اس سمندر میں نہیں ہے ہاں پہاڑ ہیں اور وہ زمین کے پہاڑوں سے زیادہ بلند ہیں اور بڑے بڑے غار ہیں اور ان غاروں میں بعض بعض نہایت چمکدار نورانی دھات ہے۔ جیسے الماس و بلور، اور اسی طرح کی بعض بعض اور منور دھاتیں ہیں جن کے بڑے بڑے پتھر قیاس کئے جاتے ہیں انکی روشنی سے جو خطوط اور صورتیں بنتی ہیں وہ ان خطوط اور صورتوں سے بالکل مشابہ ہیں جو ہماری زمین کی ان منور دھاتوں سے نکلتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے یہ نام ان دھاتوں کا رکھا ہے۔

ہمارا چاند بمقابلہ دیگر سیاروں کے چاندوں کے بہت بڑا ہے اس کے مقابلہ کا کوئی چاند ہی نظام شمسی میں نہیں ہے۔ اسکا قطر ۲۱۹۳ میل ہے۔ جب ہم مشتری اور اس کے چاندوں کی طرف دوربین سے دیکھتے ہیں تو ہم کو ایک بہت ہی چھوٹا نقطہ چاندوں کا بمقابلہ اس سیارہ کے جس کے گرد وہ گردش کرتے ہیں نظر آتا ہے۔ لیکن جب قبہ فلک میں ہم زمین اور اُسکے چاند کو دیکھتے ہیں تو کمی بیشی کا ایسا بین فرق نہیں محسوس ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ دیگر سیارات کے اقمار بمقابلہ ہمارے چاند کے زمین کی نسبت سے بہت چھوٹے ہیں۔ ہمارا چاند خود اس زمین کا ہی ایک جزو ہے۔ کروڑوں سال ہوئے جب وہ اس سے جدا ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس وقت زمین کی گردش بمقابلہ اس زمانہ کے بہت ہی تیز تھی۔ پس ایک جانب بڑی ہو گئی اور اس میں سے ایک وزن مرکز سے دور چلا گیا۔ اور آسمانی خلاء میں مثل اور سیاروں کے گردش کرنے لگا۔ اسکا اندازہ (۵۰۰۰) پانچہزار ملین میل مکعب کیا جاتا ہے (۱۰۰۰۰۰×۵۰۰۰) = ۵۰۰۰۰۰۰۰۰ میل مکعب یا (۱۰۰۰۰۰ × ۱۰۰۰۰۰ × ۷۸ × ۱۰۰۰۰۰۰) ٹن فی ...... ۷۸۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن یا دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ زمین کا $\frac{1}{49}$ حصہ حجم میں اور وزن میں سوا ($1\frac{1}{4}$) حصہ سو حصوں میں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ زمین کے ثقل کے مقابلہ میں چاند کا ثقل کم ہے کیونکہ

چاند پر جو نقل ہے وہ ایسا ہی جیسا کہ چھلکہ پر ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ چھلکہ سے ہی جدا ہوا ہے۔ اور زمین کے قلب پر جو ثقل ہے وہ چھلکہ کے مقابلہ میں زائد ہے۔

اس تمام بحث اور کیفیت سے جو ظاہر کی گئی یہ ثابت ہوا کہ خود چاند زمین کا ہی ایک ٹکڑہ ہے جو زمین سے جدا ہو کر اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ عقلاء کا یہی گمان ہے کہ وہ جگہ جہاں سے چاند جدا ہوا ہے بحر اوقیانوس وبحر پاسفک ہے جس میں اتنا بڑا مثل چاند کے ایک ٹکڑا جدا ہوگیا اور اس وقت تک یہ کمی پوری نہیں ہوئی۔ قدیم زمانہ سے لوگ چاند کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں بعض بعض نے تو چاند کی پرستش تک بھی کی ہے۔ اور بہت غور سے اس کی شکلوں اور اس کی اختلافی کیفیت کو سرچشمہ مشاہدہ کیا ہے۔ لیکن باوجودیکہ وہ ماہوار ایک گردش کرتا ہے۔ لیکن کوئی فرق اس کی شکل کا نہیں دیکھا گیا۔ اس پر علمائے فلک نے مدتوں کے تجربہ کے بعد یہ رائے قائم کی کہ جس طرح وہ اپنے محور پر گھومتا ہے۔ اسی طرح وہ زمین کے گرد بھی اسی وقت میں گردش کرتا ہے۔ یعنی اسکا دور ۲۷ ½ دن میں ہوتا ہے۔ جسقدر حصہ اس کا آج ہمارے سامنے ہے۔ اور آج ہم قاہرہ میں ہیں۔ دوسرے روز اسی سبب سے بڑھتا جائیگا اور یہی کیفیت اہل شام واہل امریکہ واہل یورپ کو نظر آئیگی۔ اور جو حصہ جس تاریخ میں قاہرہ والوں کو نظر آئے گا۔ وہی حصہ یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کو بھی نظر آئے گا۔ پس لوگوں نے قیاس کیا کہ وہی حصہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ جو زمین کے سامنے ہوتا ہے چاند کی حرکت اپنے محور پر اور زمین کے گرد بمقابلہ دیگر اجرام سماوی کے تیز نہیں ہے۔ کیونکہ ۳۳۰۰ قدم فی سکنڈ ہے لیکن بندوق کی گولی اور توپ کے گولہ کے مقابلہ میں زیادہ تیز ہے۔

چاند میں بمقابلہ زمین کے قوت جاذبہ بہت کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زمین سے چھوٹا ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کرچکے۔ اگر انسان چاند پر چڑھے تو وہ آسانی سے ایک ذقن سو قدم فاصلہ کی لگا سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں اس میں بمقابلہ زمین کے چھ گنا زیادہ قوت ہوئی اور اسکا سبب چاند کی کمی جاذبیت ہے۔

بعض بعض لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ چاند کی سطح بالکل خالی ہے۔ نہ اس میں کوئی جاندار ہے نہ نباتات ہیں پانی ہے نہ ہوا ہے۔ اور یہ زمین بھی مثل چاند کے ہی ایک روز ہو جائے گی جبکہ حیوان و نباتات اس پر سب ہلاک ہو جائیں گے۔ لیکن پروفیسر بکرنگ نے اپنی رصدگاہ سے بعد مشاہدہ قمر یہ اعلان کیا ہے کہ مذکورہ بالا خیال چاند کے بابتہ غلط ہے۔ جس طرح سطح زمین پر ہوا محیط ہے۔ اسی طرح چاند پر پانی ہے۔ لیکن اسکی شکل سیال نہیں ہے۔ بلکہ بشکل برف جما ہوا یا بشکل گیس ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں سردی نہایت شدید ہوتی ہے پس پانی جما ہوا رہتا ہے۔ بہت تھوڑی مقدار پانی کی ہوا میں شامل ہو جاتی ہے۔ وہ گیس کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ زمین پر پانی تین شکلوں میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ بعض بعض مقامات قطبیہ میں زمین پر بھی یہی کیفیت دیکھی جاتی ہے۔

قوت جاذبہ کی کمی کے سبب سے چاند میں آکسیجن و ہائڈروجن گیس نہیں ہے۔ لیکن کاربو انیک گیس بہت کثرت سے ہے اگرچہ گیسوں کی جو حالت بیان کی گئی وہ چاند میں ہے۔ لیکن پھر بھی اسباب معیشت کی چاند میں کمی نہیں ہے یعنی نباتات کی کثرت ہے۔ پروفیسر بکرنگ فرماتے ہیں کہ ان کے پاس نہایت قوی دلائل موجود ہیں کہ چاند میں نباتات کا وجود ہے مگر یہ نباتات صرف دن میں ہی اُگتے، نشو و نما پاتے، پکتے اور خشک ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ رات چاند کی نہایت درجہ سرد ہوتی ہے۔ کیونکہ درجۂ حرارت صفر سے ۱۰۰ درجے نیچے گر جاتا ہے اور اس سردی میں کوئی نباتات زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر یہ بھی یاد رہے کہ چاند کا دن مثل زمین کے دن کے صرف چند گھنٹہ کا نہیں ہوتا بلکہ ہمارے چودہ روز کے برابر ہوتا ہے۔ اور یہ مدت بعض بعض نباتات کی نشو و نما کے لئے کافی ہے۔

ہم نے ظاہر کیا ہے کہ سطح چاند پر بڑے بڑے پہاڑ ہیں اور اُن میں بڑے بڑے غار اور آتش فشاں ہیں۔ اور سطح چاند پر جو کوئی تغیر ہوتا ہے اسکی وجہ یہی آتش فشاں ہیں۔ سطح پر یہ مثل جھریوں کے معلوم ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ کسی بوڑھے شخص کے چہرے پر جھریاں

پڑی ہوں۔

یہ آتش فشاں کبھی کبھی اب بھی چاند میں عمل کرتے ہیں بلکہ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ بعض بعض کا عمل اس وقت تک جاری ہے۔ زمین کے آتش فشاں، بخارات پھینکتے ہیں یہ کچھ دور نہیں ہے کہ چاند کے آتش فشاں سے بھی بخارات نہ نکلتے ہوں اور چونکہ سطح چاند بمقابلہ زمین کے بہت ٹھنڈی ہے جیساکہ ہم نے اول ذکر کردیا ہے۔ پس یہ بخارات بجائے پانی ہونے کے گیس ہوکر برف ہوجاتے ہیں۔ان سفید خطوط کے بابتہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان آتش فشاں کے دہانوں پر جو برف ہے اسکا رنگ اور اس کے خطوط میں اور انکی شکل بالکل ان شکلوں سے ملتی ہوئی ہے جو ہم لیبوریٹری یعنی معمل میں برف پر روشنی کا انعکاس کرکے دیکھتے ہیں۔اور یہ خطوط آفتاب کے نکلتے اور ڈوبتے وقت جب چاند پر عکس ڈالتے ہیں ظاہر ہوتے ہیں۔

اور شاید طویل خطوط جو ہمیں نظر آتے ہیں وہ ان نہروں کے ہیں جن پر اول اول پانی کوہ آتش فشاں سے نکل کر بہہ چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ چاند زمین ہی کی اولاد ہے اور وہ حیات سے جیساکہ بعض بعض کا خیال ہے خالی نہیں ہے۔

اسلام اور عقلیت

برٹش مسلم سوسائٹی لندن کے سامنے سی۔اے سورما صاحب ال ال ایم نے اس موضوع پر ایک تقریر کی تھی جو اسلامک ریویو، بابتہ فروری ۱۹۳۲ء میں چھپی ہے۔

ذیل میں اس تقریر کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

دین کیا ہے؟ دین وہ فطری طاقت ہے جو انسان میں موجود ہے اور اسے نیک بد کی تمیز میں مدد دیتی ہے اگر کوئی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ انسان میں یہ طاقت موجود ہے تو وہ گویا مذہبی عقیدہ کی جڑ کھوکھلی کر رہا ہے۔ درحقیقت مذہب کی بنیاد ہی اس مفروضہ پر ہے کہ انسان میں خیر و شر کی تمیز کا مادہ ودیعت کیا گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلعم سے سوال کیا کہ دین کیا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ "دین وہ مادہ ہے جس کے ذریعہ تم اپنے نیک کاموں پر خوش ہوتے ہو اور اپنی برائیوں سے نفرت کرتے ہو" لیکن اگر انسان میں یہ قوت فطرۃً موجود ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف مذاہب کی کیا وجہ ہے اور لوگوں کے عقائد اس قدر مختلف کیوں ہیں۔ قرآن اسکا جواب دیتا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:۔

وَإِنْ مِنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ۔

یہاں ہمیں اسلام کے خصائص میں سے ایک ایسی خصوصیت نظر آتی ہے جو اسے عقلی مذہب کے درجے تک پہنچا دیتی ہے۔ بخلاف دوسرے مذاہب کے جو صرف اپنی تعلیمات کو صحیح بتلاتے

ہیں اور باقی مذاہب کی تعلیمات کو یکسر باطل ٹہراتے ہیں اور بخلاف ان مذاہب کے جو انسانی اختلافات کی تاریکی کے پردے کو چاک نہ کرسکے اسلام ایک مدلل اور معقول توجیہ پیش کرتا ہے ۔ وہ تسلیم کرتا ہے کہ اختلاف عقائد کی وجہ آب وہوا، طبائع، ماحول اور سیاسی اجتماعی اور معاشی حالات کے اختلاف ہیں لیکن دامن فطرت میں تو صرف ایک سچے مذہب کے لئے جگہ ہے۔ اور وہ اسلام ہے۔ اسکا یہ دعویٰ ہے کہ تمام انبیاء صادقین کے مذاہب اپنی اصلی حالت میں ایک ہی تھے اور وہ ایک ہی پیام تھا جو آدم سے لیکر محمد (صلعم) تک دنیا کو پہنچایا جاتا رہا۔ ذرا توقف کیجئے اور سوچئے کہ اس سے کیا مراد ہے ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس دین کی وسعت اسی قدر ہے جتنی انسانیت کی اور اسکی ابتدا بھی اسی وقت سے ہوئی ہے جب سے انسان معرض وجود میں آیا ۔ اصول سب ایک تھے صرف بعض فروع میں بنی نوع انسان کی ضروریات کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے ۔

لفظ اسلام میں بھی ایک گنجینہ معانی پنہاں ہے ۔ یہ نام خود رسول کا رکھا ہوا نہیں ہے بلکہ قرآن کہتا ہے کہ " اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام " اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ " اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ہ ۔ اب حقیقۃً اسلام کے معنی کیا ہیں اسکے دو پہلو ہیں ۔ ایک خدا کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا ، اس کی مرضی میں اپنے ارادے کو گم کر دینا جو تمام نیکیوں اور پاکیوں کا منبع ہے۔ اسکا دوسرا پہلو انسان سے اچھا سلوک کرنا ہے ۔ تمام دنیا کے ساتھ رواداری کا برتاؤ ہے ۔ اس لئے کہ اپنے بھائی کے ساتھ احسان کرنا خدا نے لازم کر دیا ہے ۔ کیسی اچھی طرح قرآن نے اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْہَہٗ لِلّٰہِ وَ ہُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَ لَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ہ ۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام " امن کا دین " ہے اب میں قرآن سے دوسری آیتوں کا حوالہ دیکر آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام کیوں ہماری عزت و احترام کا مستحق ہے : الم ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْہِ ہُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰہُمْ

ینفقون والذین یومنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ہم یوقنون اولئک علی ہدی من ربہم واولئک ہم المفلحون

مندرجہ بالا آیتوں میں سب سے زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ محض عقیدہ اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے جبتک کہ اس کے ساتھ عمل بھی نہ ہو اس لئے کہ عملی پہلو پر بہت زور دیا گیا ہے یعنی تقویٰ۔ اقامت صلوٰۃ اور اپنی دولت میں سے دوسروں کو دینا یہ قرآن کی افتتاحی عبارت ہے اور اس میں ہمیں صاف صاف یہ بتلایا گیا ہے کہ پچھلے مذاہب سچے تھے اور ہمارے لئے عمل صالح اور خیرات ضروری چیزیں ہیں نہ کہیں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور نہ عبارت میں کوئی الجھن ہے۔ روشن اور کھلا ہوا پیام ہمیں سنایا جاتا ہے اور عقل بے چون وچرا اسے صحیح تسلیم کر لیتی ہے اس کے علاوہ یہ باتیں جو اوپر بتائی گئی ہیں کسی نہ کسی صورت میں دنیا کے تمام مذاہب میں موجود ہیں ایمان بالغیب، وحی پر اعتقاد۔ قیامت کا یقین اور عبادت وخیرات کی عملی تعلیم انہیں اصول پر ہر دین کی بنیاد ہے لیکن باوجود اس یکسانیت کے جو مسائل میں اسلام اور دیگر مذاہب کے درمیان پائی جاتی ہے اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اسکا وہ تخیل ہے جو اس نے خدا کی ذات کے متعلق پیش کیا ہے قران میں خدا کے بہت سے نام ہیں جن میں سے عام 'اللہ' ہے لیکن سب سے زیادہ پر معنی لفظ 'رب' ہے اس لفظ کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس کا صحیح طور پر ادا کرنا مشکل ہے۔ بہر حال ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد پیدا کرنے والا، پالنے والا حفاظت کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جو نظرت میں پائی جاتی ہیں اور فطرت ان قوانین کا نام ہے جس سے دنیا قائم ہے۔ پھر اسلام ہم سے ایک خدا پر ایمان رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے وہ خدا جو تمام جماعتی اور قومی دیوتاؤں سے بلند وبالا ہے۔ اسلام کا خدا کسی خاص قوم کا خدا نہیں ہے کہ وہ اُسی قوم کی ضروریات کا نگراں رہے بلکہ وہ تو قرآن کی سب سے پہلی آیت میں 'رب العالمین' کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کا یہ تخیل انسانی برادری کے دائرے کو وسیع تر بنا دیتا ہے دنیا کی تمام قوموں کو اپنے احاطے میں داخل کر لیتا ہے اور

انسانی ہمدردی کو غیر محدود کر دیتا ہے ۔ توحید اسلام کا بنیادی اصول ہے اور اس پر بار بار زور دیا گیا ہے ۔ مثال کی طور پر ملاحظہ ہو کہ ذیل کی آیات میں کس خوبصورتی کے ساتھ خدا کی وحدانیت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے " اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۵

قرآن نے توحید کے ثبوت میں کتاب فطرت کو بار بار پیش کیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ ان گوناگوں قوانین فطرت میں جن پر عالم کا مدار ہے ایک ہی اصول جاری وساری نظر آتا ہے ۔ فطرت کی یکسانیت خالق کی وحدت کا حتمی ثبوت ہے ۔ اسلام میں خدا کے وجود کو معمہ نہیں بنایا گیا ہے ۔ توحید میں تثلیث اور تثلیث میں توحید کی بھول بھلیاں جسے نہ عقل تسلیم کرے اور نہ عقیدہ قابل اطمینان طریقہ سے اسکی توجیہ کر سکے یہاں نہیں ہے ۔ یہاں تو انسانی زندگی اور فطرت کی کھلی ہوئی نشانیوں کے ذریعہ سے یہ سمجھا دیا گیا ہے خدا کون اور کیا ہے ۔ تصویر صاف ، صحیح اور معقول ہے ۔ اس میں تناسب اور یکرنگی ہے ۔ کلی اور جزوی حیثیت سے ادھر سے یا ادھر سے جس طرح بھی اسکا مطالعہ کیا جائے عقل اس میں کوئی نقص نہیں نکال سکتی یہ بولتی ہوئی تصویر ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ یقین واثق پیدا کر دیتی ہے ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن انسان کے متعلق کیا کہتا ہے :۔

(۱) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ

(۲) لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا ۔

ان دونوں آیتوں سے واضح ہو گیا کہ انسان بے گناہ پیدا ہوتا ہے گناہ گار نہیں جیسا کہ عیسائیت ہمیں یقین کرانا چاہتی ہے اور سب سے زیادہ قابل توجہ بات تو یہ ہے کہ انسان میں ترقی اور تکمیل کی عظیم الشان فطری صلاحیت کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے ۔ اسلام بتاتا ہے کہ ہر بچہ جو

اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے بے گناہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں کوئی امتیاز نہیں قائم کرتا کہ اس کے ماں باپ مسلم ہیں یا غیر مسلم اس کے علاوہ اسلام میں بچے کو انسانی جماعت میں داخل کرنے کے لئے کسی اصطباغ کی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے کہ ہر بچے پر اس کے خالق کی عظمت اور تقدس کی مہر ہوتی ہے اس مضغۂ گوشت پر قرآن نے بہت زور دیا ہے اور اسے خدا کی ایک نشانی قرار دیا ہے۔

وفی الارض آیاتٌ للموقنین وفی انفسکم افلا تبصرون ۔

اب یہ ظاہر ہو گیا کہ اسلام میں اس عقیدے کی گنجایش نہیں ہے کہ انسان گناہ کا پتلا ہے اور اسکی نجات کے لئے خدا کے بیٹے کی قربانی کی ضرورت تھی۔ وہ انسان جو بے گناہ پیدا ہوا ہے اور جسے بے شمار جسمانی، دماغی، اخلاقی اور روحانی طاقتیں عطا کی گئی ہیں۔ اسکا مستقبل خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اُسے نہ تو کسی وسیلہ کی حاجت ہے اور نہ اسکی ضرورت ہے کہ کوئی دوسرا اس کے لئے جان دے۔ قرآن کہتا ہے۔ وعد اللہ الذین آمنوا وعملوا الصالحات لہم مغفرۃٌ و اجرٌ عظیم۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام حیات آخری کے متعلق کیا کہتا ہے۔

(۱) فلا تعلم نفس ما اخفی لہم من قرۃ اعین جزاءً بما کانو یعملون ہ

(۲) یوم تری المومنین والمومنات یسعیٰ نورہم بین ایدیہم وبایانہم بشریکم الیوم جناتٌ تجری من تحتہا الانہار خالدین فیہا ذلک ہوالفوز العظیم ہ

(۳) یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیہ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ایک ایسی قوم کے سمجھانے کے لئے جو باریک خیالات اور اعلیٰ تخئیلات کے ادراک کی پوری صلاحیت نہیں رکھتی تھی جنت کی لذتوں اور دوزخ کی تکالیف کی تصویر کھینچنا نہایت ضروری تھا۔ اپنے زمانہ کے لوگوں کو رسول اللہ صرف انکے احساسات کے ذریعے سے متوجہ

کر سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جنت اور دوزخ کی بہت شوخ تصویریں نظر آتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ نہایت خوبی سے اسکا مفہوم بھی خود رسول ہی نے اس حدیث میں بیان کر دیا ہے جو ابو ہریرہ سے منقول ہے۔

قال اللہ عزوجل عددت لعبادی الصالحین مالاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علے قلب بشر۔

کیا اب بھی کسی کو قرآنی آیات میں روحانیت کی کمی کی شکایت ہو سکتی ہے اسلام بار بار انسان کی روح کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے اخلاق عالیہ کی طرف اسے توجہ دلاتا ہے پھر ایسی حالت میں مادیت کا الزام صریح ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔

مندرجہ بالا سطور میں میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اس امر کی کوشش کی ہے کہ ان اصول پر جو کم و بیش ہر مذہب میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں بحث کروں اور ان میں ہر ایک کی جو تصویر اسلام نے پیش کی ہے وہ آپ کو دکھاؤں اور عقل کی کسوٹی پر اسے پرکھوں۔ اسلام میں مجھے کوئی چیز ایسی نہیں نظر آتی جسے بحیثیت عقلیت پسند کے میں رد کر سکوں کوئی جزو بھی اسکا ایسا نہیں جس کی قابل اطمینان توجیہ موجود نہ ہو۔ خدا، فطرت، انسان اور قیامت ان سے میں نے مختصراً بحث کی ہے اور سرچشمہ اسلام یعنی قرآن کا حوالہ دیکر اپنے دعوے کو ثابت کر دیا ہے۔

محمد رسول اللہ نے جو تاریخ کے تاریک ترین دور میں پیدا ہوئے تھے اور جن کی قوم اپنی جہالت اور وحشت کے لئے تمام دنیا میں بدنام تھی، صحیح دین فطرت یعنی اسلام کو پھیلانے کی کوشش میں ہمارے سامنے انسانیت کا بہترین تخیل پیش کیا ہے اور اس عجوبہ گاہ عالم میں انسان کا جو درجہ ہے اور اُسکی پیدائش کی جو غایت ہے اُسے خوب کھول کر بیان کر دیا ہے انہوں نے ہمیں ایسے مقاصد کی تعلیم دی ہے جو تمام تر علمی حقائق پر مبنی ہیں اور ایسے قوانین عطا فرمائے ہیں جو کرۂ ارض کے ہر حصے میں یکساں طور پر نافذ ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات

یہ ہے کہ مطالعہ فطرت کے لئے انسان کے ہاتھ میں ایک نئی مشعل دیدی ہے۔ انسانی ترقی اور تمدن کی وہ کامل دنیا جو آج کل ہمیں ایک دھندلے ستارے کی طرح نظر آتی ہے اس دنیا کی صحیح تصویر صحرائے عرب کے ایک بسنے والے نے چودہ سو برس پہلے ہمارے سامنے پیش کردی تھی۔ سب سے بڑا عقلیت پسند اور انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد وہ عرب کا رسول تھا جو ہماری عزت اور احترام کا مستحق ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

جوہر فرد

اس کی ساخت اور خواص

قبل اسکے کہ میں جوہر فرد اور اس کی ساخت کے متعلق موجودہ تخیل کا کچھ بیان کروں یہ لازمی ہے کہ میں ان اصحاب کے لئے جو کیمسٹری سے بالکل ناواقف ہیں جوہر فرد اور سالمہ مادہ کی وہ تعریف اور اس کے متعلق وہ کام جو زمانہ قدیم کے سائنس دانوں نے کیا ہے بیان کروں۔ اسی سلسلہ میں یہ بتانا بھی نامناسب نہ ہوگا کہ سائنس اور خصوصاً کیمسٹری کا اصلی مقصد کیا ہے۔

سائنس انسان کی تمام علمی معلومات کے مجموعہ کا نام ہے جس کے دائرہ میں کل کائنات آجاتی ہے۔ سائنس علم کا وہ ذخیرہ ہے جو تجربات اور مظاہر سے حاصل ہوکر مسلسل حقائق کی صورت اختیار کرے اور پھر کسی خاص تنظیم کے جامہ سے ملبوس ہو سکے۔ سائنس کا یہ دعویٰ ہے کہ قدرت میں یکسانی اور وحدت پائی جاتی ہے۔ سائنس کی یہ کوشش ہے کہ کائنات کے ایک دوسرے سے تعلق رکھنے والے اجزا کا مکمل علم حاصل کرے۔ اس معنی میں کہ یہ اجزا خود تنہا یا ایک دوسرے سے مل کر کیا کیا تبدیلیاں اور اثرات پیدا کرتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ سائنس کا مقصد معلومات عامہ ہے۔ اس مقصد کا حصول سائنس کی روز بروز ترقی کے ساتھ دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں ٹینی سن کا خیال جو وہ ان اشعار کی صورت میں ادا کرتا ہے بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے ؎

So runs my dream; but what am I ?

An infant crying in the night .

An infant crying for the light,

And with no language but a cry.

ہماری انسانی عقل نے سائنس کو ایک درخت سے تشبیہ دے رکھی ہے جس کے ایک ہی تنے سے مختلف شاخیں نکلی ہوئی ہیں اور ہر شاخ کا نام بغرض عام فہمی الگ الگ رکھا گیا ہے مثلاً علم نجوم، طبعیات، علم الکیمیا، معدنیات، علم طبقات الارض، علم الحیات۔

علم الکیمیا وہ علم ہے جو ہمیں کائنات کے تمام موجودہ مادوں کی حقیقت اور ان کی اصلی اور انتہائی ترکیب کا پتہ دے اور یہ بتائے کہ مختلف مادے ایک دوسرے سے مل کر کیا مظاہر پیدا کرتے ہیں۔ . . . . . . علم سائنس کی ترقی نے علم الکیمیا کو بذات خود اس قدر وسیع علم بنا دیا کہ اس شاخ کو مختلف شاخوں میں تقسیم کرنا لازم ہو گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل کیمیا کی تقسیم مختلف شاخوں میں کر دی گئی ہے۔ مثلاً نامی، غیر نامی، برقی۔ طبیعی کیمسٹری، سائنس داں اپنے علم کا استعمال اکثر تجارت اور دیگر مفید کاموں میں کرتے ہیں اس وجہ سے ایک نئی کیمسٹری کا نام Industrial یا صنعتی Technical کیمسٹری اور اضافہ ہو گیا ہے۔

زمانہ قدیم سے لوگ تمام مادوں کو جو قدرت میں پائے جاتے ہیں چند اصلی یا بنیادی مادوں سے بنا ہوا خیال کرتے چلے آتے ہیں۔ کسی زمانہ میں ہوا۔ پانی وغیرہ عناصر خیال کئے جاتے تھے۔

۱۷۷۷ء میں فرانسیسی عالم کیمیا لوازیر (Lavoisier) نے بالتحقیق تجربات سے یہ ثابت کر دیا کہ ہوا دو گیسوں کا مخلوط ہے جن گیسوں کا نام مختلف صورتیں اختیار کرنے کے بعد آج کل نائٹروجن اور آکسیجن قرار پایا ہے۔

اسی طرح سے پانی عرصہ دراز تک عنصر خیال کیا جاتا تھا ۱۷۸۱ء میں کیونڈش نے پانی کو دو عناصر یعنی ہیڈروجن اور آکسیجن کا مرکب ثابت کر دیا۔

لفظ عنصر یا Element کے موجودہ تخیل کے لئے ہم رابرٹ بائل Boyle اور اسکے

بعد لوازیر Lavoisier کے شکور ہیں۔ آج کل کے کیمیا داں عنصر اس مادہ کو کہتے ہیں
جو ابتک کسی دوسرے قسم کے مادہ میں تقسیم نہ ہوسکا ہو ۱۸۸۵ء تک Didymium عنصر
خیال کیا جاتا تھا لیکن اس سنہ میں ایک جرمن کیمسٹ Welsbach نے متعدد تجربات کی
بنا پر یہ ثابت کر دیا کہ یہ "عنصر" دراصل دو عناصر کا مخلوط ہے چنانچہ اس سنہ سے ایک عنصر
Didymium ختم ہو گیا اور اسکی جگہ دو عناصر Praseodymium اور Neodymium پیدا ہو گئے
عنصر کی اس تعریف کی بنا پر آج کل کیمیا داں کو جو عنصری مادے یا عناصر معلوم ہیں
ان کی تعداد ۱۹۲۷ء تک ۹۲ تھی۔ زمانہ قدیم کے فلسفی مادے کی ساخت اور بناوٹ
کے متعلق عجیب عجیب خیالات گڑھا کرتے تھے۔ ان تصورات میں جو یونان۔ ہندوستان
اور اٹلی کے فلسفیوں کے ہم کو دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں بہ حیرت ہم دیکھتے ہیں کہ ایک
مطابقت پائی جاتی ہے۔ ان سب فلسفیوں کی رائے قریب قریب ذیل کے چار اصول پر مشتمل
کیجا سکتی ہے جو آج کل بھی بہت تبدیلیوں کے بعد اپنے ہزارہا سال قبل کے رنگ پر قائم ہیں
جن چار اصولوں کی تعلیم ان لوگوں نے دی وہ یہ ہیں:۔

۱۔ مادہ منقسم ہوسکتا ہے۔

۲۔ تمام چیزیں چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنی ہوئی ہیں۔

۳۔ یہ ذرے لگاتار حرکت میں ہیں۔

۴۔ یہ حرکت کسی بیرونی طاقت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ان ذروں کی بذات خود یہ
خاصیت ہے کہ وہ حرکت کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ذرے دکھائی
نہیں دئے جا سکتے اور یہ کہ یہ ذرے ہمیشہ قائم رہتے ہیں۔ ان میں تبدیلی واقع نہیں ہوتی ہے۔
ہر چیز کی خاصیت انہیں ذروں کی خاصیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔

یونان کے فلسفیوں کے پاس اس نظریہ کے صحیح ہونیکے لئے کوئی تجربی اور حکمی
ثبوت نہ تھا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ زمانہ حال میں باوجود لاتعداد تبدیلیوں کے یہ نظریہ کم و

بیش قائم ہے۔

رابرٹ بوائل، رابرٹ ہوک، جان میگو، وغیرہ وغیرہ نے اس نظریہ کو پھیلانے میں بہت زور دیا۔ روسی کیمسٹ M. W. Lomonosoff نے ۱۷۴۸ء میں اس نظریہ کو اچھا اور زیادہ مضبوط بنا دیا۔ اس کے بعد جان ڈالٹن نے ۱۸۰۳ء میں اسی نظریہ کو جو عرصہ دراز سے مردہ ہو چکا تھا۔ پھر جگا دیا اور ۱۸۰۸ء میں وہ مشہور اصول اسی نظریہ کے قائم کئے جو آج کل اسی صورت میں ہر کیمیائی عمل کو سمجھانے کے لئے کافی ہیں۔

ڈالٹن کے نقطہ نظر کے مطابق جوہر فرد مادہ کے اس چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو کہتے ہیں جو کسی کیمیائی طریقہ عمل سے پھر تقسیم نہ ہو سکے۔ گویا ڈالٹن کا جوہر فرد وہی ہے جو عربوں کا جزو لایتجزیٰ ہے۔

ڈالٹن کے نظریہ کے مطابق ہر مرکب اسی جوہر فرد کے ملنے سے بنتا ہے۔ چونکہ جوہر فرد مادہ کی تقسیم کی آخری حد ہے اس لئے کسی مرکب میں کسی عنصر کے ایک جوہر فرد سے کم کا موجود ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ہر مرکب کی خاصیت ایسی جوہر فرد کی کمی اور بیشی پر اور اسکی قسم پر منحصر ہے۔ مثلاً دہی دو قسم کے جوہر فرد مختلف تعداد میں ایک دوسرے سے ملکر مختلف مرکبات پیدا کرتے ہیں۔ پانی میں ایک جوہر فرد آکسیجن دو جوہر فرد ہائیڈروجن کے ساتھ ملا ہوا ہے مگر بجائے ایک آکسیجن کے اگر دو آکسیجن جوہر فرد ہائیڈروجن جوہر فرد سے ملیں تو دوسرا مرکب جس کو Hydrogen Peroxide کہتے ہیں بنتا ہے۔ ایک مرکب کو یعنی پانی کو ہم پیتے ہیں لیکن دوسرے مرکب کو باوجود اس کے کہ وہ انہیں دو اجزا سے بنا ہوا ہے ہم دوائی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسی اصول کے مطابق یہ لازمی ہے کہ ہر ایک قسم کا مرکب ہمیشہ ایک ہی نسبت میں مختلف جوہر فردوں سے مل کر بنتا ہے۔ مثلاً کھانے کا نمک خواہ امریکہ میں تیار کیا جائے یا ہندوستان میں سانبھر جھیل سے نکالا جائے یا جرمنی میں کسی نئی ترکیب سے تیار کیا جائے ہمیشہ ایک ایٹم کلورین

اور ایک ایٹم سوڈیم سے بنا ہوا پایا جائیگا۔ ان ایٹموں کے اس چھوٹے سے چھوٹے مجموعہ کو جو اپنی ہستی قائم رکھ سکے مالیکیول کہتے ہیں۔

کیمیا داں جب تمام مادوں کو چند عناصر سے بنا ہوا خیال کرنے میں متفق ہوگئے تو پھر یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں یہ سب عناصر ایک ہی عنصر کی مختلف شکلیں تو نہیں ہیں۔ رابرٹ بوائل کا خیال تھا کہ سب عناصر ایک ہی مادہ سے بنے ہوئے ہیں برزیلیس کا خیال اس کے برعکس تھا کہ نہیں ہر عنصر بذات خود علٰحدہ مادہ ہے اور دو عناصر میں باہم کوئی تعلق نہیں۔

جب لوگوں کو جوہر فرد کا تخیل صحیح طور پر ذہن نشین ہوگیا تو کوشش شروع ہوئی کہ انکا وزن معلوم کرنیکی ترکیب نکالی جائے۔ ہر چیز کو تولنے کے لئے لازمی ہے کہ کچھ اوزان مقرر کئے جائیں۔ چونکہ جوہر فرد سے چھوٹی اور چیز نہیں تھی اس لئے کسی کو تولنے کے لئے جو باٹ مقرر ہوسکتا تھا وہ صرف کسی دوسرے عنصر کا جوہر فرد ہی ہوسکتا تھا۔ جب یہ معلوم ہوا کہ ہائیڈروجن سے ہلکا اور کوئی عنصر نہیں ہے تو تمام عناصر کے ایٹمی وزن ہائیڈروجن کے جوہر فرد سے مقابلہ کرنیکے بعد رکھے گئے یہ کس طرح کیا گیا اور اب کس طرح کیا جاتا ہے۔ یہاں بیان کرنا ناممکن ہے اور نہ غرض مضمون ہے۔ چنانچہ مختلف کیمیا دانوں نے ایٹمی اوزان کی فہرست قائم کی ۱۸۱۵ء میں لندن کے مشہور ڈاکٹر پراؤٹ ان ایٹمی وزنوں پر غور کرنے سے اس نتیجہ پر پہونچے کہ یہ وزن ہمیشہ پورے عدد اور کسور سے پاک ہوتے ہیں یعنی ہر جوہر فرد ہائیڈروجن کے جوہر فرد کا ایک خاص حاصل ضرب ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے رائے قائم کی کہ ممکن ہے کہ تمام جوہر فرد یعنی تمام عناصر ہائیڈروجن سے ہی بنے ہوئے ہوں لیکن اس رائے کو کسی نے اہمیت نہ دی اس وجہ سے کہ مختلف عناصر کے ایٹموں کے وزن ہمیشہ پورے عدد نہیں ہوتے۔

۱۸۴۳ء میں گمیلن نے عناصر کی انکے ایٹمی اوزان کے مطابق ایک فہرست تیار کی ۱۸۶۲ء میں مایر اور ۱۸۶۴ء میں نیولینڈ نے اسی سلسلہ میں یعنی

عناصر کے وزن اور صفات کے بتلانے میں بہت کام کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب عناصر اپنے وزنوں کے مطابق سلسلہ وار لکھے جائیں تو ہر سات عناصر کے بعد ایک عنصر آتا ہے۔ جو اوپر کے عنصر سے کیمیائی خواص میں مشابہ ہوتا ہے۔ اسی کو ۱۸۶۹ء میں مشہور روسی کیمیا داں (منجلف) نے Periodic Law کے نام سے مستند طور پر چھاپا۔

چونکہ منجلیف کے زمانہ میں Helium وغیرہ گیس دریافت نہیں ہوئے تھے اس لئے ان نئے گیسوں کو ایک نئے خانہ میں جس کا نمبر ۰ رکھا گیا جگہ دی گئی۔ اس نقشہ کو غور سے دیکھنے سے فوراً معلوم ہوتا ہے کہ عناصر سلسلہ وار قطاروں میں لکھے جائیں تو ہر آٹھواں عنصر پہلے عنصر سے کیمیائی اوصاف میں مشابہ ہے۔

۱۔ لیتھم (Li) ۲۔ بریلیم (Be) ۳۔ بورن (B) ۴۔ کاربن (C) ۵۔ نائٹروجن (N) ۶۔ آکسیجن (O) ۷۔ فلورین (F)
۸۔ سوڈیم (Na) ۹۔ میگنیسیم (Mg) ۱۰۔ المونیم (Al) ۱۱۔ سلیکن (Si) ۱۲۔ فاسفورس (P) ۱۳۔ گندھک (S) ۱۴۔ کلورین (Cl)
۱۵۔ پوٹیسیم۔ ۱۶۔ کیلسیم (Ca) ۱۷۔ سلینیم (Se) وغیرہ

کیمیائی مشابہت کو سمجھانے کے لئے اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح مثلاً لیتھم کسی دوسرے عنصر کے ساتھ مرکب بناتا ہے۔ لیتھم کے دو جوہر فرد آکسیجن کے ایک جوہر فرد سے مل سکتے ہیں اسی طرح سوڈیم کے بھی دو ہی جوہر فرد اور اس کے پیچھے آنیوالے عنصر پوٹاسیم کے بھی دو ہی جوہر فرد آکسیجن کے ایک جوہر فرد سے مرکب بناتے ہیں۔ ان مرکبات کے خواص یکساں ہیں۔

منجلیف نے ان تمام باتوں کو حیرت انگیز اعتقاد کے ساتھ شائع کیا اور یہ ہی نہیں کہ اپنے زمانہ کے موجودہ عناصر کے خواص بتائے ہوں بلکہ چند نئے عناصر کی پیشین گوئی بھی کر دی اور انکے اوصاف ایک مکمل قلم بند کر دئے۔ جن کا ذکر اس مقام پر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

منجلیف نے ۱۸۷۱ء میں لکھا کہ ایک نیا عنصر ملے گا جس کا نام میں فی الحال Aluminium. رکھتا ہوں اس کے اوصاف یہ ہونگے اس کے ایٹم کا وزن ۶۹،۲ ہوگا۔ تھوڑی سی گرمی سے پگھل جائے گا۔ پانی سے ۶ گنا بھاری ہوگا ہوا کا اس پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس کے دو جوہر فرد آکسیجن

کے ۳ جوہر فرد سے مل کر مرکب بنائیں گے۔ اسکا انکشاف بذریعہ طیف نما کے ہوگا۔ ۱۸۷۵ء میں فرانسیسی کیمیا داں نے طیف نما (Spectroscope) کے ذریعہ ایک عنصر کا انکشاف کیا اور معلوم کیا کہ اسکا ایٹمی وزن ۹ر ۶۹ اور پگھلنے کا درجہ حرارت ۳۰.۰ پانی سے یہ عنصر ۶ گنا بھاری پایا گیا ہوا کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور اس کے ۲ جوہر فرد آکسیجن کے ۳ جوہر فرد سے مل کر مرکب بناتے ہیں۔

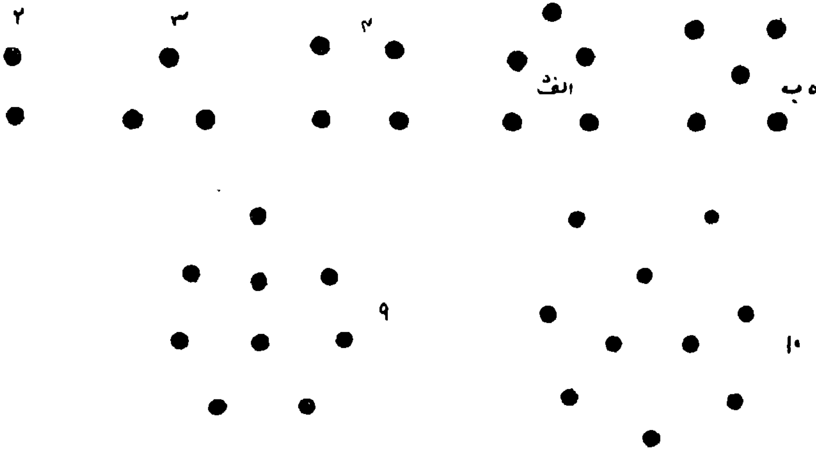
اس عنصر کا نام آج کل گیلیم ہے اور نقشہ مندرجہ صفحہ ۴۰ میں اسے درج کیا جائے تو تیسرے خانہ میں اسکی جگہ المونیم کے نیچے ہوگی اور چونکہ (مینڈلف) کے زمانہ میں ایٹمی وزن ۶۵ اور ۷۰ کے درمیان کوئی عنصر نہیں تھا اور چونکہ وہ عنصر جس کے ایٹم کا وزن ۷۲ تھا ۶۵ کے بعد بوجہ اختلاف خواص المونیم اور اس کے نیچے آنیوالے عناصر کے اس خانہ میں نہیں لکھا جا سکتا تھا اس لئے اس نے یقین کامل یہ کہدیا کہ اس خالی جگہ پر دوسرا جوہر فرد آنا چاہئے جس کے خواص جو اوپر بیان کئے گئے اس نے اندازاً اوپر کے عناصر کے خواص سے اخذ کر لئے۔ اسی طرح سے مینڈلف نے اور کئی عناصر کی پیشین گوئی کر دی جو بعد میں صحیح نکلی۔ مگر اس سب کے باوجود اس طریقہ ترتیب سے پورے طور پر عناصر کی تنظیم نہو سکی۔ کچھ ایسے ہیں جو اپنے ایٹمی وزن کی بنا پر ٹھیک ٹھیک اس نقشہ کے اندر جگہ نہ پا سکے جیسا کہ ان میں خطوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ آیوڈین کہ جس کا ایٹمی وزن ۱۲۶ ہے ٹیلوریم سے جس کا وزن ۱۲۰ ہے قبل آنا چاہئے مگر بوجہ مشابہت اوصاف قبل لکھے نہیں جا سکتے

اس موقعہ پر میری غرض اس نقشہ کے صحیح ہونیکی دلیلیں یا اسکے نقائص بیان کرنا نہیں ہے۔ باوجود تمام خامیوں کے اس سے یہ پایا جاتا ہے کہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہے جس کی وجہ سے مختلف عناصر میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مشابہت پائی جاتی ہے جس سے کیمیا دانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ جوہر فرد بھی کسی اور چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا ہے اس لئے کہ کسی اور طریق پر یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ جوہر فرد کا وزن کسی خاص حد تک بڑھ

جانے کے بعد عناصر کے خواص پھر کیوں دوبارہ مشابہ ہو جاتے ہیں اس سب کے سمجھانے کے واسطے صرف ایک ہی ترکیب خیال میں آسکتی ہے کہ عناصر کی خاصیتیں جوہر فرد کے اندر ان چھوٹے دروں کی ترتیب پر مبنی ہیں اور یہ کہ یہ ترتیب ان ذروں کی ایک خاص تعداد کے بعد پھر وہی ہو جاتی ہے جو پہلے تھی

جیسا کہ فان مایر کے مشہور تجربہ سے جو اس نے مقناطیسوں کی ایک دوسرے پر کشش معلوم کرنیکے واسطے کئے تھے معلوم ہوگا یہ تجربہ اس طریقہ پر کیا گیا۔

چھوٹے چھوٹے مقناطیس مثلاً مقناطیسی سوئیاں کارک میں لگا کر پانی پر تیرا دی گئیں اس طرح سے کہ ان چھوٹے مقناطیسوں کے ایک سی سرے۔ (مثلاً اثباتی) اوپر تیرتے رہیں توانین مقناطیسی کی رو سے یہ مقناطیس ایک دوسرے کے پاس کبھی نہ آسکیں گے۔ اگر ایسی صورت میں ایک بڑا مقناطیس غیر نفی سرے کا اوپر کچھ فاصلہ پر رکھا جائے تو یہ چھوٹے مقناطیس حسب ذیل شکلوں میں اپنے کو ترتیب دیتے ہیں۔



جیسا کہ ان شکلوں سے ظاہر ہے ۱۰ مقناطیس والی شکل اور ۹ مقناطیس والی شکل میں ضرور کچھ مشابہت ہے۔ اسی طرح ۳ اور ۱۰ مقناطیس والی شکل میں اندر کے تین مقناطیس ایک

ہی طرح ترتیب دے ہوئے ہیں۔ اگر ہم بجائے ان چھوٹے مقناطیسوں کے جوہر فرد کے اندر چھوٹے چھوٹے ذروں کو خیال کریں اور یہ کہ کیمیائی مشابہت ان ذروں کی ترتیب کی مشابہت سے پیدا ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تصور کرلیں کہ یہ ذرے یکساں قوت رکھنے کی وجہ سے حرکت میں رہتے ہیں اور کسی دوسری مرکزی قوت کی کشش سے اپنے کو خاص خاص شکلوں میں ترتیب دے لیتے ہیں تو اس کے بعد ہم اب سمجھ سکتے ہیں کہ اٹمی وزن بڑھنے کے بعد کچھ دور چل کر پھر عناصر میں کیمیائی مشابہت کیوں پائی جانے لگتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سائنس کی ترقی نے قدیم زمانہ کے کیمیا دانوں کے جوہر فرد اور مولیکول کی خیالی تصویر کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا۔ جوہر فرد اور مولیکول دراصل مادہ سے بنے ہوئے ریزوں کا نام ہے۔ یہانتک کہ اب جوہر فرد اور مولیکول کی جسامت اور حقیقی وزن دریافت کرنیکی کوشش کیجانے لگی کیمیا کے ایک پروفیسر نے سونے کی مولیکول کی جسامت معلوم کی ہے ان تجربات کے صحیح ہونیکی دلیل یہی ہے کہ ۲ مختلف ایک دوسرے سے بالکل جدا طریقوں پر مولیکول کی جسامت معلوم کئے جانے پر وہی نتیجہ نکلا یہاں پر صرف ہیڈروجن کی جسامت کا بتا دینا کافی ہوگا۔ ہائیڈروجن کے مولیکول کا صحیح وزن ۳٫۲۴×۱۰^-۲۴ گرام ہے ایک c. c ہیڈروجن گیس میں (درجہ حرارت اور ہوائی دباؤ ۰۔۷۶) ۲۵×۱۰^۱۸ یعنی ۲۵ ٹرلین مولیکول ہوتے ہیں۔ کلیہ اوگیڈرو کے مطابق ہر گیس کے ایک c. c میں مولیکول کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ لوشمید نے سب سے پہلے مولیکول کی جسامت معلوم کرنے کے قاعدے نکالے اس وجہ سے ایک c. c میں مولیکول کی تعداد کو اکثر لوشمید کا عدد کہتے ہیں۔

جوہر فرد کو ان چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا خیال کرنیکی وجہ صرف ایک یہ ترتیب Periodic table ہی نہیں ہے۔ بلکہ کچھ اور اس سے کہیں اہم تر اور قابل یقین وجوہ ہیں جو شک و شبہ کو بالکل مٹا دیتے ہیں۔ اس موقعہ پر تفصیل سے ان وجوہ کا بیان کرنا

بیکار ہوگا۔ مگر کچھ اسکے متعلق کہنا لازمی ہے تاکہ اصل مضمون سمجھ میں آسکے۔

زمانہ دراز سے یہ بات معلوم تھی کہ ہر عنصر ایک خاص قسم کی روشنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً سوڈیم کی روشنی زرد سٹرانشیم کی سرخ۔ بیریم کی سبز۔ تانبے کی نیلی وغیرہ وغیرہ ہوتی ہیں۔ یہ کہ اس روشنی کا تعلق جوہر فرد (ایٹم) سے ہے اور مولیکول سے نہیں ہے اس طرح ثابت کیا گیا کہ سوڈیم تشکل سوڈیم کلورائیڈ (نمک) سوڈیم نائٹریٹ (شورہ) یا کسی اور مرکب شکل میں کیوں نہو ہمیشہ زرد روشنی دیگا۔ جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر عنصر کی روشنی کی وجہ سے جوہر فرد ہے نہ کہ مولیکول۔ روشنی کی کلیوں کے مطابق یہ مانا جاتا ہے کہ روشنی نہایت ہی چھوٹے (ایتھر) ذرات کے بے انتہا تیزی سے حرکت کرنے سے وقوع میں آتی ہے لہذا یہ ماننا لازمی ہو جاتا ہے کہ جوہر فرد بھی اور چھوٹے ذرات سے بنا ہوا ہے اسی بات کا مزید ثبوت زیمان کے تجربہ سے ملتا ہے جو اس نے روشنی اور مقناطیس کے تعلقات معلوم کرنے میں کئے۔

۱۸۹۶ء میں اس نے یہ دیکھا کہ عناصر سے جو روشنی نکلتی ہے اور اسکا جو طیف بنتا ہے وہ مقناطیسی طاقت کے اثر سے بدل جاتا ہے کچھ بعد معلوم ہوا کہ برقی قوت سے بھی عناصر کا طیف بدل جاتا ہے۔ ان تجربات سے اس امر کا کافی ثبوت مل گیا کہ جوہر فرد بھی چند چھوٹے ذروں کے مجموعہ سے بنا ہوا ہے اور یہ کہ ان ذروں پر برقی قوت اثر کرتی ہے۔

فن طیف پیمائی نے اس قدر عروج حاصل کیا ہے کہ قریب نصف سے زائد عناصر ایسے ہیں جن کا انکشاف اس ترتیب سے ہوا ہے۔ ہر عنصر کا طیف جداگانہ ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی شے کے سپکٹرم میں کوئی نئی لکیر یا رنگ معلوم ہو تو خیال ہوتا ہے کہ ضرور یہاں کوئی نہ کوئی نیا عنصر مخفی ہے اس سراغ کے ملجانے کے بعد اس شے کی تحلیل ہر ممکن طریق پر شروع کر دیجاتی ہے اور آخر کار ایک نیا عنصر ملجاتا ہے۔

اگر ہر طیف کا پیدا ہونا ایٹم اور اس کے اندر کے چھوٹے برقی وزن پر مبنی ہے تو یہ لازمی ہونا چاہیئے کہ ایسے عناصر جن کے ایٹمی وزن کم ہیں بہت ہی سادے سپکٹرم بنائیں

گے برخلاف ان عناصر کے جن کا ایٹمی وزن بہت ہی زیادہ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے سہل و سادہ طیف۔ شروع شروع کے چند عناصر کے پائے جاتے ہیں اور جوں جوں وزن بڑھتا جاتا ہے سپکٹرم نہایت پیچیدہ اور گھنے ہوتے جاتے ہیں اس زمانہ میں جبکہ جوہر فرد (ایٹم) کی ساخت کے متعلق یہ کشمکش ہو رہی تھی رونٹگن نے وہ مشہور شعاعیں دریافت کیں جو آج تک اس کے نام سے بطور رونٹگن شعاعوں کے مشہور ہیں۔

ان رونٹگن Roentgen کی دریافت کردہ شعاعوں X—Rays کی اہمیت کیمیا دانوں کی نظر میں اس وجہ سے بہت زیادہ ہے کہ اسکی مدد سے ان کو ایٹم کے ٹکڑے کر ڈالنے میں بہت مدد ملی۔

روشنی کی لہروں کی بہت بڑی خاصیت یہ ہے کہ جب روشنی ایک گٹر میں سے گزاری جائے تو دوسری طرف سیاہ و سفید دھاریاں سی بنتی ہیں۔ آپ لوگ سوال کریں گے کہ گٹر کیا ہے؟ کسی ہموار شیشہ پر ایک انچ فاصلہ کے اندر اندر ایک لاکھ لکیریں کھینچی جائیں تو اس کو جرمن زبان میں گیٹر انگریزی میں گریٹنگ کہتے ہیں۔ اس شیشہ میں یہ خاصیت ہو جاتی ہے کہ روشنی اس میں سے گزرنے کے بعد اپنی اصلی حالت کو بدل کر دھاریاں بناتی ہیں۔

روشنی کی لہریں جس قدر چھوٹی ہوں گی اسی قدر ان لکیروں کے درمیان کا فصل کم ہونا چاہئے ورنہ یہ سیاہ و سفید دھاریاں نہیں بنتیں X-Ray کی لہریں حد درجہ چھوٹی ہیں اس وجہ سے ان کی قوت نفوذ بہت زائد ہے۔ نہایت حیرت انگیز تجربہ پروفیسر لا وے (برلن) نے یہ کیا ایک Crystal میں سے X-Ray گزاریں تو دیکھا کہ بجائے اس کے کہ یہ شعاعیں بدستور رہیں۔ سیاہ و سفید نشان بناتی ہیں۔

اس تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ Crystal جو دیکھنے میں بظاہر صاف و شفاف نظر آتا ہے۔ درحقیقت چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنا ہوا ہے جو اس قدر قریب ہیں کہ معمولی روشنی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتے لیکن X—Rays کے واسطے گیٹر کی طرح

کام کرتے ہیں۔

قبل اس کے کہ اب میں ایٹم (جوہر فرد) کی ساخت بیان کروں یہ بتا دینا اور ضروری سمجھتا ہوں الکٹرون کسے کہتے ہیں۔ جیسا کہ میں اپنے پچھلے مضمون میں بتا چکا ہوں خلا میں برق گزارنے سے چھوٹے چھوٹے ذرات منفی سرے سے دوسری جانب نہایت تیز رفتار سے چلتے ہیں۔ یہ بجلی کے ذرے منفی بجلی سے بھرے ہوتے ہیں۔ انکو الکٹرون کہتے ہیں۔
جس طرح جوہر فرد کا تخیل مادہ کی ساخت کے لئے لازمی تھا اسی طرح الکٹرون کا تخیل برق کی ساخت کے لئے لازمی ہے۔ جس طرح سے چاندی یا سونے کا ایک ایٹم کہنے سے ہم کچھ سمجھ جاتے ہیں۔ اسی طرح برق کے الکٹرون سے بھی بجلی کا وہ چھوٹے سے چھوٹا ذرہ جو انتہائی تقسیم کے بعد مل سکے سمجھنا چاہئے۔ الکٹرون ہمیشہ منفی ہوتے ہیں اس الکٹرون کے تخیل کا موجد علم ہوئٹسنر ہے۔ پلوکر نے ۱۸۵۹ء میں ان ذرات کا انکشاف کیا ہتورف نے دس سال بعد اچھی طرح ان کی تحقیقات کی اور انگریزی ماہر طبعیات کروکس نے اس پر کچھ اور تحقیق کر کے جلد سب اپنے نام سے چھپوا دیا۔

ایک الکٹرون کا وزن ہیڈروجن کے جوہر فرد (ایٹم) کے وزن سے $\frac{1}{1800}$ ہے یعنی قریب قریب بے وزن شے ہے الکٹرون کا ریڈیس 10^{-13} c.m. کا بتایا جاتا ہے ایٹم کا ریڈیس 10^{-8} یعنی اس سے ۵ گنا بڑا ہے ایک ایٹم اور الکٹرون کی جسامت میں وہی مناسبت ہے جیسے کہ کرہ زمین اور کسی مسجد کے گنبد میں برقی بار جو ایک الکٹرون پر ہوتا ہے اس کو برقی اکائی مانا گیا ہے

الکٹرون کے پیدا کرنے کی ترکیب صرف یہی نہیں ہے کہ خلا میں برق گزاری جائے۔ چونکہ ہمارے تخیل کے مطابق ایٹم ان الکٹرون سے بنا ہوا ہے۔ ہمیں اور بہت سی ترکیبوں سے الکٹرون پیدا کر لینے چاہئیں۔ چنانچہ ہر قسم کے عناصر کے سخت گرم کئے جانے پر گرمی کے اثر سے۔ یا تزہیر Phosphorescence سے الکٹرون پیدا ہوتے ہیں۔ ان الکٹرون کے نکل

جانے کے بعد وہ عنصر مثبت برق سے بھرا ہوا باقی رہجاتا ہے۔ ہر عنصر سے شعاعیں پیدا کیجاسکتی ہیں۔ ان کی شعاعوں کی لہروں کی لمبائی عناصر کے وزن کے بڑہنے سے کم ہوتی جاتی ہے۔ یعنی جس قدر ایٹم کا وزن زیادہ ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس ایٹم سے نکلنے والی شعاعوں کی قوت نفوذ بڑھتی جاتی ہے۔ یعنی انکی حرکت کی تعداد ارتعاش بڑھتی جاتی ہے اس طریقہ پر شعاعوں کے تعداد ارتعاش کی بنا پر اگر ہم عناصر کی ترتیب کریں تو ایک نیا بہلی سے بالکل ملتا ہوا عناصر کا نقشہ - - - - - حاصل ہوتا ہے جس میں وہ تمام عیب جو مینجلف کے نقشہ میں تھے غائب ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلہ وار عناصر کو ترتیب دینے سے جس مقام پر عنصر آئے اس کے نمبر کو اس عنصر کا عدد ترتیبی کہتے ہیں یہ وہ عدد ہے جو ہم کو بتلاتا ہے کہ اس عنصر کے جوہر فرد میں کس قدر مثبت ذرے ہیں۔

ایٹم کا تمام وزن انہیں مثبت برق سے لدے ہوے ذروں کی وجہ سے ہوتا ہے اس لئے کہ الکٹرون کو بالکل بے وزن خیال کیا جاتا ہے۔

اس طرح اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ ایٹم (جوہر فرد) کس ترکیب سے بنا ہوا ہے۔ ان سب نتیجوں پر پہونچنے کے واسطے سب سے زائد مدد ریڈیم کی کیمسٹری اور اسکی شعاعوں نے کی ہے اور یہی تو تیں کیمیا داں کے قبضہ میں ہیں جو اس عقدہ کے حل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ میں اپنے مضمون کو ایٹم (جوہر فرد) کا مختصر سا خاکہ بتا کر ختم کروں گا۔ اس خاکہ کی موجودہ صورت بتانے میں جن ماہرین علم طبعیات وکیمیا نے کام کیا انکے نام حسب ذیل ہیں۔

ہلم ہولز، مارسلے، رتھر فورڈ، ساڈی، بور، نعایان، لادے، پلانک، ہان۔

ایٹم چند الکٹروں (یعنی منفی برق کے انتہائی چھوٹے ذرے) اور چند - - - - - مثبت برق سے لدے ہوئے ذروں[1] سے بنا ہوا ہے۔ یہ مثبت ذرے ایک مرکز پر جمع ہیں

---

[1] ان مثبت ذروں کو اکثر لوگ پروٹون کہتے ہیں۔ الکٹرون صرف منفی بجلی کے ذروں کو کہتے ہیں

ایٹم کا وزن انہیں کی کمی وبیشی پر مبنی ہے۔ مثبت ذرے پر مثبت بجلی کے ۲ چارج ہیں ہر ایک مثبت ذرہ کا وزن ہیڈروجن کے ایٹم کے وزن سے ۴ گنا ہے یعنی

ایک ایٹم میں جس قدر یہ مثبت ذرے زائد ہونگے اسی قدر اسکا وزن زائد ہوگا اور اسی قدر اسکی مثبت برق زائد ہوگی۔

الکٹرون ایٹم میں دو طرح کے ہوتے ہیں کچھ تو بالکل اس مثبت مرکز گیلیم کے قریب اس کو گھیرے ہوتے ہیں۔ اور کچھ اس سے فاصلہ پر نہایت تیز رفتار سے چکر لگاتے رہتے ہیں

اب ایٹم میں تعدیل قائم رکھنے کے لئے لازمی ہے کہ الکٹرون کی تعداد مثبت ذروں کی برق کے برابر ہونی چاہئے۔ لیکن یہ سب الکٹرون ایک دائرہ میں چکر نہیں کر سکتے۔ ایک دائرہ میں صرف ۸ الکٹرون چکر لگا سکتے ہیں یا اس سے کم مگر جہاں ۸ سے زائد الکٹرون ہونیکی ضرورت ہوتی ہے تو یہ الکٹرون نیا دائرہ قائم کر لیتے ہیں۔ ہر ایٹم کی کیمیائی صفات ان الکٹرون کی اس تعداد پر مبنی ہوتی ہے۔ جو سب سے بیرونی دائرہ میں موجود ہوں۔

سب سے سادہ ترکیب کا جو ایٹم ہو سکتا ہے وہ وہی ہوگا جس کا وزن سب سے کم ہو یعنی ہائیڈروجن کا ایٹم کے وزن کے متواتر بڑھتے جانے سے ایٹم کی ترکیب پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔

ماہرین علم طبعیات ایٹم کی ساخت پر غور کرکے اور تجربوں کی بنا پر اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ایٹم میں الکٹروں اور مثبت ذرات کی تعداد بڑھتے جانے سے ایٹم کی ساخت کمزور ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آخر کے عناصر یعنی ریڈیم ، تھوریم ، یورانیم وغیرہ اپنے میں سے خود بخود الکٹرون خارج کرتے رہتے ہیں۔ یہ بتلا دینا بھی خالی از دلچسپی نہوگا کہ یہ مثبت ذرے کیمیائی اوصاف میں ہیلیم گیس سے بالکل یکذات ہیں رتھرفورڈ نے ۱۹۰۸ء میں اسی کو بالتحقیق ثابت کر دیا کہ ریڈیم میں سے یہ ذرے ہر وقت نکلتے رہتے ہیں۔ انکا نام ذرہ کی شکل میں جبکہ وہ ریڈیم سے نکالیں یا کسی اور طریق پر پیدا کئے جائیں۔

کے ذرات رہ گیا۔ گویا اب یہ طے ہو چکا ہے کہ ہیلیم اٹیم (جوہر فرد) کچھ نہیں۔ سوائے اس کے کہ ایک ایسا ذرہ ایک مرکز پر قائم ہیں جس پر ۲ مثبت برقی لداؤ ہیں اور اس کے گرد منفی برقی الکٹرون نہایت تیزی سے گھوم رہے ہیں چونکہ ہر مثبت برقی ذرے کا وزن ہائیڈروجن کے اٹیم سے دگنا ہوتا ہے اور چونکہ الکٹرون بغیر وزن تصور کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ہر ہیلیم اٹیم کا وزن ۴ ہونا چاہئے چنانچہ تجربہ سے جو ہیلیم کا اٹمی وزن معلوم کیا گیا وہ چار ہی نکلا

یہ صاف ظاہر ہے کہ جب ریڈیم میں سے ایک اٹیم ہیلیم نکل گیا۔ تو پھر وہ ریڈیم نہیں رہا۔ اور اسکا اٹمی وزن بھی کم ہو جانا چاہئے۔ عرصہ دراز تک چونکہ آلات اس قدر نازک نہ تھے کہ اس ہیلیم کے اخراج کی رفتار کو معلوم کر سکیں۔ اس لئے یہ کل شاید کسی کی سمجھ میں نہیں آسکا خصوصاً یہ کہ اس قدر قوت ایک اٹیم میں سے خارج ہو اور اٹیم (جوہر فرد) اسی طرح قائم رہے۔ موجودہ آلات نے یہ ممکن کر دیا کہ ریڈیم کی رفتار تجزیہ . . . . . . کو معلوم کر سکیں اب معلوم ہوا ہے کہ یک گرام ریڈیم ۲۵۰۰ برس میں کل ختم ہو جائے گا اور ایک نئے عنصر میں تبدیل ہو جائیگا۔

ایک گرام کوئلہ کو جلانے سے جو انرجی حاصل ہو سکے۔ اس سے . . . . ۲۵۰ گنی زیادہ انرجی اس عرصہ میں خارج کریگا۔

رتھرفورڈ کے سب سے حال کی تحقیق کے مطابق جو اس نے الکٹرون کو نائٹروجن میں گذار کر دیکھے تو معلوم کیا کہ نائٹروجن میں کچھ اٹیم ہائیڈروجن کے پائے جاتے ہیں۔ مگر تمام دوسرے کیمیادان و ماہرین طبعیات اسکو نہیں مانتے قبل اس کے کہ اپنے مضمون کو ختم کردوں یہ اور بتا دینا چاہتا ہوں اور غالباً آپ میں چند کو خیال بھی آیا کہ مولیکول میں یہ نئے اٹیم کسطرح موجود ہیں اور جبکہ ہر اٹیم کے چاروں طرف منفی الکٹرون ہیں تو دو اٹیم آپس میں کس طرح مل سکتے ہیں۔ اسکا جواب آجکل مختلف طرح سے دیا جاتا ہے۔

اور لوگ برابر کوشاں ہیں کہ کوئی متفق طریقہ اس کے سمجھانے کا نکالیں۔ لیکن جہاں تجربات

کو دخل نہیں اور صرف تصورات اور کلیوں کی بنا پر نقشہ اور ماڈل بنائے جاتے ہیں۔ وہاں ہر شخص اپنی اپنی رائے پر قائم رہتا ہے دو ائیم (جوہر فرد) ہائیڈروجن کا ملنا شکل ذیل سے ظاہر ہے۔



تدافع　　　　تجاذب

مفتی محمد عبدہٗ

تمہید | جریدہ المنار مصری نے ایک مضمون متعلق سوانح عمری حضرت مولانا شیخ محمد عبدہٗ قاضی القضاۃ مفتی اعظم مصری کا شائع کرتے ہوئے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک مفصل سوانح زندگی حضرت موصوف شائع کریگا۔

المنار لکھتا ہے کہ حضرت موصوف کے انتقال کے چالیس روز بعد انکے مریدین معتقدین شاگردان جامع ازہر مصر میں جمع ہوئے۔ اور حالات زندگی حضرت موصوف ذریعہ قصائد و مضامین بیان کئے گئے اور اسکی اتباع میں مجلس شوریٰ یعنی مصری پارلیمنٹ و طلبائے محکمہ جات مصر و نیز دیگر ممالک اسلامیہ میں بھی جو حالات زندگی بیان ہوئے ان سے ہم نے حسب ذیل مختصر اقتباس تیار کیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

خاندانی حالت | حضرت موصوف ۱۲۶۶ھ میں متوسط خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد محلہ نصر نامی قصبہ میں جو ضلع بحیرہ مصر میں سکونت پذیر تھے اور انکا سلسلہ نسب بنی عدی عرب اور آپ حضرت عمر فاروق رضؓ کی اولاد سے تھے۔ اور آپ کا خاندان بلاد مغرب سے ہجرت کرکے مصر میں آیا تھا آپ کا ابتدا نشو و نما مثل عام لڑکوں کے ہوا جو دیہات میں عام طور سے ہوا کرتے ہیں اور آپ اپنی عمر کے دس سال تک کسی مکتب میں باقاعدہ بغرض تعلیم داخل نہیں ہوئے۔ اور خود حضرت موصوف نے اپنی ابتدائی تعلیم کے جو حالات لکھے ہیں وہ حسب ذیل ہیں

ابتدائی تعلیم قرآن شریف | میں نے ابتدا میں لکھنا پڑھنا اپنے والد کے ہی مکان میں سیکھا اس کے بعد میں ایک حافظ قرآن کے گھر بغرض تعلیم قرآن شریف بٹھایا گیا اور ایک مرتبہ تو میں نے ناظرہ

قرآن شریف پڑھا پھر میں نے اُس کو دو سال میں حفظ کیا۔

جب میں ایک سال اپنا ختم کر چکا تھا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے اور لڑکے بھی اسی حافظ کے پاس آ آکر میرے مکتب میں شریک ہونے لگے اور انکا یہ خیال ہو گیا تھا کہ یہ حافظ قرآن نہایت عمدہ طور سے تعلیم دیتا ہے۔

علم تجوید | سنہ ۱۲۶۹ھ میں بعد حفظ قرآن شریف میرے والد صاحب مجھے شہر طنطا میں جہاں میرے ایک بھائی شیخ مجاہدؒ رہتے تھے ان کے پاس لے گئے تاکہ میں مدرسہ مسجد احمدی میں جو قراۃ کے لئے مشہور تھا فن تجوید یعنی علم قراۃ سیکھوں۔

ابتدا علم صرف نحو | سنہ ۱۲۷۱ھ میں میں مدرسہ میں بغرض حصول علم داخل ہوا اور میں نے شرح الکفراوی (جو کتاب اجرومیہ کی شرح ہے) اسی مسجد احمدی میں شروع کی اور ڈیڑھ سال کی مدت صرف کرنے کے بعد میں کچھ نہیں سمجھا اس کی وجہ یہ تھی کہ طریقہ تعلیم بہت ناقص تھا اور استاد صاحبان اصطلاحات نحویہ وقضیہ کو سمجھانے کی بجائے صرف رٹوایا کرتے تھے اور کچھ نہیں سمجھاتے نہ سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس ڈیڑھ سال کی مدت ضائع ہو جانے سے میں حصول علم سے مایوس ہو گیا۔ اور مدرسہ سے بھاگ کر تین ماہ تک اپنی ننھیال میں پوشیدہ رہا۔ لیکن میرے بھائی کو پتہ لگ گیا انہوں نے مجھے پکڑا اور مجھ سے مسجد احمدی طنطا میں چلنے کے لئے کہا میرے انکار کرنے پر جھگڑا ہوا میں نے کہدیا کہ مجھے کامل ناامیدی ہو چکی ہے کہ میں تعلیم نہیں حاصل کر سکتا مجھے زراعتی مشاغل ہی پسند ہیں جس طرح میرے اور عزیز زراعت میں مشغول ہیں میں بھی زراعت ہی کروں گا۔ یہانتک کہ میں نے اپنے بھائی کو منوا دیا اور گویا ہمیشہ کے لئے تعلیم سے بے نیاز ہو کر اور یہ خیال کر کے کہ اب کبھی تعلیم کا خیال بھی نہیں کروں گا۔ اپنے کپڑے اور سامان لیکر اپنے بھائی کے ہمراہ اپنے قصبہ محلہ نصر میں واپس آیا۔ سنہ ۱۲۸۲ھ میں میں نے شادی بھی کر لی۔

احساس نقائص طرز تعلیم | پس یہ اول نقش میرے دل پر طریقہ تعلیم کی خرابی کا ہوا اور یہی نقشہ ط[illegible]

تعلیم کا اندھیر میں تھا اور اسی کی یہ وجہ تھی کہ ۹۰ فیصدی طالب علم حقیقی تعلیم سے محروم رہتے تھے۔ استاد بغیر اسکا لحاظ کئے ہوئے کہ طلبہ نے سمجھ لیا یا نہیں سمجھا اس کی تعلیم جاری رکھتے تھے۔ اور جو نقص رہجاتا تھا اسکی دفعئی اور ان کو سمجھانیکی کوئی کوشش نہیں کیجاتی تھی اور یہ سمجھا جایا کرتا تھا کہ یہ طلبہ سمجھ گئے حالانکہ وہ بالکل کورے ہی ہوتے تھے جب وہ جوان ہو جاتے اور یہ خیال ہوتا کہ یہ کافی طور سے علم حاصل کر چکے ہیں وہ بالکل کورے مثل لڑکوں کے جاہل محض ہی ہوتے تھے اور اپنی اس ناقص تعلیم سے جہالت لوگوں میں پھیلاتے تھے خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو گمراہ کرتے تھے حقیقی علم کی روشنی اور عام لوگوں کے درمیان حاجل ہو کر لوگوں کو نفع علم سے محروم کرتے تھے۔

میری شادی کے چالیس روز بعد والد صاحب صبح کے وقت تشریف لائے اور مجھ سختی کے ساتھ پابند کیا کہ میں پھر طنطا بغرض حصول تعلیم جاؤں۔ اگرچہ میں نے بہت انکار کیا لیکن کامیابی نہیں ہوئی اور مجبورًا اُنکے حکم کی تعمیل میں جانا پڑا۔ میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر اسٹیشن (ابیائی البارود) کو روانہ ہوا تاکہ وہاں سے میں بذریعہ ریل گاڑی طنطا جا سکوں میرا ساتھی میرے عزیزوں میں سے تھا لیکن نہایت تندخو اور قوی آدمی تھا۔

ہم جب روانہ ہوئے تو گرمی بہت سخت اور لو چل رہی تھی دوپہر کے وقت تو یہ حالت ہو گئی کہ گویا آگ برس رہی ہے اور چلنا ناممکن سا معلوم ہوتا تھا میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ اب اس گرمی میں قیام کرنا چاہئے۔ اس وقت چلنا ممکن نہیں ہے لیکن میرے ساتھی نے نہیں مانا اور چلتے رہنے پر ہی اصرار کیا میں نے اپنے گھوڑے کو تیز بھگایا اور کہدیا میں تو قصبہ کنبہ اُدرین جہاں میرے والد صاحب کی ننہیال کے لوگ رہتے تھے جاتا ہوں اور اپنے ساتھی کو پیچھے چھوڑ دیا جب میں اس قریہ میں پہونچا تو وہاں کے نوجوان لوگ مجھے دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے اس لئے کہ میں گھوڑے کی سواری و فنون

سپاہ گری میں کافی مہارت رکھتا تھا اور انہوں نے خیال کیا کہ اب اس کے ساتھ ایک عرصہ تک خوب کھیل کھیلیں گے عصر کے قریب جب میرا ساتھی آیا تو میں نے اُس سے کہدیا کہ میرے گھوڑے کو واپس لیجاؤ میں تو آج یہاں قیام کر کے کل صبح طنطا روانہ ہو جاؤں گا اور یہی میرے والد صاحب سے کہدینا۔ لیکن میں تقریبًا پندرہ روز تک وہاں رہا یہاں میری زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب ہوا یعنی علم سے جو مجھے رغبت نہ تھی اب رغبت پیدا ہوگئی۔

علم سے رغبت اور اسکی وجہ

میرے والد کے ایک ماموں شیخ درویش نامی جنہوں نے صحرائے لی بیا کے بہت سے سفر کئے تھے اور طرابلس الغرب تک گئے تھے اور سید محمد مدنی رح کے درس میں شریک ہوئے جو مشہور شیخ ظافر رح کے والد بزرگوار تھے اور یہ شیخ ظافر عرصہ تک قسطنطنیہ میں رہے اور طریقہ شاذلیہ کو رائج کیا موطا امام مالک و کلام مجید و بعض کتب حدیث حفظ تھیں اور قرآن و حدیث خوب سمجھتے تھے اور وہیں قسطنطنیہ میں انتقال فرمایا۔

شیخ درویش سے ملاقات

صبح کے وقت شیخ صاحب موصوف میرے پاس تشریف لائے اور اُنکے پاس ایک کتاب تھی جس میں چند رسائل جو حضرت سید محمد مدنی رح نے اپنے بعض مریدوں کو مغربی باریک خط میں لکھے تھے مجھ سے شیخ صاحب نے فرمایا کہ یہ کتاب میں اُنکو سناؤں کیونکہ وہ بہت باریک لکھی ہوئی تھی اور شیخ صاحب کو ضعف بصارت کی شکایت تھی میں نے نہایت سخت لہجہ میں انکار کیا اور پڑھنے پر لعنت بھیجتے ہوئے کتاب کو جو انہوں نے میرے سامنے پڑھنے کے لئے رکھدی تھی دور پھینکدی۔ لیکن شیخ صاحب موصوف نے تبسم فرمایا اور اس انداز سے مجھ سے دوبارہ درخواست کی اور اپنے تحمل اور بُردباری کو ظاہر کیا کہ میں مجبور ہوگیا اور میں نے کتاب لیکر چند سطریں پڑھیں اس پر انہوں نے اس طرح اُس کی تفسیر بیان کی اور اس طرح اُس کو سمجھایا کہ کچھ کچھ مجھے بھی اُس کے سنانے اور سمجھنے میں لطف آیا لیکن تھوڑی دیر بعد میرے ہم عمر جوان آگئے اور انہوں نے مجھ سے گھوڑے کی

سواری نیزہ بازی اور اس نہر میں جو اس قصبہ کے پاس ہی تھی تیرنے کی خواہش کی میں کتاب پھینک کر انکے ہمراہ چلدیا اُسی روز عصر کے بعد پھر شیخ صاحب موصوف آئے اور عاجزی سے پھر مجھ سے پڑھنے کے لئے کہا جس کی میں نے تعمیل کی اور وہ تفسیر بیان کرتے رہے لیکن میں نے کھیل کی وجہ سے پھر اس کو چھوڑ دیا غرض دو روز تک یہی کیفیت رہی تیسرے روز میں نے تین گھنٹہ کامل پڑھا میں پڑھتا جاتا تھا اور شیخ صاحب تفسیر کرتے جاتے تھے۔ مجھے اب ان تین گھنٹہ میں پڑھنے سے سیری نہیں ہوئی تھی کہ شیخ صاحب نے فرمایا کہ انکے کھیت میں ان کو کچھ کام ہے وہ جاتے ہیں میں نے کتاب ان سے لے لی اور ان کی غیر حاضری میں دیکھتا رہا اور جو عبارت میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اُس پر نشان کر دیتا تھا تاکہ شیخ صاحب سے اُنکی واپسی پر حل کروں عصر کے وقت جب شیخ صاحب تشریف لائے تو جو جو مقامات میں نے نہیں سمجھے تھے اُن سے سمجھا انہوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت وضاحت سے اُن کو سمجھایا اور میرے مطالعہ علمی اور علمی مسائل کے سمجھنے کی کوشش پر اظہار خوشنودی فرمایا۔

ان رسائل میں علم تصوف علم آداب النفس و مکارم الاخلاق و پاکیزگی روح اور اُن کے حصول کے ذرائع وغیرہ پر بحث تھی۔ پانچویں روز تو جس چیز سے میں نفرت کرتا تھا وہ مجھے محبوب ترین معلوم ہونے لگی اور جملہ لہو ولعب و تفریحات سے کلی نفرت ہوگئی یعنی مطالعہ مجھے اب محبوب تھا اور کھیل کود سے نفرت تھی اور جوان لڑکے مجھے کھیل کود کی ترغیب دیتے اور تفریح کے لئے بلایا کرتے تھے اُن سے میں اس طرح بھاگنے لگا جس طرح ایک تندرست آدمی ایک متعدی مریض سے بھاگتا ہے۔

ساتویں روز میں نے شیخ موصوف سے دریافت کیا کہ آپ کا کیا مذہب ہے فرمایا کہ "اسلام" میں نے عرض کیا کہ کیا یہ سب لوگ مسلمان نہیں ہیں فرمایا کہ اگر یہ لوگ مسلمان ہوتے تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں نہ جھگڑتے اور بسبب و بے سبب خدا تعالیٰ کی جھوٹی قسمیں نہ کھاتے۔ یہ الفاظ گویا ایک شعلہ بجلی کی طرح میرے دل پر گرے اور میرے خیالات قدیمہ کو

مثل خس وخاشاک جلا ڈالا وہ خیالات یہ تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور جنت ونجات کے خدا کے یہاں سے صرف ہمیں ٹھیکہ دار۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ آپ خلوت میں یا بعد نماز کیا پڑھا کرتے ہیں اور آپ پر کیا نازل ہوا ہے انہوں نے فرمایا کہ سوائے قرآن کریم کوئی چیز ہم پر نازل نہیں ہوئی ہم ہر نماز کے بعد صرف چار رکوع قرآن مجید کے خوب سمجھکر اور غور کرکے پڑھا کرتے ہیں میں نے کہا کہ میں قرآن کریم کیسے سمجھ سکتا ہوں میں نے تو کچھ بھی نہیں پڑھا فرمایا کہ میرے ہمراہ قرآن پڑھو۔ خواہ ایک ہی جملہ ہو تم کو کافی ہوگا اور اللہ تعالیٰ اُس کی برکت سے تم کو علم بھی عطا فرمائیگا اور پھر تم قرآن شریف سمجھ بھی سکوگے اور جب تنہائی میں ہو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اس طریقہ سے کیا کرو اور طریقہ حضرت نے مجھ سے ارشاد فرمایا

آٹھویں روز میں نے حسب الہدایت شیخ موصوف اس پر عمل کرنا شروع کیا۔

چند روز میں میں نے اپنے میں ایک تغیر عظیم محسوس کیا۔ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ گویا میری روح عالم بالا کی طرف اُڑتی ہے اور یہ عالم باوجود اسکی وسعت وبڑائی میری نظروں میں تنگ وچھوٹا معلوم ہونے لگا تھا مجھے عرفان کا ادراک ہونے لگا اور میری روح عالم قدس کیطرف اڑنے لگی سوائے اس ایک غم کے جملہ غم والم میرے قلب سے محو ہوگئے وہ غم صرف یہ تھا کہ کاش میں بھی کامل المعرفت ہوتا اور میرا نفس نفس مطمئنہ ہوتا اور یہ سوائے شیخ موصوف کی توجہ وصحبت کے کسی طرح حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔ جنہوں نے چند ہی دن کی توجہ سے مجھے قعر جہالت سے نکالا معراج ترقی پر ڈالدیا۔ اور معرفت کے لئے راستہ صاف کردیا۔ انہوں نے گویا میرے لئے جہالت کی تقلید کے بند توڑ کر کامل توحید کی شاہراہ اعظم کی طرف ہدایت کردی۔ یہ سب کچھ شیخ موصوف کی برکت اور فیض کا ہی اثر ہے جو میرے لئے خضر راہ کنیسا درین ضلع بحیرہ میں میرے اعزا میں ثابت ہوئے۔ اگر خاکدان دنیا میں سعادت کوئی چیز ہے تو حضرت شیخ موصوف کی صحبت ہی اس سعادت کی کنجی ہے جو مجھے ملی اور میری روح پر وہ تمام فطرت انسانی کے راز افشا ہوگئے جواب تک مجھ سے پوشیدہ تھے۔

پندرہویں روز ایک شخص محلہ نصر میرے قصبہ کا رہنے والا مجھ سے ملا اور اس نے مجھے اطلاع کی کہ میری والدہ میری ملاقات کے خیال سے طنطا گئی ہیں۔ میں نے یہ خیال کرکے کہ یہ شخص میرے والد سے کہدیگا کہ بجائے طنطا کے ابھی تک کنبہ اذرین میں ہی مقیم ہوں اپنے والد صاحب کے غصہ سے ڈر کر دوسرے روز صبح طنطا روانہ ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ والد صاحب کے سامنے اگر کنبہ اذرین میں قیام کی ہزار دلیلیں پیش کیجائیں تو ایک بھی کام نہیں آئے گی۔

طنطا کو دوبارہ روانگی | میں طنطا گیا اس وقت تعلیمی سال سے اختتام کا زمانہ قریب تھا یعنی جمادی الآخر ۱۳۱۲ھ میں پہونچا اس وقت ایک عجیب اتفاق یہ ہوا تھا کہ ایک استاد صاحب کی صاحبزادی کا اسی زمانہ میں انتقال ہو چکا تھا اور انہوں نے بسبب غم والم و دیگر مصروفیتوں کے کتاب شرح زرقانی جوان سے متعلق تھی پوری نہیں کرائی تھی میں اس میں شریک ہوا اور شرح خالد جو اجرومیہ پر ہے اس میں بھی شریک ہوا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب میں ہر دو کو خوب سمجھتا تھا بلکہ بعض بعض طلبہ مجھ سے سمجھا کرتے تھے۔

ایک مجذوب کی ملاقات | ماہ رجب کی کسی تاریخ میں جبکہ میں شرح زرقانی اپنے ہمراہی طلبہ کو سمجھا رہا تھا میں نے اپنے سامنے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کو لوگ عموماً مجذوب کہتے اور سمجھتے ہیں میں نے جب سر اٹھایا تو مجھ سے کہا کہ اس کے کیا معنی ہوئے" ما احلیٰ حلوی مصر البضار"، مصر کا حلوے بھی کیسا خوش ذائقہ ہے میں نے کہا کہ وہ کہاں ہے کیا تمہارے پاس ہے، مجذوب نے کہا سبحان اللہ۔ جو ئندہ یابندہ۔ یہ کہکر چلا گیا میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے الہام کیا ہے کہ میں بجائے طنطا کے مصر جاکر تعلیم حاصل کروں۔

جامع ازہر میں داخلہ بطور طالب علم | اس سنہ کے نصف شوال میں میں جامع ازہر میں داخل ہو گیا۔ اور طلب علم میں اس طرح کوشش شروع کی۔ لوگوں سے اور دوسرے طلبہ سے دور رہتا۔ بلاضرورت کسی سے بات نہ کرتا اور اگر اتفاقاً کہیں بلاضرورت مجھے بولنا پڑتا تو توبہ کرتا۔ اور تعلیمی سال کے اختتام پر میں ہمیشہ دو ماہ کی تعطیل میں اپنے گھر محلہ نصر جایا کرتا تھا یعنی نصف

شعبان سے نصف شوال تک میں اپنے گھر رہا کرتا اور اس قریہ میں جہاں میری ملاقات میرے والد کے ماموں شیخ درویش سے ہوئی تھی آتے جاتے قیام کرتا اور جب تک میں اس قصبہ میں رہتا شیخ صاحب موصوف مجھے قرآن شریف پڑھایا اور سمجھایا کرتے اور ہر سال مجھ سے دریافت فرمایا کرتے کیا پڑھا میں نے جو کچھ پڑھا ہوتا ظاہر کر دیتا بس فرمایا کرتے منطق، فلسفہ، حساب، ہندسہ نہیں پڑھا۔ اور بعض بعض علم کے بابت بھی دریافت فرماتے اور جب میں یہ کہتا کہ یہ علوم تو ازہر میں نہیں پڑھائے جاتے تو فرماتے کہ طالب علم تو کسی جگہ بھی تحصیل علم سے عاجز نہیں ہوا کرتے۔ جب میں قاہرہ واپس لوٹا کرتا تو ان علوم کے حصول کی بھی کوشش کرتا کہیں مجھے کوئی مل جایا کرتا کبھی میں کامیاب نہیں ہوتا تھا یہاں تک کہ ۱۲۸۶ھ میں مرحوم سید جمال الدین افغانی رح مصر میں تشریف لائے۔

سید جمال الدین افغانی سے ملاقات | میں سید صاحب مرحوم کے ہمراہ ابتدائے ماہ محرم ۱۲۸۸ھ سے ہوا اور میں نے علم ریاضی و فلسفہ و علم الکلام کی بعض کتابیں ان سے پڑھیں اکثر علما ازہر و اکثر طلبہ سید صاحب کے مذہب کے خلاف رائے رکھتے تھے اور انکا خیال تھا کہ یہ علوم اسلامیہ عقائد کے مضبوط بنیادوں کو دل سے ہلا دیتے ہیں۔ اور نفس کو گمراہی کی طرف رہبری کرتے ہیں جس سے دین و دنیا دونوں خراب ہو جایا کرتے ہیں۔ اور میں جب اپنے گھر جایا کرتا تو راستہ میں حضرت شیخ درویش سے ملاقات کرتا اور یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش کیا کرتا۔ وہ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے کوئی علم کوئی حکمت اس کے علم و حکمت سے زیادہ نہیں ہے۔ جو شخص علم کا دشمن ہے وہ جاہل ہے اور جو حکمت کا دشمن ہے وہ احمق ہے۔ خدائے تعالیٰ کی قربت علم و حکمت سے زیادہ کسی اور چیز سے میسر نہیں آتی مگر خدا کے نزدیک بے شک ایک علم سب سے زیادہ قابل ملامت اور اس کے غصہ کا سبب ہے۔ اور اس علم سے جہالت خدا تعالیٰ کو پسند ہے وہ علم حقیقت میں علم نہیں بلکہ لوگوں نے اسکا نام علم رکھا ہے۔ وہ سحر اور شعبدہ بازی ہے جو صرف انسان کو نقصان پہنچانے

کے لئے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہاںتک ابتدائی تعلیم کا حال خود حضرت مفتی اعظم نے اپنے مرض موت کی سختی سے قبل لکھا تھا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ آپ تین سال تک ازہر میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور شروع شروع میں شیخ محمد تسلوتے سے استفادہ علوم عقلیہ و منطق کا کیا لیکن کسی طرح نفس کو حصول علم سے سیری نہیں ہوتی تھی اور اکثر شکوک باقی رہنے لگے تھے۔ شیخ حسن الطویل ازہر میں ایک بہت بڑے ماہر علم منطق تھے پھر ان سے تلمذ حاصل کیا اور ازہر کے کتب خانہ کی بہترین کتابیں دیکھیں لیکن شوق علم کی سیری کسی طرح نہیں ہوتی تھی اور روز بروز جذبہ حصول زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ اور شکوک جو حل نہیں ہوتے تھے بڑھتے رہتے تھے یہاںتک کہ ایک روز شیخ حسن طویل نے مجھ سے فرمایا کہ رواق شوام کے ایک مجاور کی زبانی معلوم ہوا کہ سرائے خلیل میں ایک نہایت زبردست افغانی عالم سید جمال الدین نامی تشریف لاکر مقیم ہیں۔ ان سے ملنا چاہئے چنانچہ ہم دونوں انکی ملاقات کی غرض سے گئے اور شام کے کھانے کی دعوت دی لیکن انہوں نے عذر کیا ہم نے چند آیات قرآنی کی تفسیر معلوم کرنا چاہی اور اسکی بابت صوفیہ و اہل کلام کا مذہب معلوم کرنا چاہا۔ سید صاحب نے اس وضاحت سے جوابات دئے کہ مفتی اعظم کو بہت ہی پسند آئے اور اُن کی محبت دل میں جاگزیں ہوگئی۔

جامع ازہر سے حصول سند حسن پاشا عاصم نے جو حالات زندگی حضرت مفتی اعظم مرحوم کے بیان فرمائے اس سے معلوم ہوا کہ ۱۲۹۴ھ میں صاحب مرحوم نے اپنے آپ کو بغرض امتحان و حصول سند علماء ازہر کے سامنے پیش کیا باوجودیکہ آپ کے ساتھ غیر معمولی بعض بعض اساتذہ نے بوجہ استفادہ از سید جمال الدین افغانی سختی کی لیکن آپ کو سند علم دینا پڑی اب تک حصول علم و تربیت نفس کا زمانہ تھا۔ اب سے مرحوم کا زمانہ عمل و اصلاح کا شروع ہوا۔ آپ علم توحید و منطق کا درس دینے لگے اور اکثر لوگ آپ کے درس میں شریک ہوئے اور استفادہ حاصل فرمایا۔ آپ طرز جدید کے مطابق تعلیم دیتے تھے کبھی کبھی رات کے وقت کسی علمی مباحثہ

و مناظرہ میں تمام تمام رات گزر جاتی اور صبح ہو جایا کرتی تھی یہ وقت حقیقت میں علم کے کمال رونق کا ازہر میں تھا اور جدید انکشافات علمی اور نئے اسلوب کے ساتھ بیان و تفسیر ہونے لگے تھے۔

جامع ازہر میں مدرسی | بعدہٗ آپ باقاعدہ مدرس جامع ازہر کے ہو گئے لیکن وہ سید جمال الدین کے دست بازو بنے رہے اور ان سے برابر استفادہ حاصل کرتے رہے۔ سید جمال الدین کی غرض یہ تھی کہ عالم اسلامی کی کسی طرح اصلاح ہو جائے اور وہ حکومت سے امداد لینا چاہتے تھے حضرت محمد عبدہ آپ کے اس کام میں معین اول کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ کو امید تھی کہ خدیو توفیق پاشا کے برسر حکومت آنے پر یہ غرض آپ کو حاصل ہو جائے گی اس لئے کہ توفیق پاشا انکی غرض میں شامل اور انکے معاون تھے ان ہی ایام میں اسمٰعیل پاشا خدیویت سے معزول ہوئے اور توفیق پاشا حسب امید خدیو ہوئے لیکن بجائے امداد کرنیکے انہوں نے سید جمال الدین کو جلا وطن کر دیا۔ اور مفتی اعظم مرحوم اپنے جائے پیدائش قصبہ محلہ نصر میں چلے گئے یہ واقعہ رمضان ۱۲۹۶ھ کا ہے۔

بطرز جدید درس دینا شروع کیا | مرحوم مفتی اعظم اس سے اول علم تاریخ و علم لغت عربیہ کے جامع ازہر میں مدرس تھے انہوں نے طریقہ جدیدہ کے مطابق تعلیم دینا شروع کی۔ اور اس طریقہ کے مطابق اس سے اول کسی نے تعلیم نہیں دی تھی۔ اور مقدمہ ابن خلدون پڑھانا شروع کر دیا تھا اور اس استاد اعظم و مجتہد زمانہ علم الاجتماع و علم تمدن کے ہی مسلک پر درس دینا شروع کیا اگرچہ امتداد زمانہ سے اسکا طریقہ متروک ہو گیا تھا لیکن اس جدید طرز سے مفتی صاحب کو پھر علم کا احیاء مقصود تھا

سرکاری گزٹ کی ایڈیٹری | ۱۲۹۷ھ میں صاحب الدولہ ریاض پاشا نے سرکاری گزٹ کا آپکو محرر مقرر کیا اور اس کے بعد اڈیٹر کر دیا۔ اور آپ سے خواہش کی کہ ایک قانون مطبوعات کے لئے بنایا جائے چنانچہ آپ نے اس کی تعمیل کی اس کے احکامات یہ تھے کہ حکومت پر ضروری ہے کہ وہ اپنے جملہ احکامات و اعلانات شائع کر دے اور ایڈیٹر گورنمنٹ گزٹ کو حق

ہے۔ کہ اگر کوئی قابل تنقید بات ہو تو اس کی وہ تنقید کرے اور جو اخبارات ملک مصر میں شائع ہوتے ہیں انکا محاسبہ بھی کرے اگر وہ چاہے تو کسی اخبار کو ہمیشہ کے لئے بند بھی کر سکتا ہے۔ اس گورنمنٹ گزٹ یا جریدہ کے اقسام میں ادب تدابیر ملکی یعنی سیاست امور نافعہ فی الاخلاق وعادات بھی داخل تھے جس کو خود ایڈیٹر لکھنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا تھا۔ اس قانون کے ذریعہ مرحوم کی حیثیت ایک عام نگرانی کی سی ہوگئی۔ اور سچ یہ ہے کہ آپ نے خوب ہی اسکا حق ادا کیا آپ کی باضابطہ صحیح تنقید کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بڑے ذمہ دار عہدہ دار مواخذہ حکومت سے خوف کھانے لگے۔ یہ صورت اسی وقت میں ہو سکتی ہے جبکہ تنقید حکومت کے زاویہ نگاہ سے نہ کیجائے۔ ساتھ ہی اس کے یہ بھی تھا کہ اگر کسی اخبار نے کسی شخص کو بدنام کرنے کے لئے کچھ لکھا تو سرکاری گزٹ نے حکومت سے اسکی تحقیقات کا مطالبہ کیا اگر بعد تحقیقات وہ تحریر غلط ثابت ہوئی تو اس اخبار کو بھی کافی سزا دی جاتی تھی یہانتک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند بھی کر دیا جاتا تھا۔ خاص طور سے ادب اور حسن عبارت کا بھی لحاظ تھا۔ غلط عبارت لکھنے والے اخبارات بھی سزا سے نہیں بچا کرتے تھے جس کی وجہ سے صحیح علم ادب سے ملک وقوم مستفید ہو رہی تھی اس کوشش کا یہ نتیجہ ہے کہ آج مصر کے اخبارات مہذب ترین اخبارات میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ اس میں سید جمال الدین افغانی اور اُنکے اور بھی بہت سے معاونین کی اعانت کو بھی دخل ہے۔ اسکا یہ بھی اثر ہوا کہ حکومت نے مجبور ہو کر مجلس نظارۃ المعارف قایم کی جس کی نگرانی میں تعلیم ملک کی دیدی (گویا وزارت تعلیمات کی کمیٹی) مرحوم کی اس تنقید کیوجہ سے لوگوں میں انکے خلاف حسد کا مادہ پیدا ہوا۔ اور حکومت نے بھی ان اصلاحات کو ملتوی کر دیا جو ریاض پاشا کی بدولت ملک میں نافذ ہوگئی تھیں۔

(باقی)

تین سوال

مصنفہ کاؤنٹ لیو ٹالسٹائے

سنہ ۱۹۰۳ء

ایک بادشاہ کو ایک دفعہ خیال آیا کہ اگر اس کو معلوم ہوجائے کہ اُس کام کے لئے جو اسے درپیش ہے، بہترین وقت کونسا ہے، بہترین مشورہ دینے والے اُس کے لئے کون لوگ ہو سکتے ہیں اور اُسے پرہیز کن لوگوں سے واجب ہے۔ مزید براں اگر اُسے یہ بھی علم ہو کہ اہم ترین کام اُس کے لئے کیا کیا ہیں، تو وہ کسی کام میں بھی جس کا وہ بیڑا اُٹھائے، ناکام نہ ہوا کرے۔

اور جب اُسے یہ خیال آیا، تو اُس نے اپنی سلطنت میں اعلان کر دیا کہ جو شخص اس کو سکھلائے کہ ہر ایک کام کے لئے موزوں ترین وقت کونسا ہو سکتا ہے، سب سے زیادہ مفید لوگ کونسے ہیں، اور اہم ترین معاملات کے معلوم کرنیکا کیا طریقہ ہے اسے وہ ایک بہت بیش بہا انعام دیگا۔

عالم اور فاضل شخص ہر طرف سے بادشاہ کے پاس آئے لیکن سب نے بادشاہ کے سوالوں کے مختلف جواب دئے۔

پہلے سوال کے جواب میں بعض نے کہا کہ ہر ایک کام کے لئے موزون وقت جاننے کے لئے، انسان کو چاہئے کہ مستقبل کے ایام، اور ماہ وسال کا ایک دستور العمل پہلے سے تیار کر رکھے اور ہمیشہ پابندی کے ساتھ اُس کے مطابق کام کرے، انہوں نے کہا کہ ہر ایک کام اپنے موزوں ترین وقت پر اسی طریقہ سے سرانجام پا سکتا ہے، بعض کا خیال تھا

کہ ہر ایک معاملہ کے لئے پہلے ہی سے فیصلہ کر رکھنا کہ اس کے لئے موزوں ترین وقت کونسا ہوگا ناممکن ہے، البتہ انسان کو چاہئے کہ اپنے آپ کو سستی اور کھیل کود میں نہ پڑنے دے، جو کچھ ہو رہا ہو اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہا کرے، اور پھر وہ کام جو سب سے ضروری ہو، کرے اور بعض کا خیال یہ تھا کہ بادشاہ چاہے کتنا ہی بیدار مغز ہو ایک آدمی کے لئے ممکن نہیں کہ ہر امر کے لئے موزون ترین وقت کا تن تنہا فیصلہ کر سکے اس لئے یہ ضروری ہے کہ عقلمندوں کی ایک مجلس مقرر کیجائے، جو ہر امر کے لئے موزوں وقت کا فیصلہ کرے،

لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کا خیال تھا کہ بعض امور ایسے ہوتے ہیں جن کے فیصلہ کے لئے ایک مجلس کے انعقاد کا انتظار نہیں کیا جا سکتا، اور اُن کے متعلق فوری طور پر فیصلہ کرنا ہوتا ہے - کہ انکا بیڑا اٹھایا جائے یا نہ اٹھایا جائے، لیکن اس فیصلہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ انسان کو پہلے ہی سے معلوم ہو کہ کیا کیا واقعات پیش آنے والے ہیں۔ یہ علم محض جادوگروں کو ہوتا ہے، اس لئے ہر ایک کام کے لئے موزوں وقت کا انتخاب کرنے کے لئے جادوگروں کی رائے لینا ضروری ہے۔ دوسرے سوال کا جواب بھی بالکل اسی طرح مختلف تھا۔ بعض نے کہا کہ جن لوگوں کی بادشاہ کو سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ مشیر ہیں، بعض نے کہا کہ زاہد۔ بعضوں نے طبیبوں کے حق میں رائے دی بعض نے جنگ آزمودہ سپاہیوں کے حق میں۔

تیسرے سوال یعنی اس کا کہ اہم ترین مشغلہ کونسا ہو سکتا ہے، بعض نے تو جواب دیا "سائنس"، بعض نے کہا کہ "جنگ میں مہارت" اور بعض نے کہا "خدا کی پرستش"۔

چونکہ جواب بہت مختلف تھے، بادشاہ کو کسی سے اطمینان نہ ہوا۔ اور اُس نے انعام کسی کو نہیں دیا۔ البتہ صحیح جواب پانیکی خواہش باقی رہی اُس نے ایک جوگی کی جو اپنی عقلمندی کی وجہ سے بہت مشہور تھا رائے لینے کا فیصلہ کیا۔

جوگی ایک جنگل میں رہتا تھا جہاں سے وہ کبھی نہیں ہٹتا تھا۔ اور نہ وہ غریب لوگوں کے سوا کسی سے ملتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی سادہ کپڑے پہن لئے، اور جوگی کی جھونپڑی تک پہونچنے سے پہلے اپنے گھوڑے سے اُتر آیا اور اپنے باڈی گارڈ کو پیچھے چھوڑ کر تنہا آگے گیا۔ جب بادشاہ جوگی کے ہاں پہونچا تو جوگی اپنی جھونپڑی کے آگے زمین کھود رہا تھا۔ اس نے بادشاہ کو سلام کیا اور کہا "آؤ بابا بیٹھو" یہ کہہ کر خود زمین کھودنے لگا۔ وہ بہت ضعیف اور کمزور تھا۔ وہ کدال کو زمین میں گاڑ کے مٹی کو ہلاتا جاتا تھا۔ اور تھکن کے مارے ہانپ رہا تھا۔

بادشاہ اُس کے قریب جاکر کہنے لگا، اے عقلمند جوگی، میں تم سے تین سوال پوچھنے آیا ہوں۔ میں یہ کیونکر سیکھ سکتا ہوں کہ ہر ایک کام کو موزوں ترین وقت پر کروں، وہ لوگ کونسے ہیں جن کی مجھے سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جن کی طرف مجھے زیادہ توجہ ہونا چاہیئے، اور کونسے معاملات اہم ترین ہیں جنہیں سب سے پہلے انجام دینا چاہتے

جوگی نے بادشاہ کی بات سنی لیکن جواب کچھ نہ دیا، اس نے اپنے ہاتھ پر تھوکا اور پھر زمین کھودنے لگا۔

"تم تھک گئے ہوگے،" بادشاہ نے کہا "کدال مجھکو دیدو اور اپنی جگہ کچھ دیر تک مجھے کام کرنے دو"

جوگی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور کدال بادشاہ کو دے کر خود زمین پر بیٹھ گیا۔ جب بادشاہ دو کیاریاں کھود چکا تو وہ ذرا ٹھہر گیا اور اُس نے اپنے سوال دہرائے جوگی نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اُٹھا اور کدال کے لئے اپنا ہاتھ بڑھا کر کہنے لگا۔

"اب تم ذرا آرام کرو۔ اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے کام کرنے دو۔"

لیکن بادشاہ نے کدال اُسے نہ دی خود ہی کھودتا گیا، ایک گھنٹہ اسی طرح گزر گیا پھر دوسرا گھنٹہ بھی، سورج درختوں کے پیچھے غروب ہونے لگا تو آخر بادشاہ نے کدال زمین

میں ڈال دی اور کہا۔

"اے حکیم میں تیرے پاس اپنے سوالوں کا جواب لینے کے لئے آیا تھا اگر تو مجھ کو کوئی جواب نہیں دے سکتا تو صاف کہہ دے تاکہ میں گھر چلا جاؤں"

جوگی نے کہا "وہ کوئی دوڑتا چلا آ رہا ہے دیکھیں تو وہ کون ہے"

بادشاہ نے مڑ کر دیکھا تو ایک ڈاڑھی والا شخص بھاگتا ہوا جنگل کی طرف سے آ رہا تھا وہ دونوں ہاتھ سے پیٹ پکڑے تھا۔ اور انکے نیچے سے خون بہہ رہا تھا جب وہ بادشاہ کے قریب پہونچا تو بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اور کمزوری کی شدت سے سسکنے لگا۔ جوگی اور بادشاہ نے مل کر اس کے کپڑوں کے بٹن وغیرہ کھولے۔ اس کے پیٹ میں ایک بہت بڑا کاری زخم تھا۔ بادشاہ نے اس کو حتی الامکان بہترین طریقہ سے دھویا۔ اور اپنے رومال اور جوگی کے ایک تولیہ کو ملا کر اس میں پٹی باندھی۔ لیکن خون برابر جاری رہا اس لئے بادشاہ گرم گرم خون سے آلودہ پٹیاں بار بار کھولتا رہا اور زخم کو دھو دھو کر نئے سرے سے پٹیاں باندھتا رہا۔ آخر جب خون تھم گیا۔ تو آدمی کو ہوش آیا اور اس نے پانی مانگا۔ بادشاہ نے اسے تازہ پانی لاکر دیا۔ اتنی دیر میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور ٹھنڈک ہو چکی تھی۔ اس لئے بادشاہ نے جوگی کی مدد سے آدمی کو جھونپڑی کے اندر لے لیا اور اس کو ایک بستر پر لٹایا۔ بستر پر لیٹ کر اس شخص نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور خاموش ہو گیا۔ لیکن بادشاہ پیدل چلنے کی وجہ سے اور اس کام کی وجہ سے جس میں وہ دن بھر مشغول رہا تھا اسقدر تھک چکا تھا کہ وہ دہلیز ہی پر گر کر لیٹ گیا اور وہیں اس کو نیند آ گئی۔ سویرے جب وہ جاگا تو کچھ دیر تک تو اُسے معلوم ہی نہ ہوا کہ میں کہاں ہوں اور یہ شخص جو بستر پر لیٹا ہے اور ٹکٹکی باندھے اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھ کو دیکھ رہا ہے کون ہے۔

"میرا قصور معاف کرو" ڈاڑھی والے نے کمزور سی آواز میں کہا، جب اُس نے دیکھا کہ بادشاہ جاگ اٹھا ہے اور اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔

بادشاہ نے کہا "میں تمہیں جانتا نہیں اور نہ تم نے کوئی قصور کیا ہے جو کہ معافی کی ضرورت ہو"

اس نے کہا "تم مجھے نہیں جانتے لیکن میں تمہیں جانتا ہوں، میں تمہارا وہ دشمن ہوں جس نے قسم کھائی تھی کہ تم سے اس بات کا بدلہ لوں گا. میرے بھائی کو پھانسی کی سزا دی اور اس کی جائداد ضبط کر لی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم جوگی سے ملنے اکیلے آئے ہو اور میں نے تصد کر لیا تھا کہ جب تم واپس ہو گے تو تمہیں راہ میں مار ڈالوں گا۔ لیکن سارا دن گزر گیا اور تم نہ آئے۔ اس لئے میں اپنی کمینگاہ سے نکل آیا تاکہ تمہیں تلاش کروں۔ اس تلاش میں میں تمہارے باڈی گارڈ تک پہونچ گیا، اور انہوں نے مجھے پہچان لیا اور مجھے زخمی کر دیا۔ میں اُن سے تو بچکر بھاگ آیا لیکن اگر تم میری مرہم پٹی نہ کرتے تو اتنا خون بہتا کہ میں مرجاتا۔ میں تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا اور تم نے میری جان بچالی۔ اب اگر میں زندہ رہا اور تمہاری خواہش ہوئی تو میں تمہارا فرمانبردار غلام بن کر رہوں گا اور اپنے بیٹوں کو بھی تلقین کروں گا کہ ایسا ہی کریں۔ میرا قصور معاف کرو"

بادشاہ کو بہت خوشی تھی کہ دشمن کے ساتھ اتنی آسانی سے صلح ہوگئی بلکہ وہ دوست بن گیا. اُس نے اُسکا قصور معاف کیا اور وعدہ کیا کہ وہ اپنے نوکروں اور اپنے خاص طبیب کو اس کے علاج کے لئے بھیجے گا۔ اور اس کی جائداد بھی اس کو واپس دیدیگا۔

زخمی سے اجازت لیکر بادشاہ باہر آیا اور جوگی کو ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا۔ واپسی سے پہلے وہ چاہتا تھا کہ جوگی سے اپنے سوالوں کے جواب کی پھر درخواست کرے جوگی دوزانو بیٹھا تھا اور جو کیاریاں کل کھودی گئی تھیں ان میں بیج بو رہا تھا۔

بادشاہ اس کے قریب گیا۔ اور کہنے لگا۔

"آخری بار، اے حکیم میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے سوالوں کا جواب"

جوگی بادشاہ کی طرف دیکھکر جو اُس کے سامنے کھڑا تھا کہنے لگا "تمہارے سوالوں کا جواب تو تم کو مل چکا ہے"۔

بادشاہ نے پوچھا یہ کیسے تمہارا کیا مطلب ہے "؟ جوگی نے جواب دیا" کیا تم دیکھتے نہیں۔ اگر تمہیں کل میری کمزوری پر رحم نہ آتا اور تم یہ کیاریاں نہ کھودتے بلکہ واپس چلے جاتے تو یہ شخص تم پر حملہ کرتا اور تم پچھتاتے کہ تم میرے ہی پاس کیوں نہ ٹھیرے پس اہم ترین وقت وہی تھا جب تم کیاریاں کھود رہے تھے، اور اہم ترین آدمی اُس وقت میں تھا اور میرے ساتھ بھلائی کرنا تمہارا اہم ترین کام۔ اُس کے بعد جب وہ شخص بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا تو اہم ترین وقت وہ تھا جب تم اس کی خدمت میں مشغول تھے کیونکہ اگر تم اس کے زخم نہ باندھتے تو وہ تمہارے ساتھ صلح کئے بغیر مرجاتا۔ وہی اس وقت اہم ترین آدمی تھا اور اُس کی خدمت سب سے ضروری کام تھا۔ یہ یاد رکھو کہ سب سے اہم وقت ایک ہی ہوتا ہے، اور وہ موجودہ وقت ہے یعنی وہ گھڑی جو اب گزر رہی۔ کیونکہ صرف اسی وقت ہم کو اختیار حاصل ہوتا ہے کہ جو کچھ کرنا چاہیں کریں۔ سب سے اہم شخص وہ ہوتا ہے جو تمہارے پاس ہو، کیونکہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ اس کو اب تمہارے بعد کسی کے ساتھ بات بھی کرنی نصیب ہوگی کہ نہیں، اور سب سے ضروری کام یہ ہوتا ہے کہ اُس کے ساتھ بھلائی کیجائے، کیونکہ انسان اسی لئے پیدا کیا گیا ہے۔

یاس اور امید

مضمون کا عنوان دیکھ کر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یاس عظیم آبادی اور امید امیٹھوی کا مقابلہ
کرنا منظور ہے۔ یہ بحث بھی بجائے خود دلچسپ یا بہ قول محققین دل چسپاں ہے لیکن ہم اس پر بحث
کرنا خلاف مصلحت سمجھتے ہیں کیونکہ ایک تو امید خدا جانے کسی شاعر کا تخلص ہو یا نہ ہو اور اگر
ہو بھی تو خدا جانے ان حضرات کا وطن امیٹھی ہو یا چڑیا کوٹ یا کوئی اور اسی طرح کا دیر ہستم نام والا
قصبہ۔ دوسرے یاس کا کسی سے مقابلہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کہ مبادا وہ کوئی "منقولت"
لکھ کر ہمارے نام سے معنون کر دیں۔ ہمارا مقصد اس وقت یاس سے وہ قلبی کیفیت ہے جس
کی نسبت سے بغیر کسی مناسبت کے حضرت عظیم آبادی نے اپنا تخلص یاس رکھا ہے اور امید
سے وہ جذبہ جو حضرت امید امیٹھوی کے لئے بہ شرطیکہ وہ وجود رکھتے ہوں وجہ تخلص ہے
یعنی ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی زندگی میں جسے اصطلاح میں غلامی یا
ہندو مسلم فساد بھی کہتے ہیں یاس اور امید کی کیفیتوں کا کیا درجہ ہے۔ ہمارے یہاں خدا جانے
غدر کے بعد سے یہ حالت ہے یا ہمیشہ سے کہ جن حضرات کے چہرے پر محرم اور رمضان
کا مشترکہ قبضہ ہو یا جس کی زبان پر "مبادا ازیں بتر گردد" یا "چشم من بسیار ازیں خواب
پریشاں دیدہ است" رہا کرتا ہو۔ انہیں ضرور روحانیت یا حکمت لاحق ہو گئی ہے۔ ہم
تو سمجھتے ہیں کہ یہ صورت غدر کے بعد سے پیدا ہو گئی ہے۔ اس زمانے میں جو نیک یا عقلمند
لوگ ہوں گے وہ بیچارے "غم روزگار" یا "شہر کے اندیشے" سے دوسروں سے
زیادہ ملول اور متفکر رہتے ہوں گے کیا عجب ہے کہ انہیں دیکھتے دیکھتے لوگ یہ سمجھنے لگے
ہوں کہ ہر شخص جس کے منہ پر نور کی جگہ وہ دوسری چیز برستی ہو اور جو ہمیشہ فال بد زبان سے
نکالتا ہو بڑا پرہیزگار اور دانشمند ہے۔

ذرا سا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ پاس مشرب لوگ ہرگز عقلمند اور راسخ العقیدہ نہیں ہو سکتے بلکہ اکثر بدھو اور ڈھیل یقین ہوتے ہیں ۔ ڈھیل یقین پر علاوہ دلچسپیاں والے محققین کے دوسروں کو بھی اعتراض ہے مگر ہمارے پاس ملا دوپیازہ کی اینٹ البحر کی سند موجود ہے) کیونکہ اگر ان میں عقل ہوتی تو سمجھتے کہ معیشت وسیع ریاستوں کے انگریز ملازموں کی طرح پالنے سے اور بڑھتی ہے اور مایوسی ہندوستان کی موجودہ تعلیم کی طرح رفتہ رفتہ قوت عمل، قوت ارادہ اور قوت فکر کو بیکار کر دیتی ہے ۔ اسی طرح اگر ان میں روحانیت ہوتی اور ان کا عقیدہ پکا ہوتا تو سمجھتے کہ اگر انسان اپنی سی کوشش کرے تو خدا ضرور اُسے اس کا پھل دیتا ہے ۔

پاس مشربوں اور محرمی شکل والوں میں جو شباہت دینداروں اور عقلمندوں سے ہے وہ بالکل سرسری ہے بقول شاعر

نہ ہر کہ ہیٹ بہ سر کرد افسری داند ۔ نہ ہر کہ پیش کمیشن رود سری داند

اور غور سے دیکھئے تو کچھ ایسی مشابہت بھی نہیں ہے بظاہر دیندار اور حکیم کی طرح پاس مشرب کے چہرے پر بھی سکون، اطمینان اور غور کے آثار پائے جاتے ہیں لیکن اُس سکون و اطمینان میں جو گھوڑے کو دوڑ میں جیتنے کے بعد ہوتا ہے اور اُس میں جو گدھے کو اس لئے ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دوڑنے ہی کو خیال است و محال است و جنوں سمجھتا ہے بہت فرق ہے سچے سکون و اطمینان سے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس معیار پر ہمارے گدھے صاحب کا سکون جس میں ہزاروں دولتیاں نہاں ہیں کسی طرح پورا نہیں اترتا ۔ اسی طرح چہرے پر غور کی علامت بھی اس کی دلیل نہیں کہ ذہن واقعی غور کر رہا ہے جو آدمی بالکل خالی الذہن ہو وہ بھی اگر کہنی کرسی کے بازو پر ٹیک کر اور چاہ زنخدان یا سراب ریش کا بوجھ ایک ہتھیلی پر سنبھال کر بیٹھ جائے وہ بھی غور کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے جانوروں میں اگر آپ کو اس دھوکے کی زندہ مثال دیکھنا ہو تو بھینس کو دیکھئے ۔ تجربہ کے طور پر آپ کبھی اس کے سامنے

بین بجائیے یا مقالہ افتتاحیہ پڑھے تو آپ دیکھیں گے کہ وہ اکثر جلسوں کے صدر یا نائب صدر کی طرح کمال غور سے ایک ایک حرف سنتی ہوئی معلوم ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی گردن کی خفیف جنبش سے اظہار استحسان بھی کرتی ہے لیکن کیا وہ واقعی غور کرتی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لئے ہر شخص کو خفش مرحوم اور انکی بکری کا قصہ پڑھنا چاہئے اور اگر پھر بھی تسکین نہ ہو تو اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہئے۔

مختصر یہ کہ یاس مشربی کو دینداری یا دانشمندی کے ہم معنی سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہے جس دل میں حکمت و معرفت ہوگی اس میں یاس کی گنجایش ہی نہیں ہوسکتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں یہ بات کسی کی سمجھ ہی میں نہیں لوگ بس اُسی کے قائل ہوتے ہیں جو یہ کہے کہ اس سال پانی نہیں برسے گا یا طاعون یا ہیضہ یا سائمن کمیشن سے چھٹکارا پانا مشکل ہے یا جامعہ ملیہ بند ہوجائیگی یا ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہوگا۔ ہم ان لوگوں کو سمجھاتے سمجھاتے عاجز آگئے مگر انکے سنبھلنے کی کوئی امید نہیں بلکہ

من ز وضع زمانہ در فکرم   کہ مبادا ازیں بتر گردد

از تعطیل زدہ "رپورٹر"

"وہ"

جناب سعید رضا صاحب بی اے سابق متعلم جامعہ

کس کے سجدے میں یہ فلک یہ زمیں — ہیں ملائے ہوئے جبیں سے جبیں ؟
کون ہے صدر بزم کون و مکاں — فرش محفل ہے کس کا عرش بریں ؟
کس کی خاتم کا حلقہ ہے گردوں — کس کی ہے کائنات نقش نگیں ؟
کون ہے ساقی بساط وجود — کس کا ساغر لئے ہے ماہ مبیں ؟
کس کی گلگشت ہے یہ کاہکشاں — یہ کواکب ہیں کس کے راہ نشیں ؟
کون ہے مظہر جلال و جمال — کس کے یہ نقش ہیں حسیں سے حسیں ؟
کس کی خاطر نکھار رہا ہے قمر — چاندنی سے یہ مسند زریں ؟
کس کی قدرت کے یہ مظاہر ہیں — ان مظاہر میں خود وہ ہے کہ نہیں ؟
پردۂ کائنات میں پنہاں — یا کہیں آس پاس گوشہ گزیں ؟
یا ورا الورائے بود و عدم — یا ہر اک ذرہ میں نہاں یہ مکیں ؟
کس جہت ہے وہ قبلۂ کونین — کس طرف ہے وہ، لامکاں کا مکیں ؟
سخت برہم ہے اس تفکر میں — فہم سے عقل اور گماں سے یقیں
چشم کو یہ نظر ہے مایۂ نور — دل کو یہ اضطراب ہے تسکیں
یہ تصور جلائے ذہن و دماغ — حسن فطرت کا یہ خیال آگیں
یاد اس کی ہے میری مونس جاں — نام اس کا ہے مجھکو حبل متیں
روح میری تڑپ رہی ہے رضاؔ — تاکہ دیکھے اسے کہیں نہ کہیں

تنقید و تبصرہ

نثرہ - چھوٹی تقطیع حجم ۸۱ صفحہ قیمت ۸/
پیشکش شاہجہانی - ۲۰×۲۲/۸ حجم ۲۴ صفحہ قیمت نہیں لکھی
نوربان - " " "
ارمغان " " "
نگارش عاری - ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۵۰ صفحہ

یہ پانچوں رسالے جناب محمد عزیز اللہ شاہ صاحب عرف منشی محمد ولایت خانصاحب رئیس صفی پور کی کاوش فکر کا نتیجہ ہیں اور ادبی پریس لکھنؤ میں چھپے ہیں۔ ہم کسی پچھلے پرچہ میں موصوف کے دیوان اور پنج رقعہ پر ریویو کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ آپ اس وقت ہندوستان کے فارسی انشا پردازوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ہماری رائے میں یہ سب رسالے خصوصاً نگارش عاری ان لوگوں کے لئے بیحد مفید ہیں جو مدرسوں میں فارسی کی تعلیم پاتے ہیں یا بطور خود فارسی پڑھتے ہیں۔

پنجاب میں اردو - از جناب حافظ محمود خانصاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور شائع کردہ انجمن ترقی اردو۔ لاہور۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۳۱۲ صفحہ قیمت درج نہیں۔ کتابت طباعت کاغذ قابل اطمینان ہے۔

اس کتاب میں فاضل مصنف نے زبان اردو کی تاریخ نہایت تحقیق سے لکھی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان فارسی اور برج بھاشا کے ملنے سے وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ مسلمانوں نے برج بھاشا کے علاقے میں پہونچنے سے بہت پہلے پنجاب کے حصہ میں

فارسی اور ملتانی پنجابی کی آمیزش سے اردو کی بنیاد پڑچکی تھی۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مصنف نے علاوہ تاریخی اور خارجی شواہد کے علم اللسان کے اصول کے مطابق داخلی شہادت بھی پیش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ اردو اور برج بھاشا میں اگر کچھ الفاظ کا اشتراک ہے تو یہ کافی دلیل نہیں کہ اردو کی ماں یہی زبان ہے۔ ملتانی پنجابی اور اردو زبان میں علاوہ بیشمار الفاظ مشترک ہونے کے جملوں کی ساخت اور صرفی اور نحوی ترکیبوں کے لحاظ سے بیحد مشابہت ہے۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں پنجاب کے قدیم اُردو شعرا اور نثر نگاروں کے حالات اور اُنکے کلام کے نمونے ہیں جن میں سے بعض علاوہ تاریخی اہمیت کے ادبی قیمت بھی رکھتے ہیں۔

علاوہ اس موضوع کے جس سے بحث کرنا اس کتاب کا اصل مقصد تھا ضمنی طور پر علم اللسان کے اصول اور خصوصاً اُردو زبان سے متعلق بہت دلچسپ اور مفید بحثیں ہیں۔ پروفیسر شیرانی صاحب کی یہ تصنیف اُردو کے علمی خزانے میں بہت گراں قدر اضافہ ہے۔ موصوف نے جو نظریہ پیش کیا ہے اس پر ہم عجلت میں کوئی رائے نہیں دینا چاہتے مگر اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ اہل نظر سے پوری توجہ اور غور کا طالب ہے۔

ہمارے نبی۔ از پروفیسر نواب علی صاحب۔ شائع کردہ جامعہ ملیہ

چھوٹی تقطیع حجم ۱۹ صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ نفیس۔ سرورق نہایت خوشنا قیمت ۱۲؍

یہ چھوٹی سی کتاب ان کتابوں میں سے ہے جنہیں خدائے تعالیٰ حسن قبول عطا کرتا ہے کہ وہ ملکوں ملکوں پھیلتی ہیں اور صدیوں تک انہیں لوگ پڑھتے ہیں۔ یہ کتابیں عموماً بچوں کے لئے ہوتی ہیں اور بچوں کے رنگ میں ڈوب کر لکھی جاتی ہیں مگر وہ بڑے بھی جو انتہائی پختگی پر پہونچ کر بچپن کی سادگی کے بھید کو سمجھتے ہیں ان سے تسکین قلب حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی میں

پلگرمس پراگریس اور اس قسم کی متعدد کتابیں ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب مزے لے لیکر پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق اُن سے ایمان کی گرمی اور عقیدت کا ذوق حاصل کرتے ہیں۔ پروفیسر نواب علی کا یہ رسالہ بچوں کی دنیا میں کافی شہرت حاصل کرچکا ہے اور اب تیسری بار پانچہزار کی تعداد میں چھپا ہے۔

مکتبہ جامعہ ملیہ نے سیرت پر دو اور کتابیں ہمارے رسول اور سرکار دربار کے نام سے تیار کرائی ہیں جو زیر طبع ہیں یہ تینوں کتابیں ہر مسلمان بچے کے نصاب تعلیم کا جزو ہونا چاہئیں۔

نظام گزٹ تقطیع طباعت ذغیرہ میں الہلال سے مشابہ ہے حجم ۷۲ صفحہ ملنے کا پتہ چار مینار حیدرآباد (دکن)

حیدرآباد کے اس قابل قدر ہفتہ وار اخبار پر ہم پہلے کسی اشاعت میں ریویو شائع کرچکے ہیں۔ اب ہمارے سامنے اس کا خاص نمبر ہے جو اعلیحضرت نظام دکن کی سالگرہ کے موقع پر شائع کیا گیا ہے۔ ظاہری اور باطنی خوبیوں کے اعتبار سے یہ نمبر اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ نظام گزٹ اسی شان کا اخبار ہے جیسا حیدرآباد جیسے ادبی مرکز سے نکلنا چاہئے تھا۔ اس نمبر کی قیمت ۸/ ہے اور رسالے کا سالانہ چندہ ۳/ ہے۔

خیالات ارونگ - مترجمہ محمد یحیٰی صاحب تنہا۔ ملنے کا پتہ - دارالاشاعت غازی آباد تقطیع ۲۰x۳۰/۱۶ حجم ۹۶ صفحہ لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ سرورق بہت خوشنما۔

یہ امریکہ کے مشہور انشاپرداز واشنگٹن ارونگ کے مضامین اور اس کے خود نوشتہ حالات زندگی کا ترجمہ ہے۔ ارونگ کا دلکش انداز بیان مشہور ہے اور اس کی کتاب خواہ وہ ترجمہ کی صورت میں پڑھی جائے یقیناً وسعت خیال کا ذریعہ ہے۔ ہماری

زبان کو اس کی بہت ضرورت ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں کے ادبی جواہر اُردو زبان میں منتقل کئے جائیں۔

مجلہ مکتبہ۔ تقطیع رسالہ جامعہ کے برابر۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط درجہ کا حجم ۶۶ صفحہ قیمت سالانہ صہ ر

یہ ماہوار رسالہ انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ کی طرف سے شائع ہوتا ہے۔ زیر ریویو نمبر کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عام پسند رسالوں کی صف میں شامل ہونا نہیں چاہتا بلکہ اپنا معیار بلند رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی خصوصیت رسالہ اردو کی طرح ادب ہے ہمیں امید ہے کہ یہ رسالہ ادب اردو کی مفید خدمت انجام دیگا۔

ہمیں ذیل کے رسائل بھی بغرض تنقید موصول ہوئے ہیں۔

۱۔ **الاحسان عید نمبر**۔ جمعیۃ القریش دہلی کا ماہوار رسالہ کا خاص نمبر۔
تقطیع ۲۲×۱۸/۴ حجم ۸۴ صفحہ کاغذ نفیس کتابت وطباعت اوسط درجہ کی۔ چندہ ۵ سالانہ ہے فی پرچہ ۴ر

۲۔ **ترجمہ قانون طب**۔ مصنفہ ڈاکٹر سیمیوال ہانمن موجد ہومیوپیتھی (علاج تمثیلی) قیمت دو روپے۔ ملنے کا پتہ ڈاکٹر صادق علی صاحب پرنسپل و پریسیڈنٹ سنٹرل میڈیکل ہومیوپیتھک کالج۔ سنٹرل روڈ۔ لاہور۔

۳۔ **امراض مزمنہ**۔ ہانمن کی کرانک ڈزیز کے نظری حصہ کا اردو ترجمہ۔ قیمت ۱۲ر

۴۔ **قانون طب**۔ پرسوال جواب (انگریزی) مصنفہ ہانمن صاحب۔ قیمت عہ ر

۵۔ نظام الدین صاحب کے رسائل ہومیوپیتھی کا پہلا نمبر۔ "جدید طب انگریزی خود ہومیوپیتھی کی تعلیم دیتی ہے" قیمت ۸ ر

۶۔ **فلسفۂ روحانی** ۔ مصنفہ ڈاکٹر صادق علی صاحب چھوٹی تقطیع حجم ۴۸ صفحہ قیمت درج نہیں

۷۔ **تقلید و تحقیق** ۔ مصنفہ ڈاکٹر صادق علی صاحب چھوٹی تقطیع حجم ۴۰ صفحہ قیمت درج نہیں

۸۔ **خلافت و اسلام** ۔ (انگریزی) مصنفہ مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے ایل ایل بی مترجم انگریزی کلام مجید۔ چھوٹی تقطیع حجم ۸۴ صفحہ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام احمدیہ بلڈنگ لاہور۔

۹۔ **اولی الالباب سے خطاب** ۔ از سید سعید الدین صاحب سب جج الہ آباد تقطیع $\frac{21\times18}{8}$ حجم ۳۲ صفحہ ریفارم سوسائٹی دربار الہ آباد نے شائع کی۔

شذرات

مارچ کے پرچہ میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ اپریل کا پرچہ ۲۰ اپریل تک اور مئی کا ابتدائے مئی میں نکل جائیگا۔ مگر افسوس ہے کہ اہل جامعہ کی غیر معمولی مصروفیتوں کے سبب سے اس کی پابندی نہ ہو سکی۔ بہرحال اب یہ مئی کا پرچہ آخر مئی میں نکل رہا ہے۔ اور انشاءاللہ تعطیل میں یعنی اگست تک اسی طرح ہر مہینہ کا پرچہ اُس مہینہ کے آخر میں نکلا کرے گا۔ اس کے بعد پرچہ کو مہینہ کے شروع میں لانیکی کوشش کیجائیگی۔

جامعہ کی مجلس تاسیسی کا جلسہ ۲۹ اپریل کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب نے صدارت فرمائی۔ کافی غور اور بحث کے بعد مندرجہ ذیل قرارداد منظور ہوئی:-

"مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب مرحوم کی یادگار کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کو استحکام دینے اور اُس کو مالی دشواریوں سے آزاد کرنیکے لئے اس کی ضرورت ہے کہ باضابطہ طریقہ پر پوری جدوجہد کیجائے جن کے ہاتھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا تمام نظم و نسق ہو لہذا جماعت تاسیسی آج بتاریخ ۲۹ اپریل ۱۹۲۸ء اصحاب ذیل کو بطور جماعت امناء کے منتخب کرتی ہے۔

ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری	مولانا ابوالکلام آزاد
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	مولانا محمد علی
سیٹھ جمنالال صاحب بزاز	مولانا شوکت علی
مولوی محمد شفیع داودی صاحب	عبدالمجید خواجہ صاحب
سیٹھ عبداللہ ہارون صاحب	سیٹھ جمال محمد صاحب

شعیب قریشی صاحب	مولوی مسعود علی صاحب
مولوی کفایت اللہ صاحب	مولوی محمد عرفان
جواہر لال نہرو صاحب	حاجی محمد موسیٰ خانصاحب
تصدق احمد خاں صاحب شروانی	قاضی نجم الدین صاحب
مولوی محمد نسیم صاحب	مولوی عبد القادر صاحب قصوری
ڈاکٹر محمد عالم صاحب	مولوی عبد الحق صاحب
مولانا قطب الدین عبد الوالی	ڈاکٹر عابد حسین صاحب
محمد مجیب صاحب	ای۔ جے کلاٹ صاحب
حسن محمد حیات صاحب	چودھری خلیق الزمان صاحب
مولوی سید مرتضیٰ بہادر صاحب	مولوی عبد الماجد صاحب دریا بادی

ان میں سے اصحاب ذیل جماعت امنار کے عہدہ دار منتخب کئے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر انصاری صاحب	صدر
ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب	معتمد
جمنالال بزاز صاحب	خازن

اصحاب ذیل پہلی مجلس انتظامی کے رکن منتخب کئے جاتے ہیں

۱۔ صدر مجلس امنار	۶۔ مولانا شوکت علی
۲۔ معتمد مجلس امنار	۷۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب معجل جامعہ
۳۔ خازن مجلس امنار	۸۔ خواجہ عبد المجید صاحب
۴۔ مولانا محمد علی	۹۔ مولوی شفیع داؤدی صاحب
۵۔ مولانا ابو الکلام	

مجلس تاسیسی قرار دیتی ہے کہ اس کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں مذکورہ مجلس

امنا کی طرف منتقل ہو جائیں اور اس کے بعد مجلس تاسیسی خود قائم نہ رہے چنانچہ وہ تمام حقوق اور ذمہ داریاں مجلس امنا کیطرف منتقل ہوگئیں اور اس کے بعد مجلس تاسیسی ختم ہوگئی نیز قرار پایا کہ نئی مجلس انتظامی اپنے آئندہ اجلاس میں جامعہ کا نیا دستور اساسی تیار کرکے اور مجلس امنا کے سامنے بغرض منظوری پیش کرے،،

جامعہ کا دستور اساسی تیار ہوگیا ہے اور مجلس انتظامی کے جلسہ میں جو ۱۳ رمئی کو صبح کے وقت منعقد ہوگا اس پر بحث کیجائے گی۔ اُسی دن شام کو مجلس امنا کا جلسہ ہوگا جس میں یہ دستور بغرض منظوری پیش ہوگا۔

ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اس دستور میں اُردو اکادمی کے متعلق بھی چند دفعات ہیں جن کی رو سے اکادمی کے لئے ایک مجلس عاملہ کا تقرر ہوگا اور اس کے تعلقات جامعہ سے معین کئے جائیں گے۔

آجکل جامعہ فنڈ کے لئے چندہ فراہم کرنیکی غرض سے دفود کی روانگی کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ایک دفد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی سرکردگی میں اعظم گڑھ اور جونپور گیا تھا۔ جامعہ کے سچے قدردان مولوی مسعود علی صاحب ندوی کی کوشش اور مستعدی سے دونوں جگہ خاصی کامیابی ہوئی اور ایک ہفتہ میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ چندہ جمع ہوگیا۔ یہ وفد بنارس الہ آباد، گورکھپور، غازی پور اور دوسرے مشرقی اضلاع میں بھی جانیوالا تھا مگر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو ۲۹ راپریل کے جلسہ میں شرکت کے لئے واپس آنا پڑا اور اس کے بعد جامعہ کے امتحانات شروع ہوگئے۔ اب ۱۵ رمئی کو ڈاکٹر صاحب پھر تشریف لیجائیں گے تاکہ بقیہ اضلاع کا دورہ بھی ختم کرلیں۔ دوسرے وفود بھیجنے کا مسئلہ زیر غور ہے جب کوئی قطعی فیصلہ ہوجائیگا تو اخبارات میں اعلان کردیا جائے گا۔

اپریل کے آخری ہفتہ میں یہ افسوسناک خبر آئی کہ مہاتما گاندھی کے بھتیجے مگن لال گاندھی صاحب یکایک شدید بخار میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ مگن لال صاحب جنوبی افریقہ میں مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے اور ہمیشہ انکے مخلص اور وفادار رفیق کار رہے۔ کئی سال سے انکا قیام آشرم میں تھا اور اسکا سارا انتظام انہیں کے ہاتھ میں تھا۔ علاوہ اس کے چرخہ سنگھ کے منتظم اعلیٰ بھی یہی تھے۔ چرخہ سنگھ کو جو حیرت انگیز کامیابی ہوئی اس میں مگن لال صاحب کی قابلیت اور محنت کو بہت کچھ دخل ہے جس خاموشی و بے نفسی اور محبت سے وہ قومی کاموں کو انجام دیتے تھے اُسکی مثال افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں کم ملتی ہے۔ آخری وقت میں بھی وہ بہار میں اپنی انجمن کے اغراض ومقاصد کی اشاعت کا کام کر رہے تھے۔ ہمیں اُنکے پسماندوں سے انتہائی ہمدردی ہے اور امید ہے کہ انکے ہونہار فرزند اپنے باپ کے نقش قدم پر چل کر ملک و قوم کی خدمت انجام دیں گے۔

اسی ہفتہ میں جامعہ کے لوگوں کو بھی اپنے ایک عزیز بھائی کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ جامعہ کی فوج کا ایک چھوٹا ہونہار سپاہی سمیع الدین طالب علم ابتدائی سوم اپنے عزیزوں اور رفیقوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور اسکے والدین اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جامعہ

زیر ادارت

مولانا اسلم جیراجپوری ‏ ‏ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ۔ ڈی

جلد ۱۰ | بابتہ ماہ محرم ۱۳۴۷ھ مطابق جون ۱۹۲۸ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

ابن مقفع

دوسری صدی ہجری کے ابتدائی دور میں اسلامی تہذیب و تمدن نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا۔ اسلامی تحیل نے جہاں عرب سے شرک و بت پرستی اور جہالت و وحشت کی ناپاکیوں کو بالکل مٹا دیا تھا وہاں زبان و ادب پر بھی نہایت گہرا اثر ڈالا تھا۔ عربی زبان نیا چولا بدل رہی تھی علوم و فنون کی نئی نئی شاخیں پیدا ہو رہی تھیں۔ علاوہ مذہبی علوم کے اور تمام اصناف علم خصوصاً ادبیات میں بھی حیرت انگیز ترقی ہو رہی تھی غرضکہ فطرت عربی لٹریچر کو بالکل جدید بنیادوں پر تعمیر کر رہی تھی۔ یہی زمانہ تھا جبکہ عربی کے دو زبردست انشا پرداز پیدا ہوئے انہوں نے اس تعمیر میں زبردست حصہ لیا اور اگر انکو فن انشا خصوصاً سادہ طرز تحریر کا بانی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا بلاشبہ ان کی حیثیت بالکل ایک مینار کی تھی جس سے آجتک روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ معلوم کر کے آپ متعجب ہونگے کہ ان میں سے ایک خالص عربی النسل تھا اور دوسرا عجمی (فارسی) یعنی عبدالحمید بن یحییٰ کاتب اور ابن مقفع۔ یہ دونوں امام فن نہ صرف معاصر تھے بلکہ آپس میں نہایت دوستانہ اور پرخلوص تعلقات تھے۔ دونوں اپنے ذوق صحیح اور فطرت سلیم کی بدولت علم و ادب کے آسمان پر آفتاب بنکر چمکے اور بہت جلد علمی دنیا پر چھا گئے۔ علاوہ بریں اپنی اعلیٰ ترین انشا پردازی کا ایسا بے نظیر کارنامہ چھوڑ گئے کہ ذوق سلیم آجتک سر دھنتا ہے۔ خصوصاً ابن مقفع کے طرز تحریر کی تقلید کو موجودہ زمانہ میں بھی (جبکہ عربی طرز انشا نے سخت انحطاط پذیر ہونیکے بعد اب پھر سادگی اختیار کی ہے اور بالکل جدید قالب میں ڈھل گئی ہے) مایۂ فخر سمجھا جاتا ہے۔ آج کی صحبت میں

یہ مضمون رسالہ الزہرا (مصر) تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ (جرجی زیدان) جلد دوم مقدمہ رسائل البلغا (حالات ابن مقفع) اور مقدمہ الدرۃ الیتیمہ سے ماخوذ ہے

ابن مقفع کے حالات کا تذکرہ مقصود ہے۔

نام ونسب

عبداللہ نام ابن المقفع کنیت باپ مجوسی تھا۔ اور ایک روایت کی بنا پر حجاج بن یوسف الثقفی اور دوسری روایت کی بنا پر (اور یہی زیادہ صحیح سمجھی جاتی ہے) خالد القسری کے زمانہ میں خراج وصول کرنے پر مامور تھا۔ اسی سلسلہ میں اس پر خیانت کا الزام لگایا گیا اور حجاج یا یوسف بن ہبیرہ نے جو خالد کے بعد عراق کا والی تھا اس قدر سخت سزا دلوائی کہ ایک ہاتھ بیکار ہوگیا اسی لئے مقفع نام پڑگیا اور اصلی نام ولقب داذویہ اور مبارک پر غالب آگیا۔ اس نام کے متعلق دوسرے خیالات بھی ظاہر کئے گئے ہیں مگر زیادہ صحیح اسی کو سمجھا جاتا ہے۔

خاندان کی اصل سکونت خوز ہے جو شہر کور (فارس) کا ایک مقام ہے۔ لیکن اپنے دوسرے ہموطنوں کی طرح یہ بھی تلاش روزگار میں عرب کی جانب رُخ کرنے پر مجبور ہوئے خلافت نے انہیں اپنے دامن دولت کے سایہ میں لے لیا اور آخر عرب کی سرزمین کو انہوں نے اپنا وطن بنالیا

تعلیم وتربیت

عبداللہ بن مقفع نے باوجود فارسی نژاد ہونیکے عرب اور عربی ماحول میں نشوونما پائی۔ اُسکا باپ خود عاملِ خراج اور دفتر کا منشی تھا۔ حکومت بھی اس وقت خالص عربی تھی سرکاری زبان عربی ہی تھی اس لئے اُس نے اپنے لڑکے کو اسی فن (انشا) کے سکھانیکی جانب توجہ کی اور عربی وفارسی میں مہارت پیدا کرنے کے وسائل مہیا کرنے لگا۔ خلافت بنوامیہ میں ایک فارسی النسل کی انتہائی عزت یہی تھی کہ وہ عالم، منشی، یا مترجم ہو۔

روزبہ (ابن مقفع) بعض قدرتی اسباب نیز اپنے مافوق فطرت ذہن وذکاوت کی بدولت ابھی پورے طور پر جوانی کی عمر کو بھی نہیں پہنچا تھا کہ ان تمام چیزوں میں پورے طور پر مہارت

حاصل کرلی۔ اُس کے اسقدر جلد اور اس درجہ کمال حاصل کرنے کے چند خاص وجوہ ہیں۔

۱۔ بصرہ میں نشو ونما پائی جو اُس وقت علوم و فنون کا سرچشمہ۔ فقہا، رواۃ، محدثین اور ماہرین لغت کا مرکز تھا خصوصاً مربد کا محلہ فصحا، بلغا خطیبوں اور شاعروں کے اجتماع کا مقام تھا۔

۲۔ آل اہتم کی سرپرستی میں نشو ونما حاصل کی جو فصاحت و بلاغت اور خطابت کا سرچشمہ تھا۔ اور جہاں خالد بن صفوان اور شبیب بن شبیہ جیسے لوگوں نے نشو ونما پائی۔

۳۔ عبدالحمید بن یحیٰی سے انتہائی دوستانہ تعلقات۔ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کی قابلیت سے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ دونوں میں بچپن سے دوستی تھی جو آخر دم تک قائم رہی۔ دونوں نے عراق ہی میں نشو ونما پائی کیونکہ عبدالحمید آل انبار سے تھا۔

۴۔ روایت کی جانب توجہ۔ بصرہ میں آنے والے بدوی عربوں سے استفادہ۔ جالوس ثور بن یزید سے خصوصیت کے ساتھ صحت زبان اور فصاحت و بلاغت میں تلمذ۔

جب قابلیت مستحکم ہوگئی اور علم و فضل کا چاروں طرف چرچا ہونے لگا۔ تو دولت امویہ کے زمانہ میں عمر بن ہبیرہ نے اُسے اپنا کاتب بنایا پھر عباسی عہد خلافت میں عیسیٰ بن علی کا کاتب مقرر ہوا۔ جاحظ کے بیان کے مطابق اسمٰعیل بن علی نے اپنے بچوں کو تعلیم کی غرض سے اسی کے سپرد کردیا پھر سلیمان بن علی والی بصرہ بحرین و عمان کی خدمت میں رہا پھر ابنا ، میں ابوجعفر المنصور کی خدمت میں شرف ملازمت حاصل کیا۔ اور اس کے لئے کلیلہ و دمنہ اور فارسی کی دوسری اخلاقی تمدنی نیز بعض یونانی کتابوں کا جو پہلے فارسی میں منتقل ہوچکی تھیں عربی میں ترجمہ کیا۔

اسلام

ابن مقفع اپنی عمر کے اکثر حصہ میں آبائی مذہب پر رہا اور تقریباً بوڑھاپے میں مسلمان ہوا اس کے مسلمان ہونے کا واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ابھی ذکر ہوچکا ہے کہ خلافت عباسی

کے عہد میں وہ عیسیٰ بن علی کا کاتب مقرر ہوا تھا چنانچہ وہ اسلام بھی اسی کے ہاتھ پر لایا۔ ایک روز وہ عیسیٰ بن علی کی خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا "اسلام کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہوگئی ہے۔ میں آپ کے ہاتھ پر اسلام لانا چاہتا ہوں" شام ہو چکی تھی۔ عیسیٰ بن علی نے کہا یہ وقت مناسب نہیں صبح کو آنا تمام معززین وعائد موجود ہوں گے، بہتر یہی ہے کہ اُنکے سامنے دین حق قبول کرو۔ تھوڑی دیر میں خاصہ چنا گیا وہ بھی کھانے میں شریک ہوا۔ اور کھاتے وقت زکرمہ[۵] کرنے لگا عیسیٰ نے اعتراض کیا اس نے جواب دیا "مسلمان مجھے صبح کو ہونا ہے اور یہ ناممکن ہے کہ میں کسی وقت بھی مذہب سے الگ رہوں" غرضکہ صبح کو مسلمان ہوگیا۔ نام اور کنیت بدل دی گئی۔

عقیدہ

مذہبی اتہامات کوئی نئی بات نہیں بدقسمتی سے ہر جگہ اور ہر زمانہ میں یہ چیز ترقی پذیر رہی ہے۔ اور ایسی ایسی تقدس مآب ہستیوں پر یہ الزام تراشا گیا ہے کہ سنکر حیرت ہوتی ہے۔ امام غزالی جیسے مقدس بزرگ اور ابن حبان جیسے امام المحدثین بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکے فلسفہ سے ذوق رکھنے والوں پر تو خاص نظر عنایت رہی ہے۔ ابن رشد۔ فارابی ابن سینا ابن الصائغ وغیرہ خاص طور پر اس تیر کا نشانہ بنتے ہیں۔ پھر ابن مقفع اس لپیٹ میں کیوں نہ آتا اُسپر بھی نہایت شد و مد سے یہ الزام لگایا گیا لیکن جن دلائل کی بنا پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے وہ ہیں زیادہ وزنی نہیں نظر آتیں۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ وہ محض دنیوی طمع سے مسلمان ہوا تھا تاکہ بنی ہاشم سے دولت سمیٹے۔ منصور کے چچا عیسیٰ اور سلیمان کی ملازمت اور اُنکا کاتب مقرر ہونے کو وہ اسی

---

[۵] عجمی کفار (مجوسی) زبان اور ہونٹوں کسی قسم کی حرکت دیے بغیر حلق اور ناک کے درمیان آواز کو گھماتے ہیں اور اسی طرح اپنا مطلب ادا کرتے ہیں یہی زمزمہ کہلاتا ہے (قاموس)

لالچ پر محمول کرتے ہیں اُنکے نزدیک اسی چیز نے اُسے مسلمان ہونے پر آمادہ کیا اس سلسلہ
میں وہ متعدد ثبوت پیش کرتے ہیں۔

(۱) یہ کہ اکثر بت پرستی سے متعلق مشرکانہ کتابیں مانویہ مزدکیہ مرقوبیہ وغیرہ جن پر کفر و زندقیت
کا اطلاق کیا جاتا تھا۔ ان سب کا اس نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا یونانی فلسفہ کی بعض
کتابیں جو دولت ساسانی کے اخیر عہد میں ترجمہ ہو چکی تھیں اس نے اُنکا عربی میں ترجمہ کیا
اس وقت تک اہل عرب نے اس قسم کی کتابوں کو اپنی زبان میں منتقل نہیں کیا تھا۔ بعض
لوگوں کے نزدیک کفر و زندقہ کی اصل بنیاد صرف ابن مقفع ہے۔

(۲) وہ ان پندرہ آدمیوں میں سے تھا جو اکثر ایک ساتھ رہتے تھے شراب و کباب کی مجلس گرم
رہتی تھی اور اُنکی باہمی صحبت بے تکلفی کی انتہائی حد کو پہنچ چکی تھی۔ ان لوگوں کے نام حسب
ذیل ہیں۔

والبۃ بن الحباب۔ مطیع بن ایاس۔ منقذ بن عبدالرحمٰن الہلالی۔ حفص بن ابی بردہ۔ ابن
مقفع۔ یونس بن ابی فردہ۔ حماد عجرد۔ علی بن الخلیل۔ حماد بن ابی لیلی الراویہ۔ ابن الزبرقان۔
عمارۃ بن حمزہ۔ یزید بن الفیض۔ جمیل بن محفوظ۔ بشار المرعث۔ ابان اللاحقی۔

(۳) اُس نے یحیٰی بن زیاد کا مرثیہ کہا جو زنادقہ کا سرخیل تھا[۱] لیکن اخفش کے بیان کے مطابق

---

[۱] چند ہمخیال اور ہم مذاق لوگوں کے باہمی تعلقات یا اُنکا ایک جگہ مل بیٹھنا اور تبادلہ خیالات کے
غرض سے مجتمع ہونا کوئی نئی بات نہیں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں
نے ایسے لوگوں کو اپنی مجلس میں گھسنے نہیں دیا۔ جو اُنکے ہم مذاق نہیں تھے بس انہیں لوگوں نے جو
اُنکے ہم مذاق نہ ہونیکی وجہ سے اس مجلس میں بار نہ پا سکے انہیں متہم کر دیا۔ ابن حیان التوحیدی کی
جماعت بھی اسی طرح بدنام ہوئی۔ یہ لوگ بھی قومیت اور مذہبیت میں باہم مختلف تھے لیکن علم اور فلسفہ
کے ذوق نے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دیا تھا۔ انکے متعلق بھی یہی کہا گیا کہ بد دین ہیں اور (دیکھو صفحہ)

صحیح یہ ہے کہ اُس نے ابو العوجاء کا مرثیہ لکھا ہے یہ بھی زندیق تھا حدیث وضع کرتا تھا اور جیسا کہ طبری کا بیان ہے جس وقت محمد بن سلیمان بن علی والی کوفہ اسے قتل کرنے کی غرض سے اُس کے پاس گیا تو اُس نے نہایت بیباکی سے کہا۔ اگر تم نے مجھے قتل کیا تو کوئی مضائقہ نہیں میں نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں جنمیں حلال کو حرام اور حرام کو حلال کر دیا ہے۔ لیکن طبری نے ابن ابی العوجاء کے قتل کا ۱۵۵ھ کے حادثات میں ذکر کیا ہے اور ابن مقفع ۱۴۲ھ یا ۱۴۳ھ یا اس سے بھی قبل مقتول ہوا ہے۔ اس لئے کہ سلیمان بن علی کا انتقال جو اس کے قصاص کا طالب تھا ۱۴۲ھ میں اور دیاسی (   ) کے قول کے مطابق ۱۳۹ھ میں ہوا ہے۔

ایک شبہ یہ بھی ہے کہ جس روز اس نے مسلمان ہونیکا ارادہ ظاہر کیا اسی رات سلیمان بن علی کے یہاں کھانا کھاتے وقت زمزمہ کیا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پر اسے اعتقاد نہیں تھا۔ ورنہ پھر زمزمہ کے کیا معنی۔

علاوہ بریں ابن شبر کا بیان ہے کہ اسلام کے بعد ایک مرتبہ وہ آتشکدہ کے پاس سے ہو کر گزرا اور اسے دیکھ کر اُس نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے

یا بیت عاتکۃ التی اتعزل	حذر العدیٰ وبک الفواد موکل
انی لامنحک الصدود واننی	قسماً الیک مع الصدود لامیل

ان شبہات کا جواب یہ ہے کہ جس طرح صحیح ہو سکتے ہیں اسی طرح غلط بھی ممکن ہے کہ زندقہ کی کتابوں کا اسلام سے قبل اس نے ترجمہ کیا ہو یہ دوسری بات ہے کہ وہ زنادقہ کے ہاتھوں

(بقیہ نوٹ صفحہ ۶) شراب خوری کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ جاحظ نے البیان والتبیین میں بہت سے ایسے لوگوں کا ذکر کیا ہے جن میں شدید مذہبی تباین کے باوجود بے انتہا میل جول اور مخلصانہ تعلقات تھے
(رسائل البلغا حالات ابن مقفع)

شائع ہوگئیں اور بہت سے لوگوں کی گمراہی کا باعث ہوئیں۔

اب رہا یہ امر کہ مختلف مذاہب کے لوگوں میں دوستی واخلاص کے تعلقات ہوں اور ایک دوسرے کا مرثیہ کہے تو اس کے لئے بھی ہمارے پاس کافی ثبوت ہے۔ شریف رضی نے ابواسحاق صابی کا مرثیہ کہا اور ثابت بن ہارون عیسائی نے متنبی کا مرثیہ کہا۔

ابن خلکان نے جاحظ کا قول نقل کیا ہے ابن مقفع مطیع بن ایاس اور یحییٰ بن زیاد یہ سب مذہب میں بدنام تھے۔

اسکا اصلی راز یہ ہے کہ ابن مقفع نے معتزلہ پر بہت سے اعتراضات کئے تھے معتزلہ کی جانب سے اسکا انتقام اس طرح لیا گیا کہ اس پر اس قسم کے اتہام لگا دئے گئے خود جاحظ اپنی مذہبیت کے ثبوت اور بریت کی سخت کوشش کے باوجود کب اس الزام سے بچ سکا۔

ایسی کمزور دلیلوں کی بنا پر ابن مقفع کے متعلق ایسا خطرناک فیصلہ کر دینا کہاں تک قرین قیاس ہے اسکا اندازہ خود قارئین کرام کر سکتے ہیں بغرض اگر کوئی شخص زندیقیت کو اپنے دل میں چھپائے رکھتا ہے تو اسکا حال تو خدا ہی خوب جانتا ہے۔ اور معترض سے کہا سکتا ہے کہ آپ نے اسکا دل چیر کر دیکھا تھا؟ ان باتوں کا تو اسی وقت اندازہ لگایا جا سکتا ہے جبکہ تحریروں یا کتابوں میں انکا اظہار ہو اور ان پر احکام بھی مترتب ہوں۔ بہرحال اقوال یا اعمال ایسی صورت میں ہونے چاہئیں کہ ان پر دلائل بھی قائم کئے جا سکیں برخلاف اس کے مذہبیات سے متعلق جو کچھ ابن مقفع نے لکھا ہے وہ اس کی مذہبی عقیدت اور مذہب کی جانب زبردست میلان کی دلیل ہے۔ یہ الزام صحیح ہوتا تو سب سے پہلے منصور جو اس پر سخت برافروختہ تھا اسی کی آڑ لے کر اسے قتل کرواتا اس صورت میں اسے پبلک کی خوشنودی بھی حاصل ہو جاتی۔

ابن مقفع پر معارضۂ قرآن کا الزام لگایا گیا ہے مگر اس کی حیثیت بھی بالکل ویسی ہی ہے قاضی عیاض اور باقلانی نے جو کچھ اس سے متعلق لکھا ہے وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ بعض سادہ لوح مصنفین کے خیالات کا اقتباس ہے۔ علاوہ اس کے اسکا انہوں نے اعتراف

کیا ہے بلکہ خود ابن مقفع اس سے انکاری ہے حقیقت یہ ہے کہ اس کے معاصرین اُس کے علم وفضل اور بڑھتی ہوئی شہرت کو برداشت نہ کرسکے۔ انکے دلوں میں ابن مقفع کا یہ عروج دیکھکر بغض وحسد کی آگ دہکنے لگی۔ سچ ہے کسی اچھے آدمی کی معاصرۃ بھی محرومی کا سبب بنجاتی ہے انہوں نے اُسے زندیقیت کے ساتھ جس طرح بدنام کیا وہ یا تو انکے قصور فہم کی وجہ سے تھا کہ وہ اس کے خیالات کی بلندیوں تک نہ پہنچ سکے یا اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض مد نظر تھی۔ اگرچہ یہ ضرور ہے کہ ابن مقفع جیسے بہت سی فارسی نژاد محض ظاہرا اسلام لاتے اُن کی غرض معاشی ہوتی یا سیاسی یا اسلام کو ذلیل اور اہل اسلام کو گمراہ کرنا تاریخی حوادث اور مذہبی کتابیں اُنکے اعمال کی گواہ ہیں

قتل

جس وقت عبداللہ بن علی نے منصور کی بیعت سے انکار کیا اور ابو مسلم خراسانی کے مقابلہ میں اسے شکست ہوئی تو اُس نے ساتھیوں سمیت اپنے بھائی والی بصرہ کے یہاں پناہ لی اور مدتوں اس کے یہاں چھپا رہا تا آنکہ سلیمان کو منصور نے معزول کر دیا اور بجائے اس کے سفیان بن معاویہ مہلبی کو والی مقرر کیا اس وقت عبداللہ اپنی جان کے خوف سے پھر پوشیدہ ہوگیا۔

خلیفہ منصور کو اس کا علم ہوا تو اُس نے سلیمان اور عیسیٰ کو حکم دیا کہ عبداللہ کو لیکر حاضر ہوں اور اس کی امان کے لئے جو شرط کریں مجھے منظور ہے وہ ان شرائط کو لکھوانیکے لئے ابن مقفع کے پاس گئے۔ اس نے اس تحریر میں نہایت شدت سے کام لیا اور لکھتے لکھتے یہانتک لکھ گیا کہ امیرالمومنین اپنے چچا سے غداری کرے تو اس کی بیویوں پر طلاق ہے اُس کے غلام آزاد ہیں اور مسلمان اس کی بیعت سے آزاد ہیں۔ خلیفہ پر یہ بات خصوصاً بیعت کے متعلق جو کچھ لکھا گیا تھا بہت گراں گزرا۔ ابن مقفع کی اس حرکت نے اسے نعل در آتش کر دیا۔ اس واقعہ کے چار برس بعد اس نے سفیان کو لکھا کہ اُسے پوشیدہ طور پر قتل کر دے

پوشیدہ اس لئے کہ اسے اپنے چچا کی ناراضگی کا خوف تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ سلیمان کے عزل کے بعد سفیان کا تقرر ہوا تو وہ سفیان کا مضحکہ اُڑاتا تھا اور اُس کی ہر طرح توہین روا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ سلیمان نے کسی کام سے اُسے سفیان کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ابن مقفع نے توقف کیا کہ مبادا اُسے کوئی گزند پہنچ جائے مگر سلیمان نے یہ کہہ کر اُسے مطمئن کر دیا کہ میں تمہیں بھیج رہا ہوں اور خلیفہ سے میری قرابت کے سبب وہ ایسی جرات نہیں کر سکتا۔ ابن مقفع جانے پر راضی ہو گیا۔ مگر سفیان کے گھر میں داخل ہونیکے بعد پھر اُسے نکلنا نصیب نہ ہوا۔ سلیمان و عیسیٰ اس سے سخت برافروختہ ہوئے اور منصور کی خدمت میں جاکر مرافعہ کیا۔ وہ گواہ پیش کئے جنہوں نے ابن مقفع کو گھر میں جاتے دیکھا تھا۔ منصور نے گواہوں سے کہا۔ دیکھو اگر میں نے سفیان کو ابن مقفع کے قصاص میں قتل کر ڈالا اور وہ اس گھر سے (اپنے محل کی پشت کی جانب اشارہ کر کے) نکل آیا اور تم نے گفتگو کی تو بتاؤ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہئے۔ کیا سفیان کے قصاص میں تمہیں بھی قتل کر دیا جائے"۔ یہ سنکر تمام گواہ پلٹ گئے۔ عیسیٰ و سلیمان بھی اس لئے کہ اُنکے پاس کوئی دلیل نہیں رہی نیز منصور کی ہیبت سے خاموش ہو رہے۔ وہ سمجھ گئے کہ منصور کی رضامندی سے ایسا ہوا ہے۔

قتل کی نوعیت کے متعلق مختلف روایتیں ہیں اول یہ کہ اُس نے اُنکے تمام اعضا کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔ اور تنور میں آگ روشن کر کے ایک ایک عضو اس میں ڈالتا گیا۔ سب جل چکا تو اُس کی راکھ بصرہ کے میدانوں میں پھنکوا دی تاکہ گھر کی تلاشی لی جائے تو ایک ذرہ بھی نہ نکلے دوسرے یہ کہ اُسے کنوئیں میں ڈلوا دیا گیا اور اوپر سے پتھر چنوا دئے تیسرے یہ کہ اُسے حمام میں ٹھونس کر دروازہ بند کر دیا اور وہ اُسی میں گھٹ گھٹ کر مر گیا۔ بہر حال پہلی روایت زیادہ مشہور ہے۔ ابن مقفع کو قتل کرتے وقت سفیان نے اس سے مخاطب ہو کر کہا "تیرے قتل کرنے میں میرے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ تو زندیق ہے اور تو نے

لوگوں میں فساد پھیلا رکھا ہے"

یہ بات قرین قیاس ہے کہ "شرائط امان" کی کتابت اُس کے قتل کا حقیقی سبب نہیں کیونکہ منصور نے اس پر دستخط کر دئے اور بجائے واپس کرنیکے قبول کر لیا۔ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ شرائط قبول کرلے اور اس کے کاتب کو قتل کرادے حالانکہ اُس کی حیثیت محض خادم اور ماموری کی تھی۔ اس لئے یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سفیان ہی نے اُسے قتل کرایا۔ وہ سفیان کی بے انتہا بے عزتی کرتا تھا۔ اور ذرا بھی موقعہ ملنے پر نہیں چوکتا تھا۔ چنانچہ سفیان کی ناک بہت بڑی تھی۔ ایک دفعہ اُس کی خدمت میں حاضر ہوا تو کہا اسلام علیکما یعنی تمہیں اور تمہاری ناک کو سلام" یہی وجہ تھی کہ سفیان اس سے دل ہی دل میں جلنے لگا۔ اور قتل کے درپے ہو گیا۔ منصور چونکہ زنادقہ کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا تھا اس لئے موقع بھی بہت اچھا ہاتھ آگیا اور جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ۱۴۲ھ میں دھوکہ سے قتل کر ڈالا۔

منصور بھی مشکوک ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کے خون کے مطالبہ میں اُس نے سختی سے کام نہیں لیا۔ ابن مقفع نے ۳۶ سال کی عمر پائی قتل کی تاریخ کے متعلق بھی اختلاف ہے۔ ایک روایت تو اوپر مذکور ہوئی دوسری روایت یہ ہے کہ ۱۴۵ھ میں یہ واقعہ پیش آیا لیکن سلیمان بن علی نے ۱۴۲ھ میں انتقال کیا اس لئے اوپر ہی کی روایت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

اخلاق

وہ نہایت با اخلاق اور سنجیدہ مزاج تھا۔ صرف اُنہیں لوگوں سے ملتا تھا جو عادات و اخلاق میں اُس کے برابر ہوں، اپنے دوستوں کے ساتھ نہایت وفادار تھا۔ یحیٰی بن زیاد نے دوستانہ تعلقات سے قبل محبت و مودت قائم کرنیکے لئے خط و کتابت کی ابن مقفع نے جواب میں تاخیر کی تو شکایت لکھی اس نے جو جواب دیا وہ سننے کے قابل ہے اُس نے کہا کہ

"محبت ایک غلامی ہے اور یہ میرے لئے نہایت تکلیف دہ تھا کہ تجھے پورے طور پر پہچانے

بغیر خود کو تیری غلامی میں دیدوں"

اس کی وفاداری کا حسب ذیل مشہور واقعہ اس قابل ہے کہ زریں حروف میں لکھا جائے جسوقت مروان بن محمد مقتول ہوا عبدالحمید بن یحییٰ ابن مقفع کے یہاں چھپ رہا۔ لیکن یہ راز پوشیدہ نہ رہ سکا اور ابن مقفع کے مکان پر دوڑ آگئی۔ اس وقت دونوں مکان میں موجود تھے۔ دونوں سے دریافت کیا گیا کہ تم میں سے عبدالحمید کون ہے، مگر ہر ایک نے اپنے دوست کی جان کے خوف سے کہا کہ میں ہی عبدالحمید ہوں، لیکن چند نشانیوں کی وجہ سے عبدالحمید پہچان لیا گیا۔ اور گرفتار ہو گیا۔

ابن مقفع کے متعلق اہل علم کی رائیں

ابن مقفع تیزی و ذہانت میں غیر معمولی طور پر مشہور تھا علوم لغت علوم حکمت نیز اہل فارس کی تاریخ مرتب و مدون کرنے میں اس نے انتہائی ذکاوت سے کام لیا۔ یہ مقولہ عام طور پر دہرایا جاتا ہے کہ عرب میں صحابہ کے بعد خلیل ابن احمد اور عجم میں ابن مقفع سے زیادہ کوئی ذہین نہیں پیدا ہوا لیکن ابن مقفع کے متعلق یہ بھی مشہور رہے کہ وہ محتاط اور حزم پسند نہیں تھا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ اور بعض معزز لوگوں کی کوشش سے دونوں میں ملاقات بھی ہوئی۔ وہ تین دن تک برابر تبادلہ خیالات کرتے رہے خلیل بن احمد سے دریافت کیا گیا کہ ابن مقفع کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ اس نے جواب دیا کہ ابن مقفع کی طرح میں نے آجتک کوئی شخص نہیں دیکھا لیکن اسکا علم اس کی عقل پر غالب ہے۔ اسی طرح ابن مقفع سے دریافت کیا گیا کہ تم نے خلیل کو کیسا پایا اس نے بھی یہی جواب دیا کہ اس سے پہلے میں نے خلیل کی طرح کسی کو نہ دیکھا لیکن اس کی عقل اس کے علم پر غالب ہے۔ لوگوں نے دونوں کی گفتگو سنکر کہا کہ دونوں سچے ہیں کوئی شک نہیں کہ خلیل بن احمد کی عقل اس کے علم پر غالب تھی۔ یہی سبب تھا کہ مرتے دم تک وہ زاہد ترین لوگوں میں سے تھا اسی طرح ابن مقفع کا علم اس کی عقل پر غالب تھا کہ اس نے عبداللہ کی

"امان کی تحریر" ایسی لکھی جو بالآخر اس کے قتل کا موجب ہوئی۔

ابن ندیم کے نزدیک عربی کے دس بہترین انشا پردازوں میں ایک ابن مقفع بھی ہے[1]

البیان والتبیین کے مصنف کا خیال ہے کہ ابن مقفع کی طرح فن بلاغت کی کسی نے تعریف نہیں[2] کی۔

عبدالعظیم بن ابی الاصبع کا قول ہے کہ متقدمین اپنی تحریروں میں کبھی سجع کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ ہاں اثنائے کلام میں کبھی موقع کے مناسب آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ بلکہ اس سے تحریر کے حسن میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ حضرت علی کا طرز تحریر تھا اور ابن مقفع، سہل بن ہارون اور جاحظ جیسے انشا پردازوں نے اسی کی تقلید کی۔

معرّی کہتا ہے کہ متقدمین اہل علم کل اور بعض پر الف لام داخل کرتے تھے۔ اس پر اصمعی عرب کا مشہور راوی لکھتا ہے کہ میں نے ابن مقفع کی تقریباً تمام کتابیں دیکھ ڈالیں مجھ اُس کے کلام میں صرف ایک غلطی نظر آئی۔ اور وہ اس کے اس فقرہ میں العلم اکبر من ان یحاط نحو البعض یعنی بعض پر الف لام داخل کیا ہے۔

---

[1] یعنی عبداللہ ابن مقفع۔ عمارۃ بن حمزہ۔ حجر بن محمد۔ محمد بن حجر۔ انس بن ابی شیخ۔ احمد بن یوسف الکاتب سالم سعدۃ الهریز۔

[2] ابن مقفع سے دریافت کیا گیا کہ بلاغت کیا چیز ہے اُس نے جواب دیا کہ "بلاغت کا لفظ بہت سے معانی کا جامع اور بہت سی صورتوں پر حاوی ہے۔ بلاغت خاموشی میں بھی ہوتی ہے بلاغت سننے میں بھی ہوتی ہے۔ اشارہ میں بھی ہوتی ہے گفتگو میں بھی ہوتی ہے۔ دلیل پیش کرنے میں بھی ہوتی ہے۔ جواب میں بھی ہوتی ہے کسی چیز کے ابتدا کرنے میں ہوتی ہے شعر میں ہوتی ہے خطابت اور وعظ و تقریر میں ہوتی ہے۔ مکتوبات میں ہوتی ہے

متذکرہ صدر صورتوں میں اختصار اور معنی کی طرف محض اشارہ کر دینا ہی بلاغت ہے۔

بعض لوگوں نے ابن مقفع کی یہانتک تعریف کی ہے کہ اس کے الفاظ سراسر معانی
ہیں اور معانی سراسر حکمتیں، اُسکا ناصحانہ طرز بیان ہمارے لیے بس ہے۔
ابو العیناء نے ابن مقفع کا کلام سنکر کہا کہ حقیقۃً اس کی تحریر گویا بکھرے ہوئے
موتی اور سرسبز و شاداب باغات ہیں۔
جعفر بن یحییٰ کا قول ہے عبد الحمید اصل ہے اور سہل بن ہارون فرع اور ابن مقفع
ثمر ہے اور احمد بن یوسف کلی۔
ابن مقفع شاعری بہت کم کرتا تھا لیکن جب کبھی کچھ کہتا تو بہت بہتر کہتا تھا، صاحب حماسہ
نے اُس کے تین شعر نقل کئے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے یحییٰ بن زیاد کا مرثیہ لکھا
ہے لیکن اخفش کے نزدیک صحیح یہی ہے کہ اُس نے ابن ابی العوجار کا مرثیہ لکھا ہے۔

تصنیفات و تراجم:-

ابن مقفع ایک مولف و مصنف کی حیثیت سے زیادہ مشہور نہیں، بلکہ جس چیز نے اُسے
شہرت دوام کا خلعت بخشا ہے وہ اُس کے تراجم ہیں۔ قفطی کے نزدیک وہ پہلا شخص ہے جس
نے منطق کی کتابوں کو عربی میں منتقل کرنیکی جانب توجہ کی چنانچہ منصور کے لئے اس نے منطق
کی تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔ قاطیغوریاس باری ارمینیاس (یا باریمنیاس) اور انالوطیقا۔
قفطی کا خیال ہے کہ فرفوریوس کی کتاب ایساغوجی کا بھی اُسی نے ترجمہ کیا ہے۔ اغلبًا
ان کتابوں کا اس نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ یا کسی نے انکو یونانی سے نقل کیا ہے اور اس
نے انہیں عربی قالب میں ڈھال دیا۔
ابن ندیم اس کے تراجم و تصنیفات کے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ وہ دونوں زبانوں کا
ماہر تھا۔ فارسی سے اُس نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ خدا ینامہ۔ آئین نامہ۔ کلیلہ دمنہ
مزدک نامہ۔ کتاب التاج وغیرہ یہ تمام کتابیں اسی قبیل سے ہیں۔ ابن فارس نے قدیم
زمانہ میں منطق اور فلسفہ کی جن کتابوں کا یونانی زبان سے ترجمہ کیا۔ ابن مقفع نے انہیں عربی

میں منتقل کیا۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تصنیفات و تراجم کا ایک مختصر سا خاکہ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے۔

(۱) کلیلہ دمنہ۔ اس کتاب کا موضوع اصلاح اخلاق اور تہذیب نفس ہے۔ دو ہزار برس سے زیادہ عرصہ ہوا ایک ہندی فلسفی بیدپا نے ہندوستان کے ایک راجہ کے لئے تصنیف کی تھی۔ یہ راجہ سکندر کے حملہ کے بعد تمام ہندوستان پر قابض ہو گیا تھا۔ نہایت ظالم اور مستبد تھا۔ رعایا اس کی سختیوں سے پریشان تھی۔ مصنف کا مقصد یہ تھا کہ اس ذریعہ سے راجہ کی اصلاح کیجائے۔ اس نے اس کتاب میں تمام نصیحتیں جانوروں اور پرندوں کی زبانی کی ہیں۔ جیسا کہ قدیم زمانہ کے برہمنوں کا عام دستور تھا۔ وہ اپنے حکمت و فلسفہ کو جانوروں کی زبانی بیان کرتے تھے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ تناسخ کے قائل تھے اس لئے اب عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس قسم کے قصوں کی بنیاد ہندوستان میں پڑی۔ اکثر حکماء نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ لیکن اس طرز کی ایجاد کا سہرا بیدپا کے سر ہے بعد کی تمام تصنیفات اسی کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہیں۔ اور گویا اسی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں۔

اس کتاب میں وہ تمام نصیحتیں جمع کر دی گئی ہیں جن سے انسان کو روزمرہ کی زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ نیز اخلاقی اصلاح کے لئے مفید ہیں۔ یہ نصیحتیں جیسا کہ ذکر ہوا قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں ہیں جو شاخ در شاخ چلی گئی ہیں۔ یہ کتاب پہلے سنسکرت زبان میں بارہ بابوں میں تصنیف ہوئی۔ سنسکرت سے سریانی میں اسکا ترجمہ ہوا سریانی سے پہلوی یعنی قدیم فارسی میں منتقل ہوئی۔ ابن مقفع نے اسی پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا۔ اپنی طرف سے ایک مقدمہ کا بھی اضافہ کیا ہے جس میں کتاب کے محاسن کو اُجاگر کیا ہے اور اس کے مطالعہ کی پرزور سفارش کی ہے

ابن مقفع کے معاصرین اس کی اس سبقت کو رشک و حسد کی نگاہوں سے دیکھنے لگے

حتیٰ کہ بعض لوگوں نے اسکا مکرر ترجمہ کیا بعض لوگوں نے اسے نظم بھی کر ڈالا تاکہ حفظ کرنے میں آسانی ہو۔ اس میں بھی ابن مقفع سے مقابلہ آرائی مقصود تھی۔ مگر یہ تمام تراجم قبول کی سند حاصل نہ کرسکے اور خود ہی فنا ہوگئے صرف ابن مقفع کا ترجمہ باقی رہ گیا۔ اس وقت اس کتاب میں ۲۱ باب ہیں جن میں کچھ ہندی الاصل ہیں کچھ فارسی اور کچھ عربی۔ اصل سنسکرت کے بارہ باب ہیں۔ فارسی کے تین۔ عربی ترجمہ سے پہلے تین باب غیر معروف تھے جن میں ابن مقفع کا نیز ابن علی شاہ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔ ان میں بعض چیزیں عربی کے موجودہ نسخوں میں نہیں پائی جاتیں۔

پھر ہندی اصل اور پہلوی ترجمہ دونوں ضائع ہوگئے۔ صرف یہی عربی ترجمہ رہ گیا دوسری قوموں نے اسی سے اپنی زبانوں میں منتقل کیا۔ حتیٰ کہ سریانی میں بھی دوسری مرتبہ اسی سے ترجمہ کیا گیا۔ علاوہ ان زبانوں کے یونانی۔ اطالی۔ جدید فارسی۔ ترکی۔ عبرانی۔ لاطینی۔ ہسپانی۔ لعقبہ انگریزی۔ روسی ان تمام زبانوں میں عربی سے ترجمہ ہوا۔ بعد کو ان زبانوں سے پھر دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

عربی نسخہ کے اس وقت متعدد نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ بعض میں تصاویر بھی ہیں۔ مکمل کتاب صرف مرحوم خلیل یازجی نے شائع کی ہے۔

کلیلہ دمنہ منظوم

۱ سب سے پہلے اس کتاب کو ابوسہل الفضل بن نوبخت نے نظم کیا۔ یہ منصور عباسی اور اس کے بعد اس کے بیٹے کا ملازم تھا۔ اس نے فارسی کی دوسری کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔

۲۔ ابان اللاحقی۔ اس کے صرف دو شعر باقی رہ گئے ہیں۔

۳۔ علی بن داؤد۔ زبیدہ (ہارون کی بیوی) کا کاتب

۴۔ بشر بن المعتمد نے بعض حصہ کو نظم کیا۔

یہ تمام منظومات ضائع ہوگئیں۔

۵۔ ابن بہاریا (متوفی ۵۰۴ھ) کتاب کا نام "نتائج الفطنہ فی نظم کلیلہ ودمنہ" لندن، ہندوستان اور آستانہ کے کتبخانوں میں اس کے نسخے موجود ہیں، ہندوستان کا نسخہ ۱۳۱۷ھ میں بمبئی میں (لیتھو میں) شائع ہو چکا ہے دوسرا اڈیشن کسی دوسرے مقام کے نسخہ سے بعبدا (لبنان) میں (۱۹۰۰ء میں) الخوری نعمۃ اللہ الاسمر کے اہتمام سے شائع ہوا۔ کتاب نامکمل تھی اس لئے اس نے بقیہ بابوں کا خود ترجمہ کیا ہے۔

۶۔ ابن مماتی (متوفی ۶۰۶ھ) مگر اس کی نظم ضائع ہوگئی۔

۷۔ عبدالمومن بن الحسن (ساتویں صدی ہجری) اس نے پوری کتاب یا اس کے بعض حصے یا اسی طرز کی دوسری کتاب کو نظم کیا اور اسکا نام "درر الحکم فی امثال الہنود والعجم" رکھا اس کے قلمی نسخے فینا اور موونخ میں موجود ہیں۔

۸۔ جلال الدین (نویں صدی ہجری) اسکا ایک نسخہ آبا رالیسوعین (بیروت) اور ایک برٹش میوزیم میں ہے۔

۹۔ کلیلہ ودمنہ کے مقابلہ میں سہل بن ہارون نے بھی اسی طرز کی ایک کتاب کو نظم کیا لیکن یہ بھی ضائع ہوگئی۔ کتاب کا نام اس نے "کتاب ثعلہ وعفرہ" رکھا تھا۔

(۲) کتاب الادب الصغیر۔ اسکا موضوع اخلاق وحکم اور فلسفہ اجتماع ہے۔ جمیعۃ العروۃ الوثقیٰ (اسکندریہ) نے ۱۹۱۱ء میں احمد زکی پاشا کی ادارت میں بہترین شکل وصورت میں شائع کیا۔ موصوف نے اس پر ایک مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں کتاب کے طرز واسلوب پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

(۳) کتاب الدرۃ الیتیمہ اسکا دوسرا نام کتاب الادب الکبیر ہے۔ یہ بھی نصیحت وارشاد میں ہے تقریباً ۵۰ صفحوں کی ضخامت میں کئی بار شائع ہو چکی ہے۔ ابن عربی نے "غلطۃ الاسباب و ذخیرۃ الاکتساب" کے نام سے ایک تتمہ بھی لکھا ہے۔ اسکا ایک قلمی نسخہ پیرس کے کتبخانہ میں ہے۔

(۴) ایک اخلاقی رسالہ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ نور عثمانیہ (آستانہ) میں ہے۔

علاوہ اس کے اور بھی بہت سی کتابوں کا فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کا کسی موقعہ پر ذکر بھی آچکا ہے۔ انہی میں کتاب التاج نوشیرواں کے حالات پر مشتمل ہے نیز کتاب "سیر ملوک العجم"، ابن قتیبہ نے عیون الاخبار میں اسکا کچھ حصہ نقل کیا ہے۔

نمونۂ کلام

کوئی شک نہیں کہ ابن مقفع کی شہرت کے دو بڑے اسباب ہیں یعنی تراجم، اور ماہرانہ انشاپردازی لیکن وہ نرا مترجم یا محض انشا پردازہی نہ تھا بلکہ اس میں ایک زبردست اخلاقی رہنما کی شخصیت بھی نمایاں تھی۔ وہ انسان کی اجتماعی وانفرادی زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا اور ایک کامیاب غواص کی طرح ایسے بیش بہا موتی نکال لایا جن کی چمک دمک سے آج بھی نظر میں خیرہ ہیں۔ انسان کی خوبیوں اور خامیوں اور دونوں پر اس کی گہری نظر تھی۔ وہ اپنے عجیب و غریب فلسفیانہ انداز بیان میں ایک طرف ہمیں برائیوں سے منع کرتا ہے تو دوسری طرف نیکیوں کی ترغیب دیتا ہے اس کے ان حکیمانہ اقوال کو پیش نظر رکھا جائے تو بلاشبہ ہماری زندگی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ اس موقعہ پر قارئین کی خدمت میں اس کی اسی قسم کی ایک تصنیف کا مختصر سا اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف اس کی ماہرانہ انشاپردازی اور دوسری طرف اُس کے مصلحانہ اقوال کی صداقت کا کچھ اندازہ ہوجائے۔ وہو ہذا

عَمَلُ البرِ خَیرُ صاحب	نیک کام بہترین رفیق ہے
اَحَقُ ما صانَ الرجلُ اَمرَ دینہ	مذہب انسان کے لئے سب سے زیادہ حفاظت کا مستحق ہے
الالف للدنیا مغترۃ	دنیا سے محبت کرنیوالا دھوکہ میں ہے۔
احسن العفو ما کان عن عظیم الجرم من الزم نفسہ ذکر الآخرۃ اشتغل بالعمل	بہترین عفو وہ ہے جو کسی بڑے جرم پر ہو جس نے آخرت کی یاد کو اپنے لئے ضروری سمجھ لیا وہ عمل کی جانب بھی مائل ہو
المغبون من طلب ثواب الآخرۃ فی الدنیا	جو شخص آخرت کے ثواب کی دنیا میں توقع رکھے وہ دھوکہ میں ہے

الاعتراف یودی الی التوبہ	گناہوں کا اعتراف توبہ کی جانب مائل کر دیتا ہے۔
الاصرار دعاء للذنوب	جرم پر اصرار گناہوں کی زیادتی کا موجب ہے۔
الجود من بذل مالیضن بہ	سخی وہی ہے جو ایسی چیزوں کی سخاوت کرے جن سے بخل کیا جاتا ہے
الفکر مفتاح القلب	غور و فکر دل کی کنجی ہے۔
الاستماع اسلم من القول	بولنے سے سننا بہتر ہے۔
کمون الحقود الکمون النار فی العود	پوشیدہ ہے جیسا کہ ایندھن میں آگ
اکرم الاخلاق التواضع	تواضع (اور انکسار) بہترین خصلت ہے۔
التواضع یورث المحبۃ	تواضع سے محبت پیدا ہوتی ہے۔
الکبر مقرون بسوء الظن	کبر و خود پسندی سے (دلوں میں) سوء ظن پیدا ہوتا ہے
من عذب لسانہ کثر اخوانہ	جس کی زبان میٹھی ہوگی اس کے دوست کثرت سے ہونگے
من استبعد الآخرہ رکن الی الدنیا	جس نے آخرت (قیامت کو) دور جانا دنیا کی جانب مائل ہو گیا
سرور الدنیا کاحلام النائم	دنیا کی مسرت خواب کی طرح ہے۔
المغبون من طلب الدنیا بعمل الآخرۃ	جس نے آخرت کے کاموں سے دنیا کو طلب کیا وہ دھوکہ میں ہے۔
من اھلک نفسہ فی مرضاۃ غیرہ عظم جنایتہ	جس نے اپنے آپ کو دوسرے کی مرضی کے پیچھے ہلاک کر دیا اس کا جرم بہت بڑا ہے۔
انفع الکنوز العمل الصالح	مفید ترین خزانہ عمل نیک ہے۔
من ابصر العاقبۃ فاز ہا امن الندامۃ	جس نے انجام پر نظر رکھی اور اسی کو ترجیح دی وہ ملامت سے محفوظ رہا۔
من عرف ثمار الاعمال کان حقیقا ان لایغرس شرا	جو شخص اعمال کے نتائج سے واقف ہو گیا اس سے توقع ہے کہ وہ برا بیج نہ بوئے گا۔

اہن دنیا باندہ تستکمل کرامتہ	فانی دنیا کو ٹھکرا دو اپنی شرافت کی تکمیل کرو
ابقی الجروح منضاجرح الآثام	سب سے زیادہ تکلیف کو باقی رکھنے والا زخم گناہوں کا زخم ہے
ائت الی الناس ما تحب ان یوتی الیک	دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جس کو خود تم اپنے لئے پسند کرتے ہو۔
استصغر الشفقۃ اذا ادت الی منفعۃ اطلب الرحمۃ بالرحمۃ	اس شفقت کو حقیر سمجھو جس سے کسی نفع کی توقع ہو رحمت کو رحمت ہی سے طلب کرو
احب الاعمال ما دبر بالتقوی	بہترین اعمال وہی ہیں جو تقوے کے ساتھ ہوں
بالحزم تیم الظفر	احتیاط سے کامیابی حاصل ہوتی ہے
الدنیا نوم نائم والدولۃ حلم حالم	دنیا "نیند" ہے اور دولت ایک خواب
من سالم الناس ربح السلامۃ	جس نے لوگوں سے صلح جوئی کا برتاؤ رکھا محفوظ رہا۔
ومن تعدی علیہم کسب الندامۃ	اور جس نے زیادتی سے کام لیا ندامت اٹھائی۔
بادر بعمل الخیر اذا امکنک	نیک کام کے لئے جس قدر ممکن ہو جلدی کرو
الدنیا قد تدرک بالجہل کما یدرک العقل	دنیا جس طرح عقل سے حاصل ہوتی ہے جہالت سے بھی حاصل ہوتی ہے۔
من احب التزکیۃ تعرض للضحکۃ	جس نے اپنی تعریف کو پسند کیا مضحکہ بن گیا۔
احسن العمل الصالح ما کان یصدق النیۃ	بہترین نیک کام وہی ہے جو نیک نیتی کی بنا پر ہو
من حصن سرہ امن ضرر ذلک	جس نے اپنا راز مستور رکھا اس کے ضرر سے محفوظ رہا
خسر من انفق حیاتہ بغیر حقہ	جس نے اپنی زندگی کو فضول کاموں میں ضائع کیا نقصان میں رہا۔
طوبیٰ لمن ترک دنیاہ لآخرتہ	مبارک ہے وہ ہستی جس نے آخرت کے پیچھے دنیا کو ترک کر دیا

لا تمدح نفسک علی ما ترکت من الذنوب عجزاً — گناہوں کو مجبوراً ترک کرنے پر اپنی تعریف مت کرو

لا رای لمن انفرد برایہ — اس شخص کی کوئی رائے نہیں جو اپنی رائے میں تنہا ہے

من ترک رای ذوی النصیحۃ اتباعاً لما یشتہی استوخم العاقبۃ — جس نے اپنی خواہشات کے پیچھے نصیحتوں کو پس پشت ڈال دیا برا انجام دیکھے گا

المشاورۃ اوثق ظہیر — مشورہ قابل اعتماد معین ہے

المستشار موتمن — جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہے

باجالۃ الرائے تظفر بالحزم — ہر بات کے متفرق پہلوؤں پر نظر کرنے سے احتیاط حاصل ہوتی ہے۔

استوجب الطاعۃ من ذوی الرائے بالمودۃ — اصحاب رائے کی اطاعت دوستی سے حاصل کرو

کثرۃ اعمال السوء مضرۃ بالعمل — برے کاموں کی کثرت نقصان رساں ہے

الصنیعۃ عند الکفور لا تثمر الا مرا — ناشکر پر احسان کرنا کڑوا پھل پیدا کرتا ہے

اکثر محادثۃ من نصیحتک عن عیوبک — جو تمہارے عیوب راستی سے بتائے اس سے زیادہ میل کرو۔

اکمل النصحاء من لم یکتم صاحبہ نصیحۃ وان استقلہا — حقیقی طور پر نصیحت کرنیوالا وہی ہے جو اپنی نصیحت اور مشورہ کو دوست پر ظاہر کر دے خواہ وہ اسے کیسا ہی حقیر سمجھتا ہو۔

استعن بالصبر لاطفاء الغضب — غصہ کی آگ فرو کرنیکے لئے صبر سے کام لو

لا تجنین علی نفسک عداوۃ وبغضۃ اتکالاً علی ما عندک من العمل والقوۃ والمنعۃ — اپنے اقتدار حفاظت اور عمل پر بھروسہ کرکے خواہ مخواہ کسی سے عداوت وکینہ مول نہ لو۔

کن فی الحرص علی معرفۃ عیبک بمنزلۃ عدوک فی معرفۃ ذلک — اپنے عیوب کی جستجو دشمن کی طرح کرو

البصیر من عرف ضرہ من نفعہ	دور اندیش وہی ہے جو اپنے نفع نقصان کو سمجھتا ہے
ربما تحولت البغضاء مودۃ والمودۃ بغضاء	بسا اوقات محبت عداوت اور عداوت محبت سے بدل جاتی ہے۔
قرب الصالحین داع للصلاح	پاک لوگوں کی صحبت سے انسان میں پاکی پیدا ہوتی ہے
	مفلس کو اس کے عزیز بھی بری نظروں سے دیکھتے ہیں۔
لا تغتر الاقو بالفضل قوتہم علی الضعفاء	طاقتور کمزوروں پر اپنی قوت واقتدار کی وجہ سے دھوکہ نہ کھائیں
الضعیف المحترس من العداوۃ اقرب الی السلامۃ من القوی المغتر	عداوت سے محفوظ رہنے والا کمزور بر خود غلط طاقتور سے زیادہ مامون ہے۔
من قل کلامہ حمد عقلہ	کم سخن کی عقل کی تعریف کیجائیگی۔
من عرف قدرہ قل افراط	جس نے اپنی حیثیت کا اندازہ کر لیا وہ افراط تفریط سے محفوظ رہا۔
احسن والدولۃ لک عین والدولۃ علیک	اپنی مقدرت کے وقت اچھا سلوک کرو مصیبت کے وقت تمہارے ساتھ بھی سلوک کیا جائیگا۔
من حرم عقلہ رزی دنیاہ وآخرتہ	عقل سے محرومی دنیا وآخرت دونوں کی خرابی کا باعث ہے۔
العجب آفۃ العقل	خود پسندی عقل کی تباہی ہے
الہم مرض العقل	غم وفکر عقل کی بیماری ہے
احذر صولۃ اللئیم اذا شبع	گنوار پیٹ بھرے کے حملہ سے بچو۔

الاحسان يقطع اللسان[1] — احسان زبان کو بند کر دیتا ہے۔

احسن المدح اصدقہ — تعریف میں جتنی صداقت ہوگی اتنی ہی بہتر ہوگی۔

طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ پوری کتاب نقل کر دی جائے اگر قارئین کرام نے پسند کیا اور فرصت ملی تو ارادہ ہے کہ کسی آئندہ صحبت میں ابن مقفع کی اس قسم کی کتابوں کے مفید اقتباسات پیش کئے جائیں۔

---

[1] رسائل البلغا مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹ - ۱۲۰

کبیر

ڈاکٹر ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور Evalyn Underhill نے ان نظموں کے مجموعہ پر ایک دلچسپ تمہید لکھی ہے۔ یہ مضمون اسی تمہید کا ترجمہ ہے

ہندوستان کی تاریخ تصوف میں کبیر ایک نہایت ہی دلچسپ شخصیت ہے۔ وہ ۱۴۴۰ء سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوا۔ مقام ولادت بنارس کے مضافات میں کوئی جگہ تھی۔ روایات اس کے والدین کو مسلمان بتاتی ہیں لیکن اوائل عمر ہی میں وہ مشہور ہندو زاہد راما نند کے حلقۂ ارادت و عقیدت میں داخل ہو گیا۔ راما نند شمالی ہند میں اس دینی اصلاح و تجدید کا مبلغ ہے جس کی جنوبی ہند میں بارہویں صدی مسیحی میں "برہمنیت" کے مصلح اعظم رامانج نے دعوت دی۔ یہ تحریک اصلاح ایک ردِ فعل تھا اُس عہد کی "روز افزوں پابستگی رسم و رہ عام" کا۔ نیز اُن ایام کے فلسفۂ ویدانت میں ضرورت سے زاید ذہنی غلو پیدا ہو گیا تھا اور داعیاتِ قلب کے لئے اسمیں کوئی عنصر باقی نہ رہا تھا، پس دل و دماغ کے مطلوبہ توازن کا از سر نو قیام بھی مذکورہ بالا حرکت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد تھا مزید براں مشربِ ویدانت میں توحید وجودی کا مسلک مبالغہ آمیز حد تک پہونچ گیا تھا چنانچہ یہ افراط و تفریط بھی محتاجِ اصلاح تھی۔ رامانج کی شریعت میں ہستی مطلق وشنو دیوتا کی شکل میں جلوہ آرا ہوئی۔ اور اُسکا مذہب ایک "ملت عشق" کا داعی بنا ہر قوم کی ذہنی ارتقا کی تاریخ کے ایک خاص مرحلے میں یہ مظہر ضرور نظر آتا ہے۔ اور اگرچہ نفوس انسانی کے اس مخصوص اقدام میں بجائے دماغی افکار کے دل کے جذبات زیادہ کارفرما ہوا کرتے ہیں، لیکن اس "سیلاب قلب" کے سامنے فلسفہ و حکمت کی ساری دانش آموزیاں خس و خاشاک سے زیادہ سدراہ ثابت نہیں ہوتیں۔

اگرچہ یہ روح ہندو مذہب کی خصوصیت ہے اور بھگوت گیتا کے بہت سے مقامات اس کے روشن مظاہر ہیں لیکن ہندوستان کی تاریخ مذہبیات کے دور وسطیٰ میں اُس نے جو نشاۃ ثانیہ اختیار کی اس میں ایک مفرط قسم کا تضاد بین العناصر پیدا ہو گیا تھا۔ راما نند جس نے اپنی ساری روح کبیر کے سینہ میں منتقل کر دی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مذاہب عالم کا ایک بہت بڑا وسیع النظر فاضل تھا۔ اس کے علاوہ وہ داعیانہ جوش وخروش سے ایک لبریز دل رکھتا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ جلیل القدر فارسی شعرائے متصوفین عطارؔ سعدیؔ، رومیؔ، حافظؔ وغیرہم ہندوستان کے افکار مذہبی کو اپنے طوفان تخیل اور طغیانی تصور سے زبردست تھپیڑے دے رہے تھے اور دنیائے قلب و روح کی ان بیرونی حملہ آوروں سے دست وگریباں ہونے کے لئے ہندی فلسفہ وحکمت کے کارزار میں "محاذ کے بدلنے" کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ راما نند وقت کی ضرورت کی اس خاموش آواز پر اٹھا۔ اس نے بجائے طبل جنگ بجانے کے صلح کا سفید جھنڈا بلند کیا اور ایک تجویز مفاہمت ومصالحت پیش کی۔ اس طرح اسلامی تصوف اور برہمنی روایاتی فلسفہ کا ایک "مجمع البحرین" وجود میں آیا۔ بعض محققین اس "ثنویت" کو "تثلیث" کے رنگ میں دیکھتے معلوم ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس معجون مرکب میں مسیحی عقائد اور مشرب حیات کا عنصر بھی شامل تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسا معرکۃ الآرا نقطۂ بحث ہے جس پر مستند فضلا بالکل متضاد قسم کی آراء رکھتے ہیں اس لئے اس کو اس جگہ چھیڑنا بے محل ہوگا۔ تاہم مذکورۂ بالا حقیقت معناً ضرور صحیح ہے اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ راما نند اور کبیر کا ہندوستان میں بہایا ہوا یہ چشمہ ایک اسی قسم کی "تربینی" تھا جیسا کہ قرن اول کا مسیحی کلیسا جس میں اسرائیلی مذہب کے بہت سے معتقدات اور یونانی فلسفہ الٰہیات کے بیشتر خیالات ونظریات کی آمیزش ہے لطف یہ ہے کہ ہر دو موقعوں پر یہ تینوں عناصر مشہور "عناصر اربعہ جسم انسانی" کی طرح آپس میں متغائر ومتصادم ہیں! کبیر کے استثنائی دماغ کی قدرت، تخلیق و

تسویہ" کا یہ ایک حیرت انگیز کرشمہ ہے کہ اُس نے ان متعارض اجزا کو ایک واحد مرکب میں ہم رشتہ اور پیوستہ کر کے باہم شیر و شکر کر دیا!

تجدید مذہب کے کوچہ میں کبیر ایک بے بدل مجدد ہے۔ وہ ایک مستقل ملت توحیدی کا سرچشمہ ہے جو "کبیر پنتھ" کہلاتا ہے اور جس کے رشتۂ عقیدت میں اب بھی شمالی ہند کے قریباً ایک لاکھ ہندو وابستہ گلو ہیں، وہ بالکل صوفیانہ رنگ کا ایک شاعر ہے جو "ترک رسوم" اور "کیش محبت" کا پیام مستانہ دیتا ہے اور آج بھی اپنے دوہوں اور بھجنوں کے اندر "حی و لایموت" ہے! اسکا حشر بھی اُسی کی طرح کے دوسرے "معلنین حق" کا سا ہوا جنہوں نے شاہد حقیقت کے عالم آشوب چہرے کو اپنے "دست بیباک" سے بےنقاب کر دیا اور ببانگ دہل کہدیا کہ۔

حرم جویاں درے را می پرستند   فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد   کہ یاراں دیگرے را می پرستند

یہ تھا کبیر کا نعرۂ رندانہ!

سر خدا کہ زاہد و عابد کسے نگفت   در حیرتم کہ مغبچہ از کجا شنید!

اس نے خلق خدا کو دوبارہ "عیال اللہ" کے نام سے پکارا! العظمت للہ! لیکن اس بوالعجبی کو دیکھو کہ اُس کے شیدائیوں نے اُس کی محبوب یاد میں ایک ایسی یادگار قائم کی جو اُسی قسم کی بدعت بن گئی جس کے لئے کبیر کا وجود قدسی عرصہ تک "سنگ نقش" بنا رہا!

بازایں بیت الحرم بتخانہ شد!

لیکن اُس کے ترانے اور زمزمے سچے محتسب بنکر آج بھی "تازیانہ بدست" ہیں اور اسکو اپنے قدیم لباس حقیقت میں متلاشیان مقصود کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

کبیر کی روح اس کے مستند کلام کے انہی پیکروں میں نظر آسکتی ہے اور اس

کے نام اور پنتھ کے ساتھ بہت سی منسوبات محض حقیقت کو مستور کرنے کا سامان ہیں۔

درسخن پنہاں شدم مانند بو اندر گلے
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

کبیر کے کلام میں عاشقانہ وحق پرستانہ جذبات کی ایک وسیع فضا اپنی ساری ممکن پہنائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔ بلند ترین حقایق مجردہ، شاہد سرمدیت کے ساتھ اشتیاق وصال۔ اور معراج عشق و وصول کی ذاتی واردا تیں بڑے پیارے اور گہریلو استعاروں اور تشبیہوں میں بیان کی گئی ہیں۔ کبیر اپنی زبان میں ہندو اور مسلمان ہر دو اصطلاحات اور الفاظ سے آزادانہ کام لیتا ہے اور ہر دو مذاہب کے اعتقادات و روایات کی بلا تکلف و پرہیز تلمیح وکنایہ کرتا ہے! چنانچہ ان نظموں کے مصنف کی نسبت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ آیا وہ برہمن ہے یا شیخ، سادھو ہے یا صوفی، ویدانت کا معتقد ہے یا وشنو کا پرستار! وہ " لانفرق بین احد منہم " کا کلمہ گو معلوم ہوتا ہے!

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں!

کبیر کہتا ہے کہ " میں عبد اللہ بھی ہوں اور بھگت رام بھی! "

عارف ہم از اسلام خراب ست وہم از کفر
پروانہ چراغ حرم و دیر نداند!

الغرض بالفاظِ دیگر و بمعنی کبیر۔

یک چراغیست درین خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند!

کبیر کی حیات کے گرد اگر گوناگوں اور متضاد مطلب داستانوں اور افسانوں کا ہجوم ہے جن میں سے کسی کو تکیہ اعتماد نہیں بنایا جاسکتا ان میں سے کچھ ہندوؤں نے لکھے ہیں اور کچھ مسلمان اہل قصص کی تراوش قلم ہیں اور ہر ایک گروہ باری باری سے اس کو اپنی ملت کا فرد ثابت کرنا چاہتا ہے۔ اسکا نام بلاشبہ اُس کی مسلم ولدیت کا ایک قطعی ثبوت ہے اور غالباً سب سے زیادہ مستند وہ روایت ہے جس میں کبیر کو بنارس کے ایک مسلمان نورباف کا لیپالک بتایا گیا ہے، لیکن عارفان حقیقت جانتے ہیں کہ کبیر تو اس زمرہ مخلصان

خدا کا ایک شخص ہے جن کی نسبت کہا گیا ہے:

ما پرتو آفتاب حسن ازلیم　　فرزند نہ ایم آدم و حوارا!

بنارس کبیر کا مشہور مولد و منشا ہے۔ پندرھویں صدی کے شہر بنارس میں مختلف ادیان و مذاہب کے سرچشموں کے سوتے پہلو بہ پہلو بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ دراصل اس وقت کے مذہبی جغرافیہ میں رُود دجلہ اور گنگا ندی کا سنگم اسی "دوسرے پریاگ" (بنارس) میں دکھائی دیتا ہے۔ راما نند کی شہرت کا آفتاب آج کل نصف النہار پر تھا اور اُس کا جدید مسلک اہل ویدانت اور ارباب تصوف ہر دو کے لئے ایک یکساں دعوت اور ایک مشترکہ مبحثِ نظر بن گیا تھا۔ نوخیز کبیر جس کے سینہ میں آتش حق کے شرارے پوشیدہ تھے۔ اُس نے بہت جلد دیکھ لیا کہ اس تصادم احزاب اور جنگ ذرگری میں میرا اگر کوئی موزوں مرشد ہو سکتا ہے تو وہ راما نند ہے۔ لیکن کبیر نے دیکھا کہ رسائی شیخ کی راہ میں تفریق مذہب کی کیسی سد سکندری حائل ہے!

الغرض اس کو ایک تدبیر سوجھی اور وہ بزبان حال یہ کہتا ہوا کہ،

تھوڑی سی اگر خاک ترے راہگزر کی　　ملجائے تو بن جائے دوا درد جگر کی!

اسی گھاٹ کی سیڑھیوں پر جا کر لیٹ گیا جو راما نند کے اشنان کرنے کی جگہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی طرف جاتے ہوئے ہندو درویش کا پاؤں لاعلمی میں کبیر پر پڑ گیا اور "رام رام رام!" مضطربانہ کلمات اُس کی زبان پر تھے۔ کبیر فوراً بول اُٹھا کہ "میں آپ کا چیلہ ہو گیا اور میں نے گرو کے منہ میں وہ شبد سُن لئے جو وہ اپنے مت میں داخل کرتے ہوئے بولا کرتے ہیں!"

یہ ایک عجیب منظر تھا! برہمنوں نے اس بدعت پر سخت اعتراض کیا جس کا مطالبہ کبیر نے راما نند کر سے کرنا چاہا تھا۔ مسلمان اہل شریعت نے بھی اس کو ارتداد و الحاد کی ہم معنی سمجھا۔ دونوں ملتوں کے لوگوں کے لئے مذہبی مراسم کے مسلمہ آئین کا یہ استہزا تخت

برافروختگی کا باعث ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کبیر کی یہ نرالی درخواست راما نند کے لئے ناقابل رد ثابت ہوئی اور جلد کبیر راما نند کا مرید رشید بن گیا۔ بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ کبیر راما نند کی فلسفۂ حیات کی عملی تفسیر تھا۔ ہندو مجتہد و مجدد نے جو نیا مشرب زندگی اپنی زبان و خیال سے پیش کیا تھا اسکو عملی جامہ پہنوانے کا سہرا کبیر کی بیباکانہ اقدام کے سر ہی ہے جس نے راما نند کے قدموں کو بھی اس سطح تک بلند کر دیا جہانتک ابھی اُس کے شہپر تخیل ہی کی رسائی ہوئی تھی! کبیر کے بعض مسلمان سیرت نگاروں کا بیان ہے کہ کبیر مشہور صوفی بزرگ پیر تقی جھانسوی کے حلقہ رشد و ہدایت کا ایک فیضیاب ہے، مگر اس نظریے کو قبول کرنا ذرا مشکل ہے اس لئے کہ خود کبیر اپنے کلام کے صفحات میں جہاں اپنے پیر کی بزم سلوک و طریقت آراستہ کیا کرتا ہے تو وہاں اس مسند ارشاد پر صرف راما نند کو بٹھاتا ہے بیشک اس قسم کے لوگ زیادہ تر "تلامیذ الرحمٰن" کہے جانیکے زیادہ مستحق ہیں اور وہ عملاً کوئی رہبر بجز ہادی مطلق اور اپنے "قلب سلیم" کے نہیں رکھتے، لیکن یہ ایک دوسرا نقطۂ نظر ہے۔ الغرض انسانی مرشدوں میں کبیر کو بجز راما نند کے کسی اور بزرگ سے تلمذ نہیں معلوم ہوتا۔

کبیر کے متعلق جو مختصر اور مستند تاریخ ہم تک پہونچی ہے وہ کبیر کی زندگی کے بارے میں متداول اور معروف روایات کے بیشتر حصہ کی تغلیط کرتی ہے۔ جن جن مراتب معرفت سے وہ اپنے ارتقاء روحانی کے دوران میں گزرا، اور جس طریقہ سے وہ واصل باللہ ہوا اُس کے متعلق ہم یکسر تاریکی میں ہیں۔ وہ سالہا سال تک اپنے آقا کی خدمت، صحبت میں رہا اور اُن بہ کثرت مذہبی و فلسفیانہ مباحثوں و مناظروں میں حصہ لیتا رہا تھا جو راما نند کے ساتھ برہمنوں اور ملاؤں نے کئے۔ ہندو اور مسلمان مکاتب فلسفہ کی جو جو اصطلاحیں اُس کی زبان زد معلوم ہوتی ہیں اُن سے آشنا ہونے کے غالباً یہی موقعے ہوں گے۔ ممکن ہے کہ اس نے ہندو جوگیوں اور صوفی مفکرین کے

طریق ذکر و شغل کا اتباع کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن اس قدر قطعی ہے کہ اس نے ان ہر دو جماعتوں میں سے کسی کے بھی دستور العمل حیات کو کبھی قبول نہیں کیا۔ وہ نہ کبھی چلہ کش درویش بنا اور نہ تارک الدنیا اور صحرا نشین جوگی۔ اُس نے نہ دماغ و حواس کو مختل کرنیوالے وظیفے پڑھے اور نہ اعضا و جوارح کی تکلیف و تعذیب دینے والی تپسیائیں کیں! مرشد ازل کی خاموش تربیت نے اُس کے قلب کو یہ سارے ادب آموزانہ اور معرفت آگاہانہ مراتب طے کرا دیے تھے اس کی زندگی بظاہر ایک پاکیزہ مذاق اور خوش باش دنیا دار آدمی کی سی زندگی تھی۔ وہ موسیقی سے کافی ذوق رکھتا تھا اور مشق سخن کے چسکے سے بھی خالی نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ بصورت ظاہر وہ بجائے فنافی اللہ درویش کے ایک دنیاوی "صناع" کا شغل رکھتا تھا! اُس کے بارے میں جسقدر قصے اور افسانے ہیں سب میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر دیکھی جاتی ہیں: وہ ایک جولاہا تھا اور تعلیم و خواندگی کے اعتبار سے محض اُمی، اُسکا ذریعہ بقول شخصے اسی طرح تھا کہ وہ "در کارگاہ خود دست و پا میزد"۔ عمر خیام (خیمہ دوز) اور بوہے کفش دوز کی طرح اس کے پیشہ نے بھی اس کو تخیل اور صنعت کے باہمی امتزاج کی تعلیم دی تھی! چنانچہ اس طرح اس کا عامیانہ پیشہ اس کی بلند تر ذہنی اور روحانی زندگی میں ہارج نہ ہوا بلکہ ایک گونہ اُسکا رہنما و معاون بنا! وہ رُہبانیت سے بمراحل دور تھا، اس نے رشتہ ازدواج میں اپنے کو منسلک کیا تھا اور ایک متاہلانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اُسکا دنیاوی گھر زن و فرزند کے غوغا سے آباد تھا! اگرچہ یہ وہ واقعہ نفس الامری ہے جس کے اخفا کرنے کی ہندو سیرت نگاروں نے بیسود کوشش کی ہے، یا بعض نے اگر دبی زبان سے اسکا اعتراف کیا ہے تو انتہائی ایجاز بیانی سے کام لیتے ہوئے صرف اس کے سرسری ذکر پر اکتفا کیا ہے اور علانیہ اسکی تفصیل یا توجیہ سے گریز کیا ہے! لیکن حقیقت واقعہ سے انکار ممکن ہے الغرض کبیر "مخلوق میں شامل" اور "اللہ سے دو اصل" ہو کر زندگی بسر کرنے میں

مولانائے رومی کے اس ناقدانہ مسلک حیات کا قائل تھا کہ :

چیست دنیا از خدا غافل بُدن　　نے قماش و نقرہ و فرزند وزن

اس طرح ہم کو پتہ لگتا ہے کہ کبیرؔ کے اسی دل سوز و بلند اور وہ ولولہ انگیز نغمہائے عشق حقیقی نکلے ہیں جو اسی سطح سفلی و ارضی پر اُسوقت اُس کے سینہ میں دھڑکا کرتا تھا جبکہ وہ اپنے بال بچوں کے حلقے میں بیٹھا ہوتا تھا! اُسکا سارا کلام جس میں اس نے اپنے نظام فلسفہ کو بے نقاب کیا ہے اُسکی اسی واقعی زندگی کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ وہ بار بار گھر کی زندگی کی تقدیس کرتا ہے، روزمرہ کے اعمال و فرائض حیات کی اہمیت، عظمت اور واقعیت کو بیان کرتا ہے، اور پھر اسی تاہل میں تجرد کی، اور اسی سفلیت میں علویت کی، اور اسی ارضیت میں سماویت کے مواقع اور جلوے شمار کراتا ہے! وہ پیشہ ور جوگی کے نمائشی تقدس کا مضحکہ اڑاتا ہے جو بقول اُس کے "اپنی داڑھی چھوڑ کر اور لٹیں بڑھا کر بجائے انسان کامل بننے کے ایک حیوان مکمل (بکرا) بن گیا ہے! اور اسی طرح اس حماقت اور منافقت میں وہ اُن سب لوگوں کو شامل کرتا ہے جو اُس دنیا سے فرار کرنے پر مائل ہیں جو ایک تزکیہ طلب انسان کی ریاضت نفس کا اصلی میدان ہو اور جس کا جمالی پہلو کچھ کم دلکش نہیں، جو حسن و عشق، مسرت و الفت، مروت و قربانی کے مناظر و مظاہر سے معمور ہے اور "اُس حقیقت عظمےٰ اور محبت کبرائے کا پرتو گاہ ہے جو محیط کل اور مشہور عالم ہے!"

کبیرؔ جس مجتہدانہ وسعت نظر اور جس مجددانہ بیباکی کا پیکر تھا۔ اُسکا اندازہ آسان نہیں۔ ہندو و مسلم دونوں حلقوں کے نمائش گر زہد و اتقا کی بارگاہ میں کبیرؔ علانیہ ایک ناسک یا ملحد کی نوعیت رکھتا تھا! تمام مروجہ مسلکوں اور مشربوں سے اُس کی بیزاری جملہ رسمی و بیرونی عبادات سے اس کی نفرت ـــــ جس میں وہ ایسا ہی متشدد تھا جیسا کہ عیسائی ممالک کا مسیحی فرقہ کوئیکرز نظر آتا ہے۔ ان سب باتوں میں اہل تقوے د

ارباب صلاح کی نگاہوں سے اس کو "خطرناک آدمی" کا خطاب دلوا دیا تھا اور مسجد و مندر ہر دو جگہ سے وہ مردود و مخرج کر دیا گیا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس کی نرالی روش نے عام مجالس و معابد انسانی کے اندر اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رکھی تھی۔ وہ نہ نماز کا قائل تھا نہ "سندھیا" کا معتقد، وہ "خدا کو نہ کعبہ میں پاتا تھا نہ کیلاش میں"! جو لوگ اس کے پاس جانا چاہتے تھے ان کی آنکھوں سے وہ پردہ نہ کرتا تھا، لیکن عوام کالانعام کی ذہنیت اور اس کے دل و دماغ کے مابین ایک وسیع و عریض "حجاباً مستورا" حائل ہو جاتا تھا! کبیر کے صرف خیالات عجیب تھے، ورنہ خود کبیر کا وجود جسدی کوئی ندرت نہ رکھتا تھا، چنانچہ وہ عموماً ہر گلی کوچے میں مارا مارا پھرتا تھا جہاں کہ در و دیوار اس کو خطاب کرتے تھے اور معرفت آموزی اس کی "صحبت انام" کا یہ حال تھا کہ وہ "تقدس مآب زاہد ریاکار سے زیادہ دھوبیوں اور بڑھیوں کے لئے زیادہ قابل رسائی تھا"! زہد و تقوے اور عبادت و ریاضت کی ساری کارگاہ۔ ہندو ہو خواہ مسلم یعنی قربانگاہ و مسجد، دیوتا اور یوترجل، مقدس نوشتے اور جبہ پوش مفتی و واعظ۔ یہ سب اس صاحب بصیرت و معرفت شاعر کی آنکھ میں ایک پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہ رکھتے تھے وہ ان کو روح کی جگہ پر جسم، حقیقت کے موقعہ پر مجاز، خلوص و صداقت کے بجائے چند بیجان اور نقلی چوبین مجسمے سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ سب حجابات بن کر روح اور اس کے مطلوب حقیقی ہستی مطلق کے درمیان سنگ گراں بن گئے ہیں!

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود　　　رفتیم و صنم بر در میخانہ شکستیم!

چنانچہ کبیر کہتا ہے:

"بت بیجان پارہائے سنگ ہیں۔ وہ ہرگز بول نہیں سکتے۔ میں نے ان کو پکار کے دیکھ لیا ہے۔ پران اور قرآن محض الفاظ ہیں، میں نے دونوں کتابوں کی جلدیں کھولکر دیکھ لیا ہے"!

ان بت شکن خیالات کو لیکر کبیر ہندوستان کے سب سے بڑے تھانے بنارس

میں اپنی دھونی رماتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نے گویا آتشِ نمرود کو عین مرکزِ نمرود میں موجِ سوزش دی تھی! برہمنوں کے پاس اس مردِ حق کیساتھ نبٹنے کی کوئی طاقت نہ تھی تاہم اپنی مایوسانہ جدوجہد میں انہوں نے ایک طاغوتی کوشش کی اور بخیالِ خویش فتنہ زن کی سب سے زبردست آزمائش میں اس کو ڈالنا چاہا۔ انہوں نے ایک خوبصورت لڑکی کو اس کے پاس بھیجا لیکن اس خطرناک ترغیبِ لغزش کا بالکل برعکس نتیجہ ہوا یعنی خود حسین شکار افگن اس خاکستر مالیدہ مجنونِ حق کا شکار ہو گئی!

حریفوں نے اس پری جمال اور پُرشباب دوشیزہ کو کبیرؔ کے ذوقِ جمالیت کیلئے بہترین تحفہ سمجھا ہو گا لیکن ان کو کیا معلوم تھا کہ انکا مقابل جو عاشقِ حق ہے اُس کا شمار اُن ربانی مستوں میں تھا جن کے ایک فرد نے اس سے کہیں زیادہ دلربایانہ پیشکش کے ہدیہ کئے جانے کے وقت کہدیا تھا۔

بلائے جان ہیں شہیدوں کو تری حور و قصور یہ کیا عذاب ملا ہے ثواب کے بدلے؟!

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کبیرؔ بادشاہ وقت (سکندر لودی) کے حضور میں بایں جرم پیش کیا گیا کہ وہ آلہی معجزہ کاریوں اور کرشمہ سازیوں کی طاقت کا اپنے میں مدعی ہے لیکن سکندر لودی جیسے شائستہ اور مہذب دل و دماغ کے تاجدار سے ایسی بدمذاقی کا ارتکاب ممکن نہ تھا جس کی توقع ناآشنائے واقعات فتنہ جو لوگوں کو تھی۔ سکندر لودی کے سامنے اسلام کے صوفی شعراء و عرفاء کے بیشمار کلمات و ملفوظات تھے اور کبیرؔ گویا زبانِ حال سے اپنی برات میں شریعتِ عاشقی و مجذوبی کی اس آیۂ بینہ کو پیش کر رہا تھا۔

نہ تنہا من دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطارؔ ہم مست!

کبیرؔ برہمنوں کی زد سے کسی قدر باہر بھی تھا کیونکہ آخر کار وہ مسلمان ماں باپ کا فرزند تھا اور کم و بیش ملتِ اسلامی کے صوفی شعراء کے ذیل میں شمار ہوتا تھا جن کی مستانہ نوائیوں سے مسلمان سلاطین و اربابِ افتاء بے خبر نہ تھے اور جن کے لئے شریعت کے

"باب رخصت" میں کافی رعایت رکھی گئی ہے۔ الغرض کبیرؔ اس قسم کے احتسابات سے محفوظ و مستثنیٰ تھا اگرچہ مصالح "امن و آئین" کے لئے اتنا ضرور کیا گیا کہ اس کو بنارس سے خارج البلد کر دیا گیا!

جرم عشق کی پاداش میں سیاست مذہب کے دارالقضا کی یہ جلا وطنی ۱۴۹۵ء کا واقعہ ہے۔ کبیرؔ کی مستند سیرت کا یہ آخری حادثہ ہے جو ہم تک پہونچا ہے۔ اجارہ داران "امن عامہ" کو کون بتانے والا تھا کہ کبیرؔ کی نقیض امن ہستی توام روحانیت و معرفت کا نمک تھی ؎

ہم سے وفا پرست اگر کار جنوں کو چھوڑ دیں اہل خرد کے درمیان جوش بڑا فساد ہو!

کبیر بنارس سے کیا نکلا اُسکی محدود خلوت ایک وسیع جلوت سے بدل گئی اور یہ سفر ہجرت ہمیشہ کے لئے اس کے پاؤں کا چکر بن گئی اُس نے سارے ہندوستان کا بار بار دورہ لگایا اور بشیار معتقدین اور اصحاب ذوق و اخلاص کو مستفیض کیا "کاشی نواسی" کے بجائے اب وہ پورا "بھارت باشی" ہو گیا!

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو!

کبیرؔ نے اس واقعے کو ایک "امر مقتضیٰ" سمجھا۔ وہ اس بظاہر اتفاقی افتاد میں ایک لطیفۂ غیبی نہاں دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ عاشقوں اور ملت عشق کے داعیوں کے اتباع سنت کی سعادت اُسی آوارہ گردی اور غریب الوطنی کے طفیل میں نصیب ہوئی! ع

خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا!

آخر کار ۱۵۱۸ء میں یہ "بُدھا جوان حق" ایسے عالم ضعیفی میں کہ اس کی انگلیاں "خشک تار و خشک چوب خشک پوست" سے "آواز دوست" نکالنے سے عاری ہو رہی تھیں شہر گورکھپور کے ایک نواحی مقام مگہر میں واصل باللہ ہو گیا۔

ایک بڑا ہی البیلا افسانہ کبیر کے واقعۂ وفات کے ساتھ وابستہ ہے کہتے ہیں کہ اُس

کے وصال کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس حق پر نزاع ہوئی کہ اس کی "مقدس خاک" کا وارث کون سا گروہ ہے ہردو فریق اپنے اپنے دعوے پر مصر تھے ۔ اول الذکر اس کو جلانا چاہتے تھے اور آخر الذکر اس کی تکفین و تدفین کرنے کے درپے تھے ۔ الغرض کبیر کا جسد خاکی ہندو اور مسلمان تفرقہ پسندوں اور خود بینوں کو عاشقان ربانی کی بے کیشی کا ایک آخری زندہ سبق دینے کے لئے ایک دفعہ پھر اٹھا ! کبیر یکبارگی اپنے دونوں پرخود غلط سوگواروں کے سامنے ایک لمحے کے لئے ظاہر ہوا اور اُن سے درخواست کی کہ جس جنازے کی ملکیت کے مدعی ہیں وہ ذرا کفن اٹھا کر اُس کی شناخت کرلیں ۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کیا دیکھتے ہیں کہ کفن کے نیچے کبیر کی نعش غائب ہے اور بیت پھولوں کی ایک سیج بنی ہوئی ہے ! فسبحان اللہ عما تصفون !

اے بے خبران راہ نہ آنست نہ ایں !

(۲)

صوفی شاعری کی تاریخ کا تبصرہ کرتے ہوئے اُس کے آغاز کی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ وہ اہل ظاہر کی مادہ پرستی اور استخوان فروشی کے خلاف ایک طبعی ردعمل تھا مگر اس کی ولادت میں ایک دوسرے عامل نفسیاتی کو بھی دخل ہے ۔ یہ اسکا داعیانہ و مبشرانہ جذبہ ہے ۔ جب اجارہ داران مذہب اور عوام کالانعام کی نفس پروریوں اور بے بصریوں سے حقیقت مذہب کے اوپر سینکڑوں پردے پڑجاتے ہیں اور تعصب و تکفیر بین الملل کی وبا عالمگیر ہوجاتی ہے تو ایک صاحب دل مردخدا اٹھتا ہے اور بیباکانہ شاہد حقیقت کی طلعت زیبا کو بے نقاب کردیتا ہے ۔ وہ بندۂ خدا کے درمیان کے سارے انسانی و مصنوعی حجابات کو چاک کردیتا ہے وہ "عاشق و معشوق کے درمیان کے راز سربستہ" کی خلوت میں "کراماً کاتبین" کو بھی حائل نہیں دیکھ سکتا ! وہ براہ راست دیار معشوق تک پرواز کرتا ہے اور پھر "وصال دوست کی شب معراج" کے قصہ کو بلاخوف تردید سب کے سامنے بیان کرتا ہے !

وہ عالم وجد میں اپنے قوال روح سے فرمائش کرتا ہے:۔

ہاں مطربم از بہر دل زار بگو • افسانۂ آں شبے کہ بایار گذشت!

ہاں تو صوفیانہ شاعری کے دوگونہ اثرات ہیں۔ وہ شاعر دعاشق کی واردات قلب کی روداد ہے اور چونکہ بیحد مجرمانہ، مخلصانہ، صادقانہ، اور پرجوش ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نتیجہ میں اور اپنی ابتدا و انتہا کی یکسانی میں "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق ہوتی ہے۔ وہ ایسا "قال" ہوتا ہے جو عین "حال" ہے، اس لئے اس سے محفل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور بیشتر حالات میں سامعین کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے ایک شاعر و عاشق، شمع سے مشتاقانہ سوال کرتا ہے کہ،

از کجا ایں آتش عالم فروز اندوختی؟ کرمک بیچارہ را سوز کلیم آموختی!

اور یہ حقیقت افروز جواب پاکر اپنے اندر تاثر و تاثیر کی دو طرفہ صفات پاکر اپنی ہستی کی تکمیل کرتا ہے۔

درغم دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

عالم واعظین و مذکرین کی ہرزہ سرائی کے "صدا بصحرا" ثابت ہونیکی توجیہ اس کی زبان میں یہ ہوتی ہے:۔

شمع محفل نیکے جب تو سوز سے خالی رہا تیرے پروانے بھی اس لذت سے بیگانہ رہے!

کبیر کی شاعری کا یہی آخر الذکر پہلو نمایاں اور اہم ہے۔ اس نے عامۃ الناس کے سواد اعظم کی تلقین و تعلیم کرنی چاہی ہے اور اس عمومی خطاب کے لئے لامحالہ اس کو عوام کی زبان یعنی ہندی اپنا آلۂ اظہار بنانا پڑی ہے جس کو اسی نے آسان سے آسان بنانیکے لئے مانوس استعارات و تشبیہات کا مصورانہ پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے چنانچہ وہ ساری تمثیلیں اور تلمیحیں عوام کی روزمرہ زندگی کے معاملات و مشاہدات سے لاتا ہے چونکہ اپنے مبلغانہ جوش سے وہ کبھی خالی نہیں ہوتا تھا اس لئے اس سے وہ لغزش کبھی

سرزد نہو سکتی تھی جو یہ ہے ۔ ؎

کہ اہلِ شوق عوام اند و گفتگو عربی ست!

وہ اپنے حلقہ درس سے اگر تعلیم یافتہ پیشہ ور اہلِ مذہب کو قطعًا خارج نہیں کرتا تو اُن کی کچھ زیادہ ہمت افزائی بھی کرتا نہیں معلوم ہوتا۔ وہ اُنکے مکر و ریا اور منافقت و مداہنت سے بیزار ہے اور ان کو قریبًا لاعلاج قسم کے " روحانی مریض " سمجھتا ہے! یہی وجہ ہے کہ اُس نے ان کی مذہبی و کتابی زبان کو اپنے خیالات و تعلیمات کا ذریعہ نہ بنایا کیونکہ روئے سخن دراصل دوسروں کی طرف تھا۔

اس بارے میں اُس کی " مجازی لغت " بڑی دلچسپ ہے۔ گرو اور چیلہ، دولھا اور دلہن، کسان اور بنیا، پجاری اور مندر، چڑیا اور آشیانہ وغیرہ وغیرہ اُس کی فصیح اور نیز بلیغ استعارہ طرازی کے عام ساز و برگ ہیں جن کے وسیلے سے وہ بڑے شیریں اور دلنشیں طریقے بلند سے بلند مطالب معرفت و حقیقت کو بیان کرتا رہتا ہے اُس کے نزدیک عالم سفلی اور عالم علوی کی کوئی تقسیم نہیں۔ وہ ہر شئے کو خدا کا جلوہ گاہ پاتا ہے اور ہر کوچہ و بازار کے مناظر کو طور کی تجلیوں کا حامل دیکھتا ہے۔ وہ کہیں " لن ترانی " کی امتناعی آواز نہیں سنتا! ،

وہ حال و مستقبل، دنیا و آخرۃ کی دفع الوقتیوں کو قبول نہیں کر سکتا اس لئے کہ

بستاں وعدۂ محشر حرام ست!

وہ اُن نظر بازوں میں داخل ہے جن کی " نگاہِ شوق " کی نسبت کہا گیا ہے کہ

دور بیناں ازل کوری چشم بدبیں ہم درانیجا نگرند آنچہ در آنجا نبیند!

الغرض کبیر اُن معدودے چند ہستیوں میں سے ہے جنہوں نے روئے حقیقت کا چہرۂ انور ہر راہرو کے سامنے الم نشرح کر کے کہدیا کہ ع اب نکر پردہ کہ اے پردہ نشیں دیکھ لیا!

وہ اکثر اوقات اپنے ادائے مطلب کے لئے ایسے نرالے اور اچھوتے الفاظ استعمال

کرتا ہے کہ متداول مذاق کے لوگ چونک پڑتے ہیں اور کبھی کبھی تو وہ انکوایسے کھٹکتے ہیں کہ اُنکے اندران کو علم بغاوت بلند ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مشاہیر شعرائے متصوفین کے کلام میں اس شوخ چشم رندی و مستی کے بڑے بڑے دلچسپ مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً

در مسجد اگرچہ با نیاز آمدہ ایم | حاشا کہ نہ از بہر نماز آمدہ ایم!
روزے زینجا سجادہٗ دزدیدیم | آں کہنہ شدست و باز باز آمدہ ایم!

(عمر خیام)

مسیحی تصوف کی تاریخ کے اندر اس سلسلہ میں جیکوپوں ڈا ٹوڈی، روِ اسبروک، اور بوہمے وغیرہم کا نام لیا جا سکتا ہے۔

کبیر کی شاعری اس کے معلومہ جذبات کی دوگونہ لہروں کی کشمکش کی بنا پر بڑی تشنج آمیز اور ہنگامہ خیز بن گئی ہے۔ وہ بے وقت دیکھتا بھی ہے اور دکھانا بھی چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے لئے یہ دوسری جد وجہد ایک "دوگونہ رنج و عذاب" بن گئی ہے۔ اس کے لئے اُس کو زبان کے گوناگوں پیرائے اختیار کرنے پڑے ہیں۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفوں کے فرق سے آسمان کا نظارہ کرتا ہے اور پھر اہل نیستی کو اپنے غیر معمولی مشاہدات سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ پس لازمی طور سے اس کے نغمے دو مستقل خطابات کے مجموعے نظر آتے ہیں، ایک اپنے سے اور ایک دوسروں سے! وہ یکے بعد دیگرے مابعد الطبیعاتی زبان اور گھریلو محاورے استعمال کرتا ہے، اور اس طرح اس کو بار بار عالم بالا اور دنیائے اسفل کے مابین "سیر عروجی و نزولی" کرنی پڑتی ہے!

کبیر کے انداز بیان کی اس مرکزی خصوصیت کو ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ اُس کے بیشتر حصے کی تعبیر اور توجیہ کا دار و مدار اسی شرط ماقبل پر ہے۔

کبیر کو صوفیائے عالم کی اُس مختصر بزم خاص میں شمار کرنا چاہئے جس کے دوسرے ارکان سینٹ آگسٹین، روِ اسبروک، اور جلال الدین رومی وغیرہم ہیں اور جن کی معرفت د

بصیرت روحانی کے مخصوص امتیاز کی تشریح اس طرح کیجا سکتی ہے کہ انہوں نے خدا کا گویا ایک "کیمیادی تصور" حاصل کیا! ۔ انہوں نے ذات وصفات، مادہ وروح، ظاہر وباطن آفاق وانفس اور خلق وامر کی ساری خودساختہ حدود وقیود کا تجزیہ کر ڈالا اوران سب کی صرف ایک "عنصر وحدت" کے سرچشمۂ اول تک سراغ رسی کی ۔ انہوں نے اُس وراء الوراء ہستی کو "اقرب من حبل الورید" ۔ دیکھا اور اس محفل تخلیہ میں باریاب ہوئے ۔

اُن کی نظر قلب نے اُس بلندی تک صعود کیا جہاں سے "ما و من" کی تمام تفریقات وتعینات غائب نظر آتی تھیں

تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری!

کبیر کو ہم عوام الناس کے "محبوب فقیر" کے رنگ میں دیکھتے ہیں جو ہر کہہ ومہ کے ساتھ ہم کلام ہے، ہر روح کیساتھ وابستۂ اعتنا والفت ہے، اور ہر دل کے ہمراہ ایک مونس وہمدم! اُسکا حلقۂ محبت بعید وسیع ہے ۔ اُسکا مشرب عشق یگانہ وبیگانہ کی تمیز سے بالاتر ہے، وہ اس تفریق کو بندہ ومعبود کے درمیان بھی گوارا نہیں کر سکتا وہ اس برہما" (خدا) کا قائل نہیں جو "اکاش کی اٹاری" یا عرش بریں کے قلعہ معلیٰ کے اوپر اجلال نشیں ہو، وہ ایک ایسے خالق کل کے ساتھ اپنا رشتۂ عقیدت جوڑنا چاہتا ہے جو ہر لمحہ اُس کے یمین ویسار موجود ہو ۔ ایسا ہی خدا اُس کی سمجھ میں اپنی دائمی وابدی رفاقت سے قلب انسانی کی سکینت وطمانیت، اور مسرت وبہجت کا سامان ہو سکتا ہے ۔

کبیر نے اپنے اس نظریہ سے معرفت الٰہی کی راہ کے تین عامۃ الورود خطرات کا سدباب کر دیا ۔

(۱) وہ غیر معتدل قسم کی جذبات پرستی سے کام نہیں لیتا جو "ملت عشق" کے سردل کا عام فتنہ ہے اور خدائے قدوس کا شخصی تصور (جس کو گرم محبت صوفیا کی ذہنیت ان کے دل ودماغ کے سامنے منعکس کر دیتی ہے) اس ضلالت کو لاحق حال کرنے کا ذمہ دار

بنتا ہے۔ اہلِ ہند کی تاریخ تصوف اس بے راہ روی کی ایک نمایاں مثال ہے جہاں "اوتار" کے تخیل نے مذہبی معتقدات کے اندر ایک مرکزی اہمیت اختیار کر لی۔ یورپ میں اسی میلان نے ایک دوسرا مظہر قبول کیا اور مسیحی اولیاء کے مجسموں کی کثرت سے ایک خالص موحدانہ سامادی مذہب کے معابد تبخانے بن گئے۔ ہندوستان کے اندر "روحِ کرشن" کی عقیدت "کرشن دیوتا" کے بت کی پرستش بن گئی۔

خوگرِ پیکرِ محسوس ہے انساں کی نظر!

(۲) توحیدِ وجودی کی مضحکہ خیزی سے بھی وہ صاف بچ گیا ہے جو نتیجہ صریح ہے۔ بہت سے مقبول صوفیانہ عقائد کا اُس نظریہ کا منشا یہ ہے کہ مخلوق اور خالق دونوں کے وجودوں کا مادۂ ترکیبی ایک ہی ہے اور یہ امتیاز تعینات بجز فریبِ نظر اور ایک نزاعِ لفظی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اس شریعت کے ماتحت انسان کی نجات کا مقام یہی ہے کہ وہ ذاتِ حق میں داخل اور جذب ہو جائے

چنانچہ ایک متعارف صوفی کے نزدیک اُس کی اپنی شخصیت، ذاتِ باری کا ایک جزو لاینفک ہے اور حصولِ معرفت کے معنی یہی ہیں کہ اس "سرِ مخفی" کو اپنے دل میں جاگزیں کیا جائے۔ اور اس حقیقت کبریٰ کا اعلان عام کیا جائے تاکہ انسانیت اپنے اصلی منصب اور ماہیت سے واقف ہو! حکمت ویدانت کا کلمہ اول یہی ہے کہ "ہمہ اوست" کبیر اس ثنویت کا ابطال کرتا ہے لیکن ذاتِ حق کے "رگِ گلو سے زیادہ قریب" ہونے کی حقیقت نفسِ لامری کی بشارت بھی دیتا اور اپنے انکار و اقرار کو اپنے دو رویہ کلمات میں یوں ادا کرتا ہے کہ "وہ ہم سے متمائز ہے لیکن ہم سے منفصل نہیں!

مردانِ خدا خدا نباشند لیکن ز خدا جدا نباشند!

عالم علوی و سفلی ہر دو اُس روحِ اعظم کے مقدس "نقشِ قدم" ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کے ساتھ بندے کا تجاذب ایک "وصالِ محبت" کی حیثیت رکھتا ہے جو ایک دو طرفہ کشش سے ترکیب پاتا ہے لیکن پھر "ع چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک؟" وہ اس تشبہ باللہ

ہی کو اصل نصب العین اور سعادت سمجھتا ہے۔

واقعی سب سے بڑی ذات ہے ذات باری   واقعی سب سے بڑی بات ہے بندہ ہونا!

وہ ایک مناسبت معنوی اور الفت روحانی کے جو بندے اور خدا کے باہمی قرب کی حقیقی تعبیر ہے حلول اور اتصال نہ بانے کو ممنوع اور ملعون قرار دیتا ہے۔ تمام صحیح و صالح مذاہب توحید میں انفرادیت و یکسانیت کا یہ توازن خاطر خواہ طریقے سے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لیکن یہ میزان اعتدال قریبًا ہمیشہ اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی رہی ہے اور افراط و تفریط اسکا نتیجہ ہوتا رہا ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میں پندرہویں صدی میں جس تجدید دینی کا علم بردار رآمانج بنا اور جو شریعت و شنوی کی امتیازی روح تھی وہ اسی نوع کی ایک اصلاح سے تعبیر کیجا سکتی ہے۔ رآمانج کا خلیفۂ اول راما نند بنا اور راما نند کی معرفت اس مشرب وسطیٰ کو کبیر کے قلب نے لبیک کہا۔

(۳) بلا شبہ کبیر ایک پرجوش عاشق الٰہی ہے لیکن اپنے جذبات کی رو میں وہ کبھی یہ تقاضا نہیں کرنے لگتا کہ

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل   لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!

چنانچہ وہ جس قسم کے الفاظ و خطابات کو اپنے معشوق حقیقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استعمال کرتا ہے (مثلاً رفیق روح، مونس قلب، جان جان، پیا، دولہا وغیرہ وغیرہ) وہ خدا کے تصور کو عام صوفیا اور بیشتر فلاسفہ کے مجرد ما بعد الطبیعاتی توہمات تک سفر ہونے سے باز رکھتے ہیں اور اس کے مسلک محبت کو اُس "داعی عیاشی" کی سطح اسفل السافلین تک نہیں گرنے دیتے جو اہل ویدانت کے دور متاخرین کی بدعت و لعنت بن گئی! اُس کا مذہب بحیثیت محبت ہی لیکن یہ پروانۂ محبت شمع محفل کی ہم آغوشی کے شوق میں اُس سے اتنا واصل ہونا نہیں چاہتا کہ اُس کی آغوش ہی اس کی سلامت خیال کی قبر بن جائے ؂

اگر خواہی سلامت در کنار است!

وہ اسی وصال الفت کو اپنی معراج کہتا ہے اور اپنے گوشہ قلب کے اسی جذبہ کو اپنے کنشت دل کی تنہا مورت سمجھتا ہے!

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو اس "ہردوار دل" میں لاکر جسے بسائیں!

تمام کائنات اس کو اسی کرشمہ ساز واحد کی "لیلا" نظر آتی ہے جس کے اندر اس کی محبت و رحمت کی بیشمار زبانیں اُس کے سامعہ کو گویا سنائی دیتی ہیں۔ محبت کے اس سرچشمہ اصلی کا طوفان محبت اُس کو ایک سیل بیکراں دکھائی دیتا ہے جس میں ہر چیز غرق ہے اور "چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور تکلیفوں کے کہر کے آگے یہی کلدیپ موجیں مار رہا ہے"۔ سارے مظاہر و مناظر ارض و سما اس کو ایک بازی عشق کا تماشہ دکھاتے ہیں جن کے اندر وہ اپنی محبوب کی صورت کو بڑے ہی دلچسپ خط و خال کے ساتھ دیکھتا ہے۔ جو ہر آن مصروف کار اور ہر لمحہ وقف جلوہ گری ہے کبیر اپنی شاعرانہ روح اور حیرت انگیز ادبی زبان کے ذریعے اپنے ان شاہدات کے لئے کیسی کیسی البیلی اور پیاری تشبیہیں اور تعبیریں لاتا ہے۔ وہ کبھی اس کاروبار کو ایک "رقص حسین" کہتا ہے اور کبھی اُسکا نام "گہوارہ محبت" رکھتا ہے جو اسی کے لفظوں میں "پریم کی ڈوریوں سے جھول رہا ہے!"

تمام متصوفانہ ادبیات کی یہ ایک تحیر زا خصوصیت رہی ہے کہ اگرچہ صاحب سخن کتنا ہی قادر الکلام اور نازک بیان ہو مگر وہ ایک بالواسطہ طریق ہی ادائے بیان کے لئے اختیار کرتا ہے!

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں گفتہ آید در حدیث دیگراں!

اگرچہ کتنے ہی لطیف اور پیچیدہ حقائق و غوامض معرفت ہوں مادی استعارات اور محسوس تشبیہات کو کبھی ترک نہیں کیا گیا۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

مقصد ہی ناز و غمزہ دلے گفتگو میں کام   نبتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر!

حقیقت آشنا ہوں اور محرمان راز کے لئے یہ زبان شایاں شان نہ ہو لیکن ایسے تو ہوں پر اُنکے ملفوظات لسان اور رشحات خامہ کے اصلی مخاطب عوام ہوتے ہیں جن کے لئے اپنے کو قابل فہم بنانیکی غرض سے اُن کو مادیات کی اس سطح زیریں تک اترنا پڑتا ہے۔ بقول صوفئ اعظم جلال الدین رومی کے بچوں کو تعلیم دیتے ہوئے ایک فاضل اجل کو بھی اپنا بھی کا" ابجدی آموختہ دہرانا پڑتا ہے!۔ الغرض درسگاہ وحدت اور معبد حقانیت میں بھی الفاظ کی اس تنگری سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹتا! گویہ ظاہر ہے کہ

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

مگر عوام سے خطاب کرتے ہوئے اس طریق کار کی اہمیت اور ضرورت ظاہر ہے اس ذریعے سے اُن کے لئے گویا عرش فرش پر اتر آتا ہے۔ ذہن و روح کی ساری متبرکا معراجیں آیات بینات بنجاتی ہیں۔ اور اکثر ایک واحد لفظ یا فقرہ اُنکو یکبارگی اس قعر پستی سے اٹھا کر اُس اعلیٰ علیین تک لیجاتا ہے جو صرف شاعر کے "براق قلم" کا تنہا "خرق عادت" ہے!

یہی عام فہم زبان ہے جو شاعروں کے منہ میں ہو نچکر اس طرح بولتی ہے کہ" ہم خدا کی روشنی کا "مشاہدہ" کرتے ہیں۔ ہم اُس کے نغمۂ جاں نواز کو اپنے کانوں سے "سنتے" ہیں، اس کی شیرینیت و محبوبیت ہماری زبان سے "مس" کرتی ہے اسکی "خوشبو و نکہت" سے ہمارا مشام جان معطر ہے، اور ہم اُس سے ہر لحظہ "ہم آغوش" رہتے ہیں!"

انہی عوام میں جو بعض لوگ بے محل طریقے سے ظاہر پرستی کے غیر معمولی رجحانات پیدا کر لیتے ہیں انکے لئے مغالطہ کا شکار ہونا ناگزیر ہے لیکن اُنکی روح کا ان" جسمانی تمثیلوں" سے خستہ و ہلاک ہونا کیسا افسوسناک ہے!

چنانچہ کبیر نے بھی، اگرچہ   بہت سے مروجہ آداب شاعری سے انحراف

کیا ہے لیکن شعراء و صوفیا کی قدیم مجازی زبان کے معاملہ میں اُس نے کبھی اجتہاد سے کام نہیں لیا، چنانچہ اُس کو بھی ہم دوسروں کی طرح اسی قسم کی باتیں کرتے سنتے ہیں جیسے یہ "میں نے برہما کا منوہن مکھ دیکھا ہے، میں نے اسکا امرت پیا ہے، اس نے اپنی بجلی دوڑا دینے والی انگلیوں سے میرے انگ کو چھوا ہے، اور بہشتی پھولوں کی خوشبو میں نے سونگھی ہے!" لیکن کبیر کی اصلی روح شعر و موسیقی ہے، توازن اور ترنم اُس کے نزدیک حسن فطرت اور جمال صداقت کا اصلی پیراہن ہیں، ان تمام خصائص کے اعتبار سے اس کو اپنے مغربی مثیل رچرڈ رادل سے خاص طور پر تشبیہ دیجا سکتی ہے جو معرفت و حقیقت کے نغموں کو چنگ و رباب ہی کی زبان سے سنتا تھا۔

خشک تار و خشک چوب و خشک پوست   از کجا می آید ایں آواز دوست؟!

کبیر کے الفاظ میں "ساری کائنات ہستی ایک مجسم ساز معرفت ہے جس میں سے ایک حسین موسیقی ایک "سفید پھول کی طرح کھل رہی ہے!"

ہستی کا ہر حجاب ہی پردہ ہے ساز کا!

محبت کے پھول رشتہ موسیقیت میں گوندھے جاتے ہیں۔ زہد خشک ایک دل خشک پیدا کرتا ہے جو بے مغزی کے ساتھ اصل رنگینئ عشق کی بے احترامی کرتا ہے۔

رعنائی خیال کو ٹھہرا لیا گناہ   زاہد بھی کس قدر ہے مذاق سخن سے دور!

موسیقی ہی وہ چیز ہے جو زمین اور آسمان دونوں جگہ کی محبوب شے ہے۔ اس سے ایک دیہاتی کے کانوں کو بھی مزہ آتا ہے اور ایک عارف کامل کے گوش حقیقت نیوش کے لئے بھی وہ ایک پیام وجد و کیف ہے! اور خود مُنَقّش شریر بھی ایک ستار ہے جس کے تار برہما کی انگلیوں سے ایک مسلسل حرکت میں رہتے ہیں۔" محفل ہستی کے گوشہ گوشہ میں کبیر کو ایک "سرود خموش" سنائی دیتا ہے جس کی سامعہ نوازی سے وہ ہردم مست و سرخوش رہتا ہے۔

بے نئے و مطرب و نغمہ ہمہ در وجد و سماع! بے مئے و جام و صراحی ہمہ مدہوش ا
"وہ کرشن محبت کی "بنسی" کا متوالا ہے، جس کو وہ ایک مطرب فطرت کا مظہر سمجھتا ہے اور اس کی روح پرور تانوں کی نشید شیریں کے سحر موسیقیت سے تمام عرش و فرش ایک عالم رقص و حال میں ہیں" عالم موجودات کے لئے یہی چیز غذائے روح ہے اور انکے خالق کل کی یہی عبادت۔

یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات عارف ہمیشہ مست مۓ ذات چاہئے!

لیکن اس سرمستی اور مدہوشی کے طوفان میں جو کبیر کے سینہ سے ہر دم اٹھتا رہتا ہے وہ حیات مادی کے شب و روز کے مشاغل کو نہ فراموش کرتا ہے اور نہ نظر انداز۔ اس کے قدم زمین پر ہیں لیکن وہاں وہ کسی طرح پابگل نہیں۔ اُسکا بیدار و دور بیں دل و دماغ اُس کے جسمانی سینے اور کاندھوں پر نہیں ہے بلکہ دوش عرش پر نظر آتا ہے! کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماءِ! اس کی اس ہوشمند اور غیر فراموش کار روح کے مظاہر بہت نمایاں ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک صاف و شفاف تخیل رکھتا ہے۔ ایک عام فہم اور غیر مشتبہ زبان بولتا ہے۔ فلسفیانہ اصطلاحات اور تجریدی طرق ادا سے سختی کے ساتھ محترز ہے۔ ظاہر پرستی اور ظاہرداری کا بے رحم ناقد ہے اور ہر قسم کی ریاکاری اور نمائش طلبی کے بری طرح بخیئے ادھیڑتا ہے "کائنات کی جملہ اشیا خدا کے اوتار ہیں" اور "مطلوب حقیقی ہر لمحہ آنکھوں کے آغوش میں رہتا ہے" "وہی سرچشمۂ اصلی ہے اور تمہاری تشنہ لبی اُسی وقت سیرابی سے بدلیگی جبکہ تم اُس تک پہنچ جاؤ گے"۔ پس جو لوگ اس "اصل و بیخ" کو اپنی گرفت ذہن میں رکھتے ہیں اُنکو مختلف شاخ و شاخسار اور برگ و بار میں الجھنے کی ضرورت نہیں مذہب و ملت، مسلک و مشرب، مکتب و منبر، وغیرہ کا معاملہ قطعاً ایک ضمنی سوال ہے اور جو اصل منزل مقصود کو پیش نظر رکھتا ہے اُس کے لئے مختلف راہوں میں کسی ایک کا انتخاب و ترجیح چنداں اہمیت نہیں رکھتی! لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْهُمْ مَنْسَکًا ہُمْ نَاسِکُوْہُ فَلَا یُنَازِعُنَّکَ

فِی الْاَمْرِ دَاَدْعُ اِلٰی رَبِّکَ!

پس کبیر کیش و ملت کی ان شرائط و ضوابط، اور حدود و قیود سے بالاتر ہے وہ مروجہ مذاہب میں سے کسی کا بھی قائل نہیں اور پھر وہ سب کا ہم مشرب نظر آتا ہے۔ وہ اُس بلند مقام تک صعود کر گیا ہے جہاں سے تیز نادمن غائب ہوگئی ہے اور سارے گونا گوں نقاط نظر ایک ہی مرکز انعکاس پر مرکوز و متحد ہوگئے ہیں۔ یہی راز ہے جو اس کے مسلک "صلح کل" کی اِن بو العجبیوں کی کلید ہے، کہ کبھی وہ دشنو کا پجاری ہے اور کبھی نِت فیدا کا شیدائی، کبھی حلولی ہے اور کبھی تناسخی، کبھی مشرک ہے اور کبھی موحد، کبھی ساد ہو ہے اور کبھی صوفی، اور کبھی ہندو ہے اور کبھی مسلمان!!

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں!

وہ پیشہ سے ایک جولاہا ہے اور مختلف تاگوں کے ہم رشتہ کرنے اور تانے بانے کا تار و پود گوندھنے میں ایک طبعی مہارت رکھتا ہے، مختلف اور متضاد کیش و مشرب کی پیچ در پیچ آویزشوں کو آمیزشوں کی صورت میں تبدیل کر دینے کا کام اُس کے جابکدست دماغ کے بائیں ہاتھ کا کام تھا! الغرض سارے منابر مذہب اور تمام مکاتب فلسفہ اس کی مسند درس کے ایک ہی حلقے میں داخل ہیں۔ ہم کو اگر اُس ایک نقطۂ مرکزی تک پہنچنا ہو تو تمام خطوط قطری پر سفر کرنے کی ضرورت ہوگی اور اُن میں سے ایک بھی کسی دوسرے کا مانع و مزاحم نہ ہوگا بلکہ باہدگر مؤید و متمم! اینسٹڈ کی اگر اُس "سورج مکھی ہستی" کے درشن کرنا ہیں جو تمام "تاریکیوں سے ورا رالورا واقع ہے" تو اختلافات مذاہب و ملل کی ان تمام گونا گونیوں اور نیرنگیوں کو لازم و ملزوم سمجھنا پڑے گا جو آفتاب وحدت اور شمس حقیقت کی ایک "شعاع سفید" کے "الوان ہفتین" ہیں! پس تصوف و طریقت کا یہ "مجدد و جدید" تمام مذاہب معرفت کا ناسخ ہونے کے باوجود بھی سب کی روایات و کلیات کا مصدق و معتقد بھی ہے! صوفیا کے مسلک نے کبھی بھی قشر و پیرہن کی پرستش نہ کی اس لئے سب نے بڑی آسانی کے ساتھ کبیر کی کملی کو اپنا وقتی شعار بنانے میں تامل نہ کیا۔ سب نے

اپنے اپنے میخانوں کی شرابیں کبیرؔ کی نئی "مینا" میں بھر دیں! کبیر کی شریعت معرفت کی اس "ترجمانِ کُل" نوعیت کی تصریح اُس کے اکثر دوہوں میں پائی جاتی ہے جہاں وہ شاہدِ حقیقت کی "بازیگر" (لیلا) "کلدیپ کی لہروں اور موجوں"، "طائر روح کی ہمہ سمت پرواز"، اور ایک "صد برگ کنول" کا ذکر کرتا ہے!

ہر لحظہ برنگ دگر آں یار برآمد!

کبیرؔ لاکھوں لباسوں میں کرشمہ سازِ ازل کو دیکھتا ہے اور ہزار داستان کی سی ہزار ہا زبانوں سے اس کی نقاشی کرتا ہے۔ اسکا دفتر معرفت گویا ایک "بتخانۂ وحدت" ہے جس کی گوناگوں مورتیں اُس کے اسمائے حسنیٰ کی مظہر ہیں۔ کبیرؔ کے نئے نئے اور نرالے نرالے پیرایہ ہائے بیان بڑے ہی دلچسپ و دلنشیں ہیں جن میں وہ تمام ممکن مطالب عرفان و سلوک کی تعبیر و تشریح کرتا ہے اور جو ہندوستان کی روزمرہ زندگی اور تمدن کے کاروبار و معاملات کے استعاروں اور تلمیحوں سے لبریز ہیں۔ خالص ہندی فضا جس طرح کبیرؔ نے اپنی شاعرانہ زبان کے اندر بسائی ہے اس نے اس کی متصوفانہ ادبیات کو مصورانہ بنانے کے علاوہ اس درجہ میٹھا اور مدھ بھرا بنا دیا ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتا ہے "مندر کے گھنٹے" اس کی روح کی پتری کو جگانیوالی سہیلیاں ہیں!" "سسرال سے ڈولی لیکر آنیوالے کہار" اُس کے داعیات انبساط و انشراح صدر ہیں! "پیاہ" اسکی روح کا وصال عشق ہے! "تیرتھ جاترا" اسکی پرواز روح ہے نشیمن سماوی کیطرف! "ستی" اس کے قلب کا مقام فنا و جذب ہے! وغیرہ وغیرہ! کبیر ہندوستان کے مخصوص موسموں کی زبان میں بھی بار ہا بولا ہے۔ الغرض در و دیوار، کوچہ و بازار زمین و آسمان، اور تمام کون و مکان سے اس نے حقائق معرفت اور مطالب وحدت کی بڑی فصیح اور بلیغ تفسیریں اور تعبیریں کرائی ہیں اور عرفان اور گیان کا ایک حیرت انگیز "آئینہ خانہ" کھولکر رکھدیا ہے!

خدا کی ذات و صفات عموماً مبہم و موہوم اور عام اذہان و عقول سے ماورا ہیں

اس تاریکی کی حالت میں وقتاً فوقتاً مظاہر جلال و جبروت انسان کو خدا سے اور بھی دور بھگا دیتے ہیں، مگر کبیر نے خالق ہستی کو اپنے مانوس پیرایوں میں بیان کیا ہے کہ گویا وہ ایک گھر یلو چیز ہو گیا ہے۔ نیز اس کو ایسے پیارے اور موہنی لباس پہنائے ہیں کہ وہ ہر سننے والے کا "محبوب دلہا" بن گیا ہے!

درس حقیقت ار بود زمزمۂ محبتے جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را!

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے کبیر کی سو نظموں کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے۔ ان نظموں کو بڑی کاوش سے جمع کیا گیا ہے اور کتابوں اور تذکروں سے لیکر سینہ بسینہ زبانی روایات تک کو اسکا ماخذ بنایا گیا ہے۔ چنانچہ بہت سے دوہے جو ملک میں کثرت سے زبان زد عوام ہیں بعض مشہور بھاٹوں کی معرفت نقل کیے گئے ہیں۔ کبیر کے کلام کی اس تدوین میں کافی نقد و تنقید کی ضرورت پیش آئی ہے اور تا بمقدور کوشش کی گئی ہے کہ اس مجموعے کے اندر غیر اصلی عناصر نہ آنے پائیں۔ کبیر کے مروجہ کلیات کا معتد بہ حصہ الحاقی ہے اور بعض مجموں میں ممکن ہے کہ "زائد" کے علاوہ "حشو" بھی ہو خصوصاً مشرق میں بالخصوص ایسے شعرا کا کلام دست اندازی کا تختۂ مشق بنایا گیا ہے جو ایک نئے مسلک تخیل یا مکتب ادب کے بانی ہوئے ہیں تاکہ مختلف جماعتیں اپنے معتقدات اُس میں مخلوط کر کے ان کو قبول عام کا جامہ پہنائیں اور ان مجتہدین و ناسخین کو اُنکی وفات کے بعد اپنا ہمنوا اور حواری بنائیں! یہ تحریف ایک گونہ تشابہ کے رنگ میں بھی ہوئی ہے۔ اکثر مقلدین اور معتقدین نے ان مجددین وقت اور استادان زمان کے تتبع میں طبع آزمائی کی ہے اور انکے رشحات قلم قدرۃً اصلی سرچشمہ میں مدغم ہو گئے ہیں پس اس قسم کے ایک شاعر کے کلام کی تنقیح و تطہیر میں جو مشکلات ہو سکتی ہیں اُنکا اندازہ بآسانی ممکن ہے۔ ایک بالغ نظر نقاد ادب اور ایک پورا محرم راز محقق ہی اس پر اشکال کام سے عہدہ برا ہو سکتا ہے کبیر کے کلام کی اس مذکورہ بالا ترتیب میں اس معیار تنقید و تالیف کے تمام مقتضیات ممکن

ہے پورے نہ کئے جا سکے ہوں لیکن شاید کبیر کے ملفوظات وکلمات طیبات کا یہ مستند ترین مجموعہ ہے جس تک موجودہ وسائل تحقیق وتفتیش کی حد تک ہماری رسائی ہو سکتی تھی۔

یہ نظمیں ایک نمائندہ حیثیت رکھتی ہیں جو کبیر کے تخیل ونظر کے جملہ دستیاب شدہ رنگوں کا ایک یکجائی مرقع ہے کبیر کی روح کا جذب وکیف، جوش وخروش، وارفتگی وسرخوشی واردات۔ انبساط وانقباض، بیم ورجا، اضطراب واضطرار اور طمانیت وسکینت، نازونیاز فنا دگی وخستگی، قربانی وفداکاری الغرض اس کے لمعات تخیل کے جملہ نقوش قدم اس میں موجود ہیں۔ کائنات ہستی کے متعلق وہ جس قسم کی وسعت نظر اور وسیع المشربی رکھتا ہے اُسکا اندازہ اس قطعہ سے کیجئے۔

"دریا اور اس کی لہریں ایک ہی سطح آب سے عبارت ہیں۔ کیا ان جیسی یک وجود یکجان چیزوں میں بھی کوئی تفریق کیجا سکتی ہے؟ سکون اور تموج آبی کے اوقات مختلف ہیں پانی کی سطح ستوی اور اسکے پست وبلند کے مناظر میں کوئی دو چیزیں نظر نہیں آتیں کیا محض اس وجہ سے کہ پانی کے ایک ٹکڑے کا نام 'لہر' رکھدیا گیا ہے اس کی قلب ماہیت ہو جائیگی؟ مختلف مذاہب وملل ایک ہی تسبیح کے دانے ہیں اور سب دانوں کا "امام" انگشت قدرت میں ہے!"

(۲) عشق حقیقی کا جب اس پر نزول ہوتا ہے تو اس میٹھے بلاوے کی شیرینی چکھئے، ساتھ ہی اس آواز غیب کی سماعت وشناخت کے سلسلے میں جو خطرات، تشابہات، اور فتنے ہیں انکی طرف بھی کتنا بلیغ اشارہ کیا ہے! کہتا ہے۔

"سسرال سے ڈولی مجھے لینے کے لئے آئی اور میرا دل سینہ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ الغرض میں سوار ہو کر اپنی منزل مقصود کو روانہ ہو گئی۔ لیکن ایک جگہ میں نے ڈولی کا پردہ اٹھا کر جو دیکھا تو یہ معلوم کر کے میری حیرت اور دہشت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ غدار کہار مجھکو ایک لق ودق میدان میں لے آئے ہیں! میں ان کہاروں کے پاؤں

پڑتی ہوں اور کہتی ہوں کہ ذرا میری ڈولی تھوڑی دیر کے لئے میرے میکے کی ڈیوڑھی میں پھر رکھدو کہ میں اپنے عزیز و اقارب سے رخصتی ملاقات تو کر لوں! (دستوار دعالی)

حالی رہ راست جو کہ چلتے ہیں سدا — خطرہ انہیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہے حذر — "بھیڑوں" کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما!

مبدءٔ اصلی کیطرف اُس کی روح کی تڑپ اور لگاوٹ کو دیکھو۔

"اے سندر ہنس! مجھ سے اپنی کہانی کہہ۔ تو کس دیس سے آیا ہے، اور کس آشیانے کی سمت میں تیری اڑان جاری ہے؟ اچھا موہنے ہنس! آج تڑکے ہی اُٹھ اور میرے ساتھ ہم پرواز ہو۔ تجھے ایک دیس سے چلوں جہاں رنج و غم اور خوف و خطر کا پرندہ پر نہیں مارتا! جہاں کے نواسیوں کی کان "موت" کے لفظ سے نا آشنا ہیں! جہاں کے دائمی موسم بہار نے جنگلوں اور پہاڑوں کو رنگ و بو سے بھر دیا ہے! ہاں یہی وہ چمنستان ہے جہاں دل کا بھونرا خوشنما اور امرت بھرے پھولوں میں غرق ہو جاتا ہے اور اُس کے متحرک پر ہمیشہ کے لئے آسودۂ سکون ہو جاتے ہیں!

(۳) گمراہ اور گمراہ گر دوں کو اُنکا اصلی معبد دکھاتا ہے۔

"اے مُلّا! اگر اللہ مسجد ہی میں ہے تو کیا اس محدود چار دیواری سے باہر کی دنیا اُسکی حکومت و جود سے خارج ہے! اے برہمن اگر برہما اس مندر کی مورتی کے بطن ہی میں مقید ہو کر رہ گیا ہے تو اُس کی بے بسی اور قید تنہائی رحم کے قابل ہے! اے نا فہمو اپنے کعبۂ قلب اور اپنے "تیرتھ دوار دل" کی زیارت اور جاترا کی تمہیں کب توفیق ہوگی؟"

(۴) نزاع اعتقاد و ملت کی جنگ زرگری۔

"سادھو اور صوفی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ گا رہے ہیں اور ایک کی راگنی دوسرے کے نغمے کی موسیقی سے دست و گریبان ہے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی اُس منموہن کا مکھ نہیں دیکھا ورنہ ایک دوسرے سے اُلجھنے سے فارغ ہو جاتے!

(۵) اہلِ دنیا کی فضول کادی اور تضیعِ اوقات۔

"دنیا کے تاجرو اور دوکان نشینو! جس بازار جزا و سزا کی طرف تمہارا کاروانِ عمر رواں ہے وہاں نہ کوئی دوکانیں ہیں اور نہ کوٹھیاں! یہ ساری محنت و مشقت آخر کس لئے!

جلال الدین رومیؔ اپنے جذبۂ جلال میں یہی خطاب یوں ادا کرتے ہیں۔

اہلِ دنیا کافرانِ مطلق اند　　روز و شب در زق زق و در بق بق اند

اہلِ دنیا چہ کہین و چہ مہیں　　لعنت اللہ علیہم اجمعین!

کبیرؔ کو ٹیگور کے وجود میں اس عہد کے اندر ایک بہترین مترجم ملا ہے۔ اُس کے قلم نے کبیر کے لفظوں کا "ترجمہ" کیا ہے اور اُس کی روح نے ترجمے کی بین السطور میں کبیرؔ کی حقیقی آتما کی "ترجمانی" کا کام انجام دیا ہے! "گارڈنر" اور "گیتانجلی" کبیر کے سچے "اوتار" کی زبان معلوم ہوتی ہیں!

گوشش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست!

اسرائیل احمد۔ ب

از قائم گنج

ترکیہ جدید میں تمدنی تحریک

گزشتہ ابواب میں ہم نے اس انقلاب کے خاص خاص حصوں کا ذکر کیا ہے جو ترکی قوم کی زندگی میں رونما ہوئے۔ لیکن ہم نے ابھی یہ نہیں بتلایا کہ یہ انقلاب بے روک ٹوک اور خط مستقیم میں اپنی منزل کو نہیں پہونچا بلکہ اپنے سفر میں اس کو بہت سی کجیوں اور موڑوں سے گزرنا پڑا۔ جو خود بھی بہت اہم ہیں اور اپنے نتائج کی وجہ سے تمدنی تحریک کے لئے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس وقت ہم انہی کجیوں اور موڑوں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ کجی قوم کے اعلیٰ اور تعلیم یافتہ طبقہ میں پیدا ہوئی، اس طبقہ کی کیفیت گویا کل قوم کی کیفیت رہی ہے اور آج بھی ہے، قدیم ترکی میں یہ طبقہ ایک متحدہ جماعت تھا، اور اس کی ذہنی اخلاقی اور مذہبی خصوصیات قوم کی ساری تمدنی زندگی پر اثر رکھتی تھیں۔ جب تمدن میں عام انحطاط پیدا ہوا تو زوال کی رو اس طبقہ کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی، لیکن اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں کے شروع میں ایک نیا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہوا جو قدیم طبقہ سے اس طرح مختلف تھا کہ قدیم عثمانی اور اسلامی تعلیم کے ساتھ اس نے مغربی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اس دوسری تعلیم کی وجہ سے ان کو دوسروں پر جو فوقیت حاصل تھی اس نے باوجود مخالفتوں کے انہیں برسر اقتدار پہونچا دیا۔ انکو اس بات کا موقعہ تھا کہ قوم کے قوائے زندگی کو اندر سے نشو و نما دیں اور ماضی سے یک بیک غیر ضروری طور پر قطع تعلق ہونے سے روکیں۔ اس وجہ سے یہ تعلیم یافتہ طبقہ جس تبدیلی کا حامل بنا اس میں پہلے پہل قومی و اسلامی رنگ پایا جاتا ہے اور وہ قوم کی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کی نشو و نما اور قوم کے قدیم جماعتی، سیاسی

اور مذہبی اداروں کے ارتقاء کی شکل میں ہمارے سامنے آتی ہے۔

یہ بات ظاہر تھی کہ اس طبقہ کے غیر معمولی اشخاص عوام کے ذہن میں ایک خاص شکل اختیار کرلیں اور انکی تعلیم مغربی تمدن کی طرف لوگوں کو توجہ دلائے چنانچہ ان کی وجہ سے لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ خود اپنی قوت سے آگے بڑھنا ممکن نہیں اور اب ضروری ہے کہ مغربی قوموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جائے۔ چنانچہ مغربی تہذیب و تمدن سے واقفیت رفتہ رفتہ مقصود بالذات بن گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہتر اور افضل تمدن کا سامنا ہے اور بہتیرے تھے جنھوں نے بلا تنقید اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔ یورپ نے اسلام اور ترکوں پر جو نکتہ چینی کی تھی، اس نے انکو یقین دلایا کہ خود اپنے تمدن کو یک قلم چھوڑ دینا اور مغربی تہذیب میں اپنے آپ کو جذب کر دینا لازمی ہے یعنی بالفاظ دیگر یہ بھی مغرب پرستی کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس سے ترکوں کے تمدن میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔ لیکن تھوڑے ہی دن بعد اسکا ردعمل بھی شروع ہوا، جس نے قوم پرستی اور اصلاح مذہب کی شکل اختیار کی۔ ذیل کی سطروں میں ہم انہی چیزوں پر بحث کریں گے۔

مغرب پرستی اور ذہنی انتشار

عثمانی ترکوں میں مغربی تمدن کی طرف رجحان ایک پرانی چیز ہے۔ ترکی مورخ احمد رفیق جامعہ استنبول کے اپنے درس میں مغربیت کے ان رجحانوں کو اٹھارہویں صدی کے نصف اول تک لے جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بھی آگے جانا ممکن ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود سلطان محمد ثانی نے جو سیاست فتح قسطنطنیہ کے بعد اختیار کی اسکا مقصد مشرقی و مغربی تمدن میں باہمی مصالحت ہی تھی ورنہ

جنوبی آلی پر اس نے جو فوج کشی کی اس کو خالص فوجی کارروائی سے کون تعبیر کرسکتا ہے۔ عاکف نے محمد فاتح پر جو نظم لکھی ہے اس میں کہتا ہے کہ "ساری انسانیت سے اسلام کا اتحاد کرانا تیری نیت تھی" (مرقد فاتح زیارت، در الہام وطن) لیکن اس عظیم الشان کارروائی کے شروع میں جاکر ہم دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے واقعی مغربی تہذیب سے قربت حاصل کرنے کی کوشش کی جس کی تحریک خارجی حالات نے کی اور جس کو مدد اندرونی کیفیات سے پہونچی، لیکن چونکہ قرب یا صلح پیدا کرنے کی ان کوششوں میں ترک قوم نے اپنی تمدنی حیثیت کو قائم رکھا۔ اس لئے اس کو مغرب پرستی نہیں کہہ سکتے۔ مغرب پرستی تو اسوقت شروع ہوئی جب اپنے تمدن سے بیزاری شروع ہوئی اور ہر چیز میں مغربیت کو منتہائے تمدن تسلیم کیا گیا۔ اب ذرا اس مغرب پرستی کی تفصیل سنئے۔

یہ مغرب پرستی اول اول تو شاعری میں ایک نئے انداز تحریر کی شکل میں رونما ہوئی۔ ہم ایک پچھلے باب میں بیان کرچکے ہیں کہ ترکی میں نئی دنیا کی خلاق یہ شاعری ہی ہے۔ ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ مغرب پرستوں کو کامل اقتدار حاصل ہونے تک عہد جدید کا سب سے بڑا ترکی شاعر حامد ترکی فنون لطیفہ کے تصورات پر پورے طور پر حاوی تھا۔ اور اس کے ساتھی شاعروں پر مغرب کی رومانی تحریک کا اثر تھا۔ لیکن جس وقت ترکی میں مغرب پرستی شروع ہوئی ہے تو یورپ میں اس فلسفیانہ رومانی عہد کا خاتمہ ہوچکا تھا۔ تصورات پر علوم طبیعی اور مادہ پرستی کی فرمانروائی تھی اور فنون لطیفہ میں واقعیت پسندی اور فطرت دوستی کا دور دورہ تھا۔

فلسفی۔ رومانی عہد میں آرزوئے اتحاد کی جو عظیم الشان لہر اٹھی تھی اس کا خاتمہ ذہنی انفرادیت نے مغرب کی ساری تمدنی زندگی میں کردیا تھا۔ چنانچہ فنون لطیفہ کے اس انفرادی اصول کا دردورہ تھا کہ فن کو فن کے لئے ہونا چاہئے۔ مغرب پرستی تو مغرب کی ہر چیز میں حسن مطلق کا نظارہ کرتی ہے۔ چنانچہ اس نے رومانی تحریک اور

اس کے ساتھ ساتھ حامد اور اس کے تصور شاعری کو چھوڑنا ضروری سمجھا۔ ان لوگوں کی نظر سے حامد کی اخلاقی عظمت اور اسکا تمدنی متن پوشیدہ تھا۔ انہیں ضیا پاشا اور کمال کی نظموں میں جو حامد سے بہت قریب تھے کوئی جماعتی مقصد یا شاعرانہ افادیت نظر آتی تھی جس نے گویا قدیم عثمانی شاعری کے مذہبی مقاصد کی جگہ لے لی تھی۔ ترکی شاعری کی تاریخی روایات اور اس کے تمدنی متن کو حامد نے نہایت خوبی کے ساتھ فن شعر کی ضروریات کے ساتھ ملا دیا تھا۔ اس ان لوگوں نے ہاتھ سے دیدیا تھا۔ شاعری ہی نہیں کہ قوم کی زندگی پر اثر ڈالنے سے دست کش ہوگئی بلکہ زندگی سے اُسکے تمام رشتے کٹ گئے۔ قدیم شاعری میں عربی ایرانی تخیل حاوی تھا اس کی جگہ اب مغربی خصوصاً فرانسیسی تخیل نے لے لی۔ حامد اور اس کے ساتھیوں کے برخلاف یہ جذبۂ شاعری اب صرف اپنے انداز بیان ہی میں مغربی نہ تھا بلکہ بلحاظ مطالب بھی۔ اب تو خیالات و احساسات اور طرز تحریر سب کچھ مغربی ہوگیا تھا۔ شعر کے مضامین و مطالب بھی مغربی یا مغرب پرستوں کی زندگی سے حاصل کئے جاتے تھے۔ لوگوں کا جی تو یہ چاہتا تھا کہ ہو سکے تو کسی مغربی زبان میں لکھیں بھی لیکن خیر اس کی نوبت نہیں آئی، ہاں اس کے عوض زبان کو ایسا بنایا گیا کہ اس میں مغربی تصورات و تخیلات کی ترجمانی ہو سکے۔ زبان اس طرح سادہ اور لوچدار تو ہوگئی لیکن قوم کے لئے اب بھی اتنی ہی ناقابل فہم رہی جتنی فارسی و عربی عناصر سے لبریز قدیم زبان۔

(باقی)

آزادی

(مشہور جرمن شاعر اور مصنف ہانرش ہائنے کے سفرنامہ سے)

میری آنکھیں ٹمیس کے ہرے بھرے کناروں کو دیکھ رہی تھیں اور میری روح کے گوشہ گوشہ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا بلبلان خوش نوا ابھی ابھی اپنے خواب سے چونک پڑے ہیں۔ جہاز پر ایک زرد رو آدمی میرے پاس کھڑا تھا "اے سرزمین حریت" میں بے اختیار پکار اٹھا " تجھے میرا اسلام۔ اے آزادی، نوجوان دنیا کے آفتاب تازہ، تجھکو بھی میرا اسلام۔ وہ پرانے آفتاب: محبت و ایمان، زرد پڑ گئے ہیں سرد ہو چلے ہیں۔ اب یہ روشنی ہی دے سکتے ہیں نہ حرارت۔ شہدا کے وہ جنگل کے جنگل جن میں کبھی کثرت آبادی کے باعث ریل پیل تھی آج اجاڑ پڑے ہیں اور کہیں کہیں نازک شاخوں میں اکا دکا آشیانہ نظر آتا ہے۔ وہ قدیم گنبد گر رہے ہیں جنہیں کبھی ایک ایسی پر از مذہبیت نسل نے جو اپنے ایمان و عقیدہ کی عمارت کو آسمانوں تک لیجانا چاہتی تھی اس درجہ بلند بنا دیا تھا۔ یہ سب برباد و سمار ہو رہے ہیں اور ان کے دیوتا خود اپنے اوپر ایمان نہیں رکھتے۔ ان دیوتاؤں کی زندگی کے دن پورے ہو چکے اور ہمارے عہد میں اتنا تخیل نہیں کہ نئے بت تراشے۔ قلب انسانی کی ساری قوت نے اب عشق حریت کی شکل اختیار کر لی ہے اور حریت و آزادی ہی شاید عہد جدید کا مذہب ہے۔ یہ بھی ایسا ہی مذہب ہے جس کی تلقین مالداروں کو نہیں بلکہ ناداروں کو کی گئی ہے۔ اس کے بھی مبلغ ہیں، شہید ہیں، منافق ہیں۔

زرد رو شخص نے کہا " جوشیلے نوجوان، تم جو ڈھونڈتے ہو وہ تمہیں یہاں نہ ملے گا۔ ممکن ہے تمہارا یہ خیال ٹھیک ہو کہ حریت ایک نیا مذہب ہے اور ساری

دنیا میں پھیل رہا ہے۔ لیکن جیسے پہلے ہر قوم نے جس نے عیسائیت کو قبول کیا اسے اپنی ضروریات کے مطابق ڈھالا اسی طرح ہر قوم اس نئے مذہب حریت سے بھی بس وہی اخذ کرے گی جو اس کی مقامی ضروریات اور سیرت قومی کے مطابق ہے۔

انگریز ایک گھریلو قوم ہیں، یہ نہایت محدود، گھری ہوئی خاندانی زندگی بسر کرتے ہیں۔ انگریز اپنے متعلقین کے حلقہ میں وہ اطمینان روح تلاش کرتا ہے جو اس کی فطری حجابتی بے بسی کے باعث اسے گھر سے باہر کہیں نصیب نہیں ہو سکتا۔ لہذا انگریز اس آزادی سے مطمئن ہے جو اس کے شخصی حقوق کو محفوظ کر دے اور اس کی ذات، اس کی ملک، اس کی خانگی زندگی، اس کے عقائد، حتی کہ اس کے تعصبات تک کو اپنی پناہ میں لے۔ اپنے گھر میں انگریز سے زیادہ اور کوئی شخص آزاد نہیں ہوتا۔ ایک مشہور قول کو نقل کردوں تو انگریز اپنی چار دیواری کے اندر بادشاہ بھی ہے اسقف بھی۔ اور اس کی یہ عام کہاوت کچھ نہیں "میرا گھر میرا قلعہ ہے"۔

اگر انگریزوں کو بہت زیادہ خواہش ہوتی ہے شخصی آزادی کی تو فرانسیسی ضرورت کے وقت اسے چھوڑ بھی سکتا ہے۔ بشرطیکہ اسے آزادی عام کے اس حصہ سے فیضیاب ہونے دیجئے جسے ہم مساوات کہتے ہیں۔ فرانسیسی کوئی گھریلو قوم نہیں۔ بلکہ بہت ملنسار قوم ہے۔ یہ اسے پسند نہیں کرتے کہ پاس بیٹھے ہوں اور چپ رہیں۔ اس خاموشی کو تو یہ "انگریزی گفتگو" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ قہوہ خانہ سے قمار خانہ، اور قمار خانہ سے محفل رقص کا گشت لگاتے ہیں۔ انکا ملکا۔ شمپین جیسا خون اور انکی فطری میل جول کی صلاحیت انہیں مجلسی زندگی پر مجبور کرتی ہے اور اس زندگی کی اول اور آخر شرط نہیں اس کی روح یہی چیز ہے: مساوات۔ چنانچہ اس مجلسی زندگی کے نشو ونما کے ساتھ مساوات کی خواہش کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ اور ہر چند انقلاب فرانس کی وجہ اس کے مزاج میں تلاش کرنی چاہیئے لیکن پھر بھی اس کے لئے آواز بلند کی ان عوام نے جو

پیرس کے سیلونوں میں امراء کے ساتھ بظاہر برابر کی زندگی بسر کرتے لیکن کبھی کبھی انہیں ان کی وہ گہری اور تکلیف دہ عدم مساوات یاد دلا دی جاتی تھی، چاہے اس کی وجہ کوئی شکل سے محسوس ہونے والا لیکن اس وجہ سے اور بھی زیادہ دکھ دینے والا تبسم امارت ہی کیوں نہ ہوتا ہو۔ یہ بات کہ مساوات کی خواہش ہی انقلاب کا بنیادی اصول تھی۔ اس وجہ سے اور بھی قابل پذیرائی ہے کہ ایک اہل فرانس اپنے عظیم الشان شہنشاہ کے زیر سایہ پھر نہایت مطمئن اور خوش خرم تھے جس نے ان کی خود سالی کا خیال کر کے انکی آزادی کو اپنی سخت نگرانی میں رکھا تھا اور انکے لئے بس مکمل و قابل ستائش مساوات کی مسرت چھوڑ دی تھی۔

جہاں تک جرمنوں کا تعلق ہے سو انہیں نہ حریت کی ضرورت ہے نہ مساوات کی۔ یہ ایک تخیلی قوم ہیں، تصور پرست، آگے سوچنے والے یا پیچھے دیکھنے والے، یہ خواب دیکھا کرتے ہیں، ماضی میں زندگی گزارتے ہیں یا مستقبل میں۔ انکا حاضر کوئی نہیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کا حاضر ہے انکے لئے ہر دن اپنے اندر اپنے مقابلے اور جھگڑے رکھتا ہے ہر دن کی اپنی تاریخ ہوتی ہے۔ جرمن کے پاس کچھ نہیں جس کے لئے اسے لڑنا ہو، اور جب اس نے شیخی سے یہ سوچنا شروع کیا کہ ایسی چیزیں ضرور ہونی چاہئیں جن کا حصول پسندیدہ ہو تو اس کے فلسفیوں نے اسے ایسا خوب سبق دیدیا کہ وہ ایسی چیزوں کے وجود ہی کو شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اس سے تو انکار نہیں کہ جرمن بھی آزادی سے محبت کرتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جیسے اور دوسری قومیں۔

انگریز آزادی کے ساتھ ایسی محبت رکھتا ہے جیسے اپنی منکوحہ بیوی کے ساتھ۔ اس کا اس پر قبضہ ہے اور اگرچہ کچھ بہت پیار محبت نہیں کرتا لیکن اگر وقت پڑے تو مردوں کی طرح اسکی حفاظت کرنا جانتا ہے اور خدا بچائے اس لال کوٹ والے کو جو اس کے مقدس خوابگاہ میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ چاہے عشقباز بنکر چاہے تیجے و بدمعاش کی طرح۔

فرانسیسی کو آزادی کے ساتھ ایسی محبت ہوتی ہے جیسے آمیز اپنی معشوقہ کے ساتھ، یہ اس کے عشق میں تمتایا جاتا ہے، آگ پکڑے لیتا ہے۔ یہ اپنے کو مبالغہ آمیز سے مبالغہ آمیز تعریفوں کے ساتھ اس کے قدموں پر ڈالے دیتا ہے۔ اس کی خاطر زندگی اور موت سب کچھ نثار کرتا ہے اور اس کے لئے ہزاروں حماقتیں اس سے سرزد ہوتی ہیں۔
جرمن آزادی سے یوں محبت کرتا ہے جیسے اپنی بڑھی دادی سے۔

انسان بھی عجیب چیز ہے! وطن میں ہم لوگ بھرے بیٹھے رہتے ہیں، وہاں کی ہر ایک حماقت ہر ایک غلطی سے جو اکتایا جاتا ہے۔ لڑکوں کی طرح اور جی چاہتا ہے کہ وسیع دنیا میں نکل بھاگیں لیکن جہاں واقعی اس وسیع دنیا میں آئے تو پھر یہ بھی ضرورت سے زیادہ وسیع ہو جاتی ہے اور دل ہی دل میں ہم پھر وطن کی انہیں حماقتوں اور غلطیوں کی تمنائیں کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر جی چاہتا ہے کہ اسی پرانے جانے پہچانے کمرہ میں گرم گرم بیٹھے ہوتے اور کوئی جرمن اخبار پڑھتے ہوتے۔ یہی حال میرا سفر انگلستان میں ہوا مشکل ہی سے جرمن ساحل میری نظروں سے اوجھل ہوا تھا کہ دل میں انہیں نیوتانی مہربان سست عناصر کی عجیب سی محبت کارفرما ہونا شروع ہوئی جنہیں میں نے ابھی ناراض ہو کر چھوڑا تھا۔ اور جب وطن آنکھوں سے پوشیدہ ہو گیا تو میں نے اسے پھر اپنے دل میں پالیا۔
اس لئے شاید میری آواز میں کچھ رقت ہوگی جب میں نے اس زرد رو آدمی کو جواب دیا کہ "مہربان! میرے سامنے جرمنوں کو کیوں برا کہتے ہو۔ مانا کہ یہ خواب دیکھتے ہیں لیکن ان میں سے بہتوں نے ایسے اچھے خواب دیکھے ہیں کہ میں اپنے پردسیوں کی جیتی جاگتی حقیقت سے انہیں کبھی بدلنے پر تیار نہ ہوں گا۔ ہم چونکہ سب کے سب سوتے ہیں اور خواب دیکھتے ہیں اس لئے شاید ہمیں آزادی کی اتنی ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ ہمارے ظالم حکمراں بھی تو سوتے ہیں اور اپنے ظلم کا بس خواب ہی دیکھتے ہیں۔ ہاں اس

وقت ہم ضرور جاگے تھے جب کیتھولکی اہل روما نے ہماری خواب دیکھنے کی آزادی ہم سے چھینی تھی۔ اس وقت ہم میدان عمل میں آئے۔ فتحیاب ہوئے اور پھر پڑ رہے اور خواب دیکھنے لگے۔ اے حضرت ہمارے خواب دیکھنے والوں کا مذاق نہ اڑائیے۔ نیند میں بڑبڑانے والوں کی طرح یہ خواب دیکھنے والے کبھی کبھی عجیب باتیں کہہ جاتے ہیں اور انکے الفاظ آزادی کے تخم بن جاتے ہیں۔ کون جانتا ہے کہ حالات کیا صورت اختیار کریں۔ بد مزاج برطانی اپنی بیوی سے بیزار ہو کر ممکن ہے اس کے گلے میں رسی باندھے، اور اسمتھ فیلڈ میں اسے بیچنے کے لئے لے آئے۔ پھر بھڑ یا فرانسیسی شاید اپنی معشوقہ سے بیوفائی کرے اور اسے چھوڑ کر جا چیا گا تا اپنے شاہی محل کی خاتونوں کے پاس پہونچے۔ لیکن جرمن اپنی بوڑھی دادی کو کبھی اپنے در سے دھکا دیکر نہ نکالیگا۔ اس کے لئے ہمیشہ آتش دان کے پاس جگہ ہوگی جہاں بیٹھکر یہ ہمہ تن گوش بچوں کو کہانیاں سنا سکیگی۔ خدا نہ کرے اگر ساری دنیا میں کبھی آزادی مفقود ہو جائے تو کوئی جرمن خواب دیکھنے والا اپنے خوابوں میں پھر اسے ڈھونڈ نکالے گا۔

(ذ ۔ ح ۔ خ)

کیمیاگر

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک اُن کی حکومت کسی قدر مستحکم ہوگئی تھی، مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے صرف چند حملے کئے تھے۔ ہندوتصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی، اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی۔ اور اس بے چینی کو دور کرنیکے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حادی ہوجانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اُسکا گھر سب کا گھر ہے، اُسکا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لیکر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہونچے تو انہیں حکم ملا کہ جونپور کیطرف کچھ اور نووارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا خالد پور نام رکھا گیا تھا مسلمان آبادی کی بنیاد ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالدپور میں جا بسے رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آگئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہوگئی۔ حکیم مسیح نے دنیائے اسلامی کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی، اور اپنے فن میں ماہر تھے، اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہوگئے اور ترکستان میں اُنکے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ اُن کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرادی، جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں اُن

کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں، وہ اونچا نیچا دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی
کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار تھے، تجربہ نے انہیں
انسان کی فطرت کے بھید بتا دئے تھے، انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا
اثر ہوتا ہے۔ مریض کو دوائے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیعت کے اخلاق سے کتنا، اُن کا
برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض اُن کی توجہ کو کافی علاج سمجھتے
تھے، لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سوچ سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط
سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے یہاں تک کہ اُنکی ناکامی کی وجہ علاوہ تقدیر کے اور
کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم مسیح، باوجود اپنی ہر دلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے
کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی تھی، کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ
انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ دنیا جتنی دیکھنی تھی دیکھ چکے ہیں۔ کیونکہ ہندوستان سے
واپس جانا ممکن نہیں، اور وہ یہیں مرینگے اور یہیں دفن ہونگے۔ اُنکا دل ہر قسم کے
تعصب سے پاک تھا، لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو نہ اپنے جیسے آدمی سمجھ سکتے تھے نہ ہندوستان
کو اپنے وطن جیسا ملک اُن پر کچھ اثر ان کی بیوی اور اُن کی سسرال کا بھی تھا۔ یہ لوگ
کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے، اور بغیر
ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں
سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو اُنکی اس قدر عزت، اُن سے اتنی محبت کرتے
تھے کہ انکا اپنی سسرال والوں کا ہمخیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن اُن لوگوں کے تعصب
کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح سے گھل مل سکے جیسا کہ اُن کی
فطرت کا تقاضا تھا۔ اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت
حاصل کرنے پر بھی ان کو اسکا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لئے بھی طبیعت میں وہ سکون

پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گزرتے گئے۔ حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا، اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں اُن کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے، اور اُن کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش مجھے ایک ایسا کیمیاگر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا۔"

اس کے جواب میں اُن کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا۔

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیاگر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کا مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری، اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن بعد ہی اُنکے مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا۔ لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالدپور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہئے۔ اُنکے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہونچائی گئی، اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہونچے اور انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالبًا شدید ہونے والا ہے سب نے اُسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالدپور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے، اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر اُن کی بیوی اُن سے زیادہ دوراندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا کہ تمام نوکر چاکر بوکھلائے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے

ہیں اور اُنکی بیوی رو پیٹ رہی ہیں پہلے تو انہیں یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار بنا ہے۔ مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہیں کا ماتم ہو رہا ہے۔ اُنکی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود رونا دھونا نہیں شروع کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی اور ہر ایک کو رو رو کر اُنکے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ اُنکے خسر اور سالے آگئے اور انہیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اسقدر گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کہہ کیا رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات سمجھنے اور جواب سوچنے کا موقعہ ہی نہیں دینا چاہتے تھے، اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں دونوں نے اُنکے ہاتھ پکڑ لئے، خدا اور رسول اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں، اُن کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا۔ اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو، اور کسی مسلمان کو اُس کے بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنا چاہئے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب وغریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنیکے لئے سوچ رکھی تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر اُن کے خسر اور سالے نے اُن کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اُٹھے:

"ارے وہ بیچارہ تو کچھ کہتا ہے نہیں، وہ خود جانے پر تیار رہتے ہیں!"

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے، لیکن اُن کی بیوی، جو اپنے فریق کو مضبوط پاکر اُنکے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں۔

"آپ لوگوں کے کہدینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہوگا جب یہ خود اپنی زبان سے کہدیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"چلیں گے کیوں نہیں" حکیم مسیح کے سالے نے کہا۔ "تم سامان تیار کراؤ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لیجائیں گے"۔

یہ کہکر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا، اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنیکے لئے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر انکا زندہ رہنا دشوار ہوتا، یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے۔ مگر حکیم مسیح نے انکی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کرلیا تھا کہ انکا خالدپور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلا جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالدپور میں ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا ہوگا، انکے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہوگئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہوجائیگا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور انکے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لئے کوئی مسلمان نہ ہوگا خالدپور چھوڑنا انکے لئے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا۔ مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں آسان معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے، اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اُس کے ساتھ تھے۔

اُن کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سے سمجھا بجھا کر منالیں گے لیکن بدقسمتی سے اُن کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گزشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر انکا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لمحہ ایک نیا صدمہ پہونچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی

اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں انکے دروازہ کو کھڑ
کھٹکھٹا رہے ہونگے کہیں کوئی بچہ رو دیا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت کیسی بلا ہوتی ہے
خالدپور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لئے تڑپ رہے ہوں گے
کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو ان
کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کے بار ہا آنکھوں میں آنسو بھر آئے، سر چکر کھانے لگا،
لیکن واپس جانے کی ہمت انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلہ نے خالدپور سے کوئی دس کوس پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے
تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہوگی۔ اور ہوا بھی یہی۔ کچھ دیر تک
تو ان پر ایک غفلت سی طاری ہوگئی جس سے انکا تکان جاتا رہا۔ لیکن پھر وہ پریشان خواب
دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے۔ کبھی گھوڑے پر سوار ایک
غار میں پھاند پڑتے تھے۔ جس کی تہ میں ایک خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی
میں انہیں خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں، ایک تیز آندھی آئی جس میں انکا گھوڑا کئی مرتبہ
زمین پر سے اڑ گیا، اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں
انکے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں کی گھٹا میں گم ہو جاتی ہے
سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے، اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے
جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کے ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ
ہوئے۔ دہلی کا رُخ وہی تھا

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر
آیا۔ پاس پہونچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لئے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انہوں
نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور آگے بڑھ گئے۔ مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد
انکا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اُسے جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ

تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اُسی مردہ پیچانا بھی مشکل ہوگا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اُسکا مزاج درست کرنے کے لئے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہوگئے۔

مڑتے وقت اُنکی نظر پھر اُس مسافر پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا اُنہیں تک رہا تھا گویا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔ اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کریں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اُسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا سا تھا۔ یعنی ایک نیچی موٹے سوت کی دھوتی، اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی، اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھدی تھی اُس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا، سینہ چوڑا چکلا۔ تنے اور اُبھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولا کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال، اونچی تیلی ناک، چوڑی پیشانی، چہرہ کا نمایاں سکون، سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اُسکا جسم آہنی ہے۔ مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا، اُس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی اور محبت تھی جو اس کے جسم کی مضبوطی، اس کے قد و قامت پر حاوی تھی اور اُسے دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا کہ وہ اسکا دوست اور ہمدرد ہے اور یہ مجسمہ طاقت، مجسمہ محبت اور ایثار ہے۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا، وہ جواب میں مسکرا دئے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخرکار انہوں نے پوچھا۔

"اے آہنی جسم کے مسافر، تو کہاں جارہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا، پھر اُن سے آنکھ لڑاکر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا، "خالدپور"

"مگر وہاں تو طاعون ہے!"

"ہاں میں اسے لئے جا رہا ہوں"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی، اور انہیں اس خوبصورت مردانہ جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اے مسافر، کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

"مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے، اور ہمیشہ عزیز رہے گی،" مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا، "جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی وہ خدا کو عزیز ہوگی اگر میں نے اس کی راہ میں جان دی۔"

حکیم مسیح پھر چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اسکا قول پکا ہے، انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور پختہ ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ شخص دنیا میں اکیلا ہو، اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لئے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ کچھ وہ اپنا بچاؤ بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر، کیا دنیا میں تجھ سے محبت کرنیوالا نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنیوالے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کبھی بھلائی سے نہیں روکتی۔"

آخری جملہ حکیم مسیح کے سینہ میں تیر کی طرح لگا اور وہ بیتاب ہو گئے۔

"اے مسافر تو آخر کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں،" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا، "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہونچا دے وہی میرا وطن ہے، اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہوگا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی بچے کچھ نہیں ... میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں، جہاں نیند لگی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میرے اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اُس کے قدموں پر گرتا، اور اُس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں ہمت نہیں، صرف تیری محبت مجھے سیدھے راستہ پر چلا سکتی ہے، چل، میری رہبری کر میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں ...."

"مگر مسافر، طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا، اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے پر تیار تھے، بدن پسینہ سے شل ہو گیا تھا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے۔ محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے۔ ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگے

"حکیم مسیح،" مسافر اچانک بول اٹھا "مسلمان کوئی کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا، اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو اپنے سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو تمہارے دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکئے بھیگ گئے تھے لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی انہوں نے "یا رسول" کا نعرہ مارا، پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانیکی خبر سنکر خالدپور کی آبادی میں اُدھم مچ گئی۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہیں رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آگئی جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کرنیکے لئے اُنکے مطب میں بھاگتا ہوا آیا اور اُس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا اُنکی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے شرمندگی سے اُنکی نظریں نیچی تھیں، مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوا لی۔

ادھر سویری جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اُس نے رات کے تیسرے پہر "یا رسول" کا ایک نعرہ سنا تھا، لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالدپور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں، اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالدپور چلیں۔

جب وہ اپنے گھر پہونچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں، نہ پانی پیا ہے نہ کھانا کھایا ہے، بال پریشان ہیں، آنکھیں سرخ، لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا، مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہونچنے میں بہت دیر لگی، اور جب وہ پہنچ بھی گیا تو حکیم صاحب نے نہ اُسے پہچانا نہ اسکی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بیتابی سے انتظار کیا، لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہونچیں، وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے۔ لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جاکر کھڑی ہوگئیں۔ حکیم مسیح اُنہیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ لیکن جب پہچان لیا

تو مسکرائے، کچھ سوچا اور کہا،

لالہ سیتا رام کی بیوی بیار ہیں میں نے دوا بھیج دی ہے، لیکن اُن کی تیمارداری کے لئے کوئی نہیں اگر آپ وہاں چلی جائیں . . . . . "

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی پچھلے دنوں کے تکان کا نام و نشان نہ تھا، آنکھیں اب بھی سرخ تھیں، مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں، یہ ایک نظر کافی تھی، وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتا رام کے گھر پہنچ گئیں . . . .

خالد پور میں دو مہینہ طاعون کا دورہ رہا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی کوئی تدبیر نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت اُن کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور اُنکے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے لیکن یہ بھی اُن کو تسکین دلانیکے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازوں کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں لیکن اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ علاوہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس زمانہ میں وہ اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکے۔ مگر بستی والوں کو ان دونوں سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو اُن کی بیوی کی اور بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہونچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں دوسرے انہیں بھول گے۔ اور اُنکے ضمیر نے ملاقات کے لئے فرائض ترک

کرنیکی اجازت نہ دی۔ مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ یا کوئی خود غرضی یا خوف انکے پاس نہ پھٹکنے پاتے اور وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکے۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا، اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے، کام کم ہوا، فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار دھم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیان میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے۔ ماہران فن قدر دانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایت کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے ان کی شہرت کا ڈھنڈورا دور دور تک پٹ چکا تھا، لوگ دور دور سے انکے پاس آتے تھے، اور دل میں اسکا افسوس واپس لیجاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ انکی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا، انکے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان کپڑے، جواہرات، ایسے جو بادشاہوں اور لیڈروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔ مگر حکیم صاحب اور انکی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے، تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دیدیتے تھے جس سے وہ انکی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔

خالدپور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور انکی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو۔ لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوا انکے اور انکے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے، انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں

کے عمل کہیں [illegible] ہیں، اور وہ محبت و پیار کی تقریریں جو دوسروں پر برساتے ہیں، اسی محبت
کا ایک دھندلا عکس ہے جس میں اُنکی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں، وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ یہ
محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے۔ خود بخود نہیں پیدا ہوئی، اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی
وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی انکی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اُس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے
تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی، اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا
کہ طاعون انہیں بہت زیادہ مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالدپور کے باشندوں سے
ایک مسجد بنانیکی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے۔ بلکہ یہ خواہش بھی
کی کہ چندہ کر کے ایک عالیشان عمارت بنائی جائے۔ لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں
نے اپنی بیوی کی مدد سے تھوڑے دنوں میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد ایک بڑے سایہ دار
درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اُسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے
دین اور اپنی محبت کو پختہ رکھنے کے لئے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لیکر اس مسجد میں جایا کرتے تھے، اور
وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو، کبھی ساری رات گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو
آنے سے ذرا دیر ہو گئی وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، اُن کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح
اُنکی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ اُن کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس
خلوص سے اُنکے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے
انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ اُس آہنی جسم والے
مسافر کا جس نے اُن کو خالدپور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں
جھیل سکے تھے، اس بیچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی نہیں میسر ہوئی۔ مگر اس پر
بھی وہ اُن سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے
مسافر کی طرح حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گر پڑے، اور اس سے التجا

کی کہ اپنی محبت سے اُن کی ہمت دوگونہ کرے، اُنکے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنیکی طاقت بخشے۔

جب اُنکی بیوی نے سلام پھیرا تو اُنہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے اُن کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے، پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:

"تم کو شاید یاد ہو، میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنادے، اس قوم میں مجھے کھپادے۔ دیکھو اُس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنادیا"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہونچ گئے تھے۔ انکی بی بی نے انکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباکر چوما، اُنکے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی، اور پھر دونوں اپنے کیمیاگر کے تصور میں محو ہوگئے۔

(محمد مجیب بی۔اے (آکسن))

کلام شیدا

جو فرصت درد سے ملتی تو کچھ فکر دوا کرتے

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم و مغفور کا کچھ غیر مطبوعہ کلام مرحوم کے فرزند ارجمند حکیم محمد جمیل خانصاحب نے عطا فرمایا ہے۔ اسمیں سے چند شعر ہم قارئین کرام کی خدمت میں پیش کرتے ہیں بقیہ کلام بالسلسلہ شائع ہوتا رہیگا اور دیوان شیدا کی طبع ثانی پر انشاءاللہ اسکو بھی داخل کر دیا جائے گا۔

ہمارے چارہ گر ناحق ہمیں الزام دیتے ہیں — جو فرصت درد سے ملتی تو کچھ فکر دوا کرتے
نہ سلتا حشر تک ایسا پھٹا تھا جوش وحشت میں — اگر دست تصور سے بھی ہم داماں سیا کرتے۔

بلبل زسر بہ صحن چمن نغمہ خواں رسید — در گوش ام از بہار نوید فغاں رسید
ساقی مدام بادہ گلگوں بجام ریز — علیم مکن کہ زفت بہار و خزاں رسید
در باغ بود از خم سنبل حکایتے — آمد صبا و حرف ز زلفت بیاں رسید
آں دلبرے کہ از من دیوانہ می گریخت — یارب چہ شد کہ در بر من ناگہاں رسید
در حیرتم کہ آہ دل بے قرار چوں — نا جستہ از لبم بہ در آسماں رسید
ساقی بہ عشوہ آمد و بلبل بہ نغمہ شد — غافل مشو کہ وقت مئے ارغواں رسید
تنہا نہ من کہ چشم جہانش ندید ہم — لیلیٰ ز دیدہ در دل من آنچناں رسید
بہر گناہگار نوشتند مغفرت — مفتی بہ کنہ گفتہ من کے تواں رسید

شیدا اے بادہ ہستی و باک از خداست نیست
یعنی کہ از در کسش تو سلطاں رسید

شذرات

جامعہ کا ایک وفد بہ سرکردگی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب الہ آباد اور بنارس گیا تھا۔ دونو جگہ موجودہ صورت حالات کو دیکھتے ہوئے معقول کامیابی ہوئی۔ مفصل کیفیت ابھی ہمیں معلوم نہیں ہو سکی انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں درج کیجائے گی اور اُن سب حضرات کا شکریہ ادا کیا جائے گا جنھوں نے وفد کی امداد کی۔

اردو اکادمی کی مطبوعات کے سلسلہ میں تاریخ مغربی یورپ مترجمہ محمد یحییٰ صاحب تنہا اور مل کی آزادی مترجمہ سعید انصاری صاحب زیر طبع ہیں۔ انشاء اللہ دونوں کتابیں آخر اگست تک شائع ہو جائیں گی۔

مس میو کی شورش انگیز کتاب مادر ہند کے بہت سے جوابات اور اس پر بہت سی تنقیدیں شائع ہو چکی ہیں مگر ان میں سے زیادہ تر ایسی تحریریں ہیں جن میں جائز غصہ کے اظہار پر یا الزام کے جواب میں الزام لگانے پر اکتفا کی گئی ہے۔ ایسی تنقیدیں بہت کم نظر آتی ہیں جن میں اس پر نظر ڈالی گئی ہو کہ مس میو کے بیاں کے کون سے حصے صحیح ہیں اور کون غلط۔ اغلاط کے وجوہ کیا ہیں اور اُنکے نقصانات سے بچنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ حال میں ڈاکٹر بریجے کا ایک مضمون ڈیلی میل میں شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے "ہندوستان کی عورتوں کی سچی حالت" اس میں ڈاکٹر صاحب نے مس میو کے الزامات کا ذکر کیا ہے اور ان پر متانت سے غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ الزام ایک زمانے میں صحیح تھا مگر اب نہیں کہ لڑکیاں بالغ ہونیکے بعد عرصہ تک کنواری رہتی ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی اب کم ہوتی

جاتی ہے کہ میاں بیوی کی عمر میں زمین آسمان کا فرق ہو کیونکہ ایک طرف تو لڑکیوں کی صغر سنی کی شادی کم ہو رہی ہے اور دوسری طرف بیواؤں کے بیاہ کے بھی اب لوگ زیادہ مخالف نہیں۔ آپ کے خیال میں اعلیٰ ذاتوں میں سے اسی فیصدی ایسی ہیں جن کے یہاں بیواؤں کی شادی اور طلاق دونوں جائز سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بلاشبہ ہندوستان کے نظام معاشرت میں خرابیاں موجود ہیں اور ہندوستان والے اپنے غیر ملکی ہمدردوں مثلاً مسز بیسنٹ ۔ ڈاکٹر اینڈریوز ۔ سسٹر نویدیتا وغیرہ کی تنقید اور تنبیہ کی دل سے قدر کرتے ہیں لیکن مس میو کی سی شپرہ چشم کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

جن لوگوں نے "مادر ہند" کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں ہندوستانی سماجی خرابیوں کی مثال میں جو واقعات لکھے گئے ہیں وہ اکثر صحیح ہیں مگر یا تو ان سے نتائج بالکل غلط نکالے گئے ہیں یا ناکافی شہادت کی بنا پر فیصلہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے ہر صفحہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والی نے یہ نظریہ پہلے سے قائم کر لیا تھا کہ ہندوستان نیم وحشی ملک ہے اور اس سے متاثر ہونے کے بعد واقعات کو دیکھا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اسے ثابت کرنے کیلئے واقعات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالے ہیں محض تصنیف کو دیکھنے کے بعد بغیر مصنفہ سے مزید واقفیت کے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ وہ یا تو ہندوستان کی نادان دوست یا دانا دشمن ہے۔ لیکن جب اُس کی دوسری تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو ثابت ہو جاتا ہے کہ نہ وہ نادان ہے اور نہ کسی حیثیت سے ایشیائیوں کی دوست بلکہ امریکی اور برطانوی سامراج کی شاطر ہراول ہے۔

اس کتاب سے ہندوستان کی شہرت کو یقیناً سخت نقصان پہونچ رہا ہے لیکن ہمارے خیال میں اس نقصان سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اہل الرائے خود ایسی کتابیں شائع کریں جنمیں ہندوستان کی سماجی خرابیوں کی صحیح تصویر ہو اور ان کو شش ول

کا ذکر ہو جو خود ہندوستانی انہیں دور کرنیکے لئے کر رہے ہیں اور جن سے مس ہیونے جان بوجھ کر چشم پوشی کی ہے۔ ان کتابوں کو لوگ بہت شوق سے پڑھیں گے اور ان سے متاثر ہونگے۔ اس قسم کے جوابوں سے جو آج کل لکھے جا رہے ہیں جن میں ہندوستان کی بیجا تعریف اور یوروپ و امریکہ کی جا و بیجا مذمت ہوتی ہے نہ غیر ملک والوں پر کوئی اچھا اثر پڑے گا اور نہ خود ہندوستانیوں پر۔

آزادی کی تحریک نے ایرانی مدبرین میں جو بیدار مغزی پیدا کر دی ہے اُس کا اظہار علاوہ اور باتوں کے اس سے بھی ہوتا ہے کہ ایران والے اپنی تعلیم کو غیر ملکیوں کے اثر سے آزاد کرنیکی کوشش کر رہے ہیں۔ گزشتہ سال وزارت تعلیم نے ایک فرمان جاری کیا تھا کہ تمام مدارس میں تعلیم سرکاری ضابطہ کے مطابق ہونا چاہئے یعنی ہر چھوٹے اور بڑے مدرسہ کو علاوہ اور علوم و فنون کے اسلامیات اور فارسی زبان کی تعلیم بھی دینا چاہئے علاوہ اس کے مذہب عیسوی کی دینی تعلیم پر جس میں مذہبی خلوص سے زیادہ سیاسی مصلحتیں شامل ہوتی ہیں کچھ قیود عائد کئے گئے تھے۔ اس حکم پر غیر ملکی مدرسے خصوصاً طہران کا امریکی کالج اور اصفہان کا برطانوی کالج بہت چراغ پا ہوئے اور غالباً ان دونوں ملکوں کی حکومتوں کی جانب سے دولت ایران پر ناجائز دباؤ ڈالا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دوسرے فرمان کی رو سے آئندہ جون سے تمام ملک کے مدارس میں ہر طرح کی دینی تعلیم روک دی گئی ہے۔ یعنی بائبل کے ساتھ قرآن کی تعلیم کی بھی ممانعت کر دی گئی۔

جہانتک اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بائبل کی تعلیم کو روکنے میں حکومت ایران نے مذہبی تعصب سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے ملکی مصالح کی بنا پر وہ ایسی سختی پر مجبور تھی۔ لیکن اس کے ساتھ اسلامی مذہبی تعلیم کو بھی بند کر دینا یا تو کمزوری کی دلیل ہے یا مذہب سے بیزاری

کی۔ چونکہ مغربی تعلیم پائے ہوئے ایرانیوں کو بھی ترکوں کی طرح یوروپ کی تقلید خصوصاً اُس کی لامذہبی کی تقلید کا شوق ہے اس لئے خیال ہو سکتا تھا کہ شاید یہ شاگردان مغرب اپنے اُستادوں سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے اور انہوں نے مذہبی تعلیم کو ضعیف الاعتقادی سمجھکر ممنوع قرار دیا۔ لیکن سلطنت پر علماء کا اثر دیکھتے ہوئے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے ممکن ہے کہ یہ محض سیاسی کمزوری کا کرشمہ ہو یعنی پادریوں کی سیاست آگیں مذہبی تعلیم کو روکنے کا یہی ایک ذریعہ نظر آیا کہ سرے سے مذہبی تعلیم ہی بند کر دی جائے۔ دونو صورتوں میں معاملہ نہایت افسوسناک ہے اور ذمہ داری صریحاً علماء کی گردن پر ہے۔ خداوند تعالیٰ اُنکو ایسی غیرت اور ہمت دے کہ اسلامی مذہبی تعلیم کو جاری کرنے کے لئے کم سے کم اتنی ہی کوشش کریں جتنی مفید اصلاحوں کی مخالفت میں کیا کرتے ہیں اور ایرانی مدبرین کی اس مغرب پرستی کو دور کرے کہ وہ مذہب کی مخالفت میں اس قدر تعصب کا اظہار کر رہے ہیں۔

ہمارے پاس بیروت کی امریکی یونیورسٹی کا ۲۸-۱۹۲۷ء کا دستور العمل آیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس یونیورسٹی کو ایک کمیٹی چلاتی ہے جس کا دفتر نیویارک میں ہے۔ اس کی بنیاد ۱۸۶۳ء میں ڈاکٹر ڈانیل بلس نے امریکی مشن کے ایما سے ڈالی تھی ڈاکٹر بلس نے امریکہ اور انگلستان کا سفر کیا تاکہ لوگوں کو شام میں ایک مشن کالج کھولنے پر آمادہ کریں اور اس کے لئے چندہ جمع کریں ۱۸۶۴ء میں امریکہ کی مجلس مقننہ نے چند ٹرسٹیوں کو شامی پروٹسٹنٹ کالج قائم کرنے کی اجازت دی ۱۸۶۶ء میں ایک کالج کھولا گیا جس میں ۱۶ طالب علم تھے ۱۹۲۰ء میں یہ کالج ترقی کر کے یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچ گیا اور اُسے ایک نیا چارٹر عطا ہوا جس کی رو سے اسکا نام امریکی یونیورسٹی بیروت رکھا گیا۔ امریکہ کی حکومت اس یونیورسٹی کو کوئی امداد نہیں دیتی نہ اس کے کام میں مداخلت کرتی ہے۔

اس یونیورسٹی کے دو شعبے ہیں ایک شعبہ فنون عامہ و سائنس و دوسرا [illegible] طبی۔ علاوہ اس کے ساتھ ایک مدرسہ بھی ملحق ہے۔

مدرسہ کی تعلیم آٹھ برس کی ہے۔ لازمی زبان عربی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی بھی پڑھائی جاتی ہے۔

اسکے بعد ایک سال تک طلبہ کو تجارت وغیرہ کی تعلیم دیجاتی ہے جس سے فارغ ہونے کے بعد وہ کالج میں داخل ہوتے ہیں۔ کالج کا نصاب تین برس کا ہے جو لوگ اسے پورا کر لیتے ہیں انہیں بی اے کی ڈگری ملتی ہے۔ معاشیات، علم تجارت، انجنیری اور زراعت میں بھی ڈگری ملتی ہے۔

طب کی تعلیم کے لئے وہ لوگ داخل کئے جاتے ہیں جو کم سے کم کالج کے پہلے سال کی تعلیم حاصل کر چکے ہوں طبی ڈگری کے لئے مدت تعلیم پانچ سال ہے۔

دندان سازی کے ڈپلوما کے لئے بھی داخلہ اسی معیار سے ہوتا ہے اس کی مدت تعلیم چار برس ہے۔ دندان سازی کی تعلیم تین سال میں ہوتی ہے اور اس کے لئے وہ لوگ داخل کئے جاتے ہیں جنہوں نے درمیانی سال کی تعلیم ختم کی ہو۔

آپکا چندہ جون میں ختم ہوگیا

مفصلۂ ذیل حضرات کا چندہ ماہ جون میں ختم ہوگیا۔ ہمارے اور آپکے لئے آسانی، سہولت اور کفایت اس میں ہے کہ براہ کرم آپ آئندہ سال خریداری کا اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر مبلغ پانچروپے بواپسی مرحمت فرمائیں دی۔پی میں طوالت کے علاوہ ۵ ر کا صرفہ زاید ہوتا ہے منی آرڈر نہ آیا تو جولائی کا پرچہ بذریعہ دی پی حاضر ہوگا (منیجر)

نمبر خریداری	نام	مقام	نمبر خریداری	نام	مقام
۱۸۶	منیجر صاحب	حیدر آباد	۲۰۰	افتخار حسین خانصاحب	شاہ آباد
۱۸۷	مولوی نور الرحمن صاحب	"	۲۰۱	سردار محمد خاں "بزم احباب"	شملہ
۱۸۸	پرنسپل صاحب	"	۲۰۲	ایس ایم رحمن صاحب	یوت مل
۱۸۹	مظفر حسین صاحب	"	۲۰۳	محمد حسین صاحب	رنگون
۱۹۰	غلام علی امام الدین قاضی صاحب	سیارا	۲۰۴	ایس۔ آر ملا صاحب بی اے	مدھیلا
۱۹۱	حافظ دین محمد عبد القادر صاحب	کامٹی	۲۰۵	آنریری سکرٹری	بڈنیرا
۱۹۲	زین الدین صاحب فاروقی	امراؤتی	۲۰۶	تفضل حسین صاحب انجمن اتحاد	امراؤتی
۱۹۳	اقبال احمد خانصاحب	اعظم گڈھ	۲۰۷	میجر عظمت اللہ صاحب	سیف آباد دکن
۱۹۴	احمد حاجی صدیق کھتری صاحب	بمبئی	۲۰۹	آنریری سکرٹری صاحب	الہ آباد
۱۹۵	محمد خلیل امیر صاحب جلال	کلیان	۲۱۰	فریدالدین صاحب انصاری	آلندہ دکن
۱۹۶	محمد یوسف احمد صاحب	"	۲۱۱	حاجی محمد یوسف صاحب بھائی میاں	رنگون
۱۹۷	غلام رسول امیر ملا صاحب	"	۲۱۲	نور الحسن خانصاحب	غازی پور
۱۹۸	حاجی احمد برہان الدین صاحب	"	۲۱۳	محمد الیاس صاحب	نیلنگہ

نمبر خریداری	نام	مقام
۲۱۴	سید رضا عالم صاحب	کھاگول
۲۱۵	سکرٹری صاحب	امراوتی
۲۱۶	محمد جان صاحب	اودگیر
۲۱۷	سید احمد صاحب	رامپور
۲۱۸	محمد داؤد خان صاحب	گنی
۲۱۹	حاجی عبدالرشید خان صاحب (توسط فدا احمد خان صاحب شیروانی)	بلونہ
۲۲۰	عبدالعظیم منادی صاحب	بمبئی
۲۲۱	قربان حسین صاحب گرشاہ	ناگپور
۲۲۲	حسن محمد حیات صاحب	بھوپال
۲۲۵	سید ظہیر الحسن صاحب نقوی	لکھنؤ
۲۲۶	عبدالحنان صاحب	جنڈولہ
۲۲۷	ملک خدا بخش صاحب	ڈیرہ اسمٰعیل خاں

نمبر خریداری	نام	مقام
۲۲۸	محمد عظیم خان صاحب	کوہٹی
۲۳۰	سید نصیر الدین صاحب علوی	[illegible]
۲۳۱	حافظ عبدالرب صاحب	دہلی
۲۳۲	رسالدار میجر نذیر علی خان صاحب	تاج گنج
۲۳۵	مولوی عبدالحافظ خان صاحب	″
۲۳۶	محمد ضمیر الحق صاحب	بانکی پور
۲۳۷	مولوی سید عزیز الدین علی خان صاحب	حیدرآباد دکن
۲۴۱	ایم ابوالحسن جعفری صاحب	الہ آباد
۲۴۵	مولوی سعید الدین صاحب	″
۲۴۶	مولوی محمد یوسف صاحب	نگینہ
۲۴۹	مرزا احمد اللہ بیگ صاحب	حیدرآباد دکن
۲۵۱	سید طلحہ صاحب	لاہور

بچوں - لڑکوں - بڑوں - بوڑھوں

کے لئے

سیرۃ پاک پر چار مفید کتابیں

ہمارے نبیؐ - ۴ر   ہمارے رسولؐ - ۸ر

سرکار کا دربار عہ ر   سیرۃ الرسولؐ عہ ر

یہ کتابیں نہایت تحقیق کے بعد لکھی گئی ہیں

عمر اور قابلیت کے مدارج کا خیال رکھا گیا ہے

انکی قیمتیں ضخامت کے اعتبار سے کم ہیں

انکی خوبیاں عام طور پر تسلیم ہو چکی ہیں

پھر تو

آپ یہ سب کتابیں ضرور منگائیں

ہمارے نبیؐ :- اپنے چھوٹے بچے کے لئے

ہمارے رسولؐ :- اپنے بڑے لڑکے کے لئے

سرکار کا دربار :- اپنے بھائی کے لئے

سیرۃ الرسولؐ :- گھر کے بڑے بوڑھے کے لئے

اور آپ خود یہ چاروں کتابیں پڑھیں

ملنے کا پتہ : مکتبہ جامعہ - قرولباغ دہلی

شمع

سچ فرمائیے

کیا جناب کو علم و ادب کا ذوق ہے ؟

کیا جناب کو سیاست سے دلچسپی ہے ؟

کیا جناب کو تاریخ سے شوق ہے ؟

کیا جناب اپنی زبان میں یورپ کا لٹریچر دیکھنا پسند کرتے ہیں ؟

کیا جناب ہندوستان کے بہترین شعرا کا پاکیزہ کلام ہر ماہ دیکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اخلاق و تمدنی مضامین سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب اعلیٰ پیمانہ کے افسانوں سے نیک سبق حاصل کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب جدید ترین ترقیات معلوم کرنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب جدید ترین مطبوعات سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب مصوری کے لاجواب نمونے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں ؟

کیا جناب تاریخی اور کمیاب تصاویر کے شائق ہیں ؟

کیا جناب اپنے فاضل وقت کو بہترین شغل میں صرف کرنا چاہتے ہیں ؟

اگر آپ ان میں سے ایک بھی خواہش کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو رسالہ شمع کو ضرور ملاحظہ فرمائیے اور آج ہی ۱۰ر آنے کے ٹکٹ بھیجکر نمونہ طلب فرمائیے لکھائی چھپائی بہترین چندہ سالانہ [illegible] ششماہی [illegible] جنوری [illegible] سے مصوری کے بہترین نمونوں کی شاہان اودھ کی نہایت قیمتی اور بے مثل تصاویر شائع ہو رہی ہیں۔

منیجر رسالہ شمع حسن منزل شاہگنج آگرہ

دنیا کے بسنے والے

میشنری مرکزیہ کے پرانے پائندوں

بدوؤں۔ افریقہ کے بونوں اور جاپان سوئٹزرلینڈ اور ان ملکوں کے لوگوں کے حالات جہاں ہزار بل(؟) من برف گرتی ہے۔ سید بشیر حسن زیدی صاحب بی۔ اے (کینٹب) بیرسٹرایٹ لا ہیڈ ماسٹر مسلم یونیورسٹی اسکول علیگڑھ نے بچوں کے لئے آسان زبان میں لکھی ہے۔ کتاب میں تقریباً پچاس تصویریں ہیں جن میں بعض تو ایسی ہیں کہ انہیں دیکھ کر ہنسی ضبط کرنا محال ہے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے۔ ٹائیٹل خوبصورت اور رنگین۔ قیمت صرف ۶ر

صلاح کار

عنفوان شباب کے جذبات کے نشیب و فراز پر نہایت گہری نظر۔ ازدواجی زندگی کے لئے ایک دستور العمل جو انتہائی محنت و کاوش سے تمام مغربی و مشرقی مصنفین و حکماء کے خیالات سے ماخوذ ہے۔ مصنف نے اپنے ذاتی تجربات بھی تحریر کئے ہیں از چودھری محمد علی صاحب تعلقدار ردولی

قیمت صرف عہ

ترکوں کی کہانیاں

اس کتاب میں ترک بچوں کی بہادری اور ہمت و جرأت کی چند سچی اور دلچسپ کہانیاں ہیں جن کے پڑھنے سے بچوں میں قومی جوش پیدا ہو(؟) اور ان ترک بچوں کی طرح وہ بھی تندرست اور بہادر بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ کتاب بھی بس اب

ختم ہو چکی ہے صرف چند باقی رہ گئی ہیں۔ اگر فوراً طلب نہ کیجئے گا تو پھر دوسری بار چھپنے تک انتظار کرنا ہوگا۔ آج ہی لکھ دیجئے قیمت صرف ۴ر

قومی و اسلامی تعلیم کا نظام

جناب رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب

بی۔ اے (آکسن) کی تعلیمی اسکیم جس کا جناب محمد مجیب خواجہ صاحب بی۔ اے (کینٹب) بیرسٹر نے اردو میں ترجمہ کیا

قیمت ۴ر

انتخاب مضامین جوہر

یہ ان چیدہ علمی، ادبی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جو رسالہ جوہر میں جس کو طلبائے جامعہ نے ایک سال تک علی گڑھ سے شائع کیا تھا وقتاً فوقتاً درج ہوتے رہے۔ اس میں نظمیں اور غزلیات بھی شامل ہیں اور شروع میں مولانا محمد علی صاحب جوہر کا فوٹو ہو گیا ہے۔ قیمت [illegible]

عرض جوہر

مولانا محمد علی صاحب کے کلام کا مجموعہ۔ قیمت ۸ر

دیوان شیدا

عالیجناب مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں مرحوم

کے

فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ

مسیح الملک مغفور کی دوسری خصوصیات سے دنیا واقف ہے لیکن اگر آپ انہیں ایک نغز گو شاعر کے پیکر میں جلوہ گر دیکھنا چاہیں تو یہ نادر گلدستہ طلب فرمائیں۔ مکتبہ جامعہ نے اس دیوان کو جرمنی میں طبع کرایا ہے، پاکٹ سائز، سنہری منقش اور چمکدار جلد مطلا اوراق مع ایک کیس

قیمت صرف عہ

دیوان غالب اردو

مطبع شرکت کاویانی برلن (جرمنی)

اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پہلا ایڈیشن صرف ۱۰ ماہ کے اندر ختم ہو گیا دیوان مکمل ہے۔ مرزا مرحوم کا خود نوشتہ مقدمہ، غزلیات، قصائد وغیرہ سب ہیں جلد کی نفاست صرف دیکھنے سے تعلق ہے۔ شروع میں غالب کا سہ رنگی ہافٹون فوٹو ایک قابل قدر جرمن ہنر مندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ قیمت صرف چار روپے (للعہ)

مکتبہ جامعہ قرول باغ۔ دہلی